جنوری
1957

روشنی — گرمی — حرکت

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

سالانہ چندہ [illegible] روپے

فی پرچہ ۸ آنے

جلد نمبر ۱۱ | جنوری ۱۹۵۷ء | شمارہ نمبر ۱

فہرست

دفتر ادارتِ تحریر — ایک - اے محلہ رسول پورہ - اچھرہ - لاہور

دفتر انتظام — فیض محمد فتح علی روڈ - کراچی ۱

(سید کاظم علی پرنٹر و پبلشر ... فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا)

سوچ بچار (ادارہ)

تحریکِ اسلامی ——— چہ معنی دارد؟

گذشتہ شمارے کے ایک مضمون کے سلسلے میں ہم نے ایک بحث اس اشاعت کے لئے مؤخر کردی تھی۔ اس کو اب کی بار ادارتی صفحات پر لیا جارہا ہے۔ ہمارے ایک ادبی دوست جماعتِ اسلامی کی تحریک کے بارے میں اپنے مخصوص اختلافی رجحانات و خیالات کو یوں پیش فرماتے ہیں:۔

"مجھے اس امر کا یقین ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے صرف ایک ہی طریق کار ہے کہ جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے، یعنی وہ طریقِ کار کہ جس پر مکی زندگی میں عمل پیرا ہو کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اسٹیٹ قائم کی اور ایک اسلامی معاشرہ کی طرح ڈالی اور جسے جماعتِ اسلامی نے پاکستان کے قیام سے قبل اختیار کیا۔ میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس طریقِ کار کے علاوہ اگر کوئی طریقِ کار اسلامی حکومت کے قیام کے لئے اختیار کیا جائے تو وہ مصنوعی اور غیر طبعی ہوگا اور اس کے نتیجے میں اگر ایسی جد و جہد کرنے والوں کو کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو بھی ایک صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہوسکے گی، اور اگر اسے حکومت کے ذرائع سے قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے ایک طرح کی جبریت وجود میں آئے گی۔ اور اس طرح جو اصلاح ہوگی وہ عارضی ہوگی، اور جس طرح یوسف علیہ السلام کے بعد قبطی نیشنلزم نے سر اٹھایا تھا اور ان کی دعوت اور کارِ اصلاح کو ختم کر دیا تھا، یہی حشر ان حضرات کی دعوت اور کارِ اصلاح کا ہوگا۔ پھر اسی غیر مسنون طریقِ کار کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ دورانِ جد و جہد میں اس تحریک یا جماعت سے وابستہ حضرات اس تحریک کے ظواہر سے آہستہ آہستہ دلچسپی لینے لگیں گے اور اس کی رُوح فنا ہوتی جائے گی، حتیٰ کہ اس میں ایسے افراد کی کمی نہ رہے گی جن میں دنیا کے لئے اتنی ہی کشش ہوگی جتنی ان لوگوں میں ہوگی جو اس تحریک سے وابستہ نہ ہوں۔

بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں اسے غیر فطری اور غیر طبعی کہتا ہوں۔ اس طرح ہمارے ملک میں عجیب کشمکش کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ یہ کشمکش ناگزیر ہوتی ہے مگر یہاں یہ قبل از وقت پیدا ہوگئی ہے اور اس کشمکش کی وجہ سے ہمارا برسرِ اقتدار طبقہ مستقل طور پر منافق ہوگیا ہے اور ہمارے عوام بھی مذہب کے نام پر ——— وہ بھی کوشش کے بعد ——— جماعت کی سیاسی (یا دستوری) جد و جہد میں اس کا ساتھ تو دیتے ہیں مگر اس سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملی حیثیت سے ہم روز بروز ادبار کی پستیوں میں گرتے چلے جارہے ہیں۔ جمہوریت کا مطلب ہمارے ہاں یہ رہ گیا ہے کہ بدتر لوگوں کو بدلنے کے لئے بدترین لوگ آگے بڑھیں، اور ہمارا کوئی ملی نصب العین آج تک طے نہیں ہوسکا (باوجود دستور کے)۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ جو اسلامی جماعت قیامِ نظامِ اسلامی کے لئے کوئی ایسا طریقِ کار اختیار کرے جو وہ نہ ہو جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا تو اس کے کارکنوں میں دینِ اسلام کی رُوح فنا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور وہ جذباتی حد تک تو اسلام سے وابستہ رہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ دنیا کی طرف ایک کشش محسوس کرتے ہیں۔ اس نظریہ کا اطلاق مجھ پر پوری طرح ہوتا ہے۔ اگرچہ اب تک دنیا کی کشش کی عارضی لہروں کے علاوہ دنیا کے لئے میں نے کوئی کشش محسوس نہیں کی سبب بھی دنیا کی

کشش کی لہریں مجھ تک پہنچیں مجھے کھینچ تو لے گئیں مگر بہا کر غرق نہ کر سکیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں تک اس نظریے کے پہلے حصے کا تعلق ہے، وہ مجھ پر بالکل پوری طرح صادق آتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں جماعت میں شمول و خروج کی مختصر رُوداد عرض کر دوں (مگر آپ جماعت کے اندر آئے ہی کب تھے؟ متفق ہونے کے معنی جماعت میں داخل ہونے کے نہیں ہیں۔ ن۔ ص) جماعتِ اسلامی پاکستان کی دو حیثیتیں ہیں۔ اوّل وہ جو اس کے لٹریچر میں مذکور ہے، یعنی نظری حیثیت! دوم وہ جس کا یہ عملی مظاہرہ کرتی ہے۔ اس کے لٹریچر کے مطالعہ سے میں اصل جماعتِ اسلامی سے متاثر ہوا اور جماعت میں ایک طرح سے داخل ہو گیا۔ میں جماعت سے دو تین برس تک وابستہ رہا۔ اس دوران میں نے روزے بھی رکھے، نمازیں بھی پڑھیں مگر میں بتدریج تارک الصّلوٰۃ ہوتا گیا اور پھر جو نمازیں میں پڑھتا تھا۔ ان کے بعد بھی مجھ پر وحشت سی سوار ہوتی تھی ——— اس کا فائدہ کیا ہے؟ اور جب میں مندرجہ بالا اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان عبادات میں ایک صحیح اسلامی تحریک جو اثر پیدا کرتی ہے، ایک سیاسی تحریک وہ اثر پیدا نہیں کر رہی ——— پیدا نہیں کر سکتی!"

آپ کے یہ خیالات میرے لئے نئی چیز نہیں ہیں۔ ایک بار پہلے بھی آپ نے لمبا چوڑا طومار مجھے لکھ کر دیا تھا۔ آپ کے ان خیالات کو سمجھنے کے لئے مجھے کسی کاوش کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوئی کیونکہ میں آپ کی شخصیت اور نفسیاتی ساخت سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور براہِ راست آپ کا ذہنی مطالعہ کرنے کا موقع مجھے حاصل رہا ہے، نیز آپ کی معاشی مشکلات اور ملازمانہ مجبوریاں بھی پوری طرح میرے سامنے ہیں۔ میری رائے پہلے سے یہ تھی کہ آپ کے خیالات کو بس جان لینا کافی ہے، ان پر بحث کرنا مفید نہ ہو گا۔ چنانچہ مدت پہلے جو طومار آپ نے پڑھنے کو دیا تھا اس کو پڑھ کر میں نے زبانی یہی عرض کیا تھا کہ اگر آپ کا طرزِ فکر یہ ہے تو آپ بخوشی اپنے راستے پر چلتے رہیں۔ یہ معاملہ بحث طلب نہیں ہے۔ آپ ایک بار جماعتِ اسلامی کے متفق بنے تھے اور بعد میں آپ نے اپنا اتفاق واپس لے لیا۔ گویا دروازے پر آ کر آپ نے جھانکا اور پھر لوٹ گئے۔ اتنے سے واقعہ کو آخر غیر ضروری اہمیت ہم یا آپ کیوں دیں؟ اتفاق اور اختلاف کی آزادی ہے۔ اور بے شمار لوگ ہمارے ساتھ اس آزادی کو دونوں طرح استعمال کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے ذہنی مطالعہ کی بنا پر میرے نزدیک یہ کوئی مفید مصرفِ وقت نہ تھا کہ آپ کا تعاقب کیا جاتا۔ پھر آپ کے خیالات ایک غیر حلقے میں جا کر شائع ہوئے۔ آپ ہی سمجھ سکتے ہوں گے کہ اس حرکت سے حاصل کیا نکلا؟ ——— آپ کا کوئی فائدہ یا ہمارا نقصان؟ اب آپ نے اس اختلافی قضیئے کو اٹھا کر ایک ایسے مبحث میں جا ڈالا جو بجائے خود مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں جماعتِ اسلامی پر بحث چھیڑنے کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ خلطِ مبحث ہو اور اصل موضوع بالائے طاق دھرا رہ جائے۔ بنا بریں چاہا کہ اس قضیئے کو وہاں سے نکال کر ——— خواہ آپ کو ناگوار ہی ہو ——— میں نے صحیح میدان میں لا ڈالا ہے۔

اب میں آپ کے خیالات کے بالمقابل ایک تسلسل سے اپنے خیالات رکھتا ہوں۔

——— ۱ ———

آپ نے جماعتِ اسلامی کی نظری اور عملی حیثیتوں کو الگ الگ کر کے لیا ہے اور اپنے الفاظ میں یہ ظاہر کیا ہے کہ نظری پہلو نے آپ کو کھینچا اور عملی پہلو سے آپ مایوس ہوئے۔ گویا دونوں میں کوئی تضاد تھا۔ میرے نزدیک آپ کا یہ مطالعہ و تجزیہ قطعاً غلط ہے۔ آپ زمانہ قبلِ تقسیم میں جماعت کے ساتھ نہیں آئے بلکہ بعد تقسیم کے دور میں آئے اور وہ بھی اس وقت جب کہ دستوری مہم زوروں پر تھی۔ اور پھر آپ نے پوری

انتخابی مہم ہمارے ساتھ گناری۔ جماعت کی عملی سرگرمیاں پوری طرح آپ کے سامنے تھیں اور اس کی نظری دعوت کے بارے میں بات مرگرمیوں کے
سامنے ہوتے ہوئے کوئی مغالطہ کسی معقول آدمی کو نہیں ہو سکتا۔ ہماری نظری دعوت کا جو کچھ بھی مفہوم تھا اس کی واضح تفسیر میدانِ عمل میں
سامنے تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے ہی کچھ مخصوص ذاتی تصورات ساتھ لائے اور انہی تصورات کو آپ نے جماعت کی نظری دعوت میں
پڑھا اور پھر ان تصورات کے لئے جب عملی سرگرمی کی فضا کو ناساز گار پایا تو مایوس ہو گئے۔

ورنہ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ بے شمار لوگ جو قبل تقسیم کے دَور سے جماعت کی دعوت کو نقطہ بہ نقطہ سمجھ کر چلے "اخلاص کے ساتھ قربانیاں
دے دے کر اس کی علمبرداری کرتے رہے اور جنہوں نے ہر مرحلہ پر اصل نظریہ اور مقصد کی روشنی اور کتاب و سنت کی رہنمائی میں مختلف مسائل اور
اقدامات کئے وہ تحریک کے نظری و عملی ارتقاء کی مجموعی تاریخ کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کا اطمینان آپ کی بے اطمینانی سے زیادہ بڑی
سند ہے۔ آپ تو عین گہما گہمی کے دَور میں جماعت سے متاثر ہوئے اور آپ کو اپنے دو تین سال کے دورِ تاثر میں تحریک کو اپنے پلے سے کچھ زیادہ دینا
بھی نہیں پڑا۔

تحریک کا پورا سلسلۂ ارتقاء ایک مربوط کُل ہے جسے نظری و عملی اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان اجزاء میں تضاد دکھایا جا سکتا
ہے۔ تضاد درحقیقت آپ کے تصورِ دین اور تحریک کی عملی سرگرمیوں میں تھا اور اسی نے آپ کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کا دلچسپ
افسوسناک تجربہ ہے کہ آپ کو بہت جلد اپنے اندر سے رُوح غائب ہوتی محسوس ہوئی اور عبادات تک کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔ آپ نے اپنے
اس تجربہ کی ذمہ داری اپنے بجائے تمام تر تحریک پر ڈال دی ہے اور اس تجربے کو آپ پوری تحریک پر پھیلا کر اس کے مستقبل کے بارے میں پیش
گوئیاں کر رہے ہیں کہ یوں اور ووں ہو جائے گا۔

—— ۲ ——

تحریک نہ محض مذہب کا نام ہے، نہ مجرد سیاست کا! وہ نہ صرف ایک فلسفہ ہی فلسفہ ہوتی ہے، نہ فقط کشمکش ہی کشمکش! تحریک کا معاملہ
تو جامع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ نظریات بھی دیتی ہے، اخلاقی قدریں بھی پیدا کرتی ہے، جذبات میں بھی ہلچل مچاتی ہے، سیاسی معرکے بھی برپا کرتی ہے۔
تمدن و معاشرہ کی تعمیر بھی کرتی ہے، افراد کی اصلاح بھی کرتی ہے اور ادارۂ حکومت میں بھی تغیر لاتی ہے۔ ہاں! وہ دلیل سے پکارتی بھی ہے اور وقت
پڑے تو سنوارتی بھی ہے۔ وہ لا بھی کہتی ہے اور اس کی زبان پر الّا بھی ہوتا ہے۔ وہ میٹھا میٹھا وعظ بھی کہتی ہے اور کڑوی سے کڑوی تنقید بھی کرتی ہے۔ وہ
تسکین بھی عطا کرتی ہے اور اضطراب بھی پیدا کرتی ہے۔ وہ نصیحت بھی کرتی ہے اور انتباہ بھی دیتی ہے۔ وہ کشش بھی رکھتی ہے اور کشمکش بھی پیدا کرتی ہے۔
وہ رحم و شفقت کے چھینٹے بھی دیتی ہے اور نفرت و غلظت کی بجلیاں بھی برساتی ہے۔ وہ بشارت بھی ہوتی ہے اور دھمکی بھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں
قلم ہوتا ہے تو دوسرے میں نیزہ! اس کے ساتھ فقر کا بوریا بھی ہوتا ہے اور شاہی کا تاج بھی! وہ شانِ جمال کے ساتھ حیّ علی الفلاح بھی پکارتی
ہے اور شانِ جلال کے ساتھ ھل من مبارز کا نعرہ بھی لگاتی ہے۔

... وہ کسی ایک گوشے سے متعلق ہو کر ایک ہی تقاضا نہیں رکھتا بلکہ فرد اور معاشرہ کی

ہر مقام سے اپنا پیغام سنانا چاہتا ہے۔ وہ جس کشمکش کو خیالات کی دنیا سے شروع کرتا ہے، دیر سویر وہ عمل کے تمام دائروں میں منعکس ہو جاتی ہے

اصولی تحریک ——— وہ اسلام ہو یا کچھ اور ——— شروع تو ہمیشہ خیالات ہی کے دائرے سے ہوتی ہے۔ آغاز ہمیشہ ایک 'پکار'، ایک بلاوے، ایک کلمے سے ہوتا ہے۔ اس سے ذہنی کشمکش پیدا ہوتی ہے ——— پہلے کچھ افراد میں، پھر معاشرے کے اجتماعی ذہن میں ——— ذہنی کشمکش پیدا ہوتے ہی عملی و واقعاتی زندگی میں منعکس ہونے لگتی ہے۔ اولاً خاندانی دائرے میں، کاروبار کے دائرے میں، عام مجلسی زندگی کے دائرے میں، اور جوں جوں یہ کشمکش بڑھتی ہے کچھ افراد تحریکی دائرے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور چھنٹ چھنٹ کر ماحول سے ممیز ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک جماعتی ہیئت نشوونما پاتی ہے جو مجموعی نظامِ تمدن اور اس کے ماحول سے اختلاف کرتی ہے۔ یہ جماعتی ہیئت جتنی جتنی نمایاں ہوتی ہے، سیاسی دائرے میں بھی ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ پیدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ اس جماعتی ہیئت کے سامنے کسی مرحلے پر کوئی ایسا چیلنج رکھ دیتی ہے کہ جس کو قبول کر کے اسے معرکہ ہائے دست بدست میں آنا پڑتا ہے۔ جو تحریک یا جماعت تاریخ کے چیلنج کو نہیں سمجھتی یا قبول نہیں کرتی، یا قبول کر کے وقت پر اس کا بھرپور جواب نہیں دیتی، وہ مسترد ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔

——— ۳ ———

تاریخ میں قوموں، سلطنتوں، جماعتوں اور تحریکوں کے لئے نت نئے "چیلنج" ہر آن ابھرتے رہتے ہیں۔ ہر زندہ وجود کے بالمقابل کچھ نہ کچھ مخالف و مزاحم قوتیں برسرِ عمل رہتی ہیں۔ جولانگاہِ تمدن میں ہر کسی کو ایک مسابقت درپیش ہے۔ اگر مخالف قوتیں نہ ہوتیں تو پھر نہ کشمکش کا کوئی سوال تھا، نہ مسابقت کا، نہ چیلنج کا۔ کوئی بھی انسانی طاقت جو کچھ ارادہ بھی کرتی، آرام سے پڑے پڑے از خود پورا ہو جاتا۔ ہر زندہ وجود اور ہر تمدنی و انسانی طاقت کے لئے کوئی نہ کوئی مخالف و مزاحم طاقت میدان میں موجود و متحرک ہوتی ہے۔ مخالف طاقتوں کے وجود اور ان کی حرکت کی وجہ سے ہی تاریخ میں پے در پے نو بہ نو چیلنج ابھرتے ہیں اور "مدعی" کو للکارتے ہیں۔ پس دیکھنا یہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر چکے ہیں اور آگے کیا کرنا ہے، بلکہ ساتھ کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ مخالف طاقت کیا کر چکی ہے، کیا کر رہی ہے، آگے کیا کرے گی اور اس کے پیدا کردہ حالات کس رفتار سے کس رخ ارتقاء کر رہے ہیں۔ جائزہ لینا یہ ہوتا ہے کہ یہ حالات فکر، اخلاق، ملکی سیاست، بین الاقوامی افق وغیرہ کے مختلف دائروں میں کتنی مدت کے اندر کیا نتائج پیدا کر دیں گے اور ان نتائج کی وجہ سے کسی تحریک کے لئے راہِ عمل سہل تر ہو جائے گی یا دشوار تر!

آپ نے "اسلامی تحریک" کا مسنون طریقہ یہ سمجھا ہے کہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور اس کو متاثر کرنے والی حریف طاقتوں سے [illegible] نظریے کے ساحل پر بیٹھے کنکریاں پھینکتے رہو ——— یہاں تک کہ خود وہ ساحل کٹ کر اندر جا گرے جس پر یہ بزعم [illegible] آپ ماحول کے خلاف ایک نیا نظریہ پیش کر کے خود تو تاریخ کی حریفانہ طاقتوں کو چیلنج کر دیتے اور [illegible] طرف سے آتا ہے اسے بالکل نظر انداز کر کے ایک ہی مقام پر پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ کہاں اس طرح آپ [illegible] ایک نئے نظام کی انقلابی دعوت دینے والوں کو کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ ان کے "چیلنج" کا کہاں کہاں [illegible] کس رفتار سے متحرک ہو رہا ہے اور کس گوشے سے ہر ایک چیلنج کیا ابھر رہا ہے۔ [illegible] قبول کرنا اور اس کا بھرپور جواب دینا لازم ہو جاتا ہے۔ [illegible] حالات کا چیلنج [illegible]

[illegible]

[illegible]

دنیائے تمدن مسابقت کی دنیا ہے۔ اس میں بار بار فیصلہ کن لمحے آتے ہیں۔ ایسے لمحوں کا تقاضا جس نے پورا کر لیا وہ آگے نکل جاتا ہے اور جس نے پل بھر غفلت کی وہ صدیوں کا فاصلہ پیچھے رہ گیا۔ جو نظریہ بھی آگے نکل جاتا ہے وہ صرف یہی نہیں کرتا کہ دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود آگے نکل جائے، بلکہ وہ دوسروں کے آگے بڑھنے کا راستہ روکنے کی تمام ممکن تدبیریں ساتھ کے ساتھ عمل میں لاتا ہے۔ وہ ہر قدم پر کچھ کانٹے بکھیرتا ہے، پتھر لا لا کے ڈالتا ہے، گھاٹیاں کھودتا ہے، دیواریں تعمیر کرتا ہے، رہزن مقرر کرتا ہے، پہاڑ کھڑے کرتا ہے۔ اس لئے یہ نرا کسی کی اپنی "خوشی" پر موقوف نہیں کہ وہ جس رفتار سے چاہے رینگتا ہے اور جب چاہے کسی مرحلے سے بڑھے اور جب تک چاہے کسی مرحلے پر رُکا کھڑا رہے ——— جماعت اسلامی ایسے "اللہ ما الحل" کا گروہ نہیں ہے جو تاریخ کی دوسری تمام طاقتوں سے آنکھیں بند کئے "تصورِ جاناں" میں پڑے ہیں۔ اس کی نگاہ اوّل روز سے حالات کے اُتار چڑھاؤ پر رہی ہے اور اُس نے مخالفِ اسلام طاقتوں کا پارٹ ہمیشہ بڑے غور سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور تاریخ نے جو چیلنج اُسے دیا ہے اس نے پوری طرح سے سمجھ کر اسے قبول کیا ہے۔

— ۴ —

اُوپر کے کلیہ کو اگر آپ ذہن نشین کر لیں تو آپ سے آپ یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ تحریکوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں "وقت" کو بھی بڑا دخل ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "الوقتُ سیفٌ قاطعٌ" یعنی وقت کاٹتی ہوئی ایک تلوار ہے تو یہ ایک اہم ترین تاریخی راز ہے۔ وقت کی تلوار کو اگر آپ لپک کر اُٹھا لیں اور اسے پوری طرح استعمال کر لے جائیں تو آپ کا حریف زک اٹھائے گا اور اسی طرح اگر بدقسمتی سے آپ کا حریف پھرتی سے کام لے کر اسی سیفِ قاطع کو اٹھا لے جائے تو پھر آپ کی خیر نہیں۔

ایک تحریک کے لئے فکری دائرے میں آغاز کش مکش کرنے کے بعد بہت ہی بڑا فیصلہ کسی نہ کسی وقت یہ کرنا پڑتا ہے کہ اب اسے عملی کشمکش کے دائرے میں بھی قدم رکھ دینا چاہیئے۔ مگر تاریخ کے پاس بنا بنایا کوئی کیلنڈر ایسا نہیں ہے جس میں مدتِ معیّن پر جا کر کسی خاص تاریخ کے گرد سُرخ حلقہ بنا دیا گیا ہو اس تاریخ کے آنے تک تحریک اطمینان سے فکری و رُوحانی کام کرتی رہے اور جونہی وہ تاریخ آجائے، بیان دے دیا جائے کہ آج سے ہم سیاست کے دور کا افتتاح کرتے ہیں۔ تاریخ کوئی ایسی الارم گھڑی بھی فراہم نہیں کرتی کہ آپ ابتدائی دعوت کے کام میں مگن رہیں اور اچانک الارم بجے اور آپ چونک کر اٹھیں اور سیاسی جدوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیں۔ ہر کام کی طرح اس فیصلے کا بھی کوئی موزوں ترین وقت آتا ہے۔ اس وقت کا تعین کرنے کے لئے اپنا بھی جائزہ لینا ہوتا ہی ہے، مگر حریف طاقت اور اس کے پیدا کردہ حالات اور ان سے پیدا ہونے والے آئندہ نتائج کو بھی بڑی باریکی سے پڑھنا ہوتا ہے۔ ممکن نہیں کہ یہ لمحۂ خاص اپنے آپ کو کسی تحریک کے علمبرداروں کی داخلی ضروریات کا لحاظ کر کے کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دے۔ یہ آتا ہے اور اچانک آتا ہے۔ اسے بروقت پہچاننا ہوتا ہے اور اس کے بلاوے پر لبیک کہہ دینا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی ملک پر کبھی کوئی اچانک حملہ ہو سکتا ہے ——— خواہ وہ دفاعی لحاظ سے تیاری کی تکمیل کر چکا ہو یا نہیں۔ اسی طرح فکری مرحلہ طے کرتی ہوئی تحریک کے لئے بھی عملی کش مکش کا چیلنج یکایک ابھرتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہوتا کہ تیاری مکمل کرنے کے لئے اسے ٹال دیا جائے۔ اسے قبول کرنا تاریخی طور پر واجب ہو جاتا ہے۔

تاریخی حالات کا ہمیشہ ایک منطقی تسلسل ہوتا ہے، ایک سے دوسرا مرحلہ پیدا ہوتا ہے، ایک واقعہ علت بنتا ہے اور وہ ایک معلول کو پیدا کرتا ہے پھر معلول خود علت بن جاتا ہے اور دوسرے علل سے مل کر ایک نیا معلول سامنے لے آتا ہے۔ اس منطقی تسلسل پر تحریکوں اور جماعتوں کو بڑی ماہرانہ نگاہ رکھنی ہوتی ہے اور ہر تغیر سے پیدا ہونے والی نئی ذمہ داریوں کو وقت پر سمجھنا اور اٹھانا ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی راہبوں کی طرح تاریخ کے تسلسل سے آنکھیں بند کر کے کبھی پڑی نہیں رہی۔ بلکہ ہر مرحلے اور ہر وقت کی خاص ذمہ داریوں کو اُس نے جانا اور ان کو قبول کیا۔ جہاں تک خالص فکر و دعوت کا

کام یکسوئی سے جاری رکھنا ابتدائی تیاری کے لئے اشد ضروری بھی تھا اور اس کو یکسوئی سے جاری رکھنا ممکن بھی ہوا۔ اس نے سیاسی حالات سے پوری پوری دلچسپی لینے کے باوجود براہِ راست مداخلت نہیں کی، جب اس مداخلت کا لمحہ آگیا اور اس لمحے نے آکر دستک دی تو اس نے پیغام کو سُنا اور نئی ذمہ داریاں اٹھالیں محض مصنفین یا فلسفیوں کا کوئی گروہ یا دانشوروں اور راہبوں کا کوئی حلقہ ہوتا تو اسے کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر نگاہ رکھے، حالات کے چیلنج کو سمجھنے کی فکر کرے، وقت کو پہچانے اور واقعات کے منطقی تسلسل کو سامنے رکھ کر ذمہ داریوں کے نئے نئے بوجھ اٹھاتا چلا جائے۔

—— ۵ ——

آپ کا یہ فرمانا کہ "کشمکش تھی تو ضروری مگر قبل از وقت شروع ہو گئی" ہے، تحریکی شعور کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔ تحریکیں اور جماعتیں بہت سارے اقدامات اس معنی میں تو قبل از وقت کرتی ہیں کہ وہ ان کو مزید تیاری کیلئے مؤخر رکھنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اقدامات اس معنی میں بروقت ہوتے ہیں کہ واقعات کی تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اُن کو ایک لمحۂ خاص پر کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جماعتِ اسلامی فکری تعمیر کے بنیادی کام کو بلاشبہ لمبا کرنے کی خواہش مند تھی اور خدا سے مزید مُہلتِ کار کی خواستگار تھی۔ حالات میں اگر کوئی بہت بڑا تغیر نہ آتا تو وہ یقیناً اپنے مرحلۂ اول کو طویل تر کرتی چلی جاتی لیکن تقسیمِ ملک کا واقعہ تاریخی لحاظ سے اتنا بڑا طوفانی واقعہ تھا کہ اس نے نہ صرف تمام سیاسی جماعتوں کی پوزیشن پر اثر ڈالا بلکہ پورے بین الاقوامی توازنِ قوت تک میں تزلزل پیدا کر دیا۔ اتنے بڑے تغیر سے جماعتِ اسلامی بغیر اس کے صرفِ نظر نہیں کر سکتی تھی کہ وہ لب بہ بند و چشم بند و گوش بند پر عمل پیرا ہوتی اور یہ طے کر لیتی کہ اسے انسانوں کی نت اُلٹتی بدلتی دنیا میں کام نہیں کرنا ہے بلکہ صرف مُکتی یا نروان حاصل کرنے میں مگن رہنا ہے تقسیم کے واقعہ اور پاکستان کی تشکیل نے اس کے لئے ایک بھاری چیلنج پیدا کر دیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سلطنت کی نیو ڈالی جانے والی تھی اور اس کیلئے بنیادیں طے ہونی تھیں۔ وہ کافرانہ بھی ہو سکتی تھیں اور اسلامی بھی۔ اس موقعِ امتحان پر جماعت نے چیلنج کو قبول کر لیا اور ایک ایسا کام کر دکھایا جو تاریخ میں اپنا ایک وزن رکھتا ہے۔

پس دستوری کشمکش کو قبل از وقت کہنا تاریخ کے قوانین سے ناواقفیت کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

—— ۶ ——

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے "واحد مسنون طریقہ" کے سطحی نظریہ پر بھی گفتگو کروں۔ واحد مسنون طریقہ کوئی سادہ کلیہ نہیں ہے جسے آپ کتاب و سنت اور سیرت و تاریخ سے بطور جوہر اخذ کر لیں اور پھر اسے لے کر انقلاب اٹھانے نکل کھڑے ہوں۔ اس کلیہ کو عمل میں لانے کے لئے آپ کو حالات کے اس فرق کو ضرور سامنے رکھنا ہو گا جو جاہلی عرب اور زمانۂ حال کی کسی مملکت میں پایا جاتا ہے۔ عرب میں ادھ نراجی ماحول تھا، یعنی کوئی منضبط اور دستوری حکومت نہ تھی اور نہ خالص کوئی سیاسی قیادت کہ جسے تحریکی نقشے میں کوئی جگہ دے کر اقدام کے خطوط بنائے جاتے۔ تھوڑا سا اجتماعی ربط تھا بھی تو محض وہ قبیلوی سسٹم کی صورت میں تھا، جس کے تحت جمہوریت کی فضا نہ تھی کہ جس میں کام کر کے کوئی تبدیلی رائے عام کے بل پر پیدا کی جا سکتی اس فضا میں جہاں تحریک کے لئے بعض خطرات نسبتاً زیادہ تھے وہاں سہولت یہ بھی تھی کہ کسی منظم حکومت سے سابقہ نہیں تھا، بلکہ منظم حکومت کے قیام کی ذمہ داری بھی خود تحریک ہی نے اٹھائی تھی۔

عرب کے قبیلوی ماحول میں تمدن جن مراحل میں گزر رہا تھا ان میں خیر و شر کی دعوؤں کی تقابلی حرکت اتنی تیز نہ تھی جتنی آج ہے۔ آج وسیع ذرائع و وسائل کیساتھ ایک فاسد طاقت معاشرے پر تسلط پا کر تھوڑی سی مدت میں حالات کو اتنا بگاڑ سکتی ہے کہ برسوں تک سرے سے اسلامی دعوت

کا پنپنا ممکن نہ رہے۔ اس کی ایک مثال ترکیہ میں موجود ہے جہاں حالات کو اس حد تک خراب کر دیا گیا ہے کہ وہاں ابتدائی دعوت کا انشراح گذشتہ تیس پینتیس برس سے ممکن نہیں ہو سکا۔ اور اگر ایسے رجحانات ہیں بھی تو وہ محض فکر کے دائرے کی حد تک بھی تحریکی انداز سے کھل کر کام نہیں کر سکتے۔ اس کی دوسری مثال مصر میں دیکھئے جہاں اخوان نے لمبی مدت کام کیا، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بھرپور تیاری کی، مدت تک سیاست سے کنارہ کش رہ کر ہر طبقے میں ——— حتیٰ کہ فوج میں بھی ——— نفوذ کیا۔ پھر امتحان کے وقت بھاری قربانیاں دیں۔ لیکن ایک مخالف طاقت نے تسلط پا کر ماحول کا تھوڑے سے دنوں میں اتنا ستیاناس کر دیا ہے کہ اخوان کو اگر دوبارہ موقع ملا تو سابق حالت کو بحال کرنے کے لئے بھی کئی برس کی محنت درکار ہوگی۔ جاہلی عرب میں یہ رفتار اس قدر تیز نہ تھی۔ علاوہ بریں اس اولہ نراجی ماحول میں راہِ عمل یہی تھی کہ دعوت کی تکمیل جہاد سے ہو اور جہاد کے لئے اس دور میں ایک منظم جماعت چاہیئے تھی اور اس کے لئے سیدھا سادا سا خود ساختہ اسلحہ درکار تھا۔ مگر آج تمدنی ماحول کا نقشہ دوسرا ہے۔ اس فرق کا مطالعہ کئے بغیر اگر وہاں سے "واحد مسنون طریقے" کا کلیہ اٹھا لیا جائے اور بغیر سوچے سمجھے اسے عمل میں لایا جائے تو مکہ ہی میں پڑے رہیں گے، مدینہ کبھی نہ آئے گا۔ آج کے حالات میں مکہ ہی کو مدینہ بنانا ناگزیر ہے۔

پس واحد مسنون طریقہ کا کلیہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے لے کر آپ چشم و گوش بند کر کے پڑے رہیں۔ بلکہ اس پر کاربند ہونے کے لئے اور اسے کسی مختلف تمدنی ماحول میں استعمال کرنے کے لئے متحرک دماغ، کھلی آنکھوں اور سننے کانوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ درجہ کی اجتہادی بصیرت درکار ہے۔ حالات کی ہر نئی کروٹ پر تحریکوں کو نئے فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور حریف طاقت کے ہر اقدام کا توڑ سوچنا ہوتا ہے۔

اس "واحد مسنون طریقہ" کی وکالت کرنے میں آپ نے بڑی انتہا پسندی اور بے احتیاطی سے کام لیا ہے بلکہ سیدنا یوسف علیہ السلام تک کے کارنامے کو مصنوعی اور غیر طبعی قرار دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یوسف علیہ السلام بہرحال خدا کے ایک پیغمبر تھے اور پیغمبر کوئی اقدام آسمانی رہنمائی یا اذن کے بغیر نہیں کرتا اور اگر وہ کسی مصنوعی اور غیر طبعی اقدام کا خیال بھی دل میں لائے تو اسے ٹوک دیا جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا اقدام اگر مصنوعی اور غیر طبعی ہوتا تو حق تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح "برہان" نمودار ہو کر روک دیتی جیسے زلیخا کی اکساہٹ کے موقع پر نمودار ہوئی تھی۔ یہ بجا کہ تاریخ کا ایک قانون یہ ہے کہ اوپر سے مجرد قوت ہی قوت کے بل پر نافذ شدہ نظریہ و نظام دیرپا نہیں ہو سکتا، مگر دوسری طرف اسوۂ یوسفی کی روشنی میں یہ ماننا ضرور پڑے گا کہ اگر تاریخ کسی داعیٔ اسلام کو اوپر کی طرف سے کام کرنے کے لئے پکارے اور اُسے پورا پورا موقع بہم پہنچائے تو وہ فرار نہیں کر سکتا۔ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کے کارنامے کی مثال سامنے رکھ کر جماعتِ اسلامی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کا بھی یہی حشر ہوگا" ——— افسوس ہے کہ یہ الفاظ ایک پیغمبر کے کارنامے کے سلسلے میں زبان پر لانا کسی طرح موزوں نہ تھا۔

— ۷ —

لیکن ابھی اس "واحد مسنون طریقہ" کو مشخص کرنا باقی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ دو بڑے ادوار میں تقسیم ہے: ایک مکی دور، جسے دعوت کا عنوان دیا جا سکتا ہے اور جسے "انفرادی دعوت" اور "تنظیم و تربیتِ جماعت" کے دو ضمنی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مدنی دور، جس کو عہدِ سیاست قرار دیا جا سکتا ہے اور جسے کشاکش اور تعمیرِ نَو کے دو مزید حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

لیکن حضورؐ کا دورِ دعوت تصوف کا سا مزاج نہیں رکھتا بلکہ سیاسی کشمکش کا پہلو خود اس کے اندر بھی شروع سے موجود تھا۔ اس وقت میں اور آج میں فرق یہ ہے کہ وہاں معاملہ ایک منضبط اور منظم حکومت سے نہیں تھا جس کی قیادت یا وزارت کے ٹوٹنے اور بننے پر رائے عام کی حرکت اثر انداز

ہو سکتی ہو یا جس کی پارلیمنٹ میں آئینی ذرائع سے تبدیلی آسکتی ہو۔ اپنے ماحول کے لحاظ سے ہر دور کی صورتِ حالات کو تحریک کا جلیل القدر رہنما مطالعہ کرتا تھا اور نت نئے فیصلے اور اقدام ہوتے تھے۔ ہر ممکن تدبیر کو آزمایا جاتا رہا۔ مثلاً پہلی بار جب کعبہ میں تحریک کی طرف سے اعلانِ توحید کیا گیا تھا تو یہ کارروائی چیلنج کا سا مزاج رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے کشمکش کی آگ بھڑکنا لازم تھی اور وہ عملاً بھڑکی۔ مکہ کے جاہلی ماحول میں یہ بہت بڑا سیاسی اقدام تھا۔ آپ کے سے مزاج کے لوگ اگر سرورِ عالمؐ کی رفاقت میں ہوتے تو وہ اس پر بھی اعتراض اٹھا دیتے کہ کیوں نہ خاموش انفرادی دعوت کا کام پُرسکون طریق سے جاری رہنے دیا گیا اور بھڑوں کے چھتے کو کیوں چھیڑ دیا گیا جب کہ دعوتِ اسلامی کے لئے یہ کوئی لازمی اور ناگزیر طریق نہیں ہے کہ خاص کعبہ میں اس کا اعلان بآوازِ بلند کیا جائے۔

پھر سرورِ عالمؐ برسوں کا کام کرنے کے بعد مکہ کے ماحول کی جس مایوس کن ناسازگاری سے دوچار تھے اس کے مقابل میں آپؐ یونہی نہیں پڑے رہے کہ دعوت دیتے رہو، معاشرہ بدلے گا تو خود بخود نظامِ حق قائم ہو رہے گا۔ بلکہ سیاسی بصیرت کے ساتھ مختلف راستے نکالنے کے درپے رہے۔ رفقا کو حبش بھیجا کہ شاید وہاں تحریک کو مناسب ماحول مل سکے اور اس سلسلے میں آپؐ نے بھی اور آپؐ کے رفقا نے بھی نجاشی اور اس کی قوم سے "ڈپلومیٹک" روابط قائم کرنے میں بڑی سیاسی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ پھر طائف کو ٹٹولا تو وہ مکہ سے بدتر نکلا۔ تجار اور حاجیوں کے وفود میں کام کرتے کرتے انصارِ مدینہ سے رابطہ قائم ہوا۔ اس سلسلے میں بیعتِ عقبہ ثانیہ واقع ہوئی جو اسلامی ریاست کے محل کی پہلی اینٹ ثابت ہوئی۔ یہ بیعت مذہبی بھی تھی اور سیاسی بھی!

اس مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نظامِ اسلامی کے "خود بخود" قائم ہو جانے کے منتظر ہو کر محض دعوت ہی دعوت میں منہمک نہیں رہے بلکہ ماحول سے تصادم مول لے کر ساتھ کے ساتھ سیاسی بصیرت کو کام میں لائے اور تحریک کے لئے سیاسی اقامت کے راستے اور ذرائع تلاش کرتے رہے۔ پھر جونہی پہلا موقع ہاتھ آیا تو سیاسی اقتدار کو ہاتھ میں لے کر اسے بھی فروغِ دعوت اور تعمیرِ معاشرہ کا ذریعہ بنا دیا۔

جو لوگ دعوت سے خود بخود نظام کے برآمد ہو جانے کا عجیب نظریہ رکھتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ دعوت کا اصل کام تو تیرہ برس تک مکہ میں ہوا تھا اور ریاست مدینہ میں جا قائم ہوئی جہاں مدت کے لحاظ سے دعوت کا دور بڑا ہی مختصر ہے۔ مدینہ کے ماحول نے وہ مناظر دیکھے تک نہیں جو مسلمانوں پر قریش کے تشدد نے پیدا کئے تھے۔ یہاں قربانیوں کی وہ تاریخ نمودار ہی نہیں ہوئی جس کے نقوش سے مکہ کے در و دیوار مزین تھے۔ یہاں کی آبادی کا ایک قلیل عنصر ہی ہجرت تک اسلام لایا تھا اور اس میں مہاجرین کے آملنے کے باوجود اکثریت مخالفین کی تھی۔ اندریں حالات یہاں بھی برسوں تک دعوت کا کام کرنے کی ضرورت ثابت کی جا سکتی تھی۔ مگر "خود بخود" والے نظریے پر حضورؐ نے تحریک کو نہیں چلایا بلکہ نظام کے قیام کے لئے بڑی تگ و دو کی اور بڑی تدابیر اختیار کیں۔ پیشتر اس کے کہ یہود تصادم پر اتر آتے، آپؐ نے ان سے حلیفانہ روابط استوار کئے اور معاہدوں کے ذریعے ان کو قابو میں کر لیا اور آخر الامر ان کو دستوری معاہدے میں شامل کر کے ایک اقلیتی مرتبہ پر رکھ دیا۔ آپؐ نے اپنے نظریے کے ان کٹر مخالفین تک کو تاسیسِ ریاست کی مہم میں محض سیاسی حکمت سے اپنے ساتھ لے لیا اور اس کا انتظار نہیں کیا کہ نظریہ ان کے دلوں میں اتر جائے اور ان کے اپنے سینوں میں نظامِ حق کی پیاس پیدا ہو جائے۔ آپؐ نے مدینہ میں تعلیمی و تنظیمی کام کی مہم شروع کر دی۔ آپؐ نے فوجی تنظیم کا پورا پورا اہتمام کیا۔ آپؐ نے مہاجرین کی معاشی بحالی کے لئے فوری تدابیر اختیار کیں۔ اگر آپؐ کے رفقا سیاست گریز مذہبی رجحانات میں مبتلا ہوتے تو وہ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر پہلے تو ذہنی انتشار کا شکار ہوتے اور پھر بے اطمینانی کے روگ میں پڑ کر الگ ہونا شروع ہو جاتے۔ وہ تقاضا کرتے کہ بنیادی دعوت اور تعمیرِ فکر اور تطہیرِ اخلاق کا کام کرتے چلے جانا چاہیئے تا آنکہ معاشرہ یکسر بدل جائے اور خود بخود اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ گویا وہ پہلے دن سے سمجھ کے

آتے تھے کہ اسلام مذہب و سیاست کا جامع ہے اور یہاں مذہب آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کو سنوارنے کے لئے ہے۔ اور سیاست دنیا کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ مکہ میں اس کارِ سیاست کا موقع نہیں مل سکا تھا ورنہ اسے چند برس پہلے وہیں کر لیا گیا ہوتا اور اب مدینہ میں وہی موقع ملا ہے تو اسے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ مکہ میں برسوں سے خالص کلمۂ حق کی اساسی دعوت دینے کے خوگر ہونے کے باوجود جب تحریک کی طرف سے سیاسی گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نئے مرحلے کے اس نئے اسلوبِ کار سے ذرا نہیں گھبرائے۔

مدینہ میں نبی اکرمؐ کی سیاست کاری کی تاریخ کا جو طالبِ علم مطالعہ کرے گا وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ یہود اور انصار، اور انصار میں اوس و خزرج کے درمیان جو کش مکش پائی جاتی ہے، اس کی پیچیدہ مثلث نے تحریکِ اسلامی کو جو بہترین مواقع فراہم کئے ان سے سرورِ عالمؐ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پس واحد مسنون طریقہ یہ ہے کہ نظریۂ اسلامی کی دعوت دی جائے، اس سے فکری کشمکش پیدا ہو، فکری کش مکش کے ماحول میں ایک جماعتی حیثیت ابھرے، پھر اس کے ذریعے اجتماعی دائرے میں پھیلے۔ پھر اس کش مکش کے دوران میں جب بھی کوئی چیلنج ابھرے تو اسے قبول کیا جائے اور جہاں بھی سیاسی اقدام کا موقع پیدا ہو جائے بروقت اقدام کیا جائے اور تحریک کی سیاسی اقامت کے لئے مدبرانہ کاوش کے ساتھ راستے نکالے جائیں۔

آپ نے شاید اس دور کے "واحد مسنون طریقہ" کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ صدی، دو صدی تک کتابیں لکھی جاتی رہیں، خطاب کئے جایا کریں اور نماز روزہ کا احکام جاری رہے، اور تاریخ کی واقعاتی حرکت سے ایک بے تعلق سی فضا میں بیٹھ کر ایک ایک فرد کو اس میں لیا جاتا رہے، یہاں تک کہ سارا معاشرہ اس حلقۂ دعوت و فکر میں آ جمع ہو، اور اچانک نظامِ اسلامی قائم ہو جائے۔ اس خیالی نقشے کے مطابق تاریخِ انسانی میں کوئی تحریک چلی ہے، نہ کوئی نظام قائم ہوا ہے۔

— — ۸ ———

آپ ذرا قتال کا عملی نقشہ آنکھوں کے سامنے لائیں۔ آپ کے سامنے ایک آدمی ——— ایک جماعت کی جماعت ——— دوسرے انسانوں کے قتل کے درپے ہے۔ کوئی بڑھکارتا ہے، کوئی للکارتا ہے، کوئی حریف سے گتھم گتھا ہے، کوئی کسی کو پچھاڑ رہا ہے، کوئی کسی کے سینے پر سوار اس کی گردن پر خنجر چلا رہا ہے، منہ لال بھبھوکا ہیں، آنکھیں انگارا ہو رہی ہیں، سانس دھونکنی کی طرح تند و تیز ہے، دامن خاک آلود ہے، ہاتھ خون میں لتھڑے ہیں ——— اس سارے منظر کو نظریہ و مقصود سے کاٹ کر بالکل الگ کر لیا جائے تو انسانی کردار کی یہ تصویر کبھی خوش آئند نہیں محسوس ہو گی۔

اس تصویر کو اگر مکی دور کے خالص دعوتی کردار کے متقابل رکھ کے دیکھا جائے تو ظاہر بین اور حقیقت ناشناس آنکھوں کو ایک خوفناک تضاد نظر آئے گا۔ کہاں وہ کردار کہ جو پیغام دیتا ہے اور مار کھاتا ہے اور ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اور کہاں یہ کردار کہ خنجر بدست ہو کر حریف کو للکارتا ہے۔ کہاں وہ ایک پیکرِ وہبی، اور کہاں یہ ایک مجسمۂ قاہری۔ کہاں وہ داعی جماعت کہ جو قیادت و اقتدار سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن ہے اور کہاں یہ حکمران پارٹی کہ قیادت و اقتدار کا نہ صرف تحفظ کر رہی ہے بلکہ اس کے پھیلاؤ کے راستے کی رکاوٹوں کو ہٹاتی چلی جا رہی ہے۔ کہاں وہ اہلِ دعوت کہ جن کو دنیا سے گویا کوئی مطلب ہی نہیں، اور کہاں یہ اربابِ سیاست کہ جو جہانبانی اور جہانداری میں پیش پیش ہیں۔

لیکن درحقیقت یہ ایک ہی تحریک کے دو رخ ہیں اور باہم دگر لازم و ملزوم۔ اس کی فکری دعوت اپنے اندر سیاسی تقاضوں کو مضمر رکھتی ہے اور اس کی سیاسی تگ و تاز ہر پہلو میں فکری دعوت لئے ہوتی ہے۔ یہ مسجد کے منبر سے بھی اپنا پیغام سناتی ہے اور جنگ کے مورچے سے بھی! ایک وقت میں وہ اپنے سپاہیوں پر "کفوا ایدیکم" کی قدغن لگا کر صبر کے مقام پر روک رکھتی ہے، دوسرے وقت میں وہ جاہدوا کی نفیر بجاتی ہے اور قوت کی تلوار کو حرکت دلا دیتی ہے۔ جو لوگ اس کے اندر دونوں پہلوؤں کے امتزاج کو نہیں سمجھتے، وہ ایک طرف مرحلہ صبر میں مضطرب ہو ہو کر اذنِ جہاد

طلب کرتے ہیں لیکن دوسری طرف جب حکم جہاد آجاتا ہے اور دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے تو مبہوت ہو کر "لم کتبت علینا القتال" پکار اٹھتے ہیں۔ لیکن کمال تھا تاجدارِ انسانیت کی تربیت کا کہ مکی تیار شدہ جماعت من حیث المجموع ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہو کر تحریک کے نئے شئون و اسالیب سے دیوانہ وار لپٹ گئی بلکہ بے اختیار پکار اٹھی کہ "ھٰذا ما وعدنا اللّٰہ و رسولہ و صدق اللّٰہ و رسولہ"۔ اپنے پرائے سب ہی تو اگا دکا تھے کسی نے یہ طعنہ نہ دیا کہ دینی جماعت جنگجوؤں کا ایک جتھا بن گئی ہے، یا وہ ایک حکمران پولٹیکل پارٹی میں بدل گئی ہے

—— ۹ ——

آپ کے خیال میں تحریک اسلامی کے لئے نظام ریاست کی تاسیس اور معاشرہ کی تکمیل میں قوت کا استعمال تقریباً حرام سا ہے ——— کم سے کم غیر فطری اور غیر طبعی تو لازماً ہے۔ حالانکہ انفرادی دعوت و اصلاح کے کام کے بالکل برعکس نظام اجتماعی کا قیام و بقا تمام تر قوت پر موقوف ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ بدی کے استیصال اور خیر کے استحکام کے کام میں آپ نے قوت کے استعمال کی حرمت کہاں سے اخذ کی ہے۔ بات اگر اتنی ہوتی کہ سارا کام قوت ہی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک جزء نصیحت سے ہوتا ہے تو اختلاف نہ تھا۔ لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ سارا کام نصیحت ہی سے چلایا جانا چاہیئے تو یہ بالکل فاسد نظریہ ہے۔ آج تک تاریخ کے پاس کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ مجرد نصیحت کے ذریعے کوئی ریاست قائم ہوئی ہو اور کوئی معاشرہ و نظام تمدن چلایا جا سکا ہو۔ نصیحت کے ساتھ قانون کا کوڑا اور دفاع کی تلوار جب تک متحرک نہ ہو اجتماعی لحاظ سے نہ خیر کا قیام ہوتا ہے نہ شر کا سدِ باب!

یہ دعویٰ کہ قوت اور دباؤ سے چونکہ نفاق پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا استعمال حرام رہنا چاہیئے۔ اس کی تردید تو خود مدینہ کے مثالی تجربہ میں موجود ہے۔ بغیر اس کے کہ یہود کے دلوں میں اسلام اترتا اور ان میں فکری و اخلاقی انقلاب واقع ہوتا حضور نے مسلمانوں کی تنظیم اور اپنی سیاسی مہارت کے ذریعے ان کو ایک دستوری معاہدے میں جکڑ لیا۔ آہستہ آہستہ جب وہ عالم بے بسی میں جا پہنچے تو ان کے اندر نفاق کا روگ پھیلتا گیا۔ مگر ان کے نفاق زدہ ہو جانے کی کوئی پروا نہیں کی گئی کیونکہ دوسری طرف ہزاروں افراد کے ایمان و اخلاق کو نشوونما دینے اور ان میں برگ و بار پیدا کرنے کا اہم تر معاملہ تھا۔ سو ہر اجتماعی نظام میں شر کے استیصال کے لئے جب قوت استعمال کی جاتی ہے تو جہاں وہ ایک طرف فاسد عناصر کے لئے اصلاح پذیری کے راستے کھولتی ہے، وہیں ان میں سے کچھ زیادہ ذلیل اور گھٹیا لوگ نفاق کی پستیوں میں جا گرتے ہیں۔ مگر کوئی نظامِ اجتماعی ذلیل لوگوں کی نفاق زندگی کی پرواہ نہیں کیا کرتا۔

اور یہاں تو یہ مسئلہ ہی درپیش نہیں ہے کہ آناً فاناً کوئی طاقت سیاسی قوت ہاتھ میں لینے والی ہے اور ایک دن رات میں اسلام کو بالجبر قائم کر دے گی۔ یہاں کی جمہوری فضا میں ایک طرف دعوت و نصیحت کا کام کیا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے رائے عام تربیت پاتی ہے دوسری طرف رائے عام جتنی جتنی تیار ہوتی ہے اس کا دباؤ دستور اور قیادت اور نظام حکومت پر تھوڑا تھوڑا اثر انداز ہے۔ یہ دو طرفہ تدریجی عمل ایک طویل مدت تک جاری رہے گا تا آنکہ نیچے اور اوپر دونوں طرف سے تبدیلی کی رویں بڑھتے بڑھتے جب آپس میں مل جائیں گی تو نیا نظام اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے گا۔

اس فلسفے کو ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ تاریخ کے بہاؤ پر ایک تحریک رائے عام کی قوت کے ذریعے کوئی اثر کیوں نہ ڈالے اور اس کے رُخ کو درست کرنے میں کوئی حصہ کیوں نہ لے۔

آج سیاسی تغیرات لانے کے لئے آئینی سیاسی کشمکش کا راستہ کھل چکا ہے۔ آج ایک منظم و منضبط ریاست کے کسی بہت نظم کے اندر رہ کر حسنِ تدریج بدلا جا سکتا ہے۔ اس دور کے حالات کے لحاظ سے دعوت اور سیاست کے دائروں کو بالکل الگ الگ رکھنا غیر ضروری بلکہ الٹا مضر ہے اس نئے تمدنی دور میں جس تک پہنچتے پہنچتے انسان نے بڑی کاوشیں کی ہیں اور تبدیلی کے پُرامن راستے کھولنے کے لئے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ انقلاب

کا واحد ہتھیار تلوار نہیں رہی ہے (جسے اسلام نے آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کیا ہے) بلکہ اس کی جگہ ووٹ نے لے لی ہے۔ اب قوموں کی
قیادتوں کے فیصلے جنگ کے میدانوں میں نہیں پولنگ اسٹیشنوں پر ہو جاتے ہیں۔ اس طرز کی تبدیلی ایک ہی فیصلہ کن معرکہ سے نہیں آتی بلکہ
تدریج سے آتی ہے۔ دعوت رائے عام کو ساتھ ساتھ تیار کرتی ہے اور جتنی جتنی تیار ہوتی جاتی ہے قیادت میں تبدیلی اتنی اتنی رونما ہونے
لگتی ہے۔ دوسری طرف جتنی جتنی تبدیلی قیادت میں آتی ہے اس کے مطابق رائے عام یا معاشرے کی تربیت و تنظیم کا کام تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے
فکر اور سیاست، دعوت اور کش مکش، اصلاح اور انقلاب، تعمیر اور تخریب کے دوگونہ کاموں کا ایک چکر سا چل پڑتا ہے جس کے چلنے کے دوران
میں ایک طرف کی محنت دوسری طرف مفید نتیجہ دکھاتی جاتی ہے۔

ناگزیر ہے کہ آپ "واحد مسنون طریقہ" کو ذہن میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور و تمدن کا بھی گہرا مطالعہ کریں اور اس میں کام کرنے کے بہتر سے
بہتر راستے تلاش کریں اور رفتارِ کار کو زیادہ سے زیادہ تیز بنائیں۔

—— ۱۰ ——

"واحد مسنون طریقہ" کی مبہم اصطلاح کے اندر سے اگر آپ ٹھوس مراد حقیقت نکال لیں تو وہ قطعی طور پر تین تقاضے ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ خوش قسمتی
سے یہ تین تقاضے جماعت اسلامی نے اپنے قبل تقسیم کے ٹھنڈے اور بظاہر غیر سیاسی دور میں منقح کر کے رکھ دیئے تھے۔ یہی تین تقاضے "اسلامی
حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" سے اخذ ہوتے ہیں اور انہی کو "تجدید و احیائے دین" میں "نبی کے کام کی نوعیت" کے عنوان سے نکھار کر پیش کر دیا گیا ہے (مناسب
ہوگا کہ آپ اس مقام کو ملاحظہ فرمالیں) علاوہ بریں ہمارے بنیادی لٹریچر کے اندر دوسرے مقامات پر بھی یہ مذکور ہیں۔ وہ ہیں ——— دعوت،
تنظیم اور سیاسی کش مکش۔ دعوت کے تین نکات میں بھی سیاسی کشمکش کی ضرورت و اہمیت پر خاص توجہ دلائی گئی ہے اور نظام قیادت میں تبدیلی پیدا
کرنے کو تحریک اسلامی کا لازمی تقاضا قرار دے کر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس لٹریچر کی گہرائیوں میں اتر کر اصل جوہر معنی کو مشخص کر کے
لبیک کہی تھی وہ بالکل ابتدائی دور سے آئندہ مراحل کا کچھ نہ کچھ تصور رکھتے تھے اور جب وہ مراحل بعد میں سامنے آئے تو ان کو ذرہ بھر بھی بیگانگی محسوس
نہ ہوئی۔ انہوں نے نئی ذمہ داریوں کو اس طرح شرح صدر سے خوش آمدید کہا جس طرح پہلے مرحلے کے تقاضوں کو لبیک کہا تھا۔

ہماری گزشتہ تاریخ میں اسلام کی دعوت کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ زندہ رہی ہے اور اس کے ساتھ مختلف طرز کی تنظیمی مساعی کا بھی سراغ ملتا ہے۔
لیکن یہی تیسرا تقاضا چونکہ بالعموم ساقط رہا، اس لئے اسلام بحیثیت تحریک کے کبھی نہ اٹھ سکا اور ہزار سالہ دور میں نظام اسلامی کا مکمل احیاء کبھی عمل میں
نہ آسکا۔ آج بھی اگر اس تیسرے تقاضے کو ساقط رکھا جائے تو دعوت کسی قدر جاری رہے گی، تحریک نہ چل سکے گی۔ وعظ ہوں گے اور کتابیں لکھی
جائیں گی، لیکن نظام اجتماعی میں کوئی مدوجزر پیدا نہ ہوگا۔ اگر کام پہلے دو اجزاء تک ہی محدود رکھنا ہوتا تو اس مقصد کے لئے ایک معتدبہ جماعت قائم
زیادہ نیک لوگوں کی بنائی ہوئی موجود تھی، جماعت اسلامی کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ جماعت اسلامی کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کے کام میں دعوت، تنظیم
اور سیاسی کشمکش کے سہ گونہ تقاضوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

ذرا آپ سوچیں تو اندازہ ہوگا کہ اسلام کی دعوتِ حق پوری زندگی کے لئے ہے، نہ کہ اس کے کسی ایک گوشے کے لئے۔ وہ محض آدمی کی نجی
زندگی ہی کو نہیں لیتی، وہ سیاسی معاشرے میں بھی جلوہ گر ہونا چاہتی ہے۔ وہ مسلم معاشرے کو بتانا چاہتی ہے کہ کن اصولوں پر ریاست کی دستوری ہیئت
کو استوار کرنا چاہیئے، قانون سازی کے خطوط کیا ہونے چاہئیں، نظام تعلیم کس نقشے پر بنے، معیشت و معاشرت کی اٹھان کیسی ہو، روزمرہ کے
سیاسی مسائل میں کیا نقطۂ نظر اختیار کیا جائے، کیسے لوگوں کو رہنمائی و نمائندگی سونپی جائے اور ووٹ کا استعمال کس مقصد کے لئے کیا جائے۔

ان معاملات میں تحریکِ اسلامی اگر گنگ رہتی ہے تو اس کا ادھورا پن اور عدم توازن بالکل واضح ہے۔ وہ دعوتِ حق بھی خوب ہوگی جو فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مفاسد کی اصلاح کے لئے تو پورا انہماک دکھاتی ہو مگر اجتماعی زندگی کے بڑے پیمانے کے مفاسد جن کی وجہ سے بڑا ساری افراد کی زندگیاں تباہ ہوتی ہیں اور جن کے ذریعے طرح طرح کے بگاڑ پھیل کر خود دعوتِ حق کا راستہ روکتے ہیں ان سے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے چلی جارہی ہو۔

اگر اسلام کارِ حکمرانی کے لئے کوئی رہنمائی رکھتا ہے اور تعلیم، عدالت، پارلیمانی نظام، دفاع، معیشت، خاندانی ہیئت اور انتخابات کے بارے میں کوئی ہدایت دیتا ہے تو کیا تحریکِ اسلامی اس رہنمائی و ہدایت کا دفتر لپیٹ کر بالائے طاق رکھ سکتی ہے۔ اگر وہ اس رہنمائی و ہدایت کو سامنے لاتی ہے تو پھر کیا یہ کافی ہوگا کہ اس کے علمبردار میدان سے باہر بیٹھ کر دوسروں کو داؤں اور گر بتاتے رہیں اور خود اداۓ فرض میں کوئی عملی حصہ نہ لیں کیا ایسے غیر عملی وعظ کچھ بھی اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے مسائل میں فکری رہنمائی دینے اور اس کے ساتھ عملاً کار اصلاح میں حصہ لینے کی بھاری ذمہ داری کو اگر سر سے اتار پھینکے تو پھر تحریک میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو جاتا ہے جس کے ہوتے ہوئے تحریک تحریک نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد ایک اکیڈیمی، ایک دارالمصنفین اور ایک انجمنِ واعظین کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، تحریک کا کوئی تصور قائم نہیں رہ سکتا۔

— ۱۱ —

تحریک کے سیاسی تقاضوں کے بارے میں آپ کو یہ ہول ہے کہ اگر ان کو پورا کیا جائے گا تو کارکنوں میں دنیا پرستی آجائے گی اور ان کی روحانیت ضائع ہو جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تحریکِ اسلامی کو کبھی بھی انتظامِ دنیا کو سنوارنے کی ذمہ داریاں نہیں اٹھانی چاہئیں۔ جب بھی یہ ذمہ داریاں اٹھائی جائیں گی تو تحریک دنیا پرستی کا شکار ہو جائے گی۔ اس فلسفے کے رو سے انتظامِ دنیا مستقل طور پر برائی کے سپرد کر کے اہلِ خیر کو سرمایہ روحانیت جمع کرنے میں لگے رہنا چاہیئے۔ اس فلسفے کو جو شخص ذہن میں رکھتا ہو وہ کسی نہ کسی دن خانقاہیت کے سراپردۂ اسرار میں جا پناہ لے گا، وہ کش مکش حیات کی گرانباریوں کا متحمل کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا اگر ایسا ہی ہوا ہے کہ نجات اس سے دور ہی دور رہ کر اپنی روحانیت کی فکر کرنے میں ہے تو پھر کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اسلام کو لپیٹ کر الگ رکھ دیا جائے اور بدھ مت اور جین مت سے نروان حاصل کیا جائے۔

آپ خود ہی بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں نقشہ جمہوریت یہ ہے کہ بُرے لوگوں کو ہٹانے کیلئے زیادہ بُرے لوگ آگے آتے ہیں چاہیئے یہ کہ اچھے لوگ آگے آئیں لیکن یہ بھی آپ کو منظور نہیں

— ۱۲ —

مگر اس بحث سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اگر ہم قضیئے کا اصل سررشتہ تلاش نہ کر لیں جہاں سے وہ خلجان شروع ہوتا ہے جس میں آپ اور آپ کی طرح کے دوست مبتلا ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت آپ پر عیاں ہے کہ تیرہ صدیوں کا لمبا دَور ہم نے اس حالت میں گزارا ہے کہ تحریک دو پارہ ہو گئی: ہر مسلمانوں کا ایک عنصر نفسانیت اور دنیا پرستی کی انتہا پر چلا گیا، دوسرا رہبانی روحانیت کی انتہا پر۔ دنیا کا انتظام دین سے آزاد ہو کر سوچنے اور عمل کرنے والے طبقے نے سنبھالا اور مذہب کی سرپرستی و خدمت کا مقدس فریضہ دوسرے طبقے نے لیا جو معاملاتِ دنیا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ان کے درمیان اوائل میں ایک مشترک طاقت موجود رہی، مگر وہ کمزور بھی تھی اور رفتہ رفتہ سکڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کا کلی خاتمہ ہو گیا۔ تفریقِ دین و سیاست کے اس لمبے عملی تجربے سے گزرتے ہوئے ہمارا اجتماعی ذہن سخت درجہ متاثر ہوا ہے۔ دس بارہ صدیوں کی اس تاریخ کی گہری پرچھائیں ہمارے نظامِ فکر پر اب تک موجود ہے۔ تفریقِ دین و سیاست کے اس لمبے دَور کے خلاف پچھلی ایک صدی سے جو صدائے احتجاج ہمارے اندر بلند ہوئی ہے اور جس میں

جماعتِ اسلامی نے خاصا نہ وہ پیدا کر دیا ہے، شعوری طور پر خوب اچھی طرح اثر انداز ہو جانے کے باوجود اجتماعی ذہن کے غیر شعوری اثرات کا پورا پورا ازالہ ابھی نہیں کر سکی۔

اس طویل دور نے ہمارے اندر جو مذہبی ذہن پیدا کیا ہے اس کی چند پیچیدگیاں ہیں جو اسلام کے تحریکی تصورات اور تقاضوں کو اپنانے میں مانع ہوتی ہیں۔ ان کو کسی جذبۂ تحقیر سے نہیں بلکہ محض بطور امرِ واقعہ یہاں عرض کیا جاتا ہے :-

اولاً یہ کہ وہ اپنی طرف سکڑنے سمٹنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اور آگے بڑھنے اور باہر کی طرف پھیلنے کی صفت نہیں رکھتا۔ وہ برائی سے اجتناب کرنے میں تیز ہے مگر برائی سے تصادم کرنے میں کمزور۔ وہ اجتماعی زندگی میں اصلاح چاہتا ہے مگر اندر اتر کر نہیں کنارے بیٹھ کر۔

ثانیاً یہ کہ وہ کارِ سیاست سے مستقل نفرت اور بُعد رکھتا ہے۔ اس دائرے میں قدم قدم پر جو معرکہ ہائے دست بدست پیش آتے ہیں اور جن کی وجہ سے دامن خاک و خون میں بھی آلودہ ہوتا ہے ان کو سر کرنے کے لئے حکمت و بصیرت اور عزم و ہمت کی جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ ضرورت سے کم پائی جاتی ہیں خصوصاً جب ایک نیک آدمی دیکھتا ہے کہ دائرۂ سیاست میں ایسی تدابیر، اسباب و وسائل اور ایسے مظاہر سے کام لینا پڑتا ہے جو اب تک دنیا پرست طاقتوں کے زیرِ استعمال ہیں تو اس کا ذوقِ تقویٰ ان سے کام لیتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے کوئی اخلاقی پستی پیدا ہو گئی ہے نتیجہ یہ کہ سیاست گریز رجحان زور پکڑتا ہے

ثالثاً یہ کہ ہمارا مذہبی ذہن ہمیشہ جمود پسند رہا ہے، حالانکہ اسلام حرکی تقاضے رکھتا ہے۔

ہر تحریک کی طرح اسلام کا ایک پہلو اصول کا ہے اور اس میں ثبات دوام اور استقلال پایا جاتا ہے، دوسرا پہلو مصالح، وسائل، اسالیب اور تدابیر کا ہے اور یہ پہلو ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے۔ اس کے ہاں ایک طرف منصوص احکام ہیں جو زمان و مکان کے ہر دور میں اٹل رہتے ہیں لیکن دوسری طرف ان سے کچھ جزئی نتائج بطور استنباط اخذ ہوتے ہیں اور ان میں حالات و مصالح کے تحت ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ سو یہاں ایک پہلو سے اٹل اعتقاد کی ضرورت ہے، دوسرے پہلو سے حرکت پسندانہ ذوقِ اجتہاد مطلوب ہے۔ ایک طرف جماؤ درکار ہے، دوسری طرف بہاؤ چاہیئے۔ ہمیں جو مذہبی ذہن ورثے میں ملا ہے اس کے اندر جماؤ کی صلاحیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے مگر بہاؤ کی صفت مفقود ہے۔ وہ اعتقاد میں پہاڑوں کی طرح اٹل ہے مگر اجتہادی تقاضوں کے لحاظ سے دریاؤں کی سی روانی نہیں رکھتا۔ اس کا مستقل ذوق یہ بن گیا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے جزئیے کو کلیات کی طرح پلے باندھ لیتا ہے اور ایک ایک لفظ کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے۔ وہ ادنیٰ مرتبے کی فقہی جزئیات کے معاملے تک میں صدہا برس سے لڑ جھگڑ رہا ہے۔ ایسے ذہن کو آج جب یکایک اسلام کے تحریکی عمل سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دائرہ سیاست میں اسے نت نئے اجتہادی فیصلے اور اقدامات کرتے دیکھتا ہے تو اس عمل سے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ ہر نئے اقدام، ہر نئے اسلوب، ہر نئی تدبیر اور ہر نئے وسیلۂ کار کو دیکھ کر غرابت محسوس کرتا ہے۔ وہ خوگر ہے ایک حصارِ تقدس میں بیٹھنے کا، وہ عادی ہے ایک کھنچی ہوئی لکیر پر حرکت کرنے کا ——— مگر اسے ہرگز مشق نہیں ہے اس کی کہ اساسی نظریہ و مقصد کی مشعل لے کر حالات اور مسائل کے جنگل میں سے اپنا راستہ خود تلاش کرے۔ وہ جزئیات کی حد تک ہمیشہ کے لئے طے شدہ فیصلے لے کر منزل کی طرف جانا چاہتا ہے اور اس مشقت کو قبول نہیں کرتا کہ ہر قدم پر اپنی کاوش سے ایک نہ ایک نیا فیصلہ کیا جائے۔ دین بحیثیت تحریک ایک "ریڈی ریکنر" نہیں ہے کہ آپ نے ورق نکالا اور بنا بنایا حساب ہاتھ آ گیا۔ یہاں تو جیتے جاگتے دماغ کے ساتھ بار بار پورا حسابی عمل کرنا پڑتا ہے اور اپنی کاوش سے نتائج نکالنے پڑتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے اٹل اصولوں کو وقت کے بدلتے حالات اور نئے تقاضوں سے مضروب کر کے ہر معاملے میں حاصلِ ضرب خود دریافت کرنا پڑتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس صلاحیت کے لحاظ سے ہمارا مذہبی ذہن پیچھے رہ گیا ہے اور اب اگر اسے کام کرنا ہو تو نئی تیاریاں

کی ضرورت ہے۔

بالعمایہ کہ یہ مذہبی ذہن دعوت و اصلاح کے کام میں تدریجاً درازسے فرد اور فرد کی زندگی کو سامنے رکھنے اور مخاطب بنانے کا عادی ہے۔ اس نے ہر طرف سے یکسو ہو کر فرد کو مانجھنے کی بڑی قابلِ قدر مشق بہم پہنچائی ہے۔ چنانچہ وہ کسی دینی دعوت و تحریک کو پرکھنے کے لئے دیکھتا بھی یہی ہے کہ چند افراد کس درجہ مانجھے گئے ہیں۔ پرکھ کے اس کام میں وہ بڑی باریک نگاہی سے کام لیتا ہے۔ اور اس کا قول بڑا ہی کرا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس نے دعوت و اصلاح کے کام کے لئے اجتماعی نظام کو کبھی سامنے نہیں رکھا اور اسے مخاطب نہیں بنایا اس وجہ سے وہ اس کو نہ تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے نہ اس کے پیدا کردہ مفاسد و مہالک کا جائزہ لے سکتا ہے نہ اس کے بارے میں کوئی پروگرام سوچتا ہے۔ نہ کسی ایسی دینی دعوت و تحریک کے کام کی وہ پرکھ کر سکتا ہے جو نظامِ وقت کو مخاطب بنائے اور اجتماعی ماحول کو مانجھنے کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ وہ اس کے ہاں بھی یہی دیکھتا ہے کہ اس نے افراد کس درجے کے مانجھے ہیں۔ ان افراد کو وہ کوئی الاؤنس اس بات کا نہیں دیتا کہ یہ وقت کے ماحول اور مسائل سے الگ کر کے کسی خانقاہ میں نہیں لا ڈالے گئے بلکہ ماحول سے وابستہ بھی ہیں اور اس ماحول کو مانجھنے کا عظیم فریضہ انجام دینے کی وجہ سے ہاتھوں اور کپڑوں پر کچھ نہ کچھ داغ دھبے لینے پر مجبور بھی ہیں۔

اگر اسے دلائل سے قائل کر بھی لیا جائے کہ اجتماعی ماحول کو تبدیل کرنا خود دین کا ایک اہم تقاضا ہے تو وہ اسے تقاضا مان کر اس وقت تک کے لئے مؤخر رکھنا لازم سمجھتا ہے جب تک کہ افراد اس کے قبول کردہ انتہائی معیار کے مطابق کامل ([illegible]) نہ ہو جائیں۔ وہ اس حقیقت کو مشکل ہی سے سمجھ سکتا ہے کہ ایک فاسد نظام کے نیچے ایک فاسد ماحول میں گھر کر فرد اوّل تو بڑی سے بڑی ریاضت کر کے بھی زہد و تقویٰ کے کسی مناسب معیار پر نہیں آسکتا اور اگر آبھی جائے تو ماحول کے ہر جہتی دباؤ کی زد پر رہنے کی وجہ سے اس معیار پر قائم ہرگز نہیں رہ سکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے افراد کی اصلاح و تربیت اور ماحول کی تبدیلی کے دونوں کام باہم دگر مربوط ہیں اور بیک وقت جاری رہنے چاہئیں۔ افراد کے سدھرنے سے ماحول پر اثر پڑتا ہے اور ماحول کے تغیر سے افراد کو سدھارنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ہمارا مذہبی ذہن اس نقطۂ نظر سے دور ہٹ گیا ہے۔ وہ آج بھی فرد کو ماحول سے منقطع کر کے پیشِ نظر رکھتا ہے اور ایک مدتِ مدید تک ماحول سے صرفِ نظر کر کے اس کی اصلاح و تعمیر ایک اونچے معیارِ مطلوب تک کر لینا چاہتا ہے۔ دعوت کی یہی وہ مہم ہے جس کے بارے میں اس کا تصور یہ ہے کہ اس کے مکمل ہونے پر "نظامِ حق" خود بخود قائم ہو جائے گا۔

اس کا اصل مغالطہ یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کو بھی ماحول سے الگ کر کے شانِ یکتائی کے ساتھ دیکھتا ہے، حالانکہ اس کے بالمقابل نہ صرف یہ کہ بے شمار چھوٹی چھوٹی مذہبی، سیاسی اور تحریکی دعوتیں موجود ہیں۔ بلکہ سب سے بڑھ کر ایک دعوت وہ ہے جس کا علمبردار وقت کا نظامِ اجتماعی ہے، اور جس کی منادی پورا ماحول کرتا پھرتا ہے۔ اس دعوت کے قبضے میں خزانے ہیں، ذرائع و وسائل ہیں، نظامِ تعلیم ہے، نشر و اشاعت کے انتظامات ہیں، لالچ دلانے کے لئے عہدے اور تنخواہیں ہیں اور خوف دلانے کے لئے جیل اور پھانسیاں ہیں۔ یہ بہترین دماغوں کو خریدتا ہے اور بہت بڑے اداروں کی شکل میں ان کو منظم کرتا ہے۔ پھر ایک بڑی دعوت زمانے کی عالمگیر مرتبے کی تہذیبِ الحاد کی طرف سے دی جا رہی ہے اور جو ایک سیلِ تند و تیز کی طرح دور افتادہ ترین انسانی آبادیوں تک پہنچ رہی ہے۔ آپ جس فرد کے ذہن و کردار کو بنانے میں ایک گنا محنت صرف کرتے ہیں، یہ دوسری وسیع تر دعوتیں اس کو بگاڑنے میں آپ سے سو گنا زیادہ طاقتیں خرچ کرتی ہیں۔ آپ کی دعوت جتنے عرصے میں ایک فرد کو اپنے ساتھ لیتی اور سنوارتی ہے، مقابل کی دعوتیں اتنے عرصے میں سو سو افراد کو زیرِ اثر لے لیتی ہیں اور پوری طرح بگاڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ ان حالات میں یہ خیالی نقشے بنانا کہ پہلے معاشرہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد اسلام کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جائے گی

اور پھر اس کے نتیجے میں نظام خود بخود کلمہ پڑھ لے گا، مغالطے کا ایک ایسا پیچیدہ چکر ہے جس میں پڑ جانے کے بعد ایک صدی میں بھی باہر نکل آنا ممکن نہ ہوگا۔ اس معاملے میں وہی مثل صادق آتی ہے کہ نہ نو من تیل کبھی فراہم ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی!

پس فرد اور نظام دونوں کو بیک وقت دعوتِ اصلاح کا مخاطب بنانا اور دونوں کو مانجھنے کی فکر ساتھ کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے۔ جتنے افراد تحریک کو ملتے جائیں وہ ان سب کی قوت اجتماعی نظام کی اصلاح کی لمبی مہم میں لگا دے اور نظام میں جتنی بھی اصلاح پیدا ہوتی جائے اس سے فائدہ اٹھا کر مزید افراد کو ساتھ لے، پھر ان افراد کی قوت کو پہلی قوت میں المضاعف کر کے اجتماعی اصلاح کی جدوجہد کو اور تیز کرے۔ اسی طرح کام دونوں پہلوؤں سے بڑھتا چلا جائے۔ ان دونوں کاموں کا مرحلۂ تکمیل ایک ہی ساتھ آسکتا ہے۔

نامسایہ کہ ہمارا مذہبی ذہن اب تک اس رُوحانی کیف کا لذت آشنا رہا ہے جو گوشہ نشین ہو کر اور تمام جھگڑوں جھمیلوں سے الگ رہ کر رکوع و سجود ادا کرنے میں ملتا ہے۔ اسے دوسرے طرز کے تحریکی کیف کا کوئی تجربہ نہیں ہے جو جدوجہد کرنے والے مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ "صوفی" کی سی عبادت کے سرور سے آگاہ ہے مگر سپاہی کی سی عبادت کے نشے سے ناواقف ہے۔ اسے مقامِ سکون کا مزہ معلوم ہے مگر عالمِ تگ و دو کا مزہ معلوم نہیں ہے۔ یہ فرق دو دنیاؤں کا فرق ہے۔

اس مذہبی ذہن کے لئے یہ تصور کرنا ——— اور کرے تو قائم رکھنا ——— مشکل ہے کہ میدانِ سیاست میں جو تحریکی کشمکش پیش آتی ہے اس کے تمام احوال و شئون میں جذبۂ عبودیت کے لئے کوئی کیف و سرور موجود ہے۔ اس کے لئے یہ محسوس کرنا دشوار ہے کہ ایک خطاب کرنے میں، ایک جلسے کی دریاں بچھانے میں، ایک قرارداد پیش کرنے میں، ایک مظاہرہ عمل میں لانے میں، ایک صدائے احتجاج بلند کرنے میں، ایک بلے کا رڈ اٹھانے میں بھی داعیانہ فریضہ کی انجام دہی، رضائے الٰہی کے حصول اور روحانیت کے نشوونما و ارتقاء کے کچھ مواقع موجود ہیں۔

جماعتِ اسلامی اِس مذہبی ذہن کو بدل کر تحریکی مرتبے پر لانے کے درپے ہے۔ اس کے اندر نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے نہ مجرد مذہبی تصور کافی ہے، نہ محض سیاسی سوجھ بوجھ وافی ہے، بلکہ ضرورت اسلامی نظریہ کے تحت پورے پورے تحریکی شعور کی ہے۔ جن لوگوں میں یہ تحریکی شعور پیدا ہو جاتا ہے وہ کام کے دائرے کے پورے پھیلاؤ اور اس کے متنوع تقاضوں کو سمجھ جاتے ہیں اور ادائے فرض میں لگ جاتے ہیں۔ جو لوگ تحریکی شعور پوری طرح اخذ نہیں کر سکتے، ان میں سے کچھ مذہبی تصور کے تحت اور کچھ سیاسی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ اوّل الذکر کی نگاہ میں جماعتِ اسلامی ایک پارلیمنٹری پارٹی قرار پاتی ہے جو واحد مسنون طریقہ کی حدود سے تجاوز کر رہی ہے، اور مؤخر الذکر کی رائے میں وہ مذہبی و اخلاقی اصلاح کے داعیوں کا ایک گروہ ٹھہرتی ہے جو سیاسی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام ہے۔ لیکن ہمیں نہ ان بزرگوں نے ٹھیک سمجھا، نہ ان حضرات نے! ہمیں صرف تحریکی شعور کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ کاش کہ آپ تحریکی شعور کے ساتھ ہمارا مطالعہ کر سکتے!

——— ۱۳ ———

خوب سمجھ لیجئے کہ شیطان کی سب سے گہری اور پُرپیچ چالوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کام کرنے والوں کو نظریاتی بحثوں میں ڈال کر ریب و تشکک اور بے یقینی اور تذبذب تک جا پہنچاتا ہے۔ جو اس کے چکر میں پڑا اس کے قوائے عمل ٹھٹھر کے رہ جاتے ہیں۔ وہ دوسرں کے نظریات سے اختلاف ہی نہیں کرتا، اپنے نظریہ کے لحاظ سے بھی ادائے فرض نہیں کر سکتا۔ اس کی بہترین مثال آپ کو خود اپنے اندر

ملے گی کہ آپ جماعتِ اسلامی کی سیاسی جد و جہد ہی سے دُور نہیں ہٹ گئے بلکہ جس مسنون روحانی طریق کار پر آپ کو نظری یقین تھا اس کے مطابق بھی کوئی پیش قدمی نہ ہو سکی! ـــــــــ اُلٹا اتنی پسپائی ہوئی کہ نماز نفل سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ یہ علامات ایک متوازن ذہن کے صحت مند نقطۂ نظر کی بہرحال نہیں ہیں۔

توقع ہے کہ آپ دوبارہ اپنا ذہنی جائزہ تفصیل سے لیں گے اور فکر کی عمارت کو از سرِ نو زیادہ ٹھوس اور پائدار بنیادوں پر کھڑا کریں گے۔

بقیہ:۔ ایک خط ۔ از صد ۱۷

...... جو ایک نقاد کے شایانِ شان نہیں۔

ایک نقاد کے نظریۂ حیات، ادب و تنقید کا دائرہ نہایت وسیع ہونا چاہیئے۔ مطالعہ، مشاہدہ، ریاضت اور مجاہدہ نقاد کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا فنکار کے لیئے۔

یہ سب کچھ اظہارِ اختلاف کے طور پر میں نے لکھا ہے ورنہ ع

مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

اور نعیم صاحب آپ نے جس خلوص اور محنت کے ساتھ صاحبِ مضمون کی وکالت میں مُدیر کی حیثیت سے حاشیہ آرائی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر بقول فیضؔ ؎

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یُوسف تو دیکھیئے

والسلام

مخلص ضیاء الرشید
راستنورہ۔ سعودی عرب

سید
(نظر زیدی)

دوسو لحاف

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر حاجی محمد نواز خان نے اپنے فاختئی رنگ کے موٹے کمبل کے پلو جھٹکے اور دوبارہ اچھی طرح لپیٹ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے کرسی کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی سی تپائی پر بجلی کی انگیٹھی تپ رہی تھی۔ انہوں نے پیر پھیلا کر اونی جرابوں میں ڈھکے ہوئے اپنے دونوں پیر سینکے پھر دونوں ہاتھ انگیٹھی کے قریب کر کے چٹ چٹ انگلیاں چٹخائیں۔ اور اس طرح جب ان کی روح خوشگوار حرارت سے اچھی طرح سرشار ہو گئی۔ تو کرتے کی بغلی جیب سے تسبیح نکال کر آئت کریمہ کا ورد شروع کر دیا۔

یوں تو حاجی صاحب ہمیشہ ہی مطمئن اور مسرور رہا کرتے تھے لیکن آج ان کی خوشی خاص طور پر گہری تھی۔ عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے ہی انہیں اپنی کراچی والی دکان کے منیجر کا یہ خط ملا تھا۔ کہ ماچس کے جس اسٹاک کے لئے خسارے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب کچھ نہیں تو دس بارہ ہزار کا نفع دے جائے گا منیجر نے دلیل یہ دی تھی۔ کہ جو جہاز دیا سلائی کا نیا اسٹاک لے کر آیا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں گھاٹے کا یقین ہو گیا تھا درانی صاحب کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اور اپنی روایات کے مطابق وہ اس مال کو فوراً ہی بازار میں نہیں لائیں گے بلکہ اس وقت کا انتظار کریں گے جب لوگ آگ جلانے کے لئے ایک ایک تیلی کو ترسنے لگیں اور انہیں اپنے مال کی منہ مانگی قیمت مل سکے ـــــ تجارت کے سلسلے میں حاجی صاحب اندازوں اور پیش از وقت توقعات کے بالکل قائل نہ تھے۔ لیکن منیجر کی یہ دلیل اتنی وزنی تھی۔ کہ انہیں نہ صرف اس پر یقین کرنا پڑا تھا بلکہ متوقع نفع اپنی جیب میں محسوس ہو رہا تھا۔

مسٹر درانی ان کے پرانے واقفوں میں سے تھے اور صرف انہی کے کیا پاکستان کا پورا تاجر طبقہ ان کے صحیح مرتبے سے واقف تھا، یہ وہ نامی گرامی ہستی تھی جس نے متعدد غیر ملکوں میں بلیک مارکیٹ کی باقاعدہ تعلیم اور تجربہ حاصل کر کے اپنے عزیز وطن کو تجارت کی اس کالی دیوی سے روشناس کرایا تھا۔

- ایمان دار سے ایمان دار افسر کو شیشے میں اتار کر کس طرح تجارتی لائسنس حاصل کئے جا سکتے ہیں۔
- منڈی میں کسی مال کی ریل پیل ہونے کے باوجود کس طرح قحط کا سا سماں پیدا کیا جا سکتا ہے۔
- چور بازاری کا خاتمہ کرنے کا عزم صمیم لے کر اٹھنے والے سرکاری کارندوں اور افسروں کو کس طرح غچہ دیا جا سکتا ہے! اور اس قسم کے تقریباً تمام رموز نکات انہی کے ذرخیز دماغ کی پیداوار تھے۔ اور اس بازار میں جسے کالا بازار کہا جاتا ہے ہر شخص انہیں اپنا امام تسلیم کرتا تھا۔ ان حالات میں حاجی صاحب یہ سوچنے کی کس طرح جرأت کر سکتے تھے۔ کہ ان کے منیجر نے جو کچھ لکھا ہے درست نہیں۔

تسبیح کے چکنے، سفید دانوں پر تیزی سے چلتی ہوئی انگلیوں کو ذرا دیر روک کر انہوں نے اپنے اس اسٹاک کے بارے میں حساب لگایا جو صرف چند گھنٹے پہلے ایک متعفن لاش کی طرح نظر آ رہا تھا: اچھا تو اللہ پاک کی مہربانی سے اب معاملہ یوں ہو گا کہ ایک تو چار پانچ ہزار روپے بچا جو اس مال کی قیمت گر جانے کے باعث یقیناً گھاٹے کے کھاتے میں جاتا۔ گویا یہ بھی ایک طرح نفع ہی ہوا! ہاں بالکل نفع، اس کے علاوہ دس بارہ ہزار آنے والا فائدہ، سب کو ملایا جائے تو کم سے کم بیس ہزار ہوا۔ یہاں تک سوچنے کے بعد انہوں نے بلند آواز میں الحمدللہ کہا۔ اور پھر نہایت انہماک سے تسبیح کے دانے ٹٹولنے لگے لیکن تحت الشعور میں چھپے ہوئے خیالات نے تسبیح کے امام تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں ایک بار پھر چونکا دیا۔ غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ پھر رک گیا اور آئت کریمہ کے

الفاظ بھول کر پھر اپنی اس مادی زندگی کے بارے میں سوچنے لگے۔

ماچس کا یہ تازہ اسٹاک درآمد ہونے کی خبر سنکر ہی تو ہمیں گھاٹے کا خطرہ پیدا ہوا تھا۔ اب اگر یہ اسٹاک درانی صاحب کے تہ خانے میں چلا گیا تو پورے شہر میں ایک طرح ہماری اجارہ داری قائم ہو جائے گی کیوں کہ اس وقت سب سے زیادہ مال ہمارے ہی گودام میں ہے۔ پھر کیوں نہ منیجر کو لکھ دیا جائے کہ وہ کچھ دن کے لئے ہاتھ روک کر مال فروخت کرے، ایسا کرنے سے ہمارے مال کی قیمت کچھ نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور ہو جائے گی یعنی اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ صرف ایک سودے پر ہمارا نفع ۲۰ ہزار روپے سے بڑھ کر تیس ہزار تک جا پہنچے گا۔ آخر ایسا کرنے میں حرج ہی کیا ہے! آج کل تو اس تجارتی کچھ بوجھ کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ آخر ہمیں بھی زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی خاص مہربانی سے ایسی صورت پیدا کر دی ورنہ اس بے معنی اصول پرستی کے باعث آٹھ دس ہزار کا چپت بالکل مفت میں لگ گیا تھا۔ ہاں ضرور لکھ دینا چاہیئے منیجر کو، درانی بڑی سمجھ بوجھ کا آدمی ہے۔ وہ اس وقت سے پہلے اپنے مال کو ہوا بھی نہ دکھائے گا جب تک ماچس کی ایک ڈبیہ بھی بازار میں دستیاب ہو سکے گی۔ بلکہ یہاں تک یقین رکھنا چاہیئے جب تک اس کا مال دو گنے تگنے داموں اٹھ نہیں جاتا۔ وہ نیا مال بھی نہ نکلنے دے گا۔ نہ جانے محکمہ درآمد برآمد کے کتنے افسروں کو ظالم نے ہاتھوں پر ڈال رکھا ہے۔ کیوں نہ ہو کھانے کھلانے والا آدمی ہے۔ جبھی تو دنوں میں لکھ پتی بن گیا۔ کیسی کیسی شاندار کوٹھیاں تعمیر کرائی ہیں ظالم نے! اور وہ نئے ماڈل کی کار۔ ہمارا خیال ہے پورے شہر میں اس کے سوا کسی کے پاس بھی ایسی خوبصورت گاڑی نہ ہو گی۔ اس دن گارڈن پارٹی میں وہ وزیر صاحب کس حسرت سے دیکھ رہے تھے اس کار کو —— ہو سکتا ہے اس چلتے پرزے کے بارے میں یہ افواہ بھی سچ ہی نکلے۔ کہ قومی اسمبلی کے آنے والے چناؤ میں کھڑا ہو رہا ہے۔ ہمارا تو خیال ہے اس کا کامیاب ہو جانا یقینی ہے اور اگر ممبر بن گیا تو وزیر بن جانا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں، سچ ہے روپے میں بڑی طاقت ہے"

یہاں تک سوچ کر حاجی صاحب نے تسبیح کو بجلی کی انگیٹھی کے پاس رکھ دیا، اور خط لکھنے کا سامان لینے کے لئے اپنے بھاری وجود کو سمیٹا۔ ان کی یہ حرکت بالکل غیر شعوری تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ان کی نظر چمکدار سفید دانوں کی تسبیح پر جا پڑی جو بجلی کی انگیٹھی کے پاس یوں بکھری ہوئی تھی۔ جیسے پھولوں کا جامنی ہار ہو جو تلدر کر پھینک دیا گیا ہو، اس تسبیح کو انہوں نے خاص مکہ مکرمہ میں خریدا تھا۔ امام کی بے مثل گھڑاوٹ اور دانوں کی صفائی، چمک کے علاوہ انہیں اس کی یہ خوبی خاص طور پر پسند آئی تھی۔ کہ اس کے امام میں لگے ہوئے چھوٹے سے آتشی شیشے کے اندر گنبد خضریٰ اور جنت البقیع کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہ خوبی معمولی تسبیحوں میں بھی ہوتی ہے لیکن حاجی صاحب کو اسی کی تصویر میں خوبی نظر آئی تھی کہ اسے دیکھ کر تزکیۂ نفس کا ارادہ تازہ رہے گا۔ جب بھی اس پر نظر پڑے گی یہ خیال آجایا کرے گا۔ کہ جب ایسی ایسی عظیم ہستیوں کو دنیا سے سدھارنا پڑا تو ایک دن ہمیں بھی رختِ سفر باندھنا ہو گا۔

تسبیح پر نظر پڑتے ہی ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ انہیں محسوس ہوا یہ بے جان شئے زبانِ حال سے پوچھ رہی ہے۔ کیوں حاجی صاحب! کیا مجھ سے رشتہ توڑ کر اب کالے بازار کے سب سے بڑے چور سے رشتہ جوڑیں گے آپ! تھوڑی دیر کے لئے ان کے حواس مفلوج ہو کر رہ گئے وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ تیس ہزار کے متوقع نفع کی طرف لپکیں یا اپنی تسبیح کی طرف ہاتھ بڑھائیں لیکن آخیر میں انہیں اپنا پہلا مسلک ہی درست معلوم ہوا، وہ لاحول پڑھ کر پھر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر تسبیح اٹھالی۔

لاحول ولاقوۃ شیطان کس راستے پہ لے چلا تھا۔ یہ جملہ کہہ کر نئے سرے سے تسبیح شروع کرنے کے لئے انہوں نے امام کو ٹٹولا لیکن چند دانے گھمانے کے بعد ہی ان کے ذہن میں پھر خیالات کی ایک رو دوڑ گئی۔ وہ سوچنے لگے "میرے دوسرے ہم پیشہ جا ہے ان ترکیبوں سے کروڑوں روپے کما رہے ہوں لیکن انشاء اللہ میں اس راستے پر ہرگز نہ چلوں گا۔ خدا نے جب حلال طریقے سے سب کچھ دے رکھا ہے تو حرام کی طرف نظریں

دوڑانے سے کیا فائدہ ۔ صرف دس پندرہ برس پہلے ہی کی تو بات ہے اس لاہور شہر کے اندر میں ایک چھوٹی سی ریڑھی پر بساطئے کا سامان لئے گلی گلی پھرا کرتا تھا میری نیک نیتی اور اصول پرستی کی وجہ سے اللہ پاک نے اس معمولی کاروبار میں برکت دی اور آج یہ حالت ہے لاہور کے علاوہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک شاندار دوکان چل رہی ہے ۔

یقیناً میرے انہی اصولوں نے مجھے اس قابل بنایا ہے۔ کہ بیت اللہ اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ ایک مسجد تعمیر کرا چکا ہوں، پانچ سو روپے سالانہ انجمن حمایتِ اسلام کے چندے میں ادا کرتا ہوں کئی ایک یتیم خانوں کو امداد دے رہا ہوں ۔ اور کتنی ہی بیواؤں کا وظیفہ مقرر کر رکھا ہے ۔ پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ اس گندگی میں ہاتھ ملوث کروں!

یہ خیالات پہلے خیالات کے مقابلے میں حد سے زیادہ طمانیت بخش تھے ۔ حاجی صاحب کے دل و دماغ پر میٹھا میٹھا نشہ سا چھا گیا انہوں نے بلند آواز میں الحمدللہ ۔ الحمدللہ کہہ کر پھر وظیفہ شروع کرنا چاہا لیکن اس اچھے شغل میں اب ان کا بالکل دل نہ لگا ۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ قرآن پاک کی اس مقدس آیت کے الفاظ حلق اور زبان کے درمیانی فاصلے ہی میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں ۔ کم از کم وظیفے کے سلسلے میں انہیں یہ بے دلی بالکل ناپسند تھی ۔ ان کا اعتقاد تھا دعا ہو یا عبادت اس وقت شرفِ قبولیت پاتی ہے جب روح اور جسم کی پوری قوتوں کے ساتھ کی جائے ۔ اس لئے انہوں نے یونہی شغل کے طور پر ایک طویل سانس لے کر تسبیح کو پھر بجلی کی انگیٹھی کے پاس تپائی پر رکھ دیا ۔ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں آگے کی طرف پھیلا کر دھات کی اس پلیٹ پر نظریں جما دیں ۔ جو انگیٹھی کے فریم میں سرخ یاقوت کی طرح خوش رنگ نظر آ رہی تھی ۔

انگیٹھی کی ہلکی ہلکی حرارت سے ان کی طمانیت میں اور بھی اضافہ ہوا ۔ وہ سوچنے لگے ۔" اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے انسان کو کیا شعور اور طاقت دی ہے ۔ بھلا یہ کوئی آسانی سے یقین کر لینے والی بات ہے ۔ کہ دھوئیں اور شعلوں کے بغیر ہمارے ان محفوظ کمروں میں زیادہ سے زیادہ حرارت پیدا کی جا سکتی ہے ۔ پھر مزے کی بات یہ کہ نہ کسی قسم کے ایندھن کی ضرورت ہے نہ ماچس کی ۔ بس ایک چھوٹا سا بٹن نیچے کر دو اور نہایت ہی خوشگوار قسم کی حرارت سے لطف اٹھانے لگو ۔

اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے حاجی صاحب نے نہ جانے تصورات کی کون کونسی وادیوں کی سیر کی ۔ سائنس کی نہ جانے کتنی ایجادات کی مدح سرائی کی اور نہ معلوم دنیا کے کس کس ملک کی سیر فرمائی ۔ اب انہوں نے اپنے خیال کی باگیں بالکل ڈھیلی چھوڑ دی تھیں ۔ کافی دیر تک اپنے اس پسندیدہ شغل میں محو رہنے کے بعد انہیں اچانک ہی یہ خیال آیا ۔ کہ اس وقت جبکہ میں اپنے بند کمرے میں کمبل لپیٹے بجلی کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوں، نہ جانے اللہ کی کتنی مخلوق کھلے آسمان کے نیچے سردی میں ٹھٹھر رہی ہو گی ۔ یہ خیال جو نہ جانے کس رخنے سے بے اجازت ہی ان کے ذہن میں گھس آیا تھا تیز نوکیلے نشتر سے کم نہ تھا ، وہ حد سے زیادہ حساس اور رقیق القلب آدمی تھے ۔ اس تکلیف دہ خیال کے آتے ہی ان کی پرسکون ذہنی فضا میں بھونچال سا آ گیا ۔ بیماری اور افلاس کے مارے ہوئے — انسانوں کی پرچھائیاں ان کی نظروں کے سامنے لرزنے لگیں ۔ بھوک اور برہنگی کے ذلیل کئے ہوئے لاتعداد بچوں اور عورتوں کی فریادیں ان کے کانوں میں گونج گئیں اور اس تکلیف سے بچنے کے لئے انہوں نے ہمیشہ کی طرح ان امکانات پر غور کرنا شروع کر دیا ۔ کہ نوعِ انسانی کو اس ذلت سے کس طرح نجات دلائی جا سکتی ہے !!

" کیا یہ ممکن نہیں ۔ کہ تیس ہزار کے متوقع نفع میں سے چند ہزار روپے اس مقصد کے لئے صرف کر دیئے جائیں ۔ غریب غربا کے لئے سو دو سو لحاف بنوا دینا تمہارے لئے کوئی بڑی بات نہیں پھر یہ سودا خاصے نفع کا بھی ہے ۔ اگر یہ کام سلیقے سے کیا گیا تو اخبارات میں اس کا چرچا ضرور ہو گا اور اس طرح آخرت کے ثواب کے علاوہ دنیاوی نیک نامی بھی حاصل ہو گی ۔"!

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے اپنے منیجر کے اس مشورے کی تائید کر ہی ڈالی۔ دو سو کی تعداد میں نئے لحاف بنوا کر مستحق لوگوں میں تقسیم کر دینے کا عزم کر کے انہوں نے پاس رکھی ہوئی میز میں گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اور پھر دل ہی دل میں دو سو لحافوں کا حساب جوڑنے لگے :

" جی قبلہ!" کواڑوں کی ہلکی سی چرر چوں کے بعد ایک مانوس آواز ان کے کانوں میں آئی۔ اور انہوں نے اپنے خیالات سے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ مٹیالی سی داڑھی والا ایک مؤدب شخص اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ ان کا خاص ملازم شکور تھا۔

" جی قبلہ! حاجی صاحب کو اپنی طرف متوجہ پا کر شکور نے خاص انداز میں اپنا خاص جملہ پھر دہرایا ——— دو سو لحاف بنوانے کے خرچ کا تخمینہ کرتے کرتے حاجی صاحب اب ملک کے اخبارات کی شائع کی ہوئی ان مدحیہ تحریروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جو اس عظیم مالی قربانی کے بعد ان کی شان میں یقینی طور پر لکھی جانے والی تھیں۔ اس لئے انہیں شکور کی یہ مداخلت اچھی خاصی ناگوار گزری۔

شکور ان کے ہاں صرف چار پانچ مہینے پہلے نوکر ہوا تھا۔ یہ شخص ظاہری ہیئت کے لحاظ سے تو تقریباً ویسا ہی تھا جیسے اس طبقے کے عام لوگ ہوتے ہیں لیکن اس کی شخصیت میں کوئی ایسی ندرت ضرور تھی جس سے حاجی صاحب غیر محسوس طور پر متاثر ہوئے تھے۔ ہر وقت فریادیوں کا سا روپ بنائے رکھنے کی جگہ وہ ہمیشہ صاف ستھرا اور متین نظر آتا تھا۔ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے اس کا لباس اگرچہ جگہ جگہ سے مسکا ہوا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں مردانہ ہاتھ کے لگے ہوئے بدزیب پیوند بھی دکھائی دیتے تھے لیکن داغ دھبوں اور میل سے ہمیشہ ہی پاک رہتا تھا۔ یہاں تک کہ کڑی گرمیوں کے دنوں میں پسینے کی بدبو بھی نہ آتی تھی ——— صاف ستھرا رہنے کی عادت کے علاوہ شکور کی جس خوبی نے حاجی صاحب کو خاص طور سے متاثر کیا تھا وہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور خودداری تھی۔ انہوں نے اب تک یہی دیکھا تھا۔ اس طبقے کے لوگ نوکر ہونے کے دوسرے دن ہی سے تنخواہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ شروع کر دیتے تھے۔ "دیکھئے نا سرکار ——— ! دو دو تین آدمیوں کا بوجھ ہے میرے کندھوں پر۔ ایک بیوہ بہن اور اس کے بچوں کو بھی میں ہی پال رہا ہوں۔ تنخواہ میں تھوڑا سا اضافہ فرما دیں تو جان و مال کو دعا دوں گا۔" ان کے ہاں بعض نوکر ایسے بھی آئے تھے جنہوں نے آتے ہی دھونس اور دھاندلی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔" ارے صاحب! مجھے کیا خبر تھی آپ کے ہاں اتنا کام کرنا پڑے گا۔ بازار سے سودا سلف بھی مجھی کو لانا پڑتا ہے اور گھر کے سارے دھندے بھی میرے ذمے ہیں۔ نا صاحب ان چند روپوں میں یہ مصیبت مجھ سے نہ سہی جائے گی۔ یا میری تنخواہ بڑھائیے ورنہ دوسرے نوکر کا انتظام کر لیجئے ——— !"

——— لیکن شکور میں حاجی صاحب نے ایسی کوئی بات نہ دیکھی تھی۔ وہ جس دن سے کام پر کھڑا ہوا تھا۔ نہایت خاموشی اور وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اور اس کی اسی خصوصیت نے انہیں اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ گھر کے کاموں کے علاوہ وہ کبھی کبھی خاص معاملات میں بھی اس سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت بھی اسے بلانے کا یہی مقصد تھا۔

چند ثانیے بعد جب انہیں یہ یاد آیا کہ اس غریب کو تو خود میں نے ہی گھنٹی بجا کر بلایا ہے۔ تو مسکراتے ہوئے بولے "آؤ شکور میاں! آؤ یہاں بیٹھو انگیٹھی کے پاس، خدا کے بندے تم ایک گرم کوٹ کیوں نہیں بنوا لیتے، کانپ رہے ہو ——— ؟"

شکور چند قدم آگے بڑھ کر پھر رک گیا۔ بھلا وہ حاجی صاحب کے بالکل قریب کس طرح بیٹھ سکتا تھا۔ اور سچ بات تو یہ تھی خود حاجی صاحب نے بھی یہ بات محض محاورے کے طور پہ کہہ دی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر۔ کہ اب انگیٹھی کی تھوڑی بہت آنچ اس حد تک ضرور پہنچ رہی ہو گی انہوں نے مطلب کی بات شروع کر دی "قصہ یہ ہے میاں شکور، کہ ہم غریبوں میں تقسیم کرنے کے لئے دو سو کی تعداد میں نئے لحاف بنوانا چاہتے ہیں۔ کچھ اندازہ لگاؤ اس کام پر کتنی رقم خرچ ہو جائے گی۔ اور یہ لحاف کتنے دنوں میں تیار ہو جائیں گے۔ ہمارا دل تو یہ چاہتا ہے کہ کل ہی بن کر آ جائیں اور شام

ہونے سے پہلے ہم انہیں مستحق لوگوں تک پہنچا دیں "۔
شکور اس سلسلے میں کیا رائے دے سکتا تھا۔ محض خاموش رہنے کے جرم سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر کی چند باتیں پیش کر دیں، ہاں اس کے چہرے سے یہ ضرور ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اپنے آقا کے اس عزم سے اسے سچی خوشی حاصل ہوئی تھی۔

اس کے تین چار روز بعد حاجی صاحب کے ساتھ ٹرک پر سوار ہو کر شکور تقریباً آدھی رات تک مستحق لوگوں میں لحاف تقسیم کرتا رہا، حاجی صاحب نے اس کام کے لئے رات کا وقت یوں پسند کیا تھا۔ کہ ان کی حلال کی کمائی سے بنائے ہوئے یہ لحاف مستحق لوگوں تک ہی پہنچیں۔ ان کی یہ احتیاط درست بھی تھی۔ اخبار فقیروں، محتاجوں میں بھی تو چھاپہ مار دستے موجود ہیں جو حقدار لوگوں تک کوئی چیز پہنچنے ہی نہیں دیتے "!
اگرچہ وہ کافی تھک گئے تھے اور معمول کے خلاف کافی دیر تک جاگنا بھی پڑا تھا لیکن اس رات انہیں ایسی اچھی نیند آئی۔ کہ پوری زندگی میں کبھی نہ آئی ہو گی۔ میٹھی، پُر سکون، اور پُر سرور نیند کے علاوہ آج کی رات انہوں نے خواب میں بیت اللہ کی زیارت بھی کی اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ انہیں یہ بات معلوم تھی۔ کہ اگر کوئی شخص خواب میں بھی حج کے لئے جائے تو اسے حج کا ثواب مل جاتا ہے۔
صبح بیدار ہوئے تو ان کی طبیعت حد سے زیادہ ہشاش تھی۔ صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی میں انہیں گرد و پیش کی ہر ایک چیز یوں نظر آئی۔ جیسے کوئی مقدس دوشیزہ دودھ سے منہ دھو کر آئی ہو۔ ادھ کھلی کھڑکی سے نظر آنے والے برآمدے کے رنگین ستون، باغیچے کے درخت، بیلیں اور جھاڑیاں اور دوسرے سرے پر بنا ہوا باورچی خانہ اور وہ چھوٹی کوٹھڑی جس میں شکور رہتا تھا، ہر چیز نور میں نہائی ہوئی تھی۔
بلند آواز میں چھینکیں کلمے اور صبح کی دعائیں پڑھنے کے بعد حاجی صاحب نے تفریحاً ایک لمبی سی جمائی لی اور ہاتھ بڑھا کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ یہی ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ بجنے والی دھات کی گھنٹی کے خول پر چوٹ پڑتے ہی شکور کی پُرسکون، مدھم آواز ان کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی: "جی قبلہ —" ان الفاظ میں اپنے حاضر ہونے کی اطلاع دے کر وہ بیت الخلاء والا لوٹا لا کر تپائی پر رکھ دیتا تھا۔ اور جب تک وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر آتے تھے، وضو اور نماز کیلئے مزید سامان درست کر دیتا تھا، لیکن آج تین، چار بار کتنی ہی کتنی دیر تک گھنٹی بجانے کے باوجود شکور کی آواز سنائی نہ دی۔ انہیں یہ بات بہت ہی عجیب لگی جیسے بالکل ٹھیک وقت دینے والے ان کے قیمتی کلاک کی کمانی ٹوٹ گئی ہو، چند ساعت انتظار کرنے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی اور اس بار بھی شکور کی آواز سنائی نہ دی تو ان پر جھنجھلاہٹ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بستر سے اٹھ کر انہوں نے جلدی جلدی سلیپر پہنے اور شکور کی کوٹھڑی کی سمت والا دروازہ کھول کر زور زور سے آوازیں دینے لگے۔ "شکور، اے شکور ارے بھئی کیا ہوا تمہیں، کیا افیون کی گولی نگل کر سوئے ہو آج؟"

ملاقاتیوں کی سہولت اور وظیفے وغیرہ کی یکسوئی کے خیال سے انہوں نے اپنے لئے کوٹھی کا ایک ایسا کمرہ پسند کیا تھا جو زنانخانے سے خاصا فاصلے پر تھا۔ درمیانی کمروں کے دروازے بند ہونے کے باوجود ان کی آواز اہل خانہ تک پہنچ گئی۔ نہ پہنچی تو شکور تک جس کی کوٹھڑی نسبتاً قریب اور بالکل سامنے تھی۔ اب تو حاجی صاحب کی جھنجھلاہٹ ہلکے سے غصے میں تبدیل ہو گئی۔ عام معاملات میں کسی قسم کی بے اعتدالی ہو تو وہ اسے نہایت ٹھنڈے دل سے برداشت کر جایا کرتے تھے۔ لیکن یہ اپنے فرائض سے غفلت کا معاملہ تھا، اور اس سلسلے میں ان کے ہاں رتی بھر گنجائش نہ تھی۔ ان کا ایمان تھا، اللہ تعالےٰ کی مہربانی کے بعد فرض شناسی کی بدولت ہی مجھے یہ عروج حاصل ہوا ہے۔
دریافت حال کے لئے آنے والی مائی رحیماں کے جواب میں "کچھ نہیں" کہہ کر وہ لمبی لمبی ڈگیں بھرتے ہوئے شکور کی کوٹھڑی کی طرف روانہ

ہوگئے کہ کوٹھی تعمیر ہونے کے بعد غالباً یہ پہلا موقع تھا۔ کہ وہ اس تاریک گوشے کی طرف جا رہے تھے۔ جو اس منور اور حسین و جمیل عمارت کا حصہ تھا جس پر انہیں فخر تھا۔ اور وہ بھی اس عزم کے ساتھ، کہ اس نا فرض شناس نوکر کو خوب ڈانٹیں گے جس کی وجہ سے انہیں صبح ہی صبح اتنی ذہنی کوفت برداشت کرنی پڑی تھی۔

کوٹھری کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے زور سے آواز دی "شکور! اے شکور!" پھر اپنے بھاری ہاتھ کی مٹھی باندھ کر کواڑ پر تین، چار مکے مارے، اس کے بعد ایک بار پھر آواز دی لیکن اس قدر جھنجھوڑ ڈالنے پر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو پہلی بار اُن کے دل میں ہلکا سا اندیشہ پیدا ہوا "خدا خیر کرے، اتنا شور ہونے پر تو شکور کو ضرور جاگ جانا چاہئے تھا" اس اندیشے کو دل میں دبائے انہوں نے آہستہ سے کواڑ کو دھکا دیا، اندر کی کُنڈی کھُلی تھی، ذرا سے اشارے سے کواڑ کھُل گیا۔

صبح کی ملگجی روشنی اب دودھیا اُجالے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور کوٹھری کے اندر کی ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی، حاجی صاحب کی نظر سب سے پہلے شکور کی چارپائی کی طرف گئی، اور یہ دیکھ کر ان کا نوکر کوئی چرکا لگا کر بھاگ نہیں گیا۔ انہوں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا، انہیں فوراً خیال آیا، آخر میرا نقصان ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ اللہ کے فضل سے میں اپنی ایک ایک کوڑی کی زکوٰۃ نکالتا ہوں۔

چوری ہو جانے کا اندیشہ دور ہو جانے کے بعد اُن کا غصہ بھی کس قدر کم ہو چکا تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں قدم اُٹھاتے ہوئے شکور کی چارپائی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور جھک کر اس کا شانہ ہلانے لگے: "شکور، ارے میاں شکور! آج کیا ہوا تمہیں اُٹھتے کیوں نہیں؟" لیکن اس نے اب بھی کوئی حرکت نہ کی تو حاجی صاحب نے غور سے اس کی طرف دیکھا، اور یہ محسوس کر کے ان کی روح پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ کہ شکور اب اس دنیا میں نہ تھا۔

"ہائیں یہ کیا!!" غیر ارادی طور پر بے ساختہ کہہ کر انہوں نے اپنے اس مسکین نوکر کی لاش کی طرف غور سے دیکھا، اس کے نیلے ہونٹ اور ایک بوسیدہ سی موٹی اور کھدر کی چادر میں لپٹا ہوا کمزور جسم زبانِ حال سے کہہ رہا تھا، آقا میں کیا کروں، اپنی طرف سے تو زندہ رہنے کی بہت کوشش کی لیکن آج سردی ہی بہت زیادہ تھی۔

"تو کیا اس کے پاس لحاف بھی نہ تھا! آج رات ہی تو اس نے دو سو لحاف اپنے ہاتھ سے غریبوں میں تقسیم کئے ہیں۔ کیا یہ ایک لحاف اپنے لئے نہیں رکھ سکتا تھا" حاجی صاحب افسوس کے انداز میں زبان سے چچ چچ کر کے سوچنے لگے لیکن اس سے پہلے، کہ اُن کا اس طبقے کی جہالت کی طرف منتقل ہوتا۔ اُن کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی "اور کیا تمہارا یہ فرض نہیں تھا، کہ اخباروں میں دھوم مچ جانے کے خیال سے آزاد ہو کر یہ خیرات خود اپنے گھر سے شروع کرتے،

کیا اس وقت تمہاری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں، جب یہ کمزور وجود بوسیدہ سُوتی کپڑوں میں سُڑسُڑ کرتا ہوا تمہارے کاموں کے لئے دَوڑا دوڑا پھرتا تھا......!

اس آواز نے حاجی صاحب کے خون کو برف کی طرح ٹھنڈا کر دیا۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ دو سو لحاف ان کے اوپر ایک ایک کر کے گرنے لگے ہیں، اور ان کی رُوح ان کے بوجھ تلے دَبی جا رہی ہے!

(اکرم جلیلی)

والٹیر اور تاریخ

تاریخ کے مابہ النزاع مسائل میں سے سب سے زیادہ مشہور مسئلہ واقعاتِ عالم پر انسانی تصورات کے آثار کا نظریہ ہے۔ مثلاً کیا افراد کی بنیادی خواہشات و مرضیات، واقعاتِ عالم کی حقیقی وجوہ ہیں۔ یا انسانی مرضیات و خواہشات و توجہ معاملات محض ایک معمولی سا پرتو ڈالتے ہیں۔

——— کیا خیالات اور تصورات انقلاب کو جنم دیتے ہیں یا انقلاب محض حالات کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔؟ اگر والٹیر، روسو، ٹالسٹائی اور لینن کے خیالات میں انقلابی کیفیت کا مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ قیاس وارد ہوگا۔ کہ عوام محض سیاسی قوتوں اور تحریکات کے آلۂ کار رہتے ہیں۔ اور یہ سیاسی قوتیں اور تحریکات خود ان کی تخلیق کردہ نہیں ہوتیں، اور نہ ہی وہ ان پر کوئی غلبہ پا سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر خیالات و تصورات انقلابات کی بنیاد نہیں ہوتے بلکہ مادّی حالات کی ناگزیر ارتقائی پیداوار ہوتے ہیں۔

ہومر ہمیں بتلاتا ہے کہ یونانیوں نے ٹرائے کا دس سال تک محاصرہ کئے رکھا۔ کیونکہ ٹراجن پیرس خوبصورت ہیلن کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ خفیہ طور پر فرار ہو گیا تھا۔ ہیلن کے غضبناک خاوند مینیلاس نے اپنی مغویہ بیوی کو حاصل کرنے اور اس کے عاشق کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے زبردست قوت مجتمع کر کے ٹرائے کا محاصرہ کر لیا۔ حسد و رقابت آدمی کو عمل پر اُبھارتا ہے۔ مغویہ بیوی کی بازیابی کے لئے سعی و جہد کا جذبہ انسانی فطرت کا ناگزیر اور قابلِ ستائش جذبہ گردانا جاتا ہے۔ لیکن آئیے اس معاملہ کو ذرا اور عمیق نگاہ سے دیکھیں، یہ حقیقت ہے کہ مینیلاس کو حسد و رقابت کے کچوکوں نے اپنی مغویہ بیوی کی بازیابی کے لئے ابھارا مگر اس کے حین ساتھیوں اور دوستوں نے اس معاملہ میں اس کی رفاقت کی بھلا ان کے متعلق کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے۔؟ کیا اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے دوسرے عوامل اور وجوہات نے راہ ہموار نہیں کر دی تھی۔؟ بات دراصل یہ ہے کہ یونان کے لوگ مشرق سے تجارت کرنے کے لئے ایک نیا راستہ کھولنے کیلئے مضطرب تھے۔ ٹرائے کو ختم کرنے سے پہلے پرشیا کی خوشبوؤں اور خشک گھاس کے لئے یونان کو مارکیٹ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں پیرس اور ہیلن کے معاملہ نے بلجیم کی غیر جانبداری کی طرح یونانیوں کی تگ و دو کے لئے بہترین غذا مہیا کر دی۔

میرا خیال ہے کہ یونانیوں کے ٹرائے پر حملے کی مارکسی توجیح دلنشیں کچھ اسی قسم کی ہو گی۔!

یہاں اس کی خوبیوں پر بحث کرنے کے لئے جگہ نہیں ہے۔ مگر انسانی خواہش اور مقصد کی اہمیت پر اس توجیح کی اثر اندازی قابلِ ذکر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم صرف حالات کے آلۂ کار ہیں جو نہ تو تغیر پذیر ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہم غیر مرئی قوتوں کے دباؤ سے عشق اور جنگ میں گھر جاتے ہیں۔ بڑے آدمی وہ ہوتے ہیں جو بے خوفی اور بے باکی سے عشق اور جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ہماری ہی طرح اخلاق کے خلاق ہوتے ہیں۔ مگر خلاقیت میں ان کا حصہ ہم سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اس نزاعی بحث کو اٹھارھویں صدی کے ایک بہت بڑے فرانسیسی مصنف والٹیر نے جو ایک عظیم انقلاب کا بانی بھی تھا۔ ایک نئے ڈھنگ سے پھر اٹھایا۔

والٹیئر اور روسو دونوں نے تقریباً پچاس سال تک اپنے ہم عصر تمدنی نظام کے مظالم کے خلاف ایک انقلابی جنگ جاری رکھی۔ اور اس جنگ میں انہوں نے چرچ کے اختیارات کی تحدید، حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے۔ غیر منصفانہ عدالتی نظام کی تنسیخ، پسماندہ طبقات کی حق رسی، نیز نادار ٹیکسوں کی ظالمانہ بھرمار کے خلاف آواز بلند کی۔ والٹیئر نے اپنے زبردست پروپیگنڈے کے ذریعے اس آواز کو خوب پھیلایا۔
اس وقت کے دیگر مصلحین کی مانند والٹیئر بھی سچے انسانی اخلاق اور اعلیٰ افادی علم کی تخلیق اور ترتیب و تدوین میں برابر کا حصہ دار تھا۔ ان مصلحین نے انسانی ترقی کے جو اصول پیش کئے، وہ مختصراً یہ تھے۔

- رواداری، فکر و رائے کی آزادی، قانون کی نظر میں سب کی یکساں مساوات، فرد کی آزادی اور انسانی ترقی پر ایک بھرپور یقین!

والٹیئر اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم ہی نہ تھا بلکہ دوسرے عالموں کی نسبت زیادہ مؤثر شخصیت کا مالک تھا۔ انقلاب کے دوران میں ۱۷۸۵ء تک اس کی تصنیفات کے چونتیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس کے تصنیفی اور تالیفی کام کی فہرست مسٹر جیسٹرڈ الآگنٹس کی کتاب "والٹیئر" کے چودہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے زبردست اثر کا سارا دباؤ چرچ اور ازکار رفتہ نظامِ حکومت کے خلاف پڑتا تھا۔
والٹیئر کی وفات کے گیارہ سال بعد فرانس میں انقلاب بپا ہوا اور اس سے چرچ کی قیادت اور پرانی طرز کی حکومت دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سوال کے جواب میں کہ والٹیئر نے اس نفرت و بیزاری کو پیدا کرنے میں کتنا حصہ لیا جو آخرکار ۱۷۸۹ء کے زبردست انقلاب کی صورت اختیار کر گئی۔ مورخین بڑے تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔!

مسٹر سٹن اپنی کتاب پاؤ ر پیپرز آف فرنچ ریولیوشن کے دلچسپ اختتامی باب میں فرد کی فیصلہ کن اہمیت کے متعلق استدلال کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ "والٹیئر اور اس کے ہم خیال اور ہم عصر دوستوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عوام کو وہ ابتدائی سیاسی تصورات عطا کیئے جن سے وہ ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھنے لگے جس میں تمام حقوق و اختیارات صرف امیروں کے لئے نہ ہوں گے! اور تمام بوجھ اور فرائض غریبوں کی پشت پہ نہ لادے جائیں گے۔

—— والٹیئر کے مزار پر یہ انقلابی فقرہ کندہ ہے:" اس نے عوام کو آزادی حاصل کرنے کے لئے تیار کیا" یہ ایسا مبنی بر حقیقت دعویٰ ہے۔ کہ کارل مارکس جیسا جھگڑالو طبیعت کا آدمی بھی اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکا" مسٹر سٹن کی مذکورہ بالا کتاب کے تعارف میں مسٹر لاسکی رقمطراز ہے:" اٹھارھویں صدی کے فلاسفروں نے انسانوں کو ان کے بہترین خصائص و اوصاف کا احساس دلا کر ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو دائمی طور پر اجاگر کر دیا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں عوام کے جذبات کو بیدار کرنا اور ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا کام کوئی معمولی کام نہ تھا۔ والٹیئر کو اس کام کے لئے بیسٹل جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔ اور یہ کہنا کہ اگر وہ اس انقلاب کو دیکھنے کے لئے زندہ رہتا تو وہ اس سے نفرت کرتا اور انقلاب کی آگ کو ہوا دینے کو ناپسند کرتا۔ دراصل اس پر ظلم ہوگا۔ البتہ اس حقیقت سے اختلاف کا اظہار صرف برنارڈ شا کے منہ ہی سے سجتا ہے۔ وہ کہتا ہے" انقلاب پروپیگنڈہ کی کامیابی سے نہیں بلکہ ناکامی کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ فرانس کا انقلاب اس لئے رونما نہیں ہوا تھا کہ لوگوں نے والٹیئر روسو اور دوسروں کے خیالات کو سنا تھا۔ بلکہ فرانس میں بغاوت اس لئے پھوٹ پڑی تھی۔ کہ عوام نے اُن لوگوں کی باتوں کو سننے سے انکار کر دیا تھا۔

تاہم میں کوئی مورخ نہیں ہوں کہ اس بحث میں الجھ کر رہ جاؤں میں تو صرف کسی ایک دلیل کا ساتھ ہی دے سکتا ہوں اور اس لئے بھی کسی بحث و نزاع میں پڑنے کی بجائے صرف والٹیئر کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ مجھے یقین ہے کہ انسانی اذہان واقعات پر صرف

پر تو ڈالنے کی بجائے ان پر باقاعدہ اثر انداز ہوتے ہیں، اسی لئے میں پورے یقین اور اخلاص کے ساتھ تاریخ کی مادی تعبیر کے نظریہ کو ناپسند کرتا ہوں۔

جب والٹیر نے ۸۴ برس کی عمر میں ستائیس سال کی جلاوطنی کے بعد اپنا آخری سفر پیرس کے لئے اختیار کیا تو سارے شہر نے اس روز تہوار منایا۔ لوگوں نے اس کی گاڑی کے ارد گرد گھیرا ڈال لیا، اکیڈیمی نے اسے صدارت پیش کی اور ایک خاص اجلاس منعقد کیا گیا جس میں اس کے اعزاز میں مقالے پڑھے گئے، اور کامیڈی فرانکیس کے تھیئٹر میں جہاں اس کے المیہ ڈرامے ایرین کو سٹیج کیا گیا تھا، پردے کو اٹھانے کے لئے بیس منٹ کے لئے تاخیر کی گئی کہ لوگ والٹیر کے سواگت میں تالیاں بجاتے رہے تھے۔

تقریب کے اختتام پر والٹیر کے مجسمے کو سٹیج پر ہار پہنائے گئے، اور بوڑھا والٹیر تھیٹر کے دروازے میں پیرس کی خوبصورت عورتوں کے جلو میں داخل ہوا۔ اس قسم کا شاندار استقبال آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

عوام کا ایک گروہ مستقل طور پر والٹیر کے ہوٹل کے باہر کھڑا رہا۔ اور مسلسل "والٹیر کی جے" "والٹیر فلاسفر کی جے" "پادریوں اور حکومت کے دشمن والٹیر کی جے" "ژاں کالس کے ہمدرد والٹیر کی جے" کے نعرے لگاتا رہا۔

——— ژاں کالس کون تھا؟

والٹیر کی سرگرمیوں اور کارناموں پر اس سوال کے جواب کی توضیح کئے بغیر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔

ژاں کالس ایک پروٹسٹنٹ عیسائی تھا جس کے بیٹے نے دماغ کی خرابی کی وجہ سے خودکشی کر لی لیکن کیتھولک چرچ نے الزام لگایا کہ کالس نے خود اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے اور چونکہ یہ الزام کیتھولک چرچ نے لگایا تھا۔ لہٰذا مذہبی عدالت کے لئے مزید شہادت کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ کالس کو گرفتار کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ اس کی بیوی کو اور اس کی لڑکیوں کو قید کر دیا گیا، اور اس کے لڑکوں کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

والٹیر نے تحقیق و تصدیق کے بعد پتہ چلا کہ کالس بے گناہ ہے اس پر اس کی مذہب کے خلاف بیزاری و نفرت زیادہ چمکی۔ اور اس نے اس فیصلہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا، اس کے لئے اپنی گرہ سے روپے خرچ کئے، لاتعداد پمفلٹ اور خطوط تحریر کئے اور اس زمانے کے ماہر پروپیگنڈسٹ کی طرح ہر ڈھنگ سے کام لے کر رائے عام کو ہموار کیا۔ سالوں تک یہ نزاع چلتا رہا۔ آخرکار والٹیر کی جیت ہوئی کالس کی بیوی کو دوبارہ آباد کیا گیا اور اس کی لڑکیوں کو رہائی دی گئی۔

یہ واقعہ اور اس قسم کے اور بہت سے واقعات اس بات کی دلیل بنتے ہیں۔ کہ والٹیر فطری طور پر بہت بڑا مصلح تھا۔ غریبوں اور تباہ حالوں کا ہمدرد تھا۔ اور حکومت کے خلاف مجسم بغاوت تھا۔ وہ بلند سیاسی جذبات کا حامل تھا۔ اور اس کا قول تھا کہ "سچائی سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔" والٹیر فرانس کا ایک متمول اور مہذب شہری تھا۔ جو اپنی ابتدائی عمر میں زیادہ تر عدالتوں میں گھومتا اور اپنی خودسر اور بے باک طبیعت کی وجہ سے وہ مذہب اور چرچ کے خلاف گمنام اور نفرت انگیز نظمیں لکھتا رہتا تھا۔

پھر حکومت کی طرف سے دس سال کے لئے اور مکمل تنہائی میں اپنی گھریلو ملازمہ میڈم ڈوچاٹلیٹ کے ساتھ "سارے" کے مقام پر رہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ والٹیر اور میڈم دن اور رات کے اکثر اوقات کھانے اور معمولی ورزش کے علاوہ مطالعے کے کمرے میں گذارتے، والٹیر نظمیں، المیہ ڈرامے، تاریخ اور فلسفہ کے موضوعات پر کتابیں لکھنے میں مصروف رہتا۔ اور میڈم نیوٹن کا ترجمہ کرتی نیز والٹیر کو اس کے کاموں میں سرگرم رکھنے کے علاوہ اسے حساب اور فزکس میں مدد بہم پہنچاتی۔ میڈم ڈوچاٹلیٹ کی وفات کے بعد والٹیر پرشیا کے سردار فریڈرک کے دربار میں

چلا گیا جہاں اس نے چار طوفانی سال گزارے۔ والٹیر اور فریڈرک دونوں ایک دوسرے کے مداح تھے لیکن وہ محبت کرنے والوں کی طرح آپس میں عموماً جھگڑتے بھی رہے۔ والٹیر ان اہلِ علم اصحاب کا مذاق اڑانے اور ان میں مین میخ نکالنے میں خاصا تیز تھا جن کے حلقہ میں فریڈرک کو بعض وجوہ سے بیٹھنا پڑتا تھا۔ آخرکار والٹیر کو شاہ کی نفرت و ناراضگی کے طوفان میں وہاں سے پھر بھاگنا پڑا۔ اب کے اس نے سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر فرنی کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ اور وہیں اپنی زندگی کے آخری پچیس سال بسر کئے۔ یہاں وہ بادشاہی نظام میں کسی قسم کی اصلاح سے مایوس ہو کر جمہوریت اور بغاوت کا علمبردار ہو گیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ ایک عملی باغی کی حیثیت سے کوئی پارٹ ادا کرنا اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ وہ اپنی عقل و دانش اور دل و دماغ کے تمام گوشوں سے عوام کی بہتری کی سوچتا تھا۔ وہ لوگوں کو انصاف پسند، معقول اور صابر ہونے کی تلقین کرتا۔ اور ابتدائی طور پر ان اوصاف کو بروئے کار لانے کے لئے وہ ان کو آرام دہ اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے کہتا۔

روسو کے برعکس جس سے وہ نفرت کرتا تھا۔ وہ یہ خیال نہیں کرتا تھا۔ کہ انسان فطری طور پر نیک ہوتا ہے۔ اور اپنی فطرت پر قائم رہنا اس کے اپنے بس میں ہے اور نہ ہی وہ قنوطیوں کی طرح اس چیز پر ایمان رکھتا تھا۔ کہ انسان فطرتاً بد واقع ہوا ہے۔ اور اس کی قسمت میں ذلت و خواری اور مایوسی لکھی ہوئی ہے بلکہ وہ ایک متوسط و معتدل نظریہ کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام چیزیں نیکی اور بدی کی مرکب ہوتی ہیں اور آدمی بھی ان میں شامل ہے۔ انسان مکمل خوشی کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ صرف کچھ خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اور زیادہ خوشی بھی صرف اسی طور پر حاصل کر سکتا ہے کہ حقائق کا مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی ہر شے ایک بہتر شے نہیں ہے۔ ہاں جد و جہد کے بعد اسے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

اس طرح والٹیر یقینی طور پر مسلکِ اعتدال کا حامی ہے، جو لوگ اس کے متعلق کچھ زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ انہیں مسٹر آلڈنگٹن کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ترجمہ: "سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ"

نوائے اقبالؔ

(ایم عبداللہ صدیقی)

اے مسلمانانِ پاکستان اے اہلِ عجم
کھو دیا تم نے گراں مایہ متاعِ درد و غم

اب کوئی بجلی بھی شاخوں کو جلا سکتی نہیں
ہے تمہارے شاخساروں میں قیامت کا ورم

تم کو یہ دعوےٰ کہ اب تک ہو حرم کے پاسباں
مجھ کو اندیشہ کہ خطرے میں تمہی سے ہے حرم

یہ تدبر، یہ حکومت، یہ سیاست کا کمال
اے حریفانِ جہاں! میں کھول دوں سارا بھرم؟

تم کو یہ سودا کسی صورت بھرے بھوکوں کا پیٹ
اور ہے یہ خوف مجھ کو فتنہ ساماں ہے "شکم"

فاقہ کش بندوں نے کعبے سے نکالا تھا جنہیں
آج پوشیدہ ہیں کس کی آستیں میں وہ صنم

"ڈاس کیپی ٹال" میں دیکھی روس نے اپنی نجات
تو بھی دیکھ اپنی کتاب اے امتِ خیر الامم

اے نگہبانِ حرم تو نے کبھی سوچا بھی ہے؟
جم گیا کیونکر فلسطین میں یہودی کا قدم

کب بھروسہ ہے تمہیں اللہ کی امداد پر
ہے تمہارے سینے میں مانگا ہوا غیروں سے دم

جنگ اگر چھڑ جائے تو تم کو بھروسہ ہے یہی
آئیں گی ترکی سے فوجیں، اور امریکہ سے بم!

خوں آنکھوں سے ٹپک جاتا ہے اے قومِ حجاز!
دیکھتا ہوں جب تجھے محتاجِ شمشیر و قلم

لختِ جگر کی یاد میں

(کمال الدین سالار پوری)

(ایک طویل مرثیہ کی تلخیص)

اَے چراغِ خانۂ دل ہائے مرے لختِ جگر ۔۔۔ تیرے بجھنے سے مرا گھر ہو گیا تاریک تر
روزِ روشن میں مری قسمت بگڑ کر رہ گئی ۔۔۔ حسرت و ارمان کی دنیا اُجڑ کر رہ گئی
میرے بستر پہ مچل کر، پھیل کر سمٹے گا کون؟ ۔۔۔ اب مرے سینے سے ڈر کر رات کو چمٹے گا کون؟
دفعتہً کھلتے چمن ویران ہو کر رہ گئے ۔۔۔ آرزوؤں کے محل سنسان ہو کر رہ گئے
زندگی رنگیں مناظر، موت یہ ویراں مقام ۔۔۔ اِک سہانی صبح جس کی اِتنی ہیبتناک شام
ایک گل کھلنے سے پہلے شاخ ہی نیچے گرا ۔۔۔ ایک ماہِ نَو چمکنے بھی نہ پایا چھپ گیا
اِک ہنسی آئی تھی لب پر اور پھر جاتی رہی ۔۔۔ ایک دنیا آرزو کی دل میں ابھری مٹ گئی!
ایک بیداری اٹھی اور خواب ہو کر رہ گئی ۔۔۔ ایک دولت گھر کے گھر نایاب ہو کر رہ گئی
ایک محل آباد ہونے بھی نہ پایا، گر پڑا، ۔۔۔ اِک دیا، اُف جھٹپٹے میں شام ہی کے بجھ گیا
رو رہا ہوں گرچہ رونے کا اثر کچھ بھی نہیں ۔۔۔ تو کہاں ہے؟ مجھ کو اب اس کی خبر کچھ بھی نہیں
گھر سے رخصت کر دیا آہ و بکا کے شور میں ۔۔۔ جسم تیرا ہم نے جا کر رکھ دیا اِک گور میں
گھر ہے لالہ زار وہ جس میں کوئی لالا نہیں ۔۔۔ یہ کھلونے رہ گئے اور کھیلنے والا نہیں
دیکھتا ہوں میں انہیں تیرے لئے ماتم کناں ۔۔۔ یہ ترے کُرتے قمیصیں، یہ دوا کی سیشیاں
زندگی کے یہ خس و خاشاک اور یہ دریائے موت! ۔۔۔ اُف یہ انساں کا تکبر! اُف یہ استہزائے موت!

توڑتے ہیں یہ حوادث ہی طلسماتِ غرور ۔۔۔ دُور ہوتا ہے انہی سے قلبِ انساں کا فتور
جوڑ دیتے ہیں یہ رشتہ خالقِ اسباب سے ۔۔۔ یہ جگا دیتے ہیں غفلت کے بھیانک خواب سے
یہ سکھاتے ہیں حدودِ بندگی کا احترام
یہ لگا دیتے ہیں بڑھ کر نفسِ سرکش کو لگام

نکتہ چیں ہے غمِ دل..........

(حمید حیدر ہاشمی سعید)

(طنزیہ)

موسمِ سرما کی ایک سرد رات تھی۔

میں رات کے تقریباً دس بجے ایک آفس میں پارٹ ٹائم ڈیوٹی کرکے خراماں خراماں مال روڈ پر ٹہلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اتفاقاً بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے مجھے ایک نیلا لفافہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ لفافہ کی نفاست دیکھ کر میں نے اسے اٹھا لیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ کسی کا خط پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ میں نے لفافہ کھول کر خط نکالا اور وہیں کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کس جذبہ کے تحت وہ خط پڑھ ڈالا۔ بہرحال اب تو ایک جرم کا اضافہ میرے اعمال میں ہو ہی گیا۔ وہ خط مجھے اس قدر دلچسپ معلوم ہوا کہ میں اسے آپ کو سنانے کیلئے مجبور ہو گیا۔ معلوم نہیں آپ میرے اور خط کے راقم کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے — مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال وہ خط حاضرِ خدمت ہے!

"ارسٹوکریٹ پیلس۔ ریاست جاگیروارنگر"

مملکت خداداد ۔ ۱۲ راگست ۵۶ء

پیارے دوست!

تم مجھے کئی خطوط میں لکھ چکے ہو۔ کہ میں تم کو اپنی ریاست کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں لیکن میں اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تمہارے مسلسل اصرار کی بنا پر آج میں نے بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے۔ سوچا چلو آج میں تمہاری ایک خواہش بھی پوری کر دوں۔ حالانکہ اس وقت میرا موڈ خط لکھنے کا نہیں ہے کیونکہ مس اُن اشیمٹل .... میرے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کا تقاضہ ہے کہ ان کے ساتھ ناچوں — لیکن اب تو تم کو خط لکھ کر ہی میں کہیں جاؤں گا۔

سب سے پہلے میں تم کو طلباء کے بارے میں بتاؤں گا۔ کیونکہ میں خود بھی ایک طالب علم ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اب بی۔ اے کر چکنے کے بعد بھی مجھے یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کسے کہتے ہیں۔ ڈنمارک کہاں واقع ہے۔ ایران کا وزیر اعظم کون ہے۔ یو۔ این۔ او کی کتنی شاخیں ہیں۔ آخر مجھے ان باتوں سے مطلب بھی کیا۔ میں بہرحال بی۔ اے تو ہوں ہی۔

آزادی ملنے کے بعد ہماری قوم کے طلباء نے بال روم ڈانسنز بہت تیزی کے ساتھ سیکھے ہیں۔ آج خدا کے فضل و کرم سے ہماری یونیورسٹی کے ستر فیصدی طلباء بال روم ڈانس کے ماہر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری ریاست سے بہتر بال روم کے ڈانسر کسی اور ایشیائی ملک میں نہیں ملیں گے۔ یونیورسٹی کی پارلیمنٹ میں اس بل پر غور ہو رہا ہے کہ یونیورسٹی میں کسی ایسے طالب علم کا داخلہ نہ لیا جائے جو ناچ یا موسیقی کا ماہر نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بل پاس ہو جائے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ ہمارے مذہب میں مخلوط ناچوں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں رکھی گئی ہے لیکن تم ہی بتاؤ آخر ہم اس تیرہ سو سال قبل کے مذہب اور شرع پر کیسے عمل کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں تو بال روم ڈانسنگ کا وجود ہی نہیں تھا۔ پھر آخر اسے حرام کیسے قرار دیا گیا۔ بہر حال موجودہ زمانہ میں مخلوط ناچوں میں مہارت رکھنا مہذب ہونے کے لئے اشد ضروری ہے۔ اگر ہم اس معاملہ میں پیچھے رہے تو امریکہ، روس، فرانس، برطانیہ ہم لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا، کا محبوب لباس سوٹ۔ یا قمیص و پتلون ہے۔ پاجامہ یا شیروانی کو ہم بہت معیوب سمجھتے ہیں۔ اس لباس سے قدامت پسندی کی بو آتی ہے۔ وہ طلبا جو بھولے سے کبھی شیروانی اور پاجامہ پہن کر آ جاتے ہیں، وہ ہمارے لئے تفریح کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں مختصراً ہمارا لباس بالکل یورپین ہوتا ہے بلکہ بعض طلبا، ملبوسات کے سلسلہ میں یورپی اور امریکی طلبا سے بہت آگے ہیں۔ کچھ طلبا، تو فاقہ کر کے چوری کر کے، ملبوسات کے لئے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ شاید کسی اور ملک کے طالب علم ملبوسات کے لئے فاقے اور چوریاں نہیں کر سکتے۔

ہمارے طلبا، کا محبوب مشغلہ سینما دیکھنا ہے۔ ہم زیادہ تر انگریزی فلمیں پسند کرتے ہیں۔ خاص کر جب ہم کسی Girl کے ساتھ پکچر دیکھنے جاتے ہیں تو انگریزی فلم ہی دیکھتے ہیں۔ تم نفسیات کے اچھے ماہر ہو اس لئے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ صنف نازک کے ہمراہ انگلش فلمز دیکھنا کیوں ضروری ہے۔ کلاسیکل ادب اور وہ ادب جو غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کی ترجمانی کرتا ہو ہم کو قطعاً پسند نہیں ہے۔ ہم کو رومانی، جاسوسی، جنسیاتی ادب سے کافی دلچسپی ہے۔ ہمارے محبوب فن کار خاکروب آفریدی۔ یہی پیمانوی۔ ابن فصی۔ ابن عبید، نیرو ندرام تیرتھ پوری وغیرہ ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ آخر کیوں ایسا ادب تخلیق کرتے ہیں جس کے پڑھنے سے لذت حاصل نہ ہو۔ ہم نے فرائڈ موپساں ایمائل زولا کو بھی کافی پسند کیا ہے۔ رومانی شاعری روحانی غذا ہے۔ اگر شاعری میں حسنِ عریاں کا تذکرہ ہے۔ تو پھر کیا کہنے ———— ! بائی گاڈ By god زندگی کا لطف آ جاتا ہے۔

کورس کی کتابیں پڑھنے کے لئے افسوس ہے کہ ہمیں فرصت نہیں ملتی۔ تم ہی بتاؤ ہمارے اتنے سارے پروگرام ہیں آخر کورس کی کتابیں پڑھیں تو کب پڑھیں۔ صبح نو بجے اٹھنا، ساڑھے نو بجے تک میک اپ کرنے کے بعد غسل کرنا، کالج جانا، وہاں دوستوں کے ساتھ گذشتہ رات دیکھی ہوئی فلم یا کلب کے ناچوں کے بارے میں تبصرہ کرنا۔ اس کے بعد ہم سب اپنی محبوباؤں سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ اگر محبوبائیں نہیں ہوتیں تو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخری پیریڈ میں ہم ضرور حاضر رہتے ہیں کیونکہ چھٹی کے بعد ذرا لڑکوں کے ساتھ کافی تفریح ہو جاتی ہے۔ ۵ بجے تک گھر آ کر ناشتہ وغیرہ کیا۔ لباس بدل کر مال روڈ، بندر روڈ یا کسی اور جگہ جہاں حسین صورتیں کافی دکھائی دیں، ٹہلنے کے لئے چلے جاتے ہیں، ہر لڑکی کی بیوٹی پر according to her. beauty and charm نمبر دیئے جاتے ہیں۔ ریمارکس پاس ہوتے ہیں۔ ذرا اس طریقہ سے تفریح ہو جاتی ہے۔ ۷، ۸ بجے کلب جا کر کھانا کھاتے ہیں اور پھر ہوتا ہے ناچ ———— ۱۲ بجے ہمیں کلب سے فرصت ملتی ہے۔ آخر ہم پڑھیں تو کس وقت پڑھیں۔ لیکن ہم پھر بھی پاس ہو جاتے ہیں ———— کیسے ———— ؟ یہ تم کو کیوں بتائیں کہ ہمارے sources کافی ہیں۔ روپیہ بھی ہمیں مل جاتا ہے اور جب یہ دونوں چیزیں ہوں تو پھر پاس ہونے میں کیا رکھا ہے۔!

اچھا بھئی اب اجازت دو۔ میں نے تم کو بہت لکھ دیا۔ اگر کوئی اور بات معلوم کرنی ہو تو لکھ دینا۔ (باقی ص۳۵ پر دیکھو)

(اختر احمد قاضی)

سابق صوبہ بلوچستان اور اردو ادب

ادب کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اکثر ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا۔ بعض نے اس کو اتنے وسیع معنی دیئے ہیں کہ وہ تمام تحریریں جو اقوام عالم نے مختلف ادوار میں اپنے بعد چھوڑیں۔ سب ادب میں داخل ہیں۔ اور بعض نے اسے اس قدر محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کہ تاریخ، فلسفہ، اقتصادیات اور مذہبی کتب تک اس میں شامل نہیں سمجھی جا سکتیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔

اس دور میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی پر بھی کافی بحث ہوئی ہے۔ اور ابتک جاری ہے۔ ترقی پسند ادیب یا شاعر یہ کہتے ہیں۔ کہ ادب صرف زندگی کے لئے ہے اور جو تحریریں انسانی زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں وہ نہ صرف ادب بلکہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی بھی توہین ہیں۔ اگر ہم اس زاویۂ نگاہ سے دیکھیں اور سوچیں تو پھر طب، صابن سازی اور مشینری پر جو کتب لکھی گئی ہیں وہ یقیناً ادب کا ایک حصہ ہیں لیکن ترقی پسند ادیب یا شاعر اسے بھی تسلیم نہیں کرتے یہ حقیقت ہے کہ ہیر کٹنگ کی کتب سے لے کر ہوائی جہاز اور ایٹمی قوت تک کا انسانی زندگی سے براہِ راست تعلق و ربط ہے اور اس کی افادیت سے بھی منکر نہیں ہوا جا سکتا۔ اب رہ گیا سوال ادب برائے ادب کا تو رجعت پسند اس کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ پھول میں حسن و آرٹ تو دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس سے اخلاقی درس اور معاشرتی افادیت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا ادب برائے ادب بالکل صحیح اور درست نظریہ ہے۔

اس کے بعد یہ یقینی ہے کہ ہمیں ادبی و غیر ادبی کتب کے درمیان کوئی ایسا خط کھینچنا پڑے گا۔ کہ جس سے دونوں کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ہیر کٹنگ یا صابن سازی پر لکھی ہوئی کتاب اور "بال جبریل" یا "جلال و جمال" کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی انہیں ایک ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک ادبی و غیر ادبی کتب پرکھنے کے تین اصول ہیں۔

(الف) اخلاقی — اگر مقصد اخلاقی نہیں بلکہ غیر اخلاقی ہے۔ تو وہ کتاب غیر ادبی ہو گی۔ مثال کے طور پر کوک شاستر قسم کی کتب پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کتاب کا مقصد محض عوام کو اخلاقی، عملی اور ذہنی طور پر مفلوج کرنا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی جس قوم کا اخلاقی طور پر دیوالیہ نکلا ہو وہ کبھی بھی کسی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتی۔

(ب) ذہنی — کسی کتاب کے پڑھنے سے یہ تو ممکن ہے کہ انسان کو جسمانی یا اقتصادی فائدہ نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی کچھ حاصل نہ ہو تو ایسی کتاب بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اس سلسلے میں اردو کی اکثر و بیشتر شاعری کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

(ج) جذباتی اور جمالیاتی — اگر کسی کتاب میں محض اخلاق ہی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہو جیسے بعض مذہبی کتب میں ہوتا ہے تو عوام میں ایسی کتاب قبول نہیں ہو جاتی ہے اور اگر کوئی کتاب محض ذہنی مشق سے آگے نہ بڑھے جیسے افلاطون کی "ریاست" تو بھی

یہ یقینی ہے کہ عوام میں ایسی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی ہاں اگر مندرجہ بالا دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ جذباتی اور جمالیاتی حصوں کا بھی خیال رکھا جائے تو ایسی کتاب یقیناً بہترین ہو گی۔ اور اگر کسی کتاب میں جذبات اور جمالیات کا فقدان ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کتاب کی قدر و قیمت میں کمی آگئی۔

اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ادب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تاریخ، شاعری، افسانہ نویسی اور ناول نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ اب ہم اس کے بعد سابق صوبہ بلوچستان یا موجودہ کوئٹہ قلات ڈویژن میں اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ کہ اس پسماندہ علاقہ میں اردو ادب کی کیا خدمت ہوئی۔ اس سلسلے میں ہمیں بعض بنیادی باتیں ذہن میں رکھنا ہوں گی۔ مثلاً مقامی باشندے، مقامی زبانیں، اخبارات و رسائل، لائبریریاں، ادبی حلقے، سیاسی حالات اور ادبی شخصیتیں وغیرہ۔

باشندے اور مقامی زبانیں:۔ یہاں کے قدیم اور اصل باشندے بلوچ ہیں۔ یہ کہاں سے آئے اور ان کا قدیم وطن کونسا تھا۔؟ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ جہاں تک ان کی زبان بلوچی اور براہوی کا تعلق ہے یہ قدیم فارسی کی بہت بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور بہت سے الفاظ تو ایسے ہیں جو آج بھی فارسی میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ یہاں کی تیسری مقامی زبان پشتو ہے جو پٹھان بولتے ہیں۔ یہ پشتو صوبہ سرحد اور افغانستان کی پشتو سے قدرے مختلف ہے۔ یہ اختلاف محض یہاں کے مقامی اثرات کی پیداوار ہے۔

سابق صوبہ بلوچستان کے طویل و عریض رقبہ میں صرف ایک ہی مشترک زبان اردو ہے جو کاروباری زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ تحریر و تقریر میں بھی یہی ذریعۂ اظہار ہے۔ کوئٹہ کو جو اہمیت سیاسی اعتبار سے سابق صوبہ بلوچستان میں حاصل تھی اور ہے وہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ شہر ادبی لحاظ سے اہم ہے۔ سابق صوبہ بلوچستان میں کوئٹہ علم و ادب کا مرکز تھا اور ہے۔

مقامی باشندے اور اردو:۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ اردو یہاں کے مقامی و غیر مقامی باشندوں کی ایک مشترکہ زبان ہے مقامی باشندے اکثر و بیشتر بول چال اردو ہی میں کرتے ہیں لیکن جہاں تک املا کا تعلق ہے۔ وہ خالی از دلچسپی نہیں۔ خاص طور پر تذکیر و تانیث کا معاملہ۔ اس سلسلے میں ایک مشہور لطیفہ جو یقیناً دلچسپ ہے کہ ایک سکول ماسٹر نے لڑکوں کو گھر کے لئے کام دیا اور اردو کے بعض الفاظ بھی لکھائے کہ ان پر فقرے بنا کر لائیں، ان الفاظ میں ایک لفظ "چاند" بھی تھا۔ دوسرے دن کام دیکھا تو بعض طلباء نے چاند کو مذکر اور کچھ نے مؤنث استعمال کیا تھا۔ یہ دیکھ کر ماسٹر صاحب خود الجھن میں مبتلا ہو گئے کہ چاند مذکر ہے یا مؤنث، کافی دیر تک وہ "چاند نکلا یا چاند نکلی" کی گتھی سلجھاتے رہے اور آخر کہا کہ چاند نکلی صحیح ہے دلیل یہ دی کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا لہٰذا چاند نکلی ہی سہی۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مقامی لوگوں نے جس قدر تیزی سے اردو کو اپنایا ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے اور اب نوجوان طبقہ اردو صحافت کے میدان میں نظر آنے لگا ہے اور بعض تو اردو میں تحقیقی مضامین اور مقالے بھی لکھنے لگے ہیں، حال ہی میں تاریخ کی چند کتب بھی چھپی ہیں جو یہاں کے مقامی باشندوں کا اردو سے لگاؤ ظاہر کرتی ہیں۔

املا کے متعلق ایک اور بات جو قابلِ ذکر ہے وہ بعض حروف کا غلط ادا کرنا ہے مثلاً "ف" کی بجائے "پ" بولنا۔ اس سلسلے میں دو مثالیں یہاں دیتا ہوں۔ ایک تو اپنے ایک استاد کی اور دوسرے ایک دوست کی۔ میں جب تیسری چوتھی جماعت کا طالب علم

تھا۔ تو میرا ایک ہم جماعت "فدا حسین" تھا جس سے دینیات کے مولوی صاحب سخت پریشان تھے اور لڑکے بھی دینیات کے گھنٹے کو تفریح کا گھنٹہ سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اسے "پدا حسین" کہکر پکارتے آج بھی جب میرا وہ دوست مجھے ملتا ہے تو میں اسے "پدا حسین" کہتا ہوں اور اسطرح ہم دونوں قہقہہ لگاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرے ایک دوست ہیں جنہیں میں اکثر یہ کہکر چھیڑتا ہوں کہ چلو کسی کیبن (کیفے) میں چائے پلاؤ تو وہ کہتا ہے کہ "میرے پاس پالتو پیسے نہیں۔

اس کے باوجود میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو کا مستقبل یہاں کے مقامی باشندوں کے ہاتھوں روشن اور درخشاں ہے۔ کیونکہ بہت سے اخبارات وہ خود نکال رہے ہیں اور چند ایک تو اردو میں بہت اچھے شعر کہتے ہیں جن کا تفصیلاً ذکر آگے آئیگا۔ اب ہم گذشتہ نصف صدی سے لیکر۔ بلکہ ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں پر اجمالاً ایک نظر دوڑاتے ہیں کیوں کہ اس سے پیشتر یہاں کی ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں کے متعلق ہم بالکل لاعلم ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے پہلے یہاں ادبی ماحول تھا بھی نہیں۔

قندیلِ خیال:۔ یہ ادبی ماہنامہ آج سے تقریباً پینتیس برس پہلے لورالائی سے نکلا کرتا تھا یہ چند شعراء اور ادباء کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو مشاعرے ہوا کرتے اس کی تفصیل اور چیدہ چیدہ غزلیں و اشعار ہر شمارے میں چھپا کرتے اور کچھ نثر نگار بھی اپنے خیالات لوگوں تک پہنچاتے۔

بزمِ ادب:۔ بلوچستان میں طرحی و غیر طرحی مشاعروں کی ابتداء سردار محمد یوسف مرحوم نے کی۔ جو خود تو اردو میں نہیں لکھتے تھے۔ البتہ فارسی شاعر تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ افسوس ان کے کلام کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کیونکہ نہ تو کلام کسی سے سنا ہے اور نہ ہی قندیل خیال کی کوئی کاپی باوجود انتہائی کوشش کے دستیاب ہوسکی ہے۔ بزم ادب بھی سردار صاحب ہی نے قائم کی اور ان کی موت کے ساتھ نہ صرف قندیلِ خیال کی موت واقع ہوئی بلکہ بزمِ ادب پر بھی سکرات کا عالم طاری ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد اس بزم کو پھر سے زندہ کیا گیا اور اس کے سیکرٹری صادق شاذ ہوئے۔ اس بزم ادب کو صاحبِ علم اصحاب کی سرپرستی حاصل تھی۔

بقول پروفیسر آغا صادق "محشر رسول نگری، بلوچستان کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ وہ علامہ اقبالؒ کی تعلیمات سے بہت متاثر ہیں۔ اور کلام میں اسی رنگ کی کوشش کرتے ہیں" جناب آغا صاحب نے جو کچھ محشر رسول نگری کے متعلق کہا یہ بالکل درست ہے محشر صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے انفرادیت کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ وہ گل و بلبل کی تقلیدی شاعری سے متنفر ہیں۔ درس حیات دیتے ہیں ان کے ہاں تصوف بھی ہے اور معرکۂ حق و باطل بھی۔ مجھے بہت کم انہیں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ کیونکہ وہ بھی راقم الحروف کی طرح مشاعروں کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ گوشہ نشین بھی ہیں۔ بعض احباب سے معلوم ہوا ہے کہ دنیاوی کاروبار کے بعد ان کا تمام وقت عبادت میں گذرتا ہے اور یہ بات قابلِ یقین بھی ہے۔ المختصر ہم انہیں بلوچستانی اقبال کہہ سکتے ہیں۔

ارشد امروہوی یہاں کے کہنہ مشق شعراء میں سے ہیں۔ غزل ہی لکھتے ہیں رنگ قدیم ہے لیکن یہاں کے دوسرے قدیم رنگ میں کہنے والے شعراء سے بلند ہیں۔ موصوف بھی بزم ادب کے روحِ رواں اصحاب میں سے ایک تھے۔

وزیر زادہ عبد الاحد، سورج بھان وکیل، اور عیش نیموز پوری بھی قابل ذکر ہیں، جہاں تک اس بزم کے سیکرٹری صادق شاذ

بلوچستان میں اردو ادب، یہ مضمون پروفیسر صادق نقوی ایم اے کا بہاولپور کے ادبی ماہنامہ "سخنور" بہاولپور [illegible] میں شائع ہوا ہے۔

صاحب کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری تقلیدی گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ میں نے کئی بار کلام سنا ہے لیکن ہر بار مایوس ہوا ہوں۔ نہ افکار کی بلندی ہے اور نہ جذبات میں گہرائی۔

بزمِ اقبالؒ :- بزمِ ادب میں چند لوگوں کی اجارہ داری سے تنگ آ کر یا بقول پروفیسر آغا صادق "ایک خاص ادبی مقصد کے پیشِ نظر اور بزمِ ادب سے کچھ اختلافات کی بنا پر چند ارکان نے بزمِ اقبال کے نام سے ایک ادبی محفل دو تین سال سے قائم کر لی ہے جس کے بانیوں میں سے خواجہ عبدالحمید عرفانی ایم۔ اے (کراچی سے فارسی میں چھپنے والے ماہنامہ ——— کے موجودہ مدیر) اور راشد امروہوی ہیں"۔

اس بزم میں حصہ لینے والوں میں سے غلام محمد جمیل، بشیر احمد فاروقی اور حبیب (مزاحیہ شاعر) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بزمِ سخن :- جس طرح اختلافات کی بنا پر بزمِ اقبال قائم ہوئی اسی طرح عیش فیروزپوری نے بزمِ ادب سے الگ ہو کر بزمِ سخن قائم کی۔ عیش فیروزپوری کے اختلاف کی وجہ جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہو گی کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو شاعر تسلیم نہیں کرتے حتیٰ کہ میر تقی میرؔ۔ غالبؔ اور اقبالؒ کو بھی وہ بزعمِ خود علاّمہ بھی ہیں۔ اگر انہیں کسی دعوت نامہ پر "علاّمہ" نہ لکھا ہو تو فحش کلامی پر اُتر آتے ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد جب آپ دوبارہ کوئٹہ آئے تو کافی عزت کی گئی لیکن اب تو لوگ انہیں مشاعروں میں مدعو بھی نہیں کرتے ان کی شاعری نصف صدی پیشتر کے خیالات و افکار کی آئینہ دار ہے۔ موجودہ رجحانات تو درکنار موجودہ شعراء سے بھی نہ ہونے کے برابر واقفیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے تباہ کن زلزلے سے پیشتر جہاں اتنے ادبی حلقے تھے وہاں چند ایسے شاعر بھی تھے جو ان حلقوں اور پارٹی بازیوں سے آزاد تھے۔ ان میں سے یعقوب توفیق، بخشی راجپال، صحرائی اور پروفیسر آغا صادق قابلِ ذکر ہیں۔

مرکزِ ادب :- تقسیمِ ملک کے بعد کے حالات تو بالکل میرے سامنے کے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بہت سے شعراء اور ادباء یہاں آئے کچھ ملازمت کے سلسلے میں، کچھ کاروبار کیلئے۔ میں اس وقت کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کہ ایک مشاعرہ کالج کی طرف سے کالج ہال میں پروفیسر آغا صادق صاحب نے کرایا۔ میں اس وقت تک باقاعدہ شعر نہیں کہتا تھا بلکہ کبھی کبھار تفریح کے لئے کچھ لکھ لیا کرتا تھا لیکن اس مشاعرہ نے فطری میلان کو جھنجھوڑ دیا۔ اور ایک آدھ غزل میں نے آغا صادق صاحب کو دکھائی انہوں نے بہت حوصلہ افزائی کی جو میری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ اس سے میں نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کی۔

اُس وقت کوئی ادبی حلقہ نہیں تھا بلکہ تمام شاعر اور ادیب متحد تھے۔ لیکن عیش فیروزپوری صاحب نے ۱۹۴۸ء میں "عیش لٹریری سوسائٹی" قائم کر کے اتحاد پر کاری ضرب لگائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو گروپ بن گئے اور ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے میں کوئی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ دوسرا گروپ پروفیسر آغا صادق صاحب کا تھا۔ میں اس گروہ بندی کے خلاف تھا۔ اور مذموم حرکات کے بھی۔ میری اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے تعلقات آج تک سب سے دوستانہ ہیں۔ ہاں تو ہوا یہ کہ عیش لٹریری سوسائٹی کے بالمقابل "مرکزِ ادب" پروفیسر آغا صادق صاحب نے قائم کیا۔ ایک سال تک تو عیش صاحب کی پارٹی زوروں پر رہی لیکن اس کے بعد اس کے تمام ارکین کٹ کٹ کر مرکزِ ادب کے ممبر ہوتے گئے اور بہت جلد یہ ہوا کہ عیش صاحب کے ساتھی صرف چار، پانچ ہی رہ گئے اور مرکزِ ادب کے ممبروں کی تعداد تیس سے تجاوز کر گئی۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ذاتیات پر جو سلسلہ شروع ہوا تھا مدھم ہوا اور آخر چار چھ ماہ بعد بند ہو گیا۔

مرکزِ ادب نے ۱۹۵۴ء تک یعنی چھ سال تک بڑی کامیابی سے ادب کی خدمت کی۔ ہر ماہ کسی ایک ممبر کے گھر باری باری مشاعرہ ہوتا اور ویسے بھی مشاعرے ہوا کرتے۔ کامیابی کی بڑی وجہ پروفیسر آغا صادق صاحب اور ارشد امروہوی کی بلند اخلاقی اور خلوص تھا۔ اس حلقہ کے چیدہ چیدہ شعراء، پروفیسر آغا صادق، ارشد امروہوی، حدت میرٹھی، ضیا۔ صدیقی، اور حکیم نسیم (مزاحیہ شاعر) تھے۔ صدر ناظم علی دریاآبادی ایم۔ اے تھے جو "کدار" قسم کی نثر لکھ لیتے تھے۔

بزمِ ارتقائے ادب:۔ ۱۹۵۴ء میں مرکزِ ادب کے مقابل ایک پارٹی نے جنم لیا۔ اور بہت جلد کامیاب ہو گئی۔ گنتی کے چند افراد پر مشتمل یہ گروپ "بزمِ ارتقائے ادب" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ گذشتہ سال یعنی ۱۹۵۵ء کے آخر میں آغا صادق صاحب کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جو ذاتی طور پر انہوں نے کیا۔ چونکہ یہ مشاعرہ کسی بزم یا حلقہ کی طرف سے نہیں تھا۔ اس لئے اکثر شعراء شریک ہوئے اس پر مرکزِ ادب کے دو ممبر مشتعل ہو گئے۔ عین اس وقت جب شاعر آ رہے تھے آغا صاحب کو ایک تار راولپنڈی سے ملا کہ ان کا...... ؟ پاگر ہو گیا جو۔ ہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس پر بھی مشاعرہ ہوا لیکن آغا صاحب کی پریشانی سے شرپسندوں نے فائدہ اٹھایا اور بزمِ ارتقائے ادب کے سیکرٹری ناز اکبرآبادی سے الجھ پڑے، گالی گلوچ ہوئی اور طرحی کے بعد غیر طرحی دور نہ ہو سکا۔

دوسرے دن آغا صاحب تو راولپنڈی چلے گئے۔ اور ان کے جانے کے تین چار دن بعد مرکزِ ادب کے صدر نے اخبار میں اعلان کیا کہ آج سے مرکزِ ادب کو ختم کیا جاتا ہے اب شعراء نے بزمِ ارتقائے ادب کی طرف رجوع کیا۔ اس سے شرپسند جنہوں نے آغا صاحب کے ہاں ہنگامہ کیا تھا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس بزم کے بانی مبانی چار اشخاص ہیں۔ تراب گوالیاری، صفدر سیالکوٹی، ناز اکبرآبادی، اور غلام شاہ صاحب۔ یہ چاریار زنکر ڈاک و تار میں ملازم ہیں۔

تراب گوالیاری بہت اچھے شاعر ہیں۔ اور مجھے ذاتی طور پر جن تین چار شاعروں کو سن کر خوشی ہوتی ہے (لیعنی ع۔ سلام بخاری) پروفیسر آغا صادق، اور تراب گوالیاری، ان میں سے ایک ہیں۔ تراب صاحب نہ صرف شعر ہی کہتے ہیں۔ بلکہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ گو اس بزم کے بانی چار ہیں لیکن غلام شاہ صاحب نے زندگی میں ایک شعر بھی نہیں کہا اور نہ ہی کبھی نثر لکھی ہے لیکن ادب نواز بہت ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس بزم کے روحِ رواں ہیں۔ اس بزم نے امسال ۲۳ مارچ کو یومِ جمہوریہ کے سلسلہ میں ایک ایسا کارنامہ[1] کیا ہے۔ جس سے تمام شعراء اور ادبا اس کے ممبر ہو گئے ہیں۔ آج کل اس بزم کی طرف ایک کتابچہ (نثر و نظم) چھپنے والا ہے۔

---

[1] کارنامہ یہ ہے کہ جو سرکاری یا نیم سرکاری مشاعرے کبھی ہوتے ہیں بعض نیم شاعر قسم کے لوگ ان کے چوہدری ہوتے ہیں اور وہ ان کے دوستوں یا نیم شاعر قسم کے لوگوں کو مدعو کرتے ہیں اور باقی سب نظر انداز۔ یومِ جمہوریہ کے سلسلے میں بھی ایسے ہی ہوا۔ اس مرتبہ بزمِ ارتقائے ادب نے احتجاج کیا۔ تمام کوئٹہ کے اچھے اچھے شعراء نے ان کا ساتھ دیا نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے تین، چار شعراء کے تمام کٹ گئے اور چوہدریوں کی چوہدراہٹ پر کاری ضرب پڑی۔ مشاعرہ بری طرح ناکام ہوا۔ لیکن بزمِ ارتقائے ادب کا مشاعرہ اس کے برعکس بہت کامیاب رہا۔ اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ جائے تنگ است و مرداں بسیار۔

اس بزم کے دو رکن ایسے ہیں جن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون ادھورا ہوگا۔ وہ پروفیسر خلیل صدیقی اور پروفیسر رفیق سعید صاحب ہیں۔ خلیل صاحب بہت کم شعر کہتے ہیں۔ لیکن بہت نکھرا ہوا رنگ۔ آپ جدید رجحانات کے حامل ہیں۔ جہاں تک رفیق سعید صاحب کا تعلق ہے۔ ان سے قریب قریب تمام پاکستان کے ادبی حلقے واقف ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ بہترین نقاد ہیں۔

حلقۂ اربابِ ادب:- ۱۹۴۹ء میں جب میں کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ پروفیسر انور خان صاحب (بہترین نثر نگار ہیں لیکن گاہے گاہے لکھتے ہیں) نے مجھے ایک تنقیدی حلقہ قائم کرنے کی رائے دی۔ چند احباب پر مشتمل "حلقہ اربابِ ادب" قائم کیا گیا۔ ایک سال بعد جب میں نے کالج چھوڑا اور فکر معاش سے پریشان ہوا تو حلقہ از خود ختم ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء میں پھر اسے زندہ کیا گیا۔

اس کی پندرہ روزہ نشستیں ہوتیں۔ ممبر پندرہ سولہ احباب تھے۔ ہر نشست میں ایک غزل، ایک نظم اور ایک افسانہ یا مقالہ تنقید کے لئے پیش کیا جاتا۔ اس حلقے کے قابلِ ذکر شعراء اور ادباء یہ تھے۔ پروفیسر آغا صادق، پروفیسر انور رومان، صبا رمزی، گلزار حسین گلزار، شکور ایوبی، افضل کوٹلوی، قیوم راشد اور لطیف اعوان۔ راقم الحروف اس حلقہ کا سیکرٹری تھا۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام کوئٹہ کے شعراء اور ادباء پر مشتمل ایک انتخاب شائع کیا جائے۔ بعض نے شمولیت سے انکار کیا تفصیلی ذکر میں نے کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں نظم و نثر کا یہ مجموعہ "وادیٔ بولان" میں کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب پر حلقہ کا نام اسلئے نہیں دیا گیا۔ کہ کسی شاعر یا ادیب کو اعتراض نہ ہو۔ کچھ عرصہ بعد بعض وجوہات کی بناء پر یہ حلقہ ختم کر دیا گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین:- ۱۹۴۶ء کے اوائل میں سلام بخاری (جدید کتاب کے مالک) اور انجم قزلباش نے اس کی بنا ڈالی۔ اس کی بھی تنقیدی نشستیں ہوئیں۔ اس انجمن کا مقصد نام سے ظاہر ہے۔ میں نے بھی چند نشستوں میں شمولیت کی لیکن بعض بنیادی اختلافات کی بناء پر الگ ہو گیا۔

اس انجمن کے خاص خاص رکن یہ تھے۔ سلام بخاری، انجم قزلباش، کامل القادری، رفیق راز اور ماسٹر عطا محمد صاحب، کچھ عرصہ بعد انجمن اپنی موت آپ مر گئی۔ سلام بخاری یہاں کے مقامی پٹھان ہیں لیکن بہترین شعراء میں سے ایک ہیں، مطالعہ بہت وسیع ہے، آجکل صرف علم فروش (مراد کتب فروش) ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی انجمن یا مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے اس کے باوجود یہاں کے ادبی حلقوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

آزاد شعراء اور ادباء:- مندرجہ بالا شعراء اور ادباء کے علاوہ بعض ایسے بھی ہیں جو کسی حلقہ، انجمن یا پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں وہ یہ ہیں، پروفیسر انور رومان، س۔ حیدری، ماہر افغانی، محشر رسول نگری، اقبال سلمان،

مقامی ادیب یا شاعر:- یہاں کے مقامی ادیب اور شاعر بہت کم ہیں لیکن ان کے ذکر کے بغیر چونکہ اس مضمون کے تشنہ رہنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے مختصراً کچھ لکھنا ضروری ہے۔

سلام بخاری صاحب کا ذکر اوپر آ چکا ہے، عبدالحق وحید میرے ہم جماعت ہیں لیکن بدقسمتی سے گذشتہ چند سالوں سے بالکل شعر نہیں کہتے اگر وہ مستقل طور پر شعر گوئی کرتے رہتے تو یقیناً وہ یہاں کے صفِ اول کے شعراء میں سے ہوتے۔

سننے میں آیا ہے کہ عبدالحق پانیزئی ولد علامہ عبدالعلی زلزلے سے پیشتر جو لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے یہاں کے بہترین شعراء میں سے تھے۔ اور اختر شیرانی مرحوم کے شاگرد تھے۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے یہاں تعطیلات گزارنے آئے اور بستی میں خودکشی کر لی۔ میں نے مرحوم کے

خاندان والوں سے دریافت کیا لیکن ان کا ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوسکا۔

گل خان نصیر یہاں کے مشہور ادیب ہیں اور عوام میں" تاریخِ بلوچستان" کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔

سلطان کاکڑ صاحب کو پشتو ادب سے گہرا لگاؤ ہے، کئی ایک تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ اردو میں گرامر کی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن امید ہے کہ جلد ہی یہ اغلاط دور ہو جائیں گی۔

اس سلسلے میں عبدالرحمٰن کرد اور عطا محمد مرغزانی کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

سنڈیمن لائبریری :- کوئٹہ میں صرف ایک لائبریری ہے جو سر سنڈیمن کے دور کی اسی کے نام کی ہے۔ اس میں اردو کی کتب نہ ہونے کے برابر ہیں، میرے خیال میں اردو کتب کی زیادہ سے زیادہ تعداد دو ہزار ہوگی۔ ناول سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن قریب قریب سب مرحوم ناول نگاروں کے لکھے ہوئے حصہ نظم میں تیس پینتیس کتب ہیں وہ بیس پچیس برس پہلے کی، موجودہ شعراء کے کلام میں عدم کی کتاب، دو جوش ملیح آبادی کی، دو چار حفیظ جالندھری کی، ایک سیفؔ کی اور ایک فیض احمد فیض کی۔

بالکل یہی حال دوسری کتب کا ہے، اردو کے قریب قریب ۹۰ فیصدی بلندی پایہ ادبی رسائل آپ کو وہاں نظر نہیں آئیں گے۔ میں لاکھ سر پیٹیں، لیکن سب بے سود، اب آپ اندازہ لگالیں کہ بلوچستان کی سب سے بڑی لائبریری کا جب یہ حال ہے تو دوسرے شہروں کی لائبریریوں کا کیا ہوگا۔

آخر میں ان چند سربرآوردہ شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے (۱۹۳۰ء سے لیکر اب تک) جو گاہے گاہے یہاں آتی رہیں۔

حفیظؔ جالندھری، سر عبدالقادر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مرزا محمد ہادی رسواؔ، ساغرؔ نظامی، قیصرؔ رامپوری، شفیق الرحمٰن، عبدالمجید سالکؔ، صوفی تبسم، مجید لاہوری، عبدالمجید عدمؔ، احسان دانش، قرۃ العین حیدر، فیض احمد فیضؔ، سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر اور حسن طاہر،

میں اس مضمون کا خاتمہ جناب پروفیسر آغا صادق صاحب کے الفاظ میں کرتا ہوں۔

" بلوچستان میں اردو ادب کی دلچسپی اور ہر دلعزیزی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ صوبہ بھی اپنی بساط کے مطابق اردو کی خدمت کے سلسلے میں قابلِ قدر حصہ لیتا رہیگا۔"

بقیہ صفحہ ۳۱ نکتہ چین ہے غمِ دل ......

فرصت ملی تو جواب دے دوں گا ——— دیکھو تمہیں خط لکھنے کی وجہ سے [illegible] چلی گئی۔ اب اتنے دن بعد تو آئی تھی۔ خیر دیکھو یں [illegible] مس انڈر لیٹ کو لینے کے لئے کیڈی لاک پر جا رہا ہوں۔ پھر لکھوں گا۔

تمہارا اپنا

پرنس ڈنلپ -!

(صدر النساء رٹونجی)

چنبیلی سے سرگوشیاں

(۱)

گلہائے یاسمین سے صبح نو دمیدہ کو شرمانے والی زمرد پیرہن حسینہ ہر صبح مرمریں انگلیوں کا لمس تجھے گدگداتا ہے اور ہر شام کالوں اور گیسوؤں کی گھٹائیں تجھ پر خیمہ زن رہتی ہیں۔

کتنی نوخیز کلیاں، کتنے رنگین شباب کس قدر دلفروز جمال تیری جلوہ گاہ میں دریوزۂ زینت کے لئے آتے ہیں، کوئی پھولوں کو آویزۂ گوش میں پروتا ہے۔ کوئی زینتِ دامن کرتا ہے۔ کوئی جعدِ مشکیں میں منسلک کر کے کہکشاں منظر بن جاتا ہے۔ پھولوں کے خرمن پر اتنی کثیر التعداد بجلیوں کی یورش دیکھ کر میرا دل لرز جاتا ہے۔ میری آنکھیں نازِ قاتل بھی دیکھتی ہیں۔ اور اندازِ بسمل بھی۔ تیری حمایت کا شدید جذبہ فطری طور پر میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر میں خود بھی اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ یہ بجلیاں تو یوں بھی جلوہ سامانی میں کم نہیں مگر تیرے پھولوں کو سر چڑھا کر تو یہ مہرِ نیمروز کی طرح نظارہ سوز ہو جاتی ہے۔

(۲)

عوام تیری محفل کو خاموش اور بے رنگ بتاتے ہیں۔ مگر میری زندگی تو یہاں زرنگار ہو جاتی ہے۔ عشرت کے اس ہنگامہ میں میں اپنا رنجِ تنہائی بھول جاتا ہوں۔ دربان کو مزاحم نہ پاکر پہروں رنگِ محفل کا نظارہ کرتا رہتا ہوں۔ صبحِ بہار کی طرح مرصع مجسمے دیکھتا ہوں۔ خدائی کرنے والے حسن کا پندار دیکھتا ہوں۔ تبسم زیرِ لب اور خندۂ دنداں نما دیکھتا ہوں۔ نازو انداز کی چلتی ہوئی تواریں دیکھتا ہوں۔ گلفشاں گفتار سنتا ہوں۔ نشیلی آنکھوں کے پیمانوں سے شراب پیتا ہوں۔ رعبِ حسن کہتا ہے کہ آنکھیں نیچی رہیں مگر شوخیاں تقاضا کرتی ہیں۔ کہ دیکھنا ہوگا۔

(۳)

اے حلقۂ پریشاں میں گھری رہنے والی پھولوں کی شہزادی۔ تیری شاخ پر جہاں کوئی کلی تبسم فشاں ہوئی وہیں شوقِ تزئین کے ستم زدوں کا ہاتھ بڑھ گیا۔ باغِ حسن کی اس گل چینی پر بھونرے روئے۔ بلبلیں چلائیں۔ تتلیاں بے چین ہوئیں شبنم کا پلایا ہوا دودھ خاک میں ملا۔ باغباں کا دل آزردہ ہوا اور خود تیری کیاری دیدۂ حیراں بن گئی۔ مگر تیرا ساز یہی نغمہ نکالتا رہا۔

لگا رہی ہوں گلِ یاسمیں کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

(۴)

اے خوشۂ پروین کی آئینہ دار۔ تو ان مہوشانِ فتنہ زا سے استفسار کیوں نہیں کرتی کہ تم بھی تو اپنی جگہ اک گلشنِ خراماں ہو۔ گلشن کے بیشتر لوازم تمہارے پاس بھی تو موجود ہیں۔ سروِ قامت بھی ہے۔ سنبلِ زلف بھی ہے۔ سوسنِ زبان بھی ہے نرگسِ چمن بھی ہے۔ اور گلِ عارض بھی۔ خود تمہارا رخِ رنگیں تمہاری شاخِ قامت پر ایک نازک سا گل تر ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تعاقب کر نیوالی بے شمار آنکھوں اور دلوں کو

چھوڑ کر تم میرے پاس کیوں آتے ہو۔

حرفِ استفسار زبان پر نہ لانے کا راز تو مجھ سے چھپا رہی ہے مگر ترا غنچۂ زبان بن کر کہہ رہا ہے کہ ہم استفسار کیوں کریں۔ ہماری طرف تو ان آئینہ رو دل کا التفات ہی ہمارے کمالِ زندگی پر سب سے بڑی حجت ہے۔

(۵)

اے ستاروں کی آنکھوں کو سیکھنے والی شوخ نازنین۔ جب میں چاندنی راتوں میں تجھے جلوہ آرا دیکھتا ہوں تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ تو چاندنی میں چار چاند لگا رہی ہے یا چاندنی تجھ میں۔ تیرے قریب بستر پر پڑا ہوا اختر شماری کرتا رہتا ہوں۔ فطرت کا صحیفۂ جمال میرے سامنے کھلا ہوتا ہے، مہتاب کا جمالِ جہاں آرا دیکھتا ہوں۔ بل کھاتی ہوئی کہکشاں کا اندازِ خرام دیکھتا ہوں۔ زہرہ کے غمزہ سے مسحور ہوتا ہوں۔ پروین کے خرمن سے خوشہ چینی کرتا ہوں اور بنات النعش گردوں سے نگہ باز ہوں۔ مریخ میری کامرانی کو حسرت سے دیکھتا اور رقابت کے شرارے برساتا ہے۔ میرا بستر اگرچہ دامن باغباں اور کفِ گلفروش بنا ہوتا ہے مگر نیند میری نہیں ہوتی۔ دماغ میرا نہیں ہوتا۔ راتیں میری نہیں ہوتیں۔ طفلِ دل تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے۔ میں اسے لوری سناتا ہوں۔ گود میں اٹھاتا ہوں۔ سینہ سے لگاتا ہوں۔ پیار کرتا ہوں۔ متہم ہو جانے کے خوف سے صدائے نالہ کو روکتا ہوں۔ ہزار منتیں کرتا ہوں کہ اے میرے پردہ دار سو جا مگر منت و سماجت کچھ پیش نہیں جاتی۔ اے کہکشاں کی سہیلی کیا غضب ہے کہ میرا دل تیرے پہلو میں بھی لب تشنۂ محبت ہے۔

(۶)

۲۲ مارچ ۱۹۵۶ء کی وہ یادگار رات تجھے یاد ہے جب اس مقدس سرزمین پر مغربی امامت دم توڑ رہی تھی اور نظامِ اسلامی کا ورود ہو رہا تھا۔ قوم خوشیاں منا رہی تھی کہ اب انسانیت کی جذب و کشش رکھنے والی دو متضاد اصناف متوازی رہیں گی۔ ہوس کا چمن سیراب نہیں ہوگا۔ شباب اک سر بمہر جامِ شراب ہوگا اور خارجی ماحول کی تطہیر ہوگی۔ اس نشاط انگیز رات میں جب ہر طرف ضیاء و نور کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ تیرا ہر پھول میرے سیہ خانہ کے لئے اک ظلمت شکن قندیل تھا۔ میرا گھر تجھ سے چراغاں ہی چراغاں تھا۔ گھروں میں چراغاں کرنے والے اربابِ نمائش کا ایک طرف تو تو مذاق اڑا رہی تھی اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح کر رہی تھی کہ دل کے ذرہ میں جب چمک پیدا ہو جاتی ہے تو چراغ کیا خورشید بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہرتا۔

(۷)

اے گنبدِ خضرا کی آئینہ دار۔ میرا مذاقِ محبت دنیا کے ساتھ ہرگز ہم آہنگ نہیں۔ میں تیرے پھولوں کا نہیں۔ یثرب کے گل بے خار کا شیدائی ہوں۔ وہ پھول جس کی مرغانِ چمن نے کانٹوں سے تواضع کی۔ وہ پھول جو گندے معاشرہ پر مسلسل مشک و عنبر چھڑکتا رہا۔ میرا دل اسی پھول کی نزاکتوں، نزہتوں اور نکہتوں پر نثار ہے۔ کاش نسیمِ سحری کا کوئی جھونکا اس پھول کی نکہت کو میرے مشام تک پہنچا دے۔

(۸)

اے چادرِ شب میں لپیٹ کر اپنے چہرۂ زیبا کو نکھارنے والی نازنین میں تیری تجلی و نقاب کے کرشمے دیکھ چکا۔ تیری گرمیٔ محفل قبول کر چکا۔ تیرے میکدۂ رنگ و بو سے پی چکا۔ اب مجھے اپنا مشرب بدلنے دے۔ مراکش و الجزائر کی بہاریں تجھ سے زیادہ حسین ہیں۔ فلسطین کے مرغزاروں کی فضائیں تجھ سے زیادہ نظر فریب ہیں۔ کشمیر کے افق کی گھٹائیں تجھ سے زیادہ تو پُر شکن ہیں۔ یہاں شہر نو شادزش بپا ہے میگسار صبح و شام کر کے مجھے بلا رہے ہیں میں ایک بار قصرِ مے و جام کو نگا یقین کی آتشِ خاموش کو بیدار کر دوں گا۔ نوجوانوں کا خون گرما دوں گا۔ اپنے کردار میں شعلہ و شبنم کا امتزاج پیدا کر دوں گا، سراپا تڑپ بھی ہوں گا اور قدوسیت کا پیکر بھی ◆

(حبیب کیفوی)

غزل

جہاں تو ہے ہمہ تن گوش داستاں کے لئے
مگر کسی کا کلیجہ بھی ہو بیاں کے لئے

یہ مشتِ خاک کہاں تک بلند جائے گی
کہ رفعتیں تو مقدر ہیں آسماں کے لئے

جھکا نہیں ہوں ابھی تک کسی کی چوکھٹ پر
بچا کے رکھے ہیں سجدے اک آستاں کے لئے

حقیر تنکوں کے بدلے کہ روز جلتے ہیں
کہیں سے برق چرا لوں نہ آشیاں کے لئے

ہزار رنگ کے جلوے ہیں یوں تو پیشِ نظر
ترس گیا ہوں مگر حسنِ جاوداں کے لئے

زمانہ آج بھی محتاجِ رہنمائی ہے
کہ منتظر ہے کسی مردِ راہ داں کے لئے

غمِ حیات، غمِ روزگار، فکرِ نجات
عذاب کتنے ہیں اک جانِ ناتواں کے لئے

مذاقِ شوق کو ڈھالا ہے خاص سانچے میں
حبیب ہم نے مزاجِ ستمگراں کے لئے

انور صدیقی

غزل

میں نے تجھے اکثر سوچا ہے، میں نے تجھے اکثر دیکھا ہے

جب بھی مجھے تو یاد آیا ہے، درد سا پہلو میں اٹھا ہے

یوں تو حسین دنیا میں بہت ہیں لیکن کون بھلا تجھ سا ہے

رات تری زلفوں میں خراماں تیرے دامن میں تارا ہے

حسن کی پلکوں پر شبنم ہے عشق کے سینے میں شعلہ ہے

آج ستارے ڈوب رہے ہیں آج کوئی دل ٹوٹ رہا ہے

آج مری نَے کانپ رہی ہے آج کسی نے یاد کیا ہے

آج بہت راہیں سُونی ہیں آج بہت منظر پھیکا ہے

حسن کی بزم ناز سے آ کر، عشق بہت تنہا تنہا ہے

تُو نے کبھی لمحاتِ طرب میں درد کا پرتو بھی دیکھا ہے

غم نے ترے پھر کروٹ لی ہے درد بشر پھر جاگ اُٹھا ہے

فصلِ خزاں میں صورتِ ہزاراں دیوانہ کچھ سوچ رہا ہے

عشق کی آہِ نیم شبی سے
رات کا دامن جل اُٹھا ہے

یہاں شہد نوشا نوش ہوا ہے میلہ سا رہیج [illegible]

(رشید کوثر فاروقی)

غزل

ایسی کیا آفت آئی ہے آندھی تو تھم جانے دو — کرلیں گے اپنا بھی ٹھکانا، باغ کی خیر منانے دو
بات بڑھے گی، کام رکیں گے یوں ہی کام چلانے دو — کس کو کس کو صفائی دوں گا، دیوانہ کہلانے دو
راہ دکھا کر دم لیں گے ہم تیہا سب کو دکھانے دو — دریا رُخ تو بدل کے رہیگا موجوں کو بل کھانے دو
پھولوں کی کرتال بجے گی، بھونرے بھر دیں گا ئیں گے — کانٹے الٹا پہرا دیں گے صبحِ بہار آجانے دو
ہم ایسے نادان نہیں جو دیکھنے بھر کا پیار کریں — کھائے گی اپنے منہ کی چکوری چاند ذرا چھپ جانے دو
جیسے سوکھے ساون بیتے ویسے بھرے بھادوں ہونگے — نیند کے ماتے کیا جاگیں گے آج گیا، کل آنے دو
رندو! توبہ کیا کرلوں گا جام بہ لب مرحبا دل تو؟ — یا لوحِ تقدیر دکھا دو یا نہ پیوں گا، جانے دو
جس کو غرورِ بے جا ہوگا بھگتے گا بھرپائے گا — شام کی دھوپ کو تم آنگن سی کوٹھے پر چڑھ جانے دو
رمتا جوگی بہتا پانی صبح یہاں ہے شام وہاں — رہنا کس کو ہے دھرتی پر، دم بھر دھوم مچانے دو
ان کی بھیجی موت آئی ہے کیوں روتے ہو اہلِ جہاں! — پردیسی کا ساتھ کہاں تک مجھ کو مرے گھر جانے دو!

کوثرؔ مجھ کو ریس نہ آتی لیکن امّی کا کہنا
طرحِ میرؔ میں میری خاطر ایک غزل ہو جانے دو

❋

دو غزلیں

محسن انصاری

جدید طرزِ تمدن کے عام ہیں برکات
تمام لہو و لعب میں گذرتے ہیں اوقات

خیال و فکر کی آوارگی کا ذوق ملا،
سرود و شعر کی گھر گھر پہنچ گئی سوغات

گراں ہے ذہن پہ اک لمحہ کا تفکر بھی
کچھ ایسے کارِ جہاں میں ہیں منہمک دن رات

نئے ذرائع سے بڑھ جاتی ہے تن آسانی
مذاقِ جہد و طلب چھین لیتے ہیں آلات

نہ فکر ہی میں ہے تابش نہ ذکر میں گرمی
تمام حلقہ ہے محرومِ سوز و سازِ حیات

نئے زمانوں سے ہر دم گزر رہا ہے عشق،
مراحل اس کے سفر میں ہیں طائف و عرفات

محمد بشیر فوقؔ

دل میں خیالِ پاکیٔ داماں نہیں رہا
صد شکر ہے غرور کا ساماں نہیں رہا

ہے التجا بتوں سے کہ تم ہی سنبھال لو،
وہ جس پہ ناز تھا مجھے، ایماں نہیں رہا

حیران چاک ہیں کہ گریباں نہیں نصیب
دستِ جنوں کے واسطے داماں نہیں رہا

ہے عشق کو جراحتِ دل کی طلب یہاں،
اور حسن کا جواب ہے ساماں نہیں رہا

وہ جلوہ گاہِ زلفِ پریشاں نہیں رہی
روشن جو مصحفِ رخِ خوباں نہیں رہا

پیہم ہجومِ یاس سے حسرت کدہ ہے دل
جب سے کہ ذوقِ لب سرِ ساماں نہیں رہا

پہلو میں دل ہے، دل میں مگر حسرتیں نہیں
ہے موجِ موجِ خاک جو طوفاں نہیں رہا

ہم بزم سے ہیں دور ہوئی ہم سے بزم دور
دلکش شعارِ مجمعِ یاراں نہیں رہا

رخصت ہوا ہے جب سے وہ جانِ بہار فوقؔ
گلشن میں تب سے کیفِ بہاراں نہیں رہا

ایک خط

محترم نعیم صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط اگست میں مل گیا تھا۔ ادبی اور غیر ادبی مصروفیات کے علاوہ فطری تساہل کی بنا پر آج تک جواب نہ دے سکا۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔ آپ نے مکمل تعارف کیلئے ارشاد فرمایا ہے۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو کسی اور موقعے کے لئے اٹھا رکھیے۔ چند ماہ کے بعد انشاء اللہ رخصت پر آکر نیاز حاصل کروں گا تو مکمل تعارف خود بخود ہو جائے گا۔ ڈرتا ہوں اپنے متعلق اپنے قلم سے خود ستائی کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ "چراغِ راہ" میں لکھنے کیلئے جو پُرخلوص دعوت آپ نے مجھے دی ہے اُس کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک افسانہ بعنوان "نیلوفر کا غم" حال ہی لکھا تھا، ارسالِ خدمت ہے۔

آپ نے گردوپیش کے بارے میں لکھنے کیلئے ارشاد فرمایا ہے۔ گردوپیش کے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں، انشاء اللہ بہت کچھ لکھوں گا مگر فی الحال بھی ضروریات کے تحت یہاں کچھ عرصہ اور ٹھہرنا ہے۔ وضع احتیاط سدِّ راہ ہے! ستمبر کے شمارے میں مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان پڑھا۔ عرب ممالک کو جو تنبیہہ موصوف نے فرمائی ہے وہ نہائت جامع اور بروقت ہے۔ مولانا نے مسلمان ممالک کے درمیان مضبوط رشتۂ اتحاد کی فوری ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ پاکستان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا اُس کے سفیروں کا کام ہے۔ مگر کیا کیا جائے "ہمارے سفیر ــــــــ" سفیرانِ حرم ہی بنے رہتے ہیں۔ "کچھ کرنے" کی طرف ان کی طبع نازک ہی مائل نہیں ہوتی۔

بھارت کے پراپیگنڈے کی رفتار کم ازکم مشرقِ وسطیٰ میں نہائت تیز ہے۔ بھارت کے متعلق عربی لٹریچر سارے عرب ممالک میں پھیلا ہوا ہے ایک عام جاہل عرب بھی کرشنامینن اور پنڈت نہرو کے نام سے واقف ہے۔ بھارتی ریڈیو سے ہر روز کئی کئی گھنٹے عربی پروگرام نشر ہوا کرتے ہیں۔ بھارت کی لالٹین کی بتیاں تک تقریباً سارے عرب ممالک میں بکتی ہیں۔ بھارت کی ہوزری، بھارت کا کپڑا، بھارت کے جوتے، بھارت کے المونیم کے برتن، الغرض روزمرہ کی ضروریات کی ایسی بیسیوں چھوٹی چھوٹی چیزیں تقریباً ہر عرب ملک میں درآمد کی جاتی ہیں۔ اور کم ازکم یہ سب چیزیں پاکستان میں تیار ہوتی ہیں مگر جہاں تک مجھے علم ہے ہمارے مینوفیکچررز کو مارکیٹ میں مانگ نہ ہونے کی وجہ سے پروڈکشن کم کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے صنعتی ادارے ٹھپ ہی ہو جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی ملوں میں مزدوروں اور کاریگروں پر عذاب آتا ہے۔

کیا ہمارے سفیر کوشش کر کے مشرقِ وسطیٰ کی یہ مارکیٹیں حاصل نہیں کر سکتے؟

آج سارا مشرقِ وسطیٰ مغرب کے اقتدار سے بیزار ہے۔ بھارت "ایشیائی اخوت" کے فراڈ کے ذریعے:-

(۱) مسلم بلاک کی تخریب میں کامیاب ہو رہا ہے بلکہ کسی حد تک ہو گیا ہے۔

(۲) اپنے اولین مقصد یعنی تجارت کے لئے ان OIL RICH مگر چاول اور گندم سے لیکر نمک تک کے لئے بیرونی ممالک کے دستِ نگر عرب ممالک میں اپنے قدم جماتا جا رہا ہے

مگر کوئی کیا کرے۔ اپنے ہاں تو عجیب دھاندلی مچی ہوئی ہے۔

محمد علی آف بوگرا آئے تو ہمیں نیویارک کے SKY SCRAPERS دکھا کر خود شمالی امریکہ کے RED INDIANS کے ہاں اسر پانی ہی جیسے پہ لگاکر دعوتیں کھانے چل دیئے۔

چوہدری محمد علی صاحب آئے تو پاکستان بغداد پیکٹ میں شامل تھا۔

اب سہروردی صاحب آئے تو فرماتے ہیں کہ ہمیں بھارت سے اپنا مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔

حالانکہ بھارت کی خارجی پالیسی، اندرونی نظم و نسق، مستحکم حکومت تکمیل شدہ اور زیر تکمیل ترقیاتی منصوبے وغیرہ وغیرہ ہمارے سامنے زندہ مثالیں ہیں جن سے ہمارے عوام اور خواص دونوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ بیرونی امداد بھارت کسی قسم کی Commitments یا پابندیوں کے بغیر بھی پاکستان سے زیادہ حاصل کر رہا ہے اس بات کا شکوہ چوہدری محمد علی صاحب بھی امریکی ہفتہ وار NEWS WEEK کے نمائندے سے کر چکے ہیں۔ البتہ بقول سہروردی صاحب (محمد علی آف بوگرا کی وزارت کے رکن کی حیثیت سے) "بدنام ہم ہی زیادہ ہیں"!

بہرحال سہروردی صاحب کی حکومت نے مسئلہ سویز کے سلسلے میں پاکستان کی خارجی پالیسی میں جو واضح تبدیلی پیدا کی ہے اس کا رد عمل عرب ممالک پر امید افزا ہوا ہے۔ سہروردی صاحب کا چین کا دورہ عرب ممالک کی نظروں میں پاکستان کی خود مختار خارجی پالیسی کی ایک بہترین مثال ثابت ہوگا۔

حکومت کے Pro Muslim اور Pan Islamic نظریات کے ساتھ ساتھ اگر عرب ممالک میں ہمارے سفیر بھی ایمانداری خلوص اور تن دہی سے کام کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے باہمی اختلافات خود بخود ختم ہو جائیں گے اور پھر واقعی ایک دن اسلامی بلاک روسی اور امریکی بلاک کے درمیان "متوازن قوت" کا اہم رول ادا کر سکے گا۔ اگر اسلامی بلاک کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا تو سب سے پہلے اس کا ذمہ دار پاکستان اور اس کے بعد مصر ہوگا۔ میری نظر میں مصر کا موجودہ رویہ پاکستان کی Pro Western پالیسی کا صرف رد عمل ہے۔

امن کے یاتری شری نہرو (موصوف اپنے آپ کو خود سعودی عرب کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی "امن کا یاتری" کہہ چکے ہیں) البتہ مصر کے اس رد عمل سے پورا پورا فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور اسلامی اتحاد کو تباہ کر کے امریکی اور روسی بلاک کے مقابلے میں ایک تیسرا بلاک بنانے کی کوشش میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔

اب کچھ چراغ راہ کے ستمبر کے شمارے کے بارے میں عرض کروں گا:

اختر رضائی کی رباعیات میں سے نمبر ۱ میں "معصوم و جواں سال کہاں زادے" پڑھتے ہی فوراً صفحے کے اوپر چراغ راہ کے الفاظ پر نظر پہنچ جاتی ہے۔!!

محسن ہاشمی صاحب کا خط چراغ راہ میں چھپنے سے پیشتر یہاں کی ایک مختصر و محدود سی مجلس شعر و ادب میں (جو مہینے میں ایک آدھ بار منعقد ہو جاتی ہے) سنا تھا۔ مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینی چاہتا ہوں کہ مجھے اس خط کے ذریعے محسن ہاشمی صاحب کی وکالت مقصود نہیں اور یہ سطور میں ان سے مشورہ کئے اور کہے بغیر ایک عام قاری کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔

محسن ہاشمی صاحب کو میں جانتا ضرور ہوں مگر صرف ایک شناسائی کی حد تک۔ میں ان کو گزشتہ چار برس سے دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی کسی ادبی مجلس میں ان سے براہ راست گفتگو کا موقع بھی آجاتا ہے۔ اکثر ان کی نگارشات سننے اور پڑھنے کا موقع مجھے ملتا رہا ہے۔ میری نظر میں وہ ایک ادیب اور شاعر کے ساتھ ساتھ سلجھے دماغ کے مہذب اور نارمل قسم کے مسلمان ہیں۔ "نارمل مسلمان" سے میرا مطلب ایک تنگ نظر مولوی اور ایک آزاد

ہے کہ بَین بین ایک وسیع النظر، سنجیدہ صفت، منکسر المزاج اور علم دوست قسم کے مسلمان سے ہے!
اور میری نظر میں محسن صاحب ان تمام صفات کے حامل ہیں۔
یہ سب میں نے اس لئے بیان کرنا ضروری سمجھا کہ ممکن ہے آپ نے خط کو کسی مخصوص زاویۂ نظر سے پڑھا ہو!!
اور اگر میں غلط سمجھا ہوں تو معاف فرمائیے۔
ابنِ فرید صاحب کا مضمون پڑھ کر یاس یگانہ چنگیزی یاد آگئے۔ اور ع
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے
والی کیفیت طاری ہوگئی ——— ابن فرید صاحب نے اپنے مضمون کا خاتمہ اس شوقیانہ جملے پر کیا!
"یہ سراسر منٹو ہی کا قصور تھا کہ وہ موپاساں کے برابر پہنچنے کے بجائے اُس کی بدرُوح بن گیا"
خط پہلے ہی کافی طویل ہوگیا ہے اس لئے بات اختصار سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں ——— ۱۸۹۱ء میں موپاساں نے بلیڈ سے اپنا گلا کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس سال کے آخر میں اُس کی دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کے وفادار دیرینہ ملازم فرانسائس نے اس مرتبہ بھی اسے بچالیا مگر وہ اپنے آقا کے دماغ کو درست نہ کرسکا۔ آخر موپاساں کو پاگل خانے میں داخل کرادیا گیا جہاں وہ اپنی موت تک رہا۔
پروفیسر آرتی نائین موپاساں پر اپنے ایک تنقیدی مقالے میں لکھتے ہیں:-
"موپاساں نے بیس سے تیس سال کی عمر تک ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہوکر جی بھر کے عیاشی کی اور وہ آتشک جیسے دائمی مرض میں مبتلا ہوگیا۔"
آگے چل کر پروفیسر موصوف کہتے ہیں: "دس برس کے مختصر عرصے میں تین سو سے زیادہ کہانیاں لکھنے والا ادیب یقیناً کچھ معیار سے گری ہوئی کہانیاں بھی لکھے گا"
ظاہر ہے کہ موپاساں کی شخصیت منٹو سے کئی گنا گھناؤنی اور کریہہ تھی۔ لہٰذا منٹو فنی طور پر موپاساں کے برابر پہنچا یا نہیں یہ الگ بات ہے مگر کم از کم شخصی طور پر وہ موپاساں کی بدروح نہ تھا۔
اور اگر پروفیسر آرتی نائین کا یہ کہنا کہ "دس برس کے عرصے میں تین سو سے زیادہ کہانیاں لکھنے والا کچھ معیار سے گری ہوئی کہانیاں بھی لکھے گا" آپ کو صحیح معلوم ہوتا ہے تو کیا یہی بات کم و بیش منٹو پر صادق نہیں آتی؟ یہاں پر پھر میں محمد حسن عسکری کا وہ قول دہراؤں گا جس میں ابنِ فرید صاحب نے ناجائز تبدیلی کی تھی:-
"منٹو موپاساں کے برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا۔"
آپ کہتے ہیں کہ ابنِ فرید صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "منٹو کا مستقل کردار ——— انسان دوستی کا آئینہ دار نہیں ——— لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا ادب انسان دوستی کی رُوح سے مزیّن ہو"؟ میرے خیال میں تو ابنِ فرید صاحب کے اس معیار پر بڑائی پیغمبروں کے بعد شاید ہی کوئی ذی روح پورا اُتر سکے۔
اب یہاں میں انسانی کردار کی گوناگوں کیفیتوں اور اس کے افعال اور ان کے مقابلے میں اس کے احساسات و خیالات کے تضاد کی مثالیں پیش کرنے لگوں تو یہ خط فسانۂ آزاد کی ایک جلد بن جائے گا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک ادیب یا شاعر ذہنی طور پر ایک آدمی سے کافی حد تک مختلف ہوتا ہے اور اس کی زندگی غیر معمولی طور پر "امتزاجِ شعلہ و شبنم" کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے ایک ادیب یا شاعر کا ایک عام آدمی سے

موازنہ کر کے اس کے فنکار اور اس کی تخلیقات کے بارے میں ایک رائے قائم کر لینا تنگ نظری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آپ نے منٹو کو نفسیاتی مریض کہا ہے۔ میرے خیال میں نفسیاتی مریضوں کے زمرے میں دنیا بھر کے شعراء اور ادباء کی ایک بہت بڑی تعداد آجاتی ہے۔ موپاساں منٹو سے بھی اونچے درجے کا نفسیاتی مریض تھا مگر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ موپاساں کا فن صرف اعجوبگیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبول ہوا؟ اس میں اخلاقی (اس کے ماحول کے مطابق) مقصدیت ناپید تھی؟ —— اس کی تحریریں اصل فنی عظمتوں سے عاری ہیں؟ کیا آپ موپاساں کی شخصیت کے آئینے میں یونہی ابن فرید صاحب کی طرح اس کے فن کو دیکھیں گے؟

آپ نے منٹو کو ایک شعبدے باز اور تماشا گر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعبدے باز اور تماشا گر راہگیروں کو محیر العقول کرتب دکھا کر ان کی جیبیں خالی کرا لیتا ہے .... مگر منٹو نے کبھی کوئی انہونی بات نہیں لکھی اور یہی اس کی معقولیت کا راز تھا۔ منٹو نے ہمیں ہماری زندگی کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی گنداوں کا احساس دلایا۔ ہم ان گنداوں کے بارے میں انجان بنے ہوئے ہیں۔ جیسے کچھ نہیں دیکھتے۔ جیسے سب ٹھیک ہے۔ منٹو نے ہماری خود فریبی کا مذاق اڑایا۔ ہم لوگ دل کی باتیں پکڑی جانے پر محجوب ہو گئے ...... اور بعض لوگ جھنجلا کر منٹو پر لعن طعن کرنے لگے......

ابن فرید صاحب نے کہا ہے کہ "منٹو نے قلم کی کمائی سے شراب کے پیالے بھرے ہیں۔ شراب شراب کرتے دم توڑ دیا۔ اس کے ہاں اخلاقی مقصدیت نہیں ہو سکتی"۔ اب میں ابن فرید صاحب سے کیا کہوں۔ شرابیوں نے اسلام کی تاریخ نظم کی ہے۔ شرابیوں نے پیغمبران خدا کی شان میں قصائد اور مثنویاں کہی ہیں۔ شرابیوں نے پند و نصائح کے دفتر کے دفتر رقم کئے ہیں۔ شرابیوں نے اخلاقی تعلیمات پر کتابوں پہ کتابیں لکھی ہیں۔ کیا ابن فرید صاحب ان حقائق سے منکر ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات کیا معنی رکھتی ہے کہ جس شخص نے شراب شراب کا نام لیتے دم توڑ دیا ہو اس کے ہاں اخلاقی مقصدیت نہیں ہو سکتی؟

منٹو نے شراب کے نشے میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ اس نے اپنی شراب کی عادت پر کبھی فخر نہیں کیا۔ (حالانکہ اکثر شعراء و ادباء نے اس بد عادت پر پردہ ڈالنے کیلئے خاصی خود فریبی اور فریب دہی سے کام لیا ہے) کسی شراب کے عادی کے Repentance بالفعل کی بہترین مثال منٹو کی ان تحریروں میں ملتی ہے جہاں اس نے اپنی شراب نوشی کا ذکر طنزاً کر کے اپنی فطری انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

فرض کیجئے آپ کا کہنا درست ہے کہ منٹو کا مرکزی اور ذہن پر مسلّط موضوع "جنسیت" تھا۔ مگر اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرے کی اکثر و بیشتر برائیوں کی جڑ "جنسیت" ہی ہے جنسیت انسانی زندگی کا Governing Factor ہے۔ لہٰذا اگر جنسیت منٹو کا پسندیدہ موضوع تھا تو یہ کوئی شرمناک بات تو نہیں ہے۔ آپ نے ایک دو جگہ کہا ہے کہ "سوال منٹو کے مجموعی ادبی کام کا ہے نہ کہ منفرد کہانیوں کا"—— اور منٹو نے Tight Rope پر کھڑے ہو کر صرف چار یا پانچ کہانیاں ایسی لکھی ہیں جن پر لگانے والوں نے جنسیت کا لیبل لگایا ہے۔ ان کے علاوہ اس کی نگارشات زندگی کے رنگا رنگ موضوعات پر ہیں.........!!

نعیم صاحب! منٹو کے ان مداحوں میں سے اکثر جن کا تنقیدی و ادبی مقام مسلّم ہے ذاتی طور پر منٹو سے بدرجہا بہتر انسان ہیں۔ وہ اس بازار کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی نجی زندگی کیلئے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے معزز عہدے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض تو سگریٹ تک نہیں پیتے۔ لہٰذا بقول آپ کے ان کا تنقیدی زاویۂ نظر کیونکر منٹو کے ذہن سے قرب رکھ سکتا ہے؟

میں ابن فرید صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ منٹو کی سب کتابیں ایک بار پھر پڑھیں۔ نقوش کا منٹو نمبر سامنے رکھ کر اور اپنے مطلب کے فقرے چھانٹ کر انہوں نے گویا "مت جاؤ نماز کے قریب ...." والی نامکمل بات کی ہے ....

باقی بر صفحہ ۱۵

خواتین کے لئے زندگی آموز لٹریچر

کنیز

۔۔ نظر زیدی کے اس ناول کے کرداروں کی حیثیت تاریخی نہیں لیکن اس کا پس منظر اپنے تمام پھیلاؤ کے ساتھ قریب قریب حقیقی ہے۔ یہ اس دور کی ایک خیالی داستان ہے جب فاران کی چوٹیوں سے اسلام کی پہلی کرن طلوع ہوئی تھی۔ ایک طرف بیٹی کو ننگ و عار تصور کر کے اسے زمین میں زندہ گاڑ دینے والی جھوٹی عزت تھی۔۔۔ اور دوسری طرف عورت کو مرد کا لباس اور مرد کو عورت کا لباس قرار دینے والے مذہب کی پکار۔۔۔ اس ناول میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ ہر کردار اپنی فطری حدود میں رہ کر آگے بڑھے۔

قیمت :- ۳/۸ روپے۔

نیا گھر

گھر ہر روز بنتے اور بگڑتے ہیں بلکہ بنتے کم ہیں اور بگڑتے زیادہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں، بھگتتے ہیں لیکن نہیں سوچتے کہ گھریلو زندگی میں یہ بگاڑ پیدا کیوں ہوتا ہے۔ ہزاروں ارمانوں سے بسایا ہوا گھر کیوں آناً فاناً اجڑ کر رہ جاتا ہے .... اور کیوں عہد و پیمان کے بندھن کیوں مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔

سید نظر زیدی

نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں اس راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کو پڑھیئے اور یہ داستان آپ کو بالکل اپنی محسوس ہو گی۔ اور اپنی مشکلات ایک ایک کر کے حل ہوتی نظر آئیں گی اور لطف یہ کہ کہیں پاکیزگی کے معیار کو گرنے نہیں دیا گیا۔ قیمت :- ۲/۴ روپے۔

فردوس کی راہ

پہلا حصہ ۱/۱۲ دوسرا حصہ ۲/۱۲ تیسرا حصہ ۳/۰

کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔؟ قیمت :- ۱۰/

تعمیر حیات

قیمت :- ۲/۴ روپے

انمول چارٹوں کا خوبصورت سیٹ

(۱) معیاری بیوی اسلامی نقطۂ نظر سے (۲) پردہ کے احکام (۳) عورت کیلئے ستر کی حدود (۴) اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ عورت (۵) نوباتوں کا حکم۔ پورے سیٹ کی قیمت :- ۲/۴ روپے۔ فی چارٹ :- ۱۲/

مکتبہ چراغ راہ ۔۔ بیرون سوہاری دروازہ ۔ لاہور ۔۔ نیو منچ ملی روڈ کراچی ۵

چمچہ بھر صافی
صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے
سے آپ نہ صرف خرابی خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہیں گے
بلکہ صافی آپ کے دورانِ خون میں توازن پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ
خون کی لہر دوڑائے گی۔ صافی آپ کے معدے کے فعل کو درست بنائے گی۔
قبض سے محفوظ رکھے گی، اور بھوک بڑھائے گی۔
موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے
کی عادت ڈالیے اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی
بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔
نوٹ۔ بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے۔
ہمدرد دواخانہ کراچی

ہم خرما وہم ثواب

کیا آپ نے غور کیا کہ "باوقار تنظیم" کی پہلی پرافٹ شیئرنگ اسکیم میں شامل ہو کر آپ ہر پہلو سے فائدے میں رہتے ہیں؟

- اس اسکیم میں آپ پانچ روپیہ ماہانہ بچاتے ہوئے مقررہ مدت میں پانچ سو روپے کی کثیر امدادی رقم ایک دفعہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔
- اس کے علاوہ آپ کو وہ بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے منافع سے اس اسکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔
- اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضبط نہیں ہوتا خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔
- اشد مجبوری یا ناگزیر حالات میں آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ پورے کا پورا یک مشت واپس بھی کیا جا سکتا ہے۔
- بوقت ضرورت آپ اپنے ادا کئے ہوئے روپے پر قرض حسنہ بھی لے سکتے ہیں۔
- اگر آپ چاہیں تو اپنے حقوق ممبری کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کرا کر اس سے اپنا ادا کیا ہوا روپیہ وصول کر سکتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ

آپ ایک ایسی تنظیم کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو اقتصادی اور معاشی میدان میں اسلامی اصولوں کے فروغ دیتے کیلئے باطل کے نظام معیشت سے برسرپیکار ہے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں ہم تمدنی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کو اسلام کے تصور حیات کے مطابق ڈھالنے کیلئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ وہاں اپنے تجارتی صنعتی اور معاشی نظام کو بھی سودی لین دین، لاٹری جوئے اور طالع آزمائی کی مذموم لعنتوں سے حتی الوسع پاک کرنے کی کوشش کریں۔

باوقار تنظیم

اس سلسلے میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ آئیے آپ بھی اس اسکیم میں شامل ہو کر اور ہمارے ساتھ شانہ بشانہ چل کر اس پاکیزہ جدوجہد اور نیک مقصد میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ تفصیلات مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیجیے۔

باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ بندر روڈ۔ کراچی

Kobai
کوبائی
داد، اکزیما اور دیگر جلدی
امراض کا بہترین مرہم
مہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین علاج
قیمت ۱ ایکروپیہ فی ڈبیہ

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کر سکتے ہیں
بہترین تحفہ
بارہ مجرب دواؤں کا خزینہ
گھریلو علاج اور اہل محلہ کی طبی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبی ضروریات کو پورا کردینگی
مثلاً بخار کھانسی۔ درد نمونیا اختلاج قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض
اسہال پیچش درد شکم خرابی جگر قے متلی بدہضمی ہیضہ۔ درد سر نزلہ زکام۔
نکسیر بواسیر خونی۔ درد دنداں درد گوش حاملہ کی شکایات بچوں کی جملہ
شکایات خارش فساد خون چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج
محض ان بارہ مختصر دواؤں سے کیا جاسکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس
آئی سا کو (پاکستان) کراچی
تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳
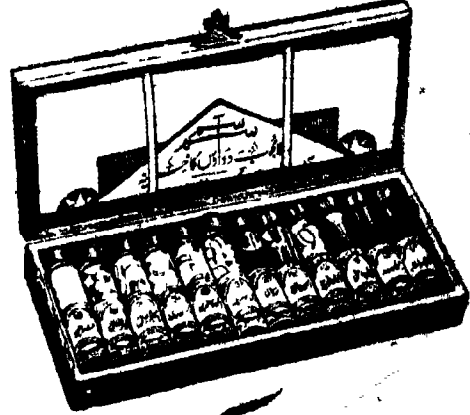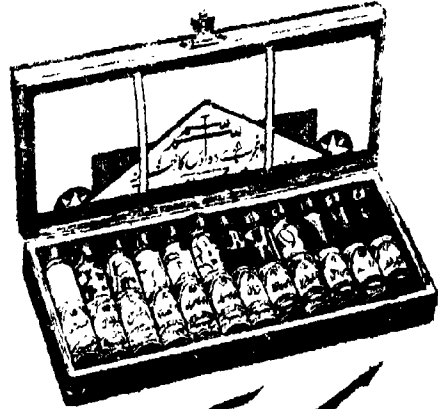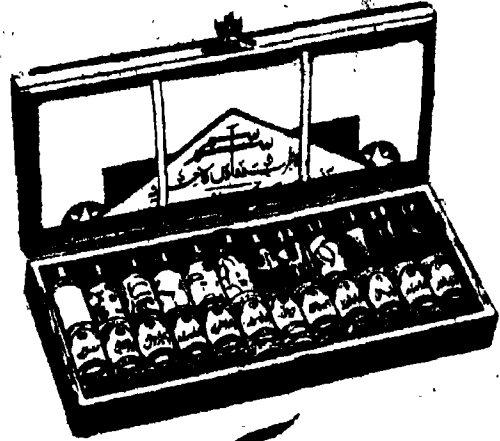
منیجنگ ایجنٹس:- احمد برادرس لمیٹڈ ... کراچی

فروری

روشنی ــــ گرمی ــــ حرکت

ماہنامہ

چراغِ راہ

کراچی

احسن رقم

جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۲

قیمت فی پرچہ : ۸ آنے
سالانہ چندہ : ۵/- روپے

فروری ۱۹۵۷ء

ترتیب

دفتر ادارۂ تحریر:
نعیم صدیقی ۱۔ اے۔ محلہ رسول پورہ ۔ اچھرہ ۔ لاہور
دفتر اشاعت و انتظام:
فیض محمد فتح علی روڈ ۔ کراچی نمبر ۱۔

سید کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

سوچ بچار

پاکستانی ثقافت

۲۰ جنوری [illegible] کو برکت علی ہال لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس کے پیش نظر وقت کا ایک اہم موضوع تھا ———— پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ اس مجلس میں مجھے بھی اپنے خیالات پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن عین وقت پر طبیعت خراب ہوگئی اور کچھ کی باتیں کہی نہ جا سکیں۔ اب [illegible] خیالات کو نہایت اجمال سے قلم بند کر کے چراغِ راہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان خیالات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ [illegible] کو توجہ دلانا ہوں کہ یہ بحث اس وقت انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ضروری ہے کہ ہمارے سوچنے والے اس پر سوچیں اور مختلف پہلوؤں [illegible] سے اس [illegible] اظہار خیال کریں۔ (نعیم صدیقی)

[illegible] ثقافت، کلچر اور آرٹ کا بڑا چرچا ہے۔ ثقافتی سرگرمیاں بھی زوروں پر ہیں اور چوں کہ علمی دائروں میں بھی اس موضوع کو خوب اچھالا جا رہا ہے۔ ہم اسی ملک کے باشندے ہیں اور اسلامی آئیڈیالوجی کے تحت مسئلہ ثقافت کو خاص اہمیت کے ساتھ زیر غور لاتے ہیں۔ ہمارے دل میں بھی کہنے کی کچھ باتیں ہیں۔ یہ باتیں مناسب ترتیب سے پیش خدمت ہیں:

۱۔ ثقافت (کلچر) کیا ہے؟ ————

تہذیب، تمدن، ثقافت، کلچر وغیرہ اصطلاحات میں بڑا التباس معانی پایا جاتا ہے اور ان کو مختلف لوگوں نے مختلف وقتوں میں متعدد معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن آج کل ثقافت (کلچر) کا جو مفہوم متعین ہوتا جا رہا ہے اس کے دائرے میں اجتماعی زندگی کے وہ تمام خارجی مظاہر آتے ہیں جن میں کسی قوم کی تمدنی شخصیت اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک قوم کے اندر شائع ہونے والی رسوم، تقاریب، مجلسی آداب، معاشرت کا طرز، لباس کا نقشہ، آرائش کے اسالیب، فرنیچر اور ظروف کی امتیازی ہیئتیں، کھیلوں اور تفریحات کا رنگ ڈھنگ، فنون لطیفہ کا خاص رنگ اور ایسی ہی دوسری چیزیں بالجملہ اس قوم کی ثقافت کہلاتی ہیں۔ اس معنی میں ثقافت لازمی طور پر کسی قوم کے نظریات و معتقدات، اس کے اخلاقی رجحانات اور اس کے ذوقِ جمالیات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کی پوری تاریخ کا عکس اپنے اندر رکھتی ہے۔

ثقافت کے نشوونما میں جو قوت محرکہ بہت ہی مثبت حصہ ادا کرتی ہے وہ انسانی فطرت کا ایک نہایت براق جوہر ہے۔ اسے "ذوقِ جمال" کا عنوان دیا جاتا ہے۔ تخلیق و ایجاد کی قوتوں کو اس جوہر سے بہت بڑی مدد حاصل رہتی ہے۔ اسی ذوقِ جمال کی مشعل ہاتھ میں لے کر تمدن و تہذیب کے قافلے مسرت و اطمینان کی طلب میں محنت کی کٹھن وادیاں طے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ذوقِ جمال "فطرت" کو کسی ایک مقام پر رکنے نہیں دیتا بلکہ اس کا عجیب طلسماتی عمل ہے کہ منزل آگے ہی آگے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ مثلاً

آج جو طرزِ تعمیر ہمیں بہت ہی مرغوب ہے، دس برس کے بعد طبیعتیں اس سے اُچاٹ ہونے لگیں گی اور ذوقِ جمال اسے ایک نیا رنگ دے دے گا۔ آج جس لباس کو پہن کر ہم ذہنی تسکین پاتے ہیں، کل وہی مذاق کا ہدف بن جائے گا۔ اسی طرح آداب و رسوم، تفریحات اور فنونِ لطیفہ میں تغیر و تبدل جاری ہے۔ دراصل ذوقِ جمال کا مصرف یہ ہے کہ زندگی میں حسن، خوبی، آراستگی، دلچسپی اور نکھار پیدا ہو اور اس پہلو سے وہ ہر آن پیش قدمی کرتی رہے

لیکن کسی قوم کا ذوقِ جمال بہرحال اس کے نظریات و معتقدات، اس کے ضابطۂ حیات، اس کے اخلاقی رجحانات اور اس کی تاریخ سے بے نیاز اور بے تعلق ہو کر کام نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی اجتماعی شخصیت کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ اگر کسی قوم کا ذوقِ جمال اس کی ملی شخصیت سے آزاد ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کا شیرازہ درحقیقت درہم برہم ہو رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ آئندہ کیا شکل اختیار کرنے والی ہے۔ پس کسی قوم کے ثقافتی لباس میں ذوقِ جمال کا مظاہرہ بھی ناگزیر ہے، لیکن یہ ذوقِ جمال بھی اس کی ملی شخصیت کے بالکل مطابق ہونا چاہیئے۔

ذوقِ جمال اپنا مکمل ترین مظاہرہ فنونِ لطیفہ کے پیرائے میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے فنونِ لطیفہ اس کے افراد کے لئے ذوقِ جمال کی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتے ہیں اور فنونِ لطیفہ ثقافت کو آراستہ پیراستہ کرنے اور اس میں حسن اور نکھار پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ چنانچہ ثقافت کا سب سے بڑا شعبہ یہی فنونِ لطیفہ قرار پاتے ہیں۔

ان ساری باتوں کو جمع کر لیا جائے تو پھر کہنا چاہیئے کہ نوعِ انسانی کی ہر ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ اس کا نظریہ و اعتقاد اپنا ہو، اس کا ضابطۂ حیات اپنا ہو، اس کا اخلاقی مزاج اپنا ہو اور اس کا ذوقِ جمال اپنا ہو، اسی طرح یہ بھی ایک منطقی نتیجہ کے طور پر لازم ہے کہ اس کا ثقافتی لباس بھی بالکل اپنا ہو۔ وہ لباس اس کے اپنے ہی قامت پر تراشا گیا ہو، اس کے اپنے ہی ذہن کا ترجمان ہو، اس کے اپنے ہی ذوق کا آئینہ دار ہو اور اس کی اپنی ہی اخلاقی حدود کا پابند ہو۔ ورنہ لباس محض ایک مضحکہ بن کے رہ جائے گا۔ اگر ایک بچہ بڑے بوڑھوں کا فرغل پہن لے، اگر ایک مرد عورتوں کی طرح جمپر غرارہ زیبِ بدن کر لے، اگر ایک پولیس مین جوگیوں یا پادریوں کے روپ میں آئے، اگر ایک شریف آدمی غنڈوں اور شہدوں کا سا پیرایہ اختیار کرے تو شخصیت اور لباس کا یہ بے جوڑ پن جس طرح مقامِ خندہ یا موقعِ ماتم ہوگا اسی طرح کسی قوم کا اپنی ملی شخصیت سے متضاد کوئی ثقافتی لباس پہن لینا کسی کے لئے ہنسی کا موجب ہوگا، کسی کے لئے رنج و غم کا!

ملتِ پاکستان کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسے ثقافتی لباس کسی سے مستعار نہیں لینا ہے بلکہ اپنے ذہن، اپنے قد و قامت، اپنے اخلاقی مرتبے اور اپنے ذوقِ جمال کے مطابق خود قطع کرنا ہے۔

۲۔ پاکستانی ثقافت کیا ہے؟

پاکستانی ثقافت کا تعین کرنے سے پہلے خود اس سوال کا جواب مطلوب ہے کہ "پاکستان کیا ہے؟"

پاکستان ایک زیرِ تعمیر ریاست اور ایک زیرِ تعمیر معاشرہ ہے۔ وہ ایک ہیئتِ مجہول سے ایک ہیئتِ مطلوب کی طرف حرکت کے عالم میں ہے۔ اس لئے اس کی ثقافت بھی ایک زیرِ تعیین ثقافت ہے دوسرے لفظوں میں پاکستانی ثقافت پردۂ مستقبل میں ہے۔ اس کا ہم ایک ذہنی تصوّر رکھتے ہیں، لیکن عالمِ واقعہ میں وہ تعیّن کے سانچے میں ابھی نہیں ڈھلی۔ وہ ایک مرتبہ ہے کہ جس کے حصول کے لئے ہم نے چند برس ہوئے آغازِ سفر کیا تھا اور ہنوز منزلِ اوّل میں ہیں۔ ایک تعمیر کا ہیولیٰ تو ہماری چشمِ تصوّر میں ہے لیکن ابھی تاریخ کی سرزمین پر اس کی اساس تک عملاً نہیں رکھی جا سکی۔

ثقافت کے اس عالمِ مطلوب سے اگر صرفِ نظر کر لیا جائے اور عالمِ واقعہ میں پوچھا جائے کہ اس وقت کی پاکستانی ثقافت کیا ہے تو یہ سوال ہمیں ایک عجیب پریشان خیالی میں ڈال دیتا ہے۔ ہم لاجواب سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جس قوم کا اپنا نظریۂ حیات کہیں بر سرِ عمل نہ ہو، جس کے ضابطۂ حیات کا تذکرہ صرف کتابِ آئین کے صفحات کی زینت ہو، جس کی اپنی کوئی قومی زبان نہ ہو، جس کا اپنا کوئی ملی لباس نہ ہو، جس کے تمدن میں اپنی امتیازی قدریں کہیں جلوہ گر نہ ہوں، جس کے ذوقِ جمال کے اظہار کا اپنا کوئی نہج نہ ہو، آخر اس کی ثقافت کیا ہو گی؟

درحقیقت اس وقت ہم بحیثیت سے اپنے عالمِ باطن میں بُری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ نظریہ کے معاملے میں الجھے ہوئے، ضابطۂ حیات کے معاملے میں اُلجھے ہوئے ہیں، ذوقِ جمال کے معاملہ میں بھی الجھے ہوتے ہیں ——— نتیجہ یہ کہ ثقافت کی بحث میں بھی اُلجھ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ثقافت کے دو متوازی دھارے بیک دم بہ رہے ہیں۔ پاکستان میں دو کلچر پائے جاتے ہیں اور بدقسمتی سے ان میں کوئی بھی وہ پاکستانی کلچر نہیں ہے جس کے ہم طالب ہیں ——— یہاں طبقۂ اعلیٰ کا کلچر جدا ہے اور طبقۂ عوام کی ثقافت جدا۔ شہری تمدن کسی اور طرف چلا جا رہا ہے اور دیہی آبادی کی معاشرت کا طرز دوسرا ہے۔ کچھ یک بام و دو ہوا کا سا معاملہ ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کی ثقافت لباسِ مستعار ہے اور طبقۂ عوام کی ثقافت ایک ایسی قدیم، میلی اور بوسیدہ گدڑی ہے جس میں کہیں ٹاٹ کے ٹکڑے لگے ہیں اور کہیں مخمل کے پیوند لگے ہیں۔ مختلف مذاہب، معاشرتوں اور تمدنوں کے اچھے اور بُرے اثرات کی ایک عجیب کھچڑی سی ہے جو تاریخ کی دیگ میں پکی ہے اور اب چھیکے پر دھری رکھی باسی ہو گئی ہے۔ اس عوامی ثقافت میں اسلام کے بہت سے قابلِ قدر آثار و نقوش باقی ہیں مگر وہ دوسرے اجنبی عناصر کے ساتھ گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ پھر یہ کہ اس عوامی ثقافت کی نشو و نما کئی قرنوں سے رکی پڑی ہے اور جمود نے اسے بوسیدہ کر دیا ہے۔ اب یہ ثقافت طبقۂ اعلیٰ کی ثقافتِ مستعار کے حملے کی زد میں ہے اور اس میں اتنی سکت نہیں کہ یہ اس حملے کو روک سکے۔

پاکستانی ثقافت دراصل ایک بالکل ہی تیسری چیز ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو اتفاقاً از خود نمودار ہو جائے اور آٹومیٹک طریق سے پروان چڑھتی جائے بلکہ ہم اسے بالارادہ قائم کریں گے تو وہ قائم ہو گی اور پروان چڑھائیں گے تو وہ پروان چڑھے گی۔ اس کی فکری اساس ہمیں اپنے مرکزی چشمۂ حیات ——— قرآن ——— سے لینی ہو گی اور اس کی تعمیر کے لئے بہت سا ضروری مسالہ ہمیں اپنی عظیم الشان تاریخ کے گوشے گوشے سے جمع کرنا ہو گا۔ جو جبرالٹر سے لے کر انگ کانگ تک اور سمرقند سے لے کر سماٹرا تک بکھرا ہوا ہے۔ بڑی چھان پھٹک کے بعد یہ مسالہ اخذ کرنے کے بعد اسے دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق اور اپنے ماضی کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھانا ہو گا۔ نئے ذوقِ جمال

کی مناسبت سے نئی ترتیب دینی ہوگی۔ نئی ترتیب دیتے ہوئے ہمیں آفاقی وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ دنیا کی دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ لیکن فائدہ اٹھانا ہوگا ـــــــــ نہ کہ نقالی!

۳۔ ثقافت کے نشوونما کے لئے تحدیدات ـــــــــ

ثقافت من حیث المجموع، اور فنونِ لطیفہ بالامتیاز، اور اس سے بڑھ کر ذوقِ جمال غیر معمولی اختصاص کے ساتھ ـــــــــ کیا زندگی کی آخری کارفرما طاقت ہے اور اس پر کوئی تحدیدات نہیں لگائی جاسکتیں یا وہ کسی دوسرے اہم تر عنصر کے تابع ہے اور بنابریں اس پہ حدود و قیود عائد ہونی چاہئیں۔

اس سوال کا جواب درحقیقت اوپر کی بحث میں آچکا ہے۔ زندگی کی اصل کارفرما طاقت کسی قوم کی نظریاتی "روح" ہے۔ جو ایک خاص طرح کے شعورِ حقیقت اور ایک خاص طرز کے اخلاقی تصورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے وہ اسی روح کے تابع اور اسی کے تقاضوں میں محدود رہتا ہے۔ بنابریں ناگزیر ہے کہ ہماری ثقافت ہمارے معاشرے کی روح کے مطابق جادہ اس کی مقرر کردہ حدوں کی پابندی کرتے ہوئے ارتقاء پذیر ہو۔

اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے اندر جس طرح قانون اور تعلیم اور معیشت کے لئے ضروری حد بندیاں پائی جاتی ہیں، ذوقِ جمال اور فنونِ لطیفہ اور مجموعی طور پر ثقافت کے لئے بھی تحدیدات موجود ہوتی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو وہی ہوتا ہے کہ "مرج کر آزادیاں سامانِ شیون ہوگئیں"!

ثقافت کے بہتے نشوونما میں بڑے بھاری خطرات و مہالک کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں ہمارے سامنے جتنی بھی تباہ شدہ قوموں کی عبرت ناک داستانیں موجود ہیں وہ سب کی سب ثقافتی لحاظ سے مروجہ اصطلاح کے مطابق معیاری حد تک ترقی یافتہ تھیں اور بیشتر کے ہاں ثقافت ہی کے چور دروازوں سے تباہی نے نقب لگائی تھی۔ تفریح "لا تبتغا" جمال پرستی کے راستے جس آسانی سے قوموں کی اجل اپنے لشکر تمدن کے قلعے میں داخل کر لیتی ہے ویسی آسانی اور کسی راستے میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے ایک باشعور قوم کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ ثقافت کے نشوونما پر کڑی نظر رکھے اور اس کے صحیح جادۂ ارتقاء کے ہر دو جانب مضبوط حدوں کے پتھر گاڑ دے۔ ورنہ جو نہی ذرا آنکھ چوکی پوری زندگی فساد کا شکار ہوئی!

یہاں ہم چند خطرات و مہالک کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے ثقافت کو بچانے کی ہر ممکن تدبیر اوّل روز سے بر سرِ عمل رہنی چاہئے۔ خصوصاً ایک قوم کے سربراہ کاروں کی ذمہ داری اس معاملہ میں درجہ اوّل کی ہے۔

۱ ـــــــــ سب سے بڑا طوفانِ ہلاکت جو اقوامِ عالم کے نظامِ ثقافت میں اٹھتا رہا ہے اور جس کے ہاتھوں بڑی تباہیاں واقع ہوئی ہیں وہ جنسیت کا طوفان ہے۔ جنسیت کا طوفان اوّل اوّل فنونِ لطیفہ کے سرچشموں سے اٹھتا ہے۔ شعر و افسانہ، ڈرامہ و موسیقی کی رنگینیوں کا جادو اور رقص کو قوموں کو کھا جانے والا شیطان زندگی پر حملہ آور ہوتا ہے اور یہیں فحاشی و عریانی روز افزوں بنتا ہے

نمودار ہونے لگتی ہے، تفریحات کے دائرے میں سخافت اور شہد پن بڑھتا ہے، معاشرت میں مخلوط مجلسی زندگی فروغ پاتی ہے، عوام میں بدنظمی و بدقماشی پھیلنے لگتی ہے، یہاں تک کہ ہر طرف بدکاری اور زناکی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔

حال ہی میں پروفیسر سارو کن کی ایک تازہ تصنیف کا اخباروں میں تعارف کرایا گیا ہے جس کا ماحصل بحث ہی یہ ہے کہ جدید مغربی تمدن ہر پہلو سے جنسی ہیجان کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور آرٹ، کلچر اور ادب سب پر اس کے اثرات بد نمایاں ہیں۔ پروفیسر موصوف نے در حقیقت یہ انتباہ دینا چاہا ہے کہ اگر ثقافت کو اس فتنے سے بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو روم اور یونان کی تہذیبوں کی طرح موجودہ مغربی تہذیب بھی تباہی کا شکار ہو جائے گی۔

آج ہم خود اپنے تمدنی احوال کا مشاہدہ کر کے پروفیسر سارو کن کے اندیشے کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ مغربی ثقافت جس رفتار سے پھیل رہی ہے اسی رفتار سے بدنگاہی، آوارگی، عورتوں سے چھیڑ چھاڑ، زنا بالجبر اور اغوا کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ پچھلے دنوں پے در پے واقع ہونے والے دردناک حوادث کا اخباروں میں جو چرچا رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔

اس موقع پر اقبالؒ کا ایک شعر یاد آگیا جسے ذرا سے تصرف کے ساتھ پڑھیئے ؎

یہ تحفہ آیا ہے مغرب سے ایشیا کے لئے ۔ مئے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری

پاکستان جو اسلامی تہذیب کا علم لے کے نمودار ہوا ہے، کاش کہ اس کے کارفرماؤں پر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اسلام نے ثقافت کو فتنۂ جنسیت سے بچانے کا کڑا اہتمام کیا ہے۔ اس کی ایک اہم ترین تہذیبی قدر "حیا" ہے۔ یہی حیا جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو پردہ کا وہ نظام وجود میں آتا ہے جو مرد و عورت کو دو الگ الگ دائرہ ہائے عمل میں رکھتا ہے۔ یہ قدر ادب اور فنونِ لطیفہ میں فحاشی و عریانی کی روک تھام کا ذریعہ بن سکتی ہے اور یہی قدر تفریحات اور تقاریب میں ہمارے شرف و وقار کی پاسبانی کر سکتی ہے۔ یہ ایک روک ہے جو جنسیت کے طوفان کو اٹھنے نہیں دیتی۔ پاکستانی ثقافت وہی ہو سکتی ہے جس میں دل و نظر کے لئے یہ روک موجود رہے۔

ب ——— ثقافت کے دروازے سے داخل ہونے والا دوسرا خطرہ اسراف کا خطرہ ہے۔ یعنی ایک قوم اگر آرائش، تکلف و تصنع، تفریحات اور فنونِ لطیفہ میں انہماک بڑھا لیتی ہے تو اس کے ہاں دولت کے غیر تعمیری مصارف پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیاں قومی معیشت کی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے لگتی ہیں۔ ثقافتی معیار کے اونچا ہو جانے پر جب افراد کی آمدنیاں کوتاہ ثابت ہوتی ہیں تو لوگ ناجائز طریقوں سے کمائی بڑھانے اور مصارف کو پورا کرنے پر اتر آتے ہیں۔ گویا اسراف آتا ہے تو خیانت کے شیطان کو بھی ساتھ لاتا ہے۔ خود ہمارا معاشرہ آج اسی شیطان کی تگ و تاز سے نالاں ہے اور کوئی راہِ نجات نہیں مل رہی۔ اسی خطرے سے بچانے کے لئے اسلام نے لہو میں انہماک سے روکا ہے اور اسراف کو تمدنی جرم قرار دیا ہے۔

ج ——— انسانی زندگی فرض اور خواہش کی ایک دوامی کشمکش پر مشتمل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ افراد نے بھی اور اقوام نے بھی ہمیشہ بازی اس صورت میں ہاری ہے جب کہ "خواہش" نے ان کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا ہے۔ بدقسمتی سے ثقافتی سرگرمیوں کو جب

کبھی اپنی حدوں سے آگے نکلنے کا موقع ملا ہے تو انہوں نے خواہش کے ہاتھ مضبوط کر کے انسان کو ادائے فرض کے پہلو سے کمزور کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ضرورت ہے کہ ثقافت کی کڑی نگرانی کی جائے کہ وہ انسان کو خواہشات میں مگن کر کے اسے اس کے بے حساب فرائض سے غافل نہ کر دے۔

اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کی تعمیری اور تفریحی سرگرمیوں میں صحیح تناسب ہونا چاہئے۔ یہ صحیح تناسب جوں ہی ہٹا، معاشرہ تعیش میں پڑ جائے گا۔ مثلاً ہم اہل پاکستان کے سامنے تعمیری کام کی ذمہ داریوں کا میدان بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں سائنس، معیشت اور دفاع کے پہلوؤں سے ان تھک جذبے کے ساتھ برسوں کام کرنا ہو گا۔ تب ہم اس دور کے لحاظ سے زندگی اور آزادی کو برقرار رکھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ہمارے سامنے فرائض کا جو لمبا تسلسل رکھا ہے وہ تفریح اور لذتیت کی بہت ہی تھوڑی سی گنجائش دیتا ہے۔ ایک قوم ہے جس کے لاکھ فاقوں مر رہے ہیں اور جو ابھی جیسے ابتدائی مسئلہ کو حل نہیں کر پائی جس کے ہزاروں افراد روز بیماریوں کی چڑیلوں کا لقمہ بن رہے ہیں اور وہ ان کی چارہ گری کا سامان نہیں کر سکتی، جس کی سرزمین کا ایک لازمی حصہ اغیار کے قبضے میں ہے اور جس کی سرحدیں محفوظ نہیں ہیں، جس کی کثیر آبادی جہالت کی تاریکی میں پڑی ہے، ایسی قوم میں مغربی ثقافت کے چونچلے اور ایک عیاشانہ زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ ایک عبرت انگیز مذاق ہیں۔ اس قوم کے ایک طبقے کا اسی قوم کی دولت کے بل پر کلبوں میں بیٹھ کر شرابیں پینا اور جوا کھیلنا، بال روموں میں آرکسٹرا کی تال کے ساتھ ناچنا، اس کی بیگمات کا نت نئے فیشنوں کی نمائش کرتے پھرنا، اپنی آئندہ نسلوں کو موسیقی اور ایکٹنگ کی تعلیم دلانا ———— اور اس ہنگامۂ تعیش کا نام ثقافت رکھنا بڑی ٹریجڈی ہے۔ بالکل وہی کیفیت کہ اپنا جھونپڑوں میں، خواب محلوں کے! بالکل وہی صورت کہ گھر میں بھونی بھانگ نہیں، ٹھاٹھ نوابوں کے سے!

ہمارے [...] کا یہ عیش جو ہماری تعمیری سرگرمیوں سے ہمارا آگے بڑھ گیا ہے ایک طرح کا ثقافتی بھگوڑا پن ہے۔ مغرب کے شکر مایہ فروش ہمارے اس بھگوڑے پن کو مختلف طریقوں سے بڑھا رہے ہیں اور جھوٹے بھالے بچوں کی طرح ہمیں سگریٹ اور پہ بہلا پھسلا کر ہمیں ہماری اصل متاعِ حیات سے محروم کر رہے ہیں۔

تعمیر اور تفریح میں جو عدم توازن ہماری موجودہ ثقافت میں پیدا ہو گیا ہے اسے بروقت رفع کرنے کی ضرورت ہے۔

———— ثقافت کے راستے سے اقوامِ غیر کے ذہنی غلبہ کا خطرہ بھی نہایت آسانی سے وارد ہوتا ہے۔ چاہئے تو یہ کہ ثقافت ایک قوم کی اپنی ملی خودی کی پاسبان ہو۔ اور اس کے اندر بیرونی اثرات کو گھسنے کے کھلے راستے نہ ملیں۔ لیکن اگر ذرا بھی تغافل سے کام لیا جائے تو فکری اور سیاسی اور معاشی اثرات کے مقابلے میں ثقافتی اثرات زیادہ آسانی سے اندر گھس آتے ہیں۔ یہ بیرونی اثرات آہستہ آہستہ سرے سے ذہن ہی کو بدل ڈالتے ہیں اور ضابطۂ حیات اور نظریہ تک کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں مغربی اقوام اپنے استیلاء کو باقی رکھنے کے لئے سب سے زیادہ زور اسی پر دے رہی ہیں کہ کسی طرح ایشیائی اور مسلم اقوام کے اندر ان کی ثقافت کے عساکر گھس جائیں اور اپنی مستقل جگہ پیدا کر لیں۔ پاکستان پر بھی یہ ثقافتی تاخت بڑے زوروں سے ہو رہی ہے اور اس پر بھاری رقمیں صرف کی جا رہی ہیں اور درجہ اول کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھر کے پاسبانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس یورش سے ہملا

بچاؤ کرانے کے بجائے خود ہی بیرونی اثرات کے حملہ آور کے لئے رہنما اور آلۂ کار بن کر کام کر رہے ہیں۔

اس وقت پوری کی پوری مغربی ثقافت بلا کسی ادنیٰ ترمیم کے ہمارے اوپر لادی جا رہی ہے گویا ایک اجنبی لباس ہے جسے بغیر کسی قطع و برید کے ہمارے قامت پر سجایا جا رہا ہے۔ یہ لباس ہمارے ملی تشخص کا ترجمان نہیں بلکہ اس کے متضاد ہے۔ اسے کچھ مدت پہننے کے بعد ہمارے اندر وہی ذہن و کردار پیدا ہو جائے گا جس کی ترجمانی یہ ثقافتی لباس کرتا ہے اور وہ پیدا ہو رہا ہے۔

اس ثقافتی خطرے کا استیصال کرنے کے لئے اسلام نے ہمیں دوسری قوموں کی نقالی سے روک دیا ہے۔ مشہور حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کا اصل منشا یہی ہے کہ ایک قوم جب ثقافتی دائرے میں دوسری قوم کی نقالی پر اتر آتی ہے تو اس کی خودی، اس کا ذہن و کردار اور اس کی پوری ملی شخصیت چکنا چور ہو جاتی ہے اور بالکل دوسری شخصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی ثقافت کو ظہور دینے کے لئے یہ کام ہونا چاہئے کہ ہمارے اندر سے وہی کچھ ابھرے جس کا تقاضا ہماری ملی فطرت کرتی ہو اور باہر سے وہی کچھ لیا جائے جو اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو یا مطابقت اختیار کر سکے۔ کسی اجنبی ثقافت کو مصنوعی طور پر باہر سے ٹھونسنا سرے سے غلط ہے۔ قومی زندگی کا مسئلہ ایک پودے کا سا ہے جس کے نظریے کی جڑ اگر سرسبز ہے اور جس کے ضابطۂ حیات کا تنا اگر استوار رہے تو اس پر از خود اس کی فطرت کے مطابق برگ و بار آنے لگتے ہیں۔ ہم اپنی ملی زندگی کے درخت کی جڑ کو سیراب کرنے کے بجائے اگر محض اس کی ٹہنیوں پر دوسرے درختوں کی پتیاں کو پلیں لا لا کے باندھتے رہے تو نہ وہ پتیاں اور کونپلیں سرسبز رہ سکیں گی، نہ وہ درخت ہی صلاحیت نمو سے بہرہ ور رہ سکے گا۔

۴۔ ایک تحریکی، ایک انقلابی عمل کی ضرورت ———

ایک قوم جو زوال اور غلامی کے چکروں سے خستہ حال ہو کر نکلی ہو، از سر نو زندگی و قوت حاصل کرنے اور اپنی امتیازی ثقافت کو تعمیر کرنے کے لئے ایک تحریکی و انقلابی عمل کی محتاج ہے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اس نظریہ و اعتقاد کے جام سے سرشار ہو کر اٹھے جس نے اسے ایک خاص قومی تشخص دیا ہے، اپنے سرمایۂ اقدار و روایات کو اپنی روحِ حیات اور جزو بنائے اور شعوری اور ارادی طور پر اپنی مخصوص تمدنی ہیئت کے احیاء کے لئے جانفشانیاں کرے۔ وہ اپنی ثقافت کو بچانے اور اس کے جو اجزاء برقرار رہ گئے ہوں ان کی سختی سے حفاظت کرتے ہوئے ضائع شدہ اجزاء کو دوبارہ بحال کرے اور باہر سے کسی متضاد عنصر کو دخل انداز نہ ہونے دے۔ ہمارے اندر قومی سطح پر ایک نئی رَو اٹھ جائے اور بچہ بچہ اس میں سرمست و بیخود ہو جائے کہ ہم ایک مسلم قوم ہیں اور فکر، نظامِ زندگی اور ذوقِ جمال کے لحاظ سے دوسروں سے بالکل الگ ایک مستقل تشخص رکھتے ہیں۔ یہ انقلابی شعور اگر ایک رَو کی طرح جاری و ساری نہ ہو جائے تو پاکستان کی ثقافتِ مطلوبہ کبھی نشوونما نہیں پا سکتی۔

اس تحریکی و انقلابی شعور کا اولین دائرۂ عمل علم و فکر کا میدان ہے۔ ہمیں علمی حیثیت سے اپنے اوپر یہ واضح کرنا ہے کہ اسلامی ثقافت کی فکری بنیادیں کیا ہیں۔ پھر گہری نظر سے جائزہ لینا ہے کہ ہمارا تاریخی سرمایۂ ثقافت کیا ہے اور اس میں سے کتنا حصہ قابلِ قدر ہے

جسے نامطلوب کوڑے سے الگ کر کے ساتھ لینا ہے۔ ماضی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے حال پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈال کر یہ دیکھنا ہے کہ آج ہمارے ثقافتی کباڑ خانے میں کیا کچھ بھرا پڑا ہے۔ اس میں ہمارا اپنا اور ہمارے مزاج کا اور ہماری ضرورت کا قیمتی مواد کتنا ہے اور اس گودام میں غیروں اور پرایوں نے جو جو کچھ فضولیات لا لا کے زبردستی بھر دی ہیں، نیز زمانے کی ہوا کے جھونکوں نے خس و خاشاک کے جو ڈھیر لگا دیئے ہیں اُن کی تطہیر کیسے ممکن ہے۔ ہمارے حرمِ ثقافت میں زمانے کس کس نے اپنی پسند کے کیا کیا اصنام لا کے نصب کر دیئے ہیں اور اب جب کہ ہر صنمِ باطل کی پرستش اور پاسبانی ہو رہی ہے، اس حرم کو کیسے اپنی اصل حالت پر بحال کیا جا سکتا ہے۔ پھر علمی دائرے ہی میں یہ بحث بھی ٹھنڈے دل سے طے کرنی ہے کہ مغربی ثقافت سے ہمارا طرزِ معاملہ کیا ہونا چاہیئے۔ کیا ہم اس کے سامنے مفتوح ہو کر پڑے رہیں اور سرِ تسلیم و رضا خم کر دیں اور اپنا قومی تشخص اس کی بھینٹ چڑھا دیں؟ یا ہم اپنی زندگی کے قلعے پر ملّی غیرت و حمیت کو پاسبان بنا کے کھڑا کریں جو تنقید کی دوربینوں اور خوردبینوں سے ہر بیرونی فکر اور ثقافتی عنصر کا جائزہ لے اور کسی ایسے اثر کو اندر داخل نہ ہونے دے جو ہمارے قومی تشخص کے لئے تباہ کن ہو۔

ہمارے تحریکی اور انقلابی شعور کا دوسرا دائرہ عمل نظامِ تعلیم و تربیت ہے۔ اپنی ثقافت کے بارے میں ہم جو جو کچھ علمی حیثیت سے طے کرتے جائیں، ان سارے فیصلوں کو ہمیں اپنے نظامِ تعلیم و تربیت میں سمو دینا چاہیئے۔ انہی فیصلوں کے مطابق ہمیں اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دل و دماغ، ان کے جمالیاتی ذوق اور ان کے ثقافتی مزاج کو ڈھالنا چاہیئے۔

ہمارے مدرسوں اور کالجوں، ہمارے علمی و ادبی اداروں، ہمارے اخبارات اور ہمارے لٹریچر، ہمارے فلموں اور ریڈیائی پروگراموں، ہماری مجالس اور رسوم، ہمارے محکمہ ہائے تعلقاتِ عامّہ اور سرکاری تقاریب، ہمارے دفاتر اور محکمہ جاتی مراکز، ہمارے نظامِ امدادِ باہمی اور دیہی ترقی کی رضاکارانہ تنظیموں اور ہماری سیاسی، مذہبی اور سوشل جماعتوں، غرضیکہ معاشرے کے مجموعی نظامِ تعلیم و تربیت کو اس مقصد کے لئے متحرک ہو جانا چاہیئے کہ یہاں اسلامی اصولوں پر ہماری اپنی ہی ایک ثقافت پروان چڑھے گی اور جو جو کچھ اس اپنی ثقافت سے متصادم اور متغائر محسوس ہو گا اس کی یہاں کوئی جگہ نہ ہو گی۔ ہمیں باہر سے لوگوں کو بلا کر اور اپنے سماجی وفود کو بھیج کر دنیا کے سامنے صرف اپنی اسلامی ثقافت کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور کسی ثقافتِ مستعار کو اپنی طرف سے فخریہ پیش کرنے کی بے حمیتی کو کبھی دوہرانا نہیں ہو گا۔

لیکن اس تحریکی و انقلابی شعور کے ساتھ ایک نئے دورِ ثقافت کا افتتاح کرنے میں ہمارا مغرب زدہ طبقہ ملکی اقتدار کی مدد سے بُری طرح حائل ہے اور وہ پورے نظامِ تعلیم و تربیت پر قابض ہو کر اسے دوسری ہی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ اعلیٰ دماغوں کو خرید خرید کر اسلامی اصولِ ثقافت کو شکست دینے اور مغربی ثقافت کو غالب کرنے کے لئے علمی میدان میں بھی ڈال رہا ہے۔ وہ ایسی ناپاک ثقافتی سرگرمیاں کا طوفان اٹھائے ہوئے ہے جن کے ذریعے تھوڑی ہی مدت میں اسلامی ثقافت کے بچے کچھے آثار ملیامیٹ ہو جائیں اور دلوں میں ان کے لئے جو تڑپ باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

ایسے عالم میں پاکستان کی مطلوبہ اسلامی ثقافت کا اِحیاء بغیر سیاسی تغیر کے قطعاً ممکن نہیں۔ تحریکی و انقلابی شعور کے ساتھ

باقی ص۳۰ پر

تجدید ———!

نعیم صدیقی

"——— اور وہ اللہ ہی ہے کہ بشارت دینے والی ہواؤں کو اپنی رحمت
کے آگے آگے رواں کرتا ہے ——— تاکہ آنکہ وہ گھنگھور
گھٹاؤں کو اٹھا لیتی ہیں، پھر ہم ان کو کسی سرزمینِ مُردہ کی طرف ہانک
لے جاتے ہیں، پھر اس سرزمینِ مُردہ پہ پانی برساتے ہیں، پھر
اس کے ذریعے ہر طرح کے پھل اُگاتے ہیں! ———
یُوں ہم مُردوں کو زندگی دیتے ہیں!" الاعراف ——— آیت ۵۰

[طویل نظمیں لکھنے کی وجہ سے میں پہلے ہی کچھ بدنام ہوں، اب اس بدنامی کی رہی سہی کسر پوری کر رہا ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ مقصدی شاعری کے دائرے میں کسی نظریے کے اظہار کے لئے نظم ——— اور طویل نظم ——— کہنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دوسرے رفقا شاید اس مشکل سے دوچار نہ ہوتے ہوں، میرا تجربہ یہی ہے۔

یہ طویل مختصر نظم جو پیشِ خدمت ہے تھوڑی تھوڑی کرکے کم و بیش ایک برس میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ طے کرنا کہ یہ حاصلِ محنت کسی قدر و قیمت کا حامل ہے یا نہیں، اہلِ نظر کا کام ہے۔ لیکن چونکہ حلقۂ یاراں کے بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ یہاں بسا اوقات اس طرز کی فنی تخلیقات کے ساتھ ایک تعارف بہت ضروری ہوتا ہے اور اگر اس ضرورت کو پورا نہ کیا جائے تو بہت سے قدردان اوپر ہی اوپر سے نکل جاتے ہیں لہٰذا یہ چند سطور لکھی جا رہی ہیں۔

قصیدہ کے سے رنگ میں لکھی ہوئی اس نظم میں بیک دم فلسفہ ہے، مطالعۂ تاریخ ہے، دورِ حاضر کی تہذیب کا جائزہ ہے اور بحیثیت حاصلِ نظم کی حیثیت سے اس میں ایک پیغام شامل ہے۔ غیب سے خیال میں آیا ہوا یہ مضمون حقیقت کے جن متنوع پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ان کی وسعت نے شاعر کو مجبور کر دیا ہے کہ حقیقت کا کچھ جزو تو جوں کا توں لے لے اور اس کے بہت سارے عناصر کو استعارہ و کنائیت میں لپیٹ دے ورنہ یہ طویل نظم اتنی مختصر نہ رہ سکتی۔ علاوہ بریں استعارہ و کنائیت کا رنگ دیئے بغیر فکرِ حقیقت کو لطیف نہ بنایا جا سکتا اور وہ شعر کیلئے بوجھل ہو جاتی۔ مرکزی استعارہ جو نظم کی اصل بنا ہے یعنی خیر بنیاں ہے وہ قرآن سے ماخوذ ہے اور اس کی طرف مندرجہ بالا آیت خود ہی اشارہ کر رہی ہے۔ اس استعارے [illegible] یہ کوشش کی ہے کہ منظر نگاری کے بیان [illegible] کر لیا جائے۔ مزید جزئی کنایات معروضات [illegible]

اور قاری خود ہی جھانک کر حقیقتوں کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے۔ اس نظم میں ایک حصہ نعتیہ انداز کا بھی شامل ہے جو پرانی ڈگر سے ہٹ کر ایک نئے اسلوب کو نمایاں کرتا ہے

اور لوگ تو شائد اس کی معنویت کو پوری طرح اخذ نہ کر سکیں، لیکن جو لوگ تحریکِ اسلامی کی صدائے جرس پر اقدام کر رہے ہیں ان کے ذہنوں کے لئے اس نظم میں کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ البتہ ڈرتا ہوں کہ جن رفقاء کا شعر و ادب سے زیادہ محرمانہ رابطہ نہیں ہے وہ چھٹے بند میں ایک آدھ مقام پر الجھیں گے۔ بخصوص "ات بنانے" اور "مندر بسانے" کی حرکت ان کو پریشان کرے گی۔ ان پر یہ واضح ہو جائے تو اچھا ہے کہ اس بند میں ضمیر متکلم سے مراد شاعر کی ذات نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ ہے ——— اس کا اجتماعی ذہن! ——— اور کون نہیں جانتا کہ اس ذہن نے نظامِ اسلامی کے سقوط اور زندگی سے محرومی کے بعد ایک ردِ عمل میں پڑ کر عجیب و غریب صنم خانۂ افکار آباد نہیں کئے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ اس اجتماعی ذہن نے خود ہی اپنے آپ کو اپنی گم شدہ حقیقت سے مربوط رکھنے کے لئے بڑے جتن کئے ہیں اور ان کا تذکرہ بھی اسی بند میں موجود ہے۔

اتنی طویل نظم لکھنے میں مجھے اندیشہ ہے کہ فنی اور لسانی اہتمام میں نہ جانے کتنی کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہوں گی ——— خصوصاً جب کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے بہت زیادہ کاوش اور بار بار نظرثانی کرنا میرے لئے کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی کوتاہیوں سے اگر مجھے آگاہ کیا جائے اور مشورہ دیا جائے یا بہرہ مند کیا جائے تو میرے لئے مفید ہوگا

(نعیم صدیقی)]

مست کالی گھٹا، جیسے اک جل پری، پر کھلاتی ہوئی، پھڑپھڑاتی ہوئی!
اک حسیں ملگجا بانا پہنے ہوئے، کالے گیسو ہوا میں اڑاتی ہوئی
اک روپہلی کناری کا آنچل لئے، نیلا آنچل مسلسل ہلاتی ہوئی
اس کا میخانۂ ذوق بحرِ عرب! پی کے صہبا چلی گنگناتی ہوئی
مسکراہٹ بھی کیا مسکراہٹ سی ہے! وقفے وقفے پہ بجلی گراتی ہوئی
بڑھتی ہے اپنا دامن جھٹکتے ہوئے، اپنے دامن سے موتی لٹاتی ہوئی

دیکھو برکھا دلہن کی سواری ہے یہ! خیرِ مقدم کو سمٹی ہیں پہنائیاں
کچھ ابابیل چکر لگانے لگے! عندلیبیں بجاتی ہیں شہنائیاں
ایک پیلی پتنگ اونچی اڑنے لگی، کیسے تینے لگی ڈور انگڑائیاں
کچھ کبوتر اڑے ——— جیسے ادراک میں اک حسیں خواب کی جلوہ آرائیاں
ابر پاروں میں کیسی رَوا رَو سی ہے، جیسے پروازوں کی دشت پیمائیاں
دھوپ چھاؤں میں چہلیں سی ہونے لگیں، دوڑتی پھرتی ہیں کیسے پرچھائیاں
دھوپ چھاؤں کا ہے کھیل خود زندگی! نور و ظلمت کی ہنگامہ آرائیاں!

وقت کا شعبدہ گر ہے اسٹیج پر! ——— شعبدے اپنے ملبوس دکھانے لگا
کوئی نقاش رنگوں کا ڈبا لئے کیسے نقشے بنانے مٹانے لگا
آسمانوں کا دُھندلا افق سے پرے، سات رنگوں کی لیکر کماں ہاتھ میں
چھُپ کے بیٹھا ہوا اپنی دھُن میں لگا، پیلی رُوئی کے گالے اڑانے لگا
جیسے کوئی نگارِ فرنگی کہیں، اک سگار اپنے ہونٹوں میں دابے ہوئے
سوچ میں ڈوب کر کش لگانے لگا اور مرغولے پیہم اٹھانے لگا
منجمد تھا کبھی قلزمِ نیلگوں، تہ نشیں ہو کے ہر موج خوابیدہ تھی
پھر پگھل کر تلاطم میں آنے لگا، برف کے تودے ہر سُو ترانے لگا

پیرکِ چرخ ہے کاوشِ شعر میں! ایک استادِ فن کی یہ طبعِ رواں
غیب سے لے کے مضمون آتے ہوئے جیسے رنگیں خیالوں کے ہیں کارواں
اِک بہاریں قصیدہ ہے پیشِ نظر، شعلۂ ذوقِ تخلیق ہے گُل فشاں،
جیسے مصرع پہ مصرع کی آمد رہے! اس قصیدہ کا ہو جانے مقطع کہاں!
میرؔ و غالبؔ تحیّر میں ڈوبے ہوئے، ذوقؔ و مومنؔ ہوئے مہر بر لب یہاں

اور گم سُم ہے یہ شاعرِ بےنوا، بس نظر کا خزانہ لُٹاتا ہوا
اپنے جذبوں پہ تازہ خراشیں لئے، حسنِ فطرت کا مرہم لگاتا ہوا
زخم کچے تھے احساس کے، چِھل گئے! اخمن زخموں سے لے بس رس گئے آتا ہوا
شاعرِ بےنوا کو خبر ہی نہیں ——— وقت بڑھتا ہے، پرچم اُڑاتا ہوا
وقت بڑھتا ہے پرچم اُڑاتا ہوا! ہر زماں اک قیامت اٹھاتا ہوا
عظمتوں کے منارے گراتا ہوا! پستیوں کو فلک سے مِلاتا ہوا

کون ہے؟ کون ہے؟ کس کا چہرہ ہے وہ؟ کس کا ماتھا افق پر چمکنے لگا
آشنا سی یہ خوشبو ہے کس حُسن کی؟ جھونکا جھونکا ہوا کا مہکنے لگا
جیسے صدیوں کی تاریخِ انساں کا غم اک جبیں سے سمٹ کر ٹپکنے لگا

جانِ بے تاب! آخر یہ کیا ہے سماں؟ ــــ زندگی! ہائے مری زندگی! تو کہاں؟
گردشِ خوں کی رفتار ہے تیز تر! اور ہی چال سے دل دھڑکنے لگا
زندگی ہائے مری گم شدہ زندگی! تو کہاں تھی؟ کہاں تک گئی؟ کیوں گئی؟
تیرہ سو سال پہلے جو کانٹا چبھا، از سرِ نو جگر میں کھٹکنے لگا؟!

میں نے تجھ بن گزاری ہیں گھڑیاں کڑی! تیری یادوں کے مندر بساتا رہا
شعر و فن کے صنم خانۂ شوق میں مدّتوں تک ترے بُت بناتا رہا
تھا تخیّل کا جادو مرے ہاتھ میں! اپنے خوابوں میں تجھ کو بلاتا رہا
دورِ فرقت کی اندھیاریوں میں کھڑا اپنے اشکوں کی شمعیں جلاتا رہا
میں تمدّن کے صحرائے پُر خار میں بن کے دیوانہ چکّر لگاتا رہا
مدرسوں، میکدوں، معبدوں میں پھرا! خانقاہوں کے در کھٹکھٹاتا رہا
قید خانوں میں کھیلا ہوں زنجیر سے! تختۂ دار پر مُسکراتا رہا
کانٹے چبھتے رہے، کانٹے چبھتے رہے! میں تری یاد کے گُل کھِلاتا رہا
پھر چہرے پہ پتھر برستے رہے! پھر بھی شعروں کے موتی لُٹاتا رہا
میرے ہونٹوں پہ مہریں لگائی گئیں! پھر بھی تیرے فسانے سُناتا رہا
عاشقی پہ سزائیں کڑی دی گئیں! پھر بھی میں عشق کے گیت گاتا رہا
تیرہ صدیوں کی کالی شبِ جاں گسل! اپنے قلب و جگر کو گھلاتا رہا
آپ رویا، جہاں کو رُلاتا رہا! خود جلا دوسروں کو جلاتا رہا
ایک جلتے توے پر تڑپتے ہوئے ساتھیوں کو تڑپنا سکھاتا رہا
میں نے زندہ رکھا اپنے احساس کو! اپنی رُوحِ خودی کو بچاتا رہا
ایک فردا کی امّید دل میں لئے، اپنے ماضی سے رشتہ مِلاتا رہا

آج بھی کیا وہ صحرا تجھے یاد ہے؟ ــــ ریت کا اک سمندر کھڑا پھار سُو!
اُونچی اونچی کھجوروں کی لمبی صفیں! وُہ بگولے، وہ جھکڑ، وُہ صرصر، وہ لُو!
گرد چشموں کے اترے ہوئے کارواں! سُرخ اونٹوں کی بجتی ہوئی گھنٹیاں!

اپنے خیمے لگاتے ہوئے ساربان! موج زن دُور تک شورشِ ہاؤ ہو!
بدویت ہر تصنع سے خالی وہاں! آدمی ہر تکلف سے عاری وہاں!
خود تمدن سے آزاد جلوہ فشاں ——— فطرتِ شعلہ رُو، فطرتِ سادہ خُو!
وہ انوکھی فضائیں حرارت بھری! کتنی اقدام آموز! تحریک زا!
ہر گھڑی تیز تر دل کی واں دھڑکنیں! ہر زماں گرم تر دواں رگوں کا لہو!
نت بگولوں کے طوفان اُٹھتے ہوئے، جیسے دل میں عزائم ابھرتے ہوئے!
ٹیلے بنتے ہوئے ٹیلے مٹتے ہوئے! نت تغیر کے سو شعبدے رُوبرو!
ہر زماں ایک منزل نئی سامنے! ہر زماں اک نئے مرحلے میں گزر!
ہر گھڑی اک نئی عشرتِ آرزو! ہر نفس اک نئی لذتِ جستجو!
جنگ کے قرنا روز بجتے ہوئے! بھالے چلتے ہوئے تیر چھٹتے ہوئے!
روز ترکش کے شانوں سے گرتے ہوئے! روز مٹی کو سیراب کرتا لہو!
اب وہ صحرا تجھے یاد ہو یا نہ ہو ——— تیرے خوابوں کی وہ جنتِ گم شدہ!
تیری تاریخ کا وہ سنہری ورق! ——— میں نہ مانوں اسے بھول سکتی ہے تو!

کیا خبر اب تجھے یاد ہے یا نہیں! تو نے میثاق باندھا تھا کوئی وہاں
ساری تاریخ کی وہ نمایاں گھڑی، اس پہ شاہد ہے یہ گھومتا آسماں
روم و ایراں کی تہذیبِ جبروت نے جب کھدیڑا تھا پامال کر کے تجھے
سوچ میں ڈوب کر یاد لا وہ گھڑی! ——— کوئی سنتا نہ تھا تیرا دردِ نہاں!
خود ترے پاسبانوں نے لوٹا تجھے! خود ترے مہربانوں نے توڑی جفا
کیسے جلاد تھے، کیسے قصاب تھے! نوچتے تھے ترے جسم سے بوٹیاں!
تو بھکارن بنی پھرتی تھی دربدر! ——— زندگی! اب تجھے یاد ہو یا نہ ہو!
رحم کھا کر بڑی گہری شفقت لئے، تیری جانب بڑھا اک قریشی جواں"
"تیری جانب بڑھا اک قریشی جواں" رحم کھا کر بڑی گہری شفقت لئے
اور پھر ہاتھ سینے پہ رکھتے ہوئے کعبے کے سائے میں دی تھی تجھ کو اماں
قوم کی قوم گو اس کی دشمن ہوئی، اس نے تجھ پر کوئی آنچ آنے نہ دی

اُس یتیمِ عرب کا یہ کردار تھا اپنے وعدے کا وہ بن گیا پاسباں ؛
اُس کی راتوں کی نیندیں اڑیں فکر میں، اور اس کے دِنوں کا سکوں چھن گیا
کوچے کوچے میں اس پر مسخر ہوئے، مسکرا کر وہ سہتا رہا پھبتیاں
اس کے رستے میں کانٹے بچھائے گئے، پتھروں سے وہ طائف میں زخمی ہوا
اس نے تیرہ برس تک پڑھیں آیتیں! اس نے تیرہ برس تک سنیں گالیاں
اس کے ایک ایک ساتھی کی جاں پر بنی! لوہے کے کوڑے حرکت میں آنے لگے
تپتی ریتوں پہ ان کو لٹایا گیا! کتنا سنگیں تھا ایمان کا امتحان!
اس کے اپنے چچا اٹھے بپھرے ہوئے، اس کے خونِ مقدس کے پیاسے ہوئے
اس نے آخر وطن کو کہی الوداع! اپنے گھر سے چلا ہو کے بے خانماں
سازشوں کے مسلسل بگولے اٹھے، جنگ کے تُند طوفان آتے رہے
وہ شجاعت کا پیکر تھا ثابت قدم، خنجروں کی چمکتی رہیں بجلیاں
اس نے اک آدمِ نو کی تشکیل کی! اس نے اک عالمِ نو کی تاسیس کی!
اس نے ایّام کی باگ ہاتھوں میں لی! اس نے تبدیل کی گردشِ آسماں
تجھ کو ایمان کا اس نے جوہر دیا، تجھ کو اخلاص کا اس نے زیور دیا
اس نے زنجیریں نوچیں ترے جسم سے، اس نے کاٹیں ترے پاؤں کی بیڑیاں
اس نے تجھ کو بڑا اونچا مقصد دیا! اس نے تحریک دی، اس نے جذبے دیئے
عقل و دانش کو ذوقِ جنوں بھی دیا، اس نے ذوقِ عمل کو کیا پرفشاں
اس نے نسل و وطن کی حدیں توڑ دیں، اس نے کڑیاں اخوت کی پھر جوڑ دیں
اس کے اشکوں سے سیراب ہوتا ہوا لہلہایا محبت کا باغِ جناں

لہلہایا محبت کا باغِ جناں! غنچے کھِلنے لگے، گُل مہکنے لگے ؛
ریگزاروں کی قسمت دِگرگوں ہوئی! شاخساروں میں بلبل چہکنے لگے
کیسے سنبل کی زلفیں لہکنے لگیں! کیسے شبنم کے موتی دمکنے لگے
مست نرگس کی آنکھیں مٹکنے لگیں! داغ لالہ کے دل میں دہکنے لگے
بیلیں انگور کی اونچی بڑھتی گئیں، ان میں خوش رنگ خوشے لٹکنے لگے

ڈالی ڈالی ہوئی وقت پر بارور، کچے پھل دھوپ کھا کھا کے پکنے لگے
مالی آخر گھنی چھاؤں میں سو گئے! سو گئے اور ایسے سوئے کہ بس کھو گئے
رنگ و بُو کے چلے دُور تک قافلے، چلتے چلتے یکایک بھٹکنے لگے
تو نے پھل توڑ کر اپنی جھولی بھری! مالی جاگے تو تیرا نشاں تک نہ تھا
وہ جو سبزے میں کھیلے، گلوں میں پلے، ان کے سینوں میں کانٹے کھٹکنے لگے
تجھ کو جنت سے شیطاں نے بہکا لیا، تو نے چُپ چاپ مغرب کا رستا لیا
تیرے محسن اِدھر ہمتیں ہار کر غم میں ڈُوبے، تری راہ تکنے لگے

عبرت آموز ہے آپ بیتی تری، پہلے نُوری تھی اور آج ناری ہے تو
تیرے قدموں میں دولت کے گو ڈھیر ہیں! پھر بھی سنتے ہیں قسمت کی ہاری ہے تو
گو زمینوں میں سونے کی فصلیں اُگیں! پھر بھی سنتے ہیں فاقوں کی ماری ہے تو
آہنی دیو بنتے ہیں بانے ترے! پھر لباسِ شرافت سے عاری ہے تو
وہ کہ صہبائیں، مینائیں تیرے لئے! پھر بھی مصروفِ خُونابہ باری ہے تو
یہ ثقافت کے کیف آفریں شعبدے! پھر بھی وقفِ غم و آہ و زاری ہے تو
فکر و کردار کی اتنی آزادیاں! پھر گلہ مندِ بے اختیاری ہے تو
آپ ہی اپنے ناوک کی صیدِ زبوں! چاند تاروں کی یوں تو شکاری ہے تو
ہیں ترے بس میں گو ایٹمی طاقتیں! جنگ کے دیوتا کی سواری ہے تو
تیری آمد سے جُھلسے چمن خُود ترا! اک عجب موجِ بادِ بہاری ہے تو
جس کی مٹی سے زہریلے کانٹے اُگیں! باغِ تخلیق کی ایسی کیاری ہے تو
عہد کو توڑنے کی یہ تعزیر ہے! عالمِ خاک پر آج بھاری ہے تو

پھر بلاتی ہے رُوحِ محمدؐ تجھے! بھُولی بسری مقدس فضاؤں میں آ!
مادیّت کے گھن چکروں سے نکل! اپنی معصوم فطری اداؤں میں آ!
آ، کھجوروں، ببُولوں میں چل، گھوم پھر! ریگزاروں میں بکھیتیوں میں گنگنا میں آ!
چھوڑ مغرب کے کبریلے ماحول کو! لوٹ کر مشرقی دھوپ چھاؤں میں آ!

اِن بہاروں میں آ! اِن خزاؤں میں آ! اِن ہواؤں میں آ! اِن گھٹاؤں میں آ!
زندگی! آ، سحر کی اذانوں میں آ! آدھی راتوں کی دکھتی دعاؤں میں آ!
اپنے ٹوٹے ہوئے عہد کو جوڑ پھر! رازداروں میں آ! آشناؤں میں آ!
پھر بلاتی ہے رُوحِ محمدؐ تجھے! بھولی بسری مقدس فضاؤں میں آ!

ارضِ مُردہ کے خوابیدہ ذرّو اٹھو! آسمانوں کو پھر تم پہ پیار آگیا!
تشنگی کے پیالے بھرو جھُوم کر! بن کے ساقی یہ ابرِ بہار آگیا!
مست کالی گھٹا تم پہ واری گئی! کیا پھواریں پڑیں، کیا جھڑی سی لگی!
تم کو اتنا ترستے ہوئے دیکھ کر، جوشِ رحمت کو بے اختیار آگیا
چھینٹا چھینٹا مشیت کا الہام ہے! قطرے قطرے کے سینے میں پیغام ہے
کتنا انعام ہے، کتنا اکرام ہے! دورِ نَو جس کا تھا انتظار، آگیا!
بیج مدفون تھے جو بھی پھوٹیں گے اب! ڈالی ڈالی شگوفے بھی پھوٹیں گے اب
سارے پت جھڑ کے افسون ٹوٹیں گے اب! پھر نمو آگئی، پھر نکھار آگیا!
ارضِ مُردہ کے خوابیدہ ذرّو اُٹھو! آسمانوں کو پھر تم پہ پیار آگیا!

مست کالی گھٹا جیسے اک جل پری، پَر پھیلاتی ہوئی پھڑپھڑاتی ہوئی
اک حسیں ملگجا بانا پہنے ہوئے، کالے گیسو ہوا میں اڑاتی ہوئی
اک روپہلی کناری کا آنچل لئے، نیلا آنچل مسلسل ہلاتی ہوئی
اس کا میخانۂ ذوق بحرِ شرب اپی کے صہبا چلی گنگناتی ہوئی
مسکراہٹ بھی کیا مسکراہٹ سی ہے! وقفے وقفے پہ بجلی گراتی ہوئی
بڑھتی ہے اپنا دامن جھٹکتے ہوئے، اپنے دامن سے موتی لٹاتی ہوئی!

ایک نامور مصنفؒ و صحافی کا گرامی نامہ

جناب محترم - السلام علیکم۔

چند روز ہوئے آپ کا گرامی نامہ کراچی ہوتا ہوا فاران کے ذریعہ سے مجھے یہاں ملا، پڑھا اور پڑھتا چلا گیا۔ نیچے آپ کا نام دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے جس وسعتِ ظرف سے کام لے کر، مجھے اور میری کتاب کو سراہا ہے اس کا واقعی مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ خوشی ہوئی کہ ـــــــــ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

مجھے اپنے بارے میں، یا اپنے خیالات کے بارے میں، یا اپنی کتاب کے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ لیکن ایک ایسے شخص کی کسی بات سے تأثر قبول کرنا، جو بہرحال شاملِ جماعت نہیں ہے، اور بہ ظاہر ایسے ادارہ سے منسلک ہے جس سے آپ کی جماعت کو بنیادی اختلافات ہیں، اور اس تأثر کو پوری رواداری کے ساتھ بیباک الفاظ میں، بغیر کسی ذہنی تحفظ کے واشگاف الفاظ میں بیان کر دینا، کم از کم سخن پروری کے اس دور میں، معجزہ سے کم نہیں۔ اور بلاشبہ یہ بات انہی لوگوں سے ظہور میں آسکتی ہے، جن کی دوستی بھی خدا کے لئے ہو، اور دشمنی بھی خدا کے لئے۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ میں اپنے جذبات کا صحیح طور پر اظہار کر سکوں۔

اپنے اور ادارہ کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں: میں نے آج تک کوئی فرمائشی چیز نہیں لکھی۔ صرف وہ لکھا جو خود چاہا۔ جس روز اسے یہاں نہیں پاؤں گا، اس دن، ملکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست!

جواب میں تاخیر کا معذرت خواہ ہوں۔ پیچش کا شدید دورہ پڑا تھا، ابھی تک نڈھال ہوں، اور ستم یہ کہ چند روز میں بھارت بھی جانا ہے۔

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیریت ہوں۔

نیازمند

رئیس احمد جعفری

۸۹۔ ٹیگور پارک، لاہور۔

سبط حسن دانش

ماہر القادری کی "فردوس"

نظم و نثر کی متعدد کتابوں کے جواں قلم مصنف ماہر القادری جنہوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت ادب میں کہنہ قدروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے اپنے تازہ ترین مجموعہ کلام "فردوس" کو زبان و بیان کی نکھری ہوئی خوبصورتی کے ساتھ زندگی کی ضرورتوں کو تخیلِ فکار کا زرنگار پیرہن پہنا کے سجا کر لائے ہیں۔ پاکستانی شاعری کی دس سالہ آزادی اور اس کے ارتقاء کے دور میں یہ اپنی نوعیت کا سب سے بہتر مجموعہ ہے۔ یہاں شاعر کی زبان اپنی پوری جولانی اور پختگی پر ہے۔ ماہر القادری کا ذہن و فکر حقیقت سے فرار اختیار نہیں کرتا اور نہ وہ اپنے ماحول سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کو سامنے رکھ کر اپنے شعروں کی تخلیق کرتے ہیں ان کے فن نے اُن فضاؤں میں جنم لیا ہے جہاں زندگی اور ادب یکجا ہو جاتے ہیں۔ یہ رجحانات ان کے ذہن میں اس حد تک رچے بسے ہیں کہ ان کا ہر خیال زندگی کے دامن سے چمٹا ہوا نظر آتا ہے۔ عمیق نظروں سے دیکھنے پر "فردوس" پاکستان کی تنقیدی تاریخ کا ایک ہلکا سا عکس معلوم ہوتی ہے۔ اس زمرہ میں جو نظمیں آتی ہیں اُن میں "مزدور سے" "اسلامی دستور" "آج بھی" "ان کو پہچانئے" "جائزہ" اور جھلکیاں بہت بڑی حد تک کامیاب ہیں یہ ضرورت ہے کہ بعض جگہ ماہر القادری کے بیان اور فکر پر اقبال کی چھاپ نظر آتی ہے وہ جگہ جگہ اقبال کے اندازِ بیان اور ان کے فلسفیانہ تفکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر یہ تقلید نہیں کہی جا سکتی اور یہ امر مسلم ہے کہ قریب قریب ہند و پاک کے تمام شاعروں کے ذہن پر اقبال سوار ہے۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ کوئی اس میں بالکل گم ہو گیا ہے اور کوئی ڈوب کر ابھر آیا ہے۔ کچھ آغاز ہی میں اقبال سے متاثر ہو جاتے ہیں اور کچھ انجام تک اس بحرِ بیکراں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم "یہ تو وہ راہ ہے جس میں راہبر بھی گم نظر آتے ہیں" تو کچھ بے جا نہیں ہے، مشہور انگریزی نقاد واٹسن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "ہر شاعر اور ادیب پر کسی نہ کسی شاعر و ادیب کا رنگ سوار رہتا ہے"۔ اور یہ بالکل سچ ہے کیونکہ ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں۔ اس لئے اگر ماہر القادری بھی کسی حد تک اقبال کے نظامِ شعر اور ان کی تاثیر کی مقبولیت سے متاثر ہیں تو کچھ بے جا نہیں ہے کیونکہ اقبال ہی صرف ایشیا کا وہ عظیم شاعر ہے جس سے آنے والی تمام نسلیں بجا طور پر متاثر رہیں گی۔

"فردوس" میں بنیادی طور پر اسلامی اصول و روایات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ماہر القادری نے اپنے روزمرہ کے تجربات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اور دوسروں کا درد اپنے فن میں سمویا ہے۔ "فردوس" میں انہوں نے ان بہت سے اہم مسائل کی ترجمانی کی ہے جو سماجی حقائق سے قریب تر ہیں اور جن سے ان کے عصری رجحانات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اس طرح وہ عوام اور خصوصاً اسلام کے علم بردار ہیں اور شاعرِ اسلام کہلانے کے بجا طور پر مستحق۔ وہ ادیب جو اپنے کو صرف عوام کا ترجمان بتاتے ہیں دراصل سستی شہرت کے متلاشی ہیں۔ ان کا ادب نہ عوام کے سہارے پر کھڑا ہوتا ہے اور نہ ان کا شعور محنت کش طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے اور نہ وہ

مکمل طور پر اس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ مگر فردوس میں ان باتوں کا پوری طرح سے لحاظ رکھا گیا ہے جو مقصد کی تنفیذ کے لئے عمل میں آتی ہیں مگر فردوس میں فرسودہ نظام سے ذہنی بغاوت کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے

"فردوس" کے آغاز میں حمد و نعت اور منقبت موجود ہیں جو ماہر القادری نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان میں ادا کی ہیں اور سچے اور عشق انگیز حقائق کی ترجمان ہیں اور جس قدر عقیدت ان میں موجود ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ بعض بعض اشعار تو تاثیر اور محبت کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

اے نام محمد صلِّ علیٰ ماہرؔ کے لئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

یا ؎

اشعار میں ظاہر کر دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے
اصحابِ محمدؐ سے ماہرؔ جتنی میں عقیدت رکھتا ہوں

مگر "بلبل و چکور" اور "محکوم و آزاد" جیسی نظمیں اقبال کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم پھر بھی ان نظموں میں پختہ کار راز صلاحیت جھلکتی ہے جو تصنع اور بناوٹ سے دُور ہے۔ اسلامی حرارت کے جذبات ابھارنے والی نظم "مسلمان عورت سے" بہت خوب ہے اور آخری شعر تو وجدان میں زلزلہ سا ڈال دیتا ہے۔ ؎

وُہی ہے راہ ترے عزم شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم

"فردوس میں "اندھی بھکارن" واقعاتی قسم کی ایک ہی نظم ہے جس میں مصورانہ طور پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس قسم کی نظمیں اُردو میں خال خال ہی ہیں۔ اس نظم کا انجام بھی شاعر نے اسلامی اصولوں پر رکھا ہے ع

"جس میں اک بڑھیا خلیفہ کا گریباں تھام لے"

"گزارش" ان کی بہت تاثیر انگیز اور سحر کارانہ نظم ہے جس کا ہر ہر شعر جاذبِ نظر اور دل میں کھب جانے والا ہے۔ اس میں ان کے دل کی دھڑکنیں صاف طور پر سنائی دیتی ہیں۔ یہ شاعرانہ سربلندی ہر حساس دل پر اپنا سکہ بٹھا دیتی ہے۔ اس نظم میں حسن آفرینی اور سوز و گداز بدرجہ اتم موجود ہے اور روانی بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جس کے سامنے کوئی بھی رکاوٹ نہیں۔ اگر اس نوع کی دو چار نظمیں اور ہوتیں تو فردوس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا۔ "پاکستان کا مستقبل" کے عنوان سے جو نظم فردوس میں موجود ہے وہ مجموعہ کی جان ہے۔ اس میں ماہر القادری نے بہترین الفاظ ترکیب کے ساتھ ملک کے ماحول پر حقیقانہ نظر ڈالی ہے۔ کاش پاکستان کا مستقبل اتنا ہی روشن ہوتا۔

"بہار کا منظر" اور "پرکھارت" منظر نگاری کے عمدہ مرقعے ہیں اور نیچرل شاعری کی عمدہ مثال ہیں۔ منظر نگاری میں اگرچہ تکلف اور مبالغہ [illegible] کے مقابلے میں یہ فن ہمارے یہاں ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے "درد" سید جعفر کی طرح ہمارے

یہاں آج تک کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا جس نے فطرت کا مطالعہ صحیح طور پر کیا ہو حالانکہ ایرانی شاعروں میں رودکی اور قاآنی اور عربی شعراء میں امرؤالقیس نے اس فن میں اپنے کمالات کا ایک اچھا مظاہرہ کیا ہے اور بعض جگہ وہ انگریزی شعراء سے بھی بڑھ گئے ہیں مگر انہوں نے بے جا مبالغہ اور بناوٹ سے کام لے کر فطرت کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔ جب نیچرل شاعری میں حقیقت سے گریز ہوگا تو وہ ایک ایسا بھونڈا سا نقش ہو کر رہ جائے گی جس پر سیاہی انڈیل دی گئی ہو۔

"فردوس" کی غزلوں کے حصّہ "برق پارے" پر اقبال محیط ہے اور زیادہ تر غزلیں اقبالی آہنگ اور انہی ردیف و قوافی میں کہی گئی ہیں جو بالِ جبریل میں موجود ہیں حالانکہ کہیں کہیں وہ اقبال سے بھی ٹکرا لے گئے ہیں اور کسی جگہ انہوں نے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔

"فردوس" کا تیسرا حصّہ "انجمن" ہے۔ یہ بھی غزلوں پر مشتمل ہے مگر یہ "برق پارے" کے لب و لہجہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ماہرالقادری کا مخصوص رنگ ہے۔ ان غزلوں میں عشق کی چاشنی، ظرافت، شوخی اور عہدِ شباب کی صنّاعی موجود ہے ان میں تغزّل بھی ہے اور تصوّف بھی، شگفتگی بھی ہے اور رعنائی بھی، موسیقی بھی ہے اور ترنّم بھی، تاثیر بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ مسرت کے چشمے بھی اُبلتے ہیں اور غم کے بادل بھی چھائے ہوئے ہیں اور مطالب و معانی کی بارش سی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وہ ان کا مخصوص طرز ہے جو اُن کے پچھلے مجموعوں میں صاف نمایاں ہے۔ ان میں سب شعر جنون و وجدان کی سرحدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں:۔ ؎

اے دوست تیری وعدہ خلافی کی خیر ہو
اب ڈگمگا رہے ہیں قدم اعتبار کے

یا ؎

تم آ گئے زہے قسمت تمہاری عمر دراز
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

نگاہ و دل کو تجلّی بنا دیا جائے — جو تم کہو تو یہ پردہ اٹھا دیا جائے
غرورِ حسن کی آخر کوئی نہایت بھی — کبھی کبھی تو ذرا مسکرا دیا جائے
حریمِ دل میں کوئی بے نیاز آتا ہے — چراغِ شوق و تمنا بجھا دیا جائے

اور یہ اشعار تو میرے ذہن میں بہت عرصے تک گونجتے رہیں گے ؎

وہ جو آئے تھے تو اے ضبط بعنوانِ خوشی
کم سے کم ایک ہی آنسو سرِ مژگاں ہوتا!

لالہ و گل نہ سمجھنا مرے دل کو اے دوست — غم کوئی رنگ نہیں ہے جو نمایاں ہوتا

تغافل کا گلہ اُن سے نہ کرنا تھا ابھی ماہرؔ
یہ تم نے کیا کیا بیتی ہوئی بازی کو ہار آئے

ایک پرانے اور فرسودہ مضمون کو ماہرالقادری نے کتنے اچھوتے اور عمدہ طریقہ پر ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ جانے یہ کیا وقت آیا ہے دل پر
تمہیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے

یا ؎

زندگی موت میں تبدیل ہوئی جاتی ہے
آخری حکم کی تعمیل ہوئی جاتی ہے

اور یہ شعر زندگی سے کتنا قریب اور معنی خیز ہے ؎

مُصیبت کا بھی اک مقصد ہے دنیائے حوادث میں
کہ اک ٹھوکر لگے اور آدمی ہشیار ہو جائے

اور بہت سے اس قسم کے شعر فردوس میں موجود ہیں جو اپنی لطافت کے باعث دل میں تیر کی طرح چبھ جاتے ہیں مجموعی حیثیت سے "فردوس" ایک گراں قدر مجموعہ ہے جس میں فن کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ مقصد اور نظریہ کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے نئے اصولوں اور تجربوں کو بھی عمدہ طریقے پر اجاگر کیا ہے۔ "فردوس" نئی قدروں کی علم بردار اور زندگی کا ترجمان ہے۔ ماہرالقادری نے سماجی تصور کو واضح اور روشن طریقے پر پیش کیا ہے۔ انہوں نے مقصد کے لئے فن کو قربان نہیں کیا ہے اور نہ وہ جذبات کی رَو میں بہہ کر بہکے ہیں۔ اگرچہ فردوس پر حقیقتاً فردوس کا اطلاق تو نہیں ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس پر ہمیں ناز کرنا چاہیئے ؛

بقیہ: "نیلوفر" از صفحہ ۱۴

بچّی کو سہارا دے کر اندر لے چلو"۔

دیر تک فلیٹ کے ایک کمرے میں سے نیلوفر کی سسکیاں سُنائی دیتی رہیں .... مگر ہر سسکی کے ساتھ گویا نیلوفر کے غم کا ایک انگارہ بجھ جاتا تھا .... !!!

چند لمحے میرزا ادیب کے ساتھ

——— ایک انٹرویو

ذکاء الرحمٰن

جناب ذکاء الرحمٰن کو چھوٹی عمر میں قدرت نے بڑے دماغ سے نوازا ہے۔ موصوف نے اپنی یہ تحریر اشاعت کے لئے عنائت فرمائی۔ ادیبوں سے لئے ہوئے انٹرویو کی اشاعت کے معاملے میں ہم ایک سابق تجربے کی وجہ سے محتاط ہو گئے تھے۔ ذکاء الرحمٰن صاحب سے درخواست کی گئی کہ آپ ایک بار اپنا مسودہ میرزا ادیب صاحب کو دکھا لیں۔ ان کے نقطہ نظر کی ترجمانی میں کوئی ایسا جھول نہ رہ جانا چاہیئے جس کے بارے میں انہیں بعد میں شکائت ہو۔ ہمارا مقصد ایسی چیزوں کی اشاعت سے یہ نہیں ہے کہ نامور ادیبوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوں بلکہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ذہنی لحاظ سے وہ جو کچھ بھی ہیں ان کو اسی طرح سمجھا جائے۔ چنانچہ ذکاء الرحمٰن صاحب نے گذارش کا منشاء پورا کر دیا، وہ مسودہ دکھلا لائے۔ میرزا ادیب صاحب نے تین مقامات پر واضح ترمیمات فرمائی ہیں۔

میرزا ادیب کے فنی مرتبے کا جو کچھ شعور ہمیں ہے، ہم اس کے لحاظ سے ان کی شخصیت کو باوقعت سمجھتے ہیں اور ان کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے۔ البتہ نظریات کا اختلاف اپنی جگہ پر ہے اور بہت ہی واضح ہے۔ ہمارے لئے یہ بہت مفید صورت ہے کہ ملک کے ایک نامور ادیب کا ذہن اسلام اور ادب اور اسلامی ادب کے بارے میں جو کچھ ہے ایک حد تک سامنے آگیا ہے۔

ذکاء الرحمٰن صاحب اس طرح کے انٹرویو دوسرے اہم ادیبوں سے بھی لینا چاہتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ سلسلہ دلچسپ اور بصیرت افروز ثابت ہوگا۔ (ادارہ)

جب پہلی بار میں میرزا ادیب سے ماہنامہ "ادبِ لطیف" کے دفتر میں ملنے گیا تو رگِ گل سے بھی باریک ہونٹوں اور چھتنار "ناک" والے میرزا ادیب "ادبِ لطیف" کے خریداروں کا رجسٹر کھولے، حساب کتاب میں مصروف تھے۔ میں خاموشی سے پاس والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب حساب کتاب سے فارغ ہو کر میرزا صاحب میری طرف ملتفت ہوئے۔

"کہیئے آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ نیز اگر لگے ہاتھوں آپ اپنا اسم شریف بھی بتا دیں تو عین نوازش ہوگی" ——— میرزا صاحب نے میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے، نہائت مزاحیہ انداز میں کہا۔

میں نے کرسی پر ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "جی بندہ کو ذکاء الرحمٰن کہتے ہیں۔ میں 'اسلامی ادب' کا ایک گمنام خادم ہوں۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور آپ سے انٹرویو لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"اچھا! تو آپ جماعتِ اسلامی کے ادب کے نام لیوا ہیں"۔ میرزا صاحب نے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر بے معنی خطوط کھینچتے ہوئے کہا۔ لیکن

بھائی آپ تو خفا ہو رہے ہیں۔ نہ آپ کے داڑھی نہ مونچھ، آپ کیسے ...."

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا: "اگر گستاخی معاف ہو تو چند ضروری باتوں کی تصریح کر دوں۔"

"فرمایئے" ————

"سب سے پہلی چیز جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ 'اسلامی ادب' سے مراد جماعتِ اسلامی کا ادب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام بہت وسیع مذہب ہے اور وہ داڑھی شرعی پاجامے اور استنجے کے ڈھیلوں میں مقید نہیں۔ اس لئے 'اسلامی ادب' کا نام لیوا ہونے کیلئے داڑھی رکھنا ضروری شرط نہیں۔ تیسرے یہ کہ علم و حکمت عمر پر منحصر نہیں۔ البتہ تجربات کا انحصار ضرور عمر پر ہے۔ چنانچہ اگر ہم گزشتہ علماء اور حکماء کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثریت ایسے اصحاب کی ہے جو پندرہ سولہ یا زیادہ سے زیادہ سترہ برس کی عمر میں علم و حکمت کے لحاظ سے کامل ہو گئے تھے خود مسلمان عالموں میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے بارہ برس کی عمر ہی میں علم و حکمت کی سرحدیں پھلانگ لی تھیں۔"

میری ان معروضات پر میرزا صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے بولے۔ "اچھا بھئی کل تو اتوار ہے۔ آپ پیر کے دن تشریف لے آئیں۔ پھر جو باتیں مجھ ایسے گمنام اور ایک کونے میں پڑے ہوئے ادیب سے پوچھنا چاہتے ہوں، پوچھ لیں۔"

مجھے بھی جلدی تھی، چنانچہ میں السلام علیکم کہہ کر چلا آیا۔

پیر وار کو میری طبیعت ناساز ہو گئی اور اس کے بعد امتحانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اس طرح میں قریباً تین ہفتے تک میرزا صاحب سے ملاقات نہ کر سکا۔

پرسوں امتحانات ختم ہوئے اور کل میں پھر میرزا صاحب کے ہاں 'ماہنامہ ادبِ لطیف' کے دفتر واقع سرکلر روڈ' میں جا دھمکا۔ اب کے میرزا صاحب ادبِ لطیف کے سالنامہ کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ اور ان کے سامنے والی کرسی پر مشہور شاعر ظفر اقبال صاحب بیٹھے تھے۔ میں میرزا صاحب کے دائیں طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سابق ترقی پسند اور حال سرکاری شاعر جناب ابنِ انشاء کے برادرِ خورد بھی تشریف لے آئے اور میرے ساتھ والی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ میں سلسلۂ گفتگو شروع کرنا ہی چاہتا تھا کہ پروفیسر غلام علی چوہدری ادبِ لطیف کے سالنامہ کیلئے 'اپنا افسانہ دینے آ گئے۔

میرزا صاحب نے انہیں تشریف رکھنے کی دعوت دی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ باہر پروفیسر صاحب کے دوست ان کا انتظار کر رہے تھے اور وہ جلدی ہی لوٹ گئے۔ میں نے معاً میرزا صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ بولے۔ "بھئی وہ تو بڑی پرانی بات ہو چکی۔ اور پھر میں تو ایک بادیہ نشین ادیب ہوں، میرا انٹرویو لے کر کیا کیجئے گا۔"؟

"اگر وعدہ کر کے پھر جانا' ترقی پسند ادب کی ایک قدر ہے تو میں نہیں لیتا آپ کا انٹرویو۔ اگر معاملہ برعکس ہے تو آج تو بہر حال آپ کو انٹرویو دینا پڑے گا" ———— میں نے اپنے چہرے پر مایوسی اور امید کے ملے جلے اثرات پھیلاتے ہوئے کہا ———— حملہ بڑا شدید قسم کا تھا۔ میرزا صاحب کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اور وہ "ہاں صاحب! تو شروع کیجئے" کہتے ہوئے کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور سوالات شروع کر دیئے۔

"آپ ترقی پسند ادب سے کیا مراد لیتے ہیں؟"

"میں ترقی پسند ادب سے وہی مراد لیتا ہوں جو ترقی پسند زندگی سے لی جاتی ہے۔ یعنی جو ادب زندگی کے ارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہو وہ

جو انسانی قدار کی نوک پلک سنوارنے کے سلسلے میں کوئی آئیڈیل (Ideal) پیش کرکے سفینۂ زندگی کو امن سکون اور حسن کا گہوارہ بنا سکے میرے خیال میں وہ ترقی پسند ادب ہے"

"کیا آپ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو ترقی پسند ادیب تسلیم کرتے ہیں ؟"

"تسلیم کرتا بھی ہوں اور ....."

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ میں منٹو کو بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ خاص طور پر ان کے افسانے "موذیل" اور "نیا قانون" فن اور زندگی کا بڑا حسین امتزاج ہیں۔ کہیں کہیں ان کا قلم ضرور فحاشی کی قلمرو میں داخل ہو گیا ہے مثلاً سرکنڈوں کے پیچھے وغیرہ۔ مگر اس طرح کے افسانوں کو ان کے فن سے کوئی علاقہ نہیں اور ان کے افسانوں کی عظمت کی اساس محض ایسے کمزور افسانوں پر نہیں ——————— باقی رہا عصمت چغتائی کا سوال تو انہوں نے متوسط طبقہ کی جنسی زندگی کی نہایت شاندار عکاسی کی ہے۔ بجز ایک افسانے لحاف کے جو انہیں خود بھی پسند نہیں۔"

"طنز و مزاح نگاروں میں سے آپ کس کس کو پسند کرتے ہیں ؟"

"طنز و مزاح نگاروں میں پطرس بخاری کو میں سب سے اونچا درجہ دیتا ہوں۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے مگر ان کے ہاں فن کی عظمت اور بے ساختگی ہی ہے جس سے فی الحال ہمارے بہت کم طنز و مزاح نگار مالا مال ہیں۔ ویسے کہیں کہیں شفیق الرحمان اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی بے ساختگی کا سراغ ملتا ہے مگر فنی چابکدستی اور لطافت نہیں"۔

"نسیم حجازی کے ناولوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"نسیم حجازی کے ناولوں کو میں ناول تسلیم کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ بلکہ اگر ان کے ناولوں کو خطبات اور وعظوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ان کے ناولوں میں مذہبی جنون ملتا ہے اور شگفتگی جو ناول کا جزو لاینفک ہوتی ہے نسیم صاحب نے ناول لکھتے وقت فن کی بنیادی اور اساسی اقدار کو قطعاً پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انہوں نے اپنے نام نہاد ناولوں میں تاریخ کے چہرے کو بالکل مسخ کرکے پیش کیا ہے اور اصلی واقعات و حقائق کا حلیہ بگاڑ کر اپنی مطلب برآری کے لئے توڑ موڑ کر انہیں اس طرح عوام کے سامنے پیش کیا ہے کہ تاریخ کا ایک طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیز نہ صرف تاریخی بلکہ ادبی بددیانتی ہے"۔

"کیا آپ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات سمجھتے ہیں ؟"

"یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام نے ایک ایسا آئیڈیل پیش کیا تھا جس سے ایک ترقی پسند معاشرہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اسلام کو اس کے اپنے وقت کا مکمل ترین اور سب سے بڑا ترقی پسند نظام حیات سمجھتا ہوں۔ لیکن موجودہ دور کچھ ایسا ترقی پسند اور زندگی کچھ اتنی پیچیدہ اور گنجلک ہو گئی ہے کہ اسلامی نظام کو اس کا ساتھ دینے کے لئے اور اس کا ہم رکاب ہونے کیلئے اپنی بہت کچھ اقدار کی از سر نو تشکیل اور تدوین کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میرا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور کی ترقی یافتہ مقتضیات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں "انسانیت" سے اکتساب کرنا چاہیئے"

"کیا اسلام اور انسانیت دو متضاد نظریئے ہیں ؟"

• اسلام اور انسانیت قطعاً متضاد نہیں۔ مگر ان کو ہم آہنگ کرنے کیلئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ویسے میں کلمہ گو ہوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اسلام کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ رکھا جائے تو بہتر ہے۔"

• اسلامی ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟"

• میں نے بہت غور کیا لیکن یہ اسلامی ادب کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ جب ادب کو کسی بھی مذہب سے متعلق کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ ادب نہیں رہتا بلکہ مذہب کے اصولوں کی تفسیر بن جاتا ہے۔"

• اقبال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟"

" میں اسے اس صدی کا بہت بڑا انسان سمجھتا ہوں۔"

• کیا آپ ظہیر کاشمیری کو ترقی پسند شاعر مانتے ہیں ؟"

• بالکل مانتا ہوں صاحب !"

وقت کافی ہو چکا تھا۔ میں نے میرزا صاحب سے اجازت چاہی۔ انہوں نے اپنی دو کتابیں "جنگل" اور "لہو اور قالین" اپنے دستخط کر کے عنایت کیں۔ "جنگل" پر انہوں نے مصحفی کا یہ شعر لکھ کر اپنے دستخط کئے :۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم + کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا !

دوسری کتاب "لہو اور قالین" پر یہ فقرہ لکھ کر اپنے دستخط کئے :۔

"ذکاء الرحمٰن کے لئے —— جس کی ذہانت سے میں بہت متأثر ہوا" ——

اس طرح یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔ اور میں میرزا صاحب کے اسلام کے متعلق کہے ہوئے فقرات پر غور کرتا ہوا ادبِ لطیف کے دفتر سے نکل آیا۔

چراغِ راہ ———

ایسے انٹرویو یوں تو محض ایک ادبی دلچسپی کی چیز ہوتے ہیں اور ان کو اسی حیثیت سے لینا چاہئے لیکن اس انٹرویو میں بعض خاص نکات بڑے قابلِ توجہ معلوم ہوتے ہیں۔

ادیب لوگ کسی معاشرے کے دل و دماغ ہوتے ہیں اور ان کی ذہانت سے خاص امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس صف میں میرزا ادیب کا مقام خاصا نمایاں اور بلند ہے کئی سال سے وہ فکر و تخلیق کے میدان میں ہیں اور انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل انسان اور اس کے کردار ول اور ادب اور اس کے ماله و ما علیہ کو زیر کاوش لیا ہوگا۔ ایسا آدمی اگر اسلامی ادب کی تحریک کو جماعت اسلامی کا ادب قرار دے تو دو میں سے ایک بدگمانی میں پڑنے پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کہ میرزا ادیب اسلامی ادب کے مفہوم کو سمجھے نہیں ہونگے، یا یہ کہ وہ سمجھنے کے باوجود مخلصانہ اختلاف کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر تحزب کے

پیدا کردہ متعصبانہ جذبات کے تحت ایک طرح کا پروپگنڈہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ مگر ہمارا مقام یہ کہتا ہے کہ ہم ان دونوں بدگمانیوں سے بچیں۔ ہمارے سامنے ایک تیسری صورت آتی ہے ـــــــــ یہ کہ میرزا ادیب نے اسلامی ادب کے نظریے اور اس کی تخلیقات و نگارشات کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے۔ غالباً ان کی نگاہ میں ایک صدائے تو جس میں نظریاتی اختلاف کی تلخی بھی موجود ہے اور جو پہلے کے جمے ہوئے نظریات کو چیلنج کرتی ہے، اتنی وقعت حاصل نہ کر سکی ہوگی کہ وہ اس پر اپنے وقت اور اپنے دماغی قویٰ کا کوئی حصہ صرف کرتے۔ لیکن اگر ہمارا یہی قیاس درست ہو تو جب بھی صورتِ معاملہ افسوسناک ہے۔ ذہنی طبقے سے تعلق رکھنے والے رجال کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وقت کی ساری آوازوں کو وہ پوری طرح سمجھیں اور جسے سمجھنے کے لئے وہ وقت نہ نکال سکے ہوں اس کے بارے میں سطحی طور پر فیصلہ کن اظہارِ رائے کرنے سے پرہیز کریں۔ مگر یہ تو آدمی کی محض اخلاقی ذمہ داریاں ہیں جن کو پورا کرنے پر اسے خارج سے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ ایک طرح کی بے بسی ہے کہ ہم ایسے ایسے بڑے لوگوں کے الٹے طرزِ عمل کو برداشت کریں اور دیر تک کرتے رہیں۔

لیکن ٹھنڈے دل سے مزید غور و فکر کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کا کوئی قصور نہیں، وہ بالکل مجبور ہیں ـــــــــ وہ خود اپنی ذہنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "یہ اسلامی ادب کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی"۔ کیوں سمجھ میں نہیں آئی؟ ـــــــــ اس کا راز بھی خود انہوں نے کھول دیا ہے۔ فرماتے ہیں: "جب ادب کو کسی بھی مذہب سے متعلق کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ ادب نہیں رہتا۔"

دراصل میرزا ادیب کی مشکل یہ ہے کہ وہ خود اسلام کی ماہیت سے آشنا نہیں ہیں۔ اس سبب سے اسلامی ادب کی اصطلاح ان کے ذہن کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ اور یہ پیچیدگی میرزا ادیب کے ساتھ خاص نہیں ہے، بہ حیثیت مجموعی ہمارے ذہین طبقے کو یہی الجھن درپیش ہے۔

اسلام جب ایک نظریۂ حیات پر مبنی ایک اجتماعی تحریک تھا تو تھا ـــــــــ اب تو وہ ہزار سالہ لمبے دورِ انحطاط سے گزر کر ہم لوگوں کو ایک جامد مذہب کی صورت میں ملا ہے۔ ہم پیدا ہوئے تو ہم نے اپنے ماں باپ اور محلے والوں کو چند بے جان عقیدوں اور چند پامال رسموں کو اسلام کے نام سے اختیار کئے ہوئے دیکھا۔ اسلام کی حقیقت جس اصل قرآنی سرچشمہ سے اخذ کی جا سکتی تھی، اس سے قوم کی قوم کا ذہنی تعلق کٹ چکا تھا۔ قرآن کے جو ترجمے ہمیں دیکھنے کو ملے، سیرت اور تاریخ کی جو کتابیں ہاتھ آئیں، ان سب میں اسلام کو مذہب بنا کر ہی پیش کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ سرمایۂ فکر ہمیں ہاتھ آیا کہ یہ مذہب دوسرے مذاہب سے قدرے زیادہ وسیع ہے اور کسی قدر عقلی قسم کا ہے، لیکن بس ایک مذہب ہی ہے۔ جو طبقہ اس مذہب کا انچارج بنا بیٹھا تھا اسے ہم نے پوری اجتماعی زندگی سے منقطع ایک عجیب سی حالتِ غنودگی میں پایا۔ اسلام کے ان ترجمانوں نے خود جو تصویر اسلام کی ہمارے سامنے پیش کی وہ حد درجہ محدود بھیانک اور بیزار کن تھی۔ پھر ہم کو عملی زندگی بسر کرنے کے لئے بنیادی فکر و شعور، زاویۂ نظر اور حکمت و بصیرت کے جس سرمائے کی ضرورت تھی اسے حاصل کرنے کیلئے ہمیں اپنا آپ ایک ایسے نظامِ تعلیم کے حوالے کرنا پڑا جو اسلام سے کھلا کھلا تخالف رکھتا تھا۔ ہم نے عمر کا ایک بڑا حصہ کھپا کر سوچنے کا جو نہج، اقدار کے جو پیمانے اور خیر و شر کے جو معیارات حاصل کئے وہ اسلام ـــــــــ بہ حیثیت جامد مذہب کے بھی اور بہ حیثیت تحریک کے بھی ـــــــــ سے قطعاً متضاد تھے۔ ہماری خودی بالکل ہی ایک اجنبی سانچے میں ڈھال دی گئی۔ ذہنی تشکیل کے اس مرحلے کو عبور کر کے جب ہم میدانِ حیات میں اترے تو ایک خدا ناشناس اور مادہ پرست جہانی تہذیب کی طوفانی یلغار سے سابقہ پڑا اور آخر کار یہ تہذیب فلسفہ و فکر اور ادب و شعر اور لٹریچر اور پروپگنڈے کی تند موجیں اچھالتی چلی آ رہی تھی۔ اس عالم میں کسی میرزا ادیب کا کیا قصور؟ ـــــــــ آج اگر معاشرے کے چند افراد نے تاریخ کے سینکڑوں ادوار کی مٹی ہوئی تہوں کی تہیں کھود کر اسلام کے تحریکی شعور کا خزانۂ حقیقت کھود نکالا ہے تو ابھی برسوں کی مدت درکار ہے کہ اس تحریکی شعور سے سارا ماحول آگاہ ہو جائے۔

بھی کتنے ہی میرزا ادیب اسلام کے بارے میں الجھیں گے اور کتنے ہی ذکار الرحمٰن اس الجھاوے پر متعجب اور پریشان ہوں گے۔ اغلباً موجودہ نسل جس کے ذہن میں اسلام کے متعلق ایک مایوس کن تصور، مذہب پینچ وارکیل کی طرح گڑا ہوا ہے اور اس کیل کو زنگ لگ چکا ہے، اسی طرح اپنے ذہنی الجھاووں میں پریشان ہوتی گزر جائے گی اور ایک نئی نسل اٹھے گی جو اپنے نئے میرزا ادیب پیدا کرے گی۔

جو لوگ اسلام کو ایک حامل نظریہ اجتماعی تحریک کی حیثیت سے نہیں جانتے، بلکہ ڈاڑھی اور مونچھ، لوٹے اور ڈھیلے، نماز اور روزے، ختم اور درود، قل اور چالیسویں جیسے اجزاء پر مشتمل ایک مذہب مانتے ہیں ان کا ذہن فی الواقع یہ تصور کیسے کر سکتا ہے کہ ایسے مذہب کا بھی ادب کے دائرے میں کوئی کام ہو سکتا ہے۔

اسلام کا تحریکی تصور جس نظریۂ حیات پر مبنی ہے وہ بھی دورِ حاضر کے مروّجہ نظریات کی طرح انسان کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے آراستہ کرتا ہے اور سوچنے اور حکم لگانے کا ایک نہج سکھاتا ہے۔ اس زاویۂ نگاہ اور سوچنے کے اس نہج کو لے کر جب کوئی صاحبِ دل زندگی اور انسان کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ایک خاص طرز کے تاثرات حاصل ہوتے ہیں اور اس کے خیالات ایک خاص سلیقے میں ڈھلنے کے لئے موزوں ہو جاتے ہیں۔ گویا نظریۂ اسلامی پورے ذہنی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس مخصوص طرز کے ذہنی عمل کا تخلیقی پرتو جب خارج میں منعکس ہوتا ہے تو ادب یا کوئی دوسرا فنِ لطیف ظہور پاتا ہے۔

ایک شخص زندگی کو ایک کھیل تماشا سمجھتا ہے، ایک شخص اسے ایک بے معنی اتفاقی حادثہ قرار دیتا ہے، اسی طرح ایک تیسرا شخص مسلم نظریۂ حیات کو اپنا کر اسے ایک معرکۂ کارزار بھی سمجھ سکتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو زندگی میں اوّلین اہمیت خواہشات کو دیں لیکن کچھ دوسرے لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اسلامی نظریہ کے زیرِ اثر تاریخ میں خواہش اور فرض کو برسرِ کشمکش پا کر اپنا پورا وزن فرض کے پلڑے میں ڈالیں۔ کوئی گروہ فن کے دائرے میں لذتیت اور تفریح کو منتہائے مقصود بنا سکتا ہے اور اسلامی شعور رکھنے والے کسی دوسرے گروہ کی نگاہ میں اخلاقی اقدار کی نشوونما مرکزی اہمیت حاصل کر سکتی ہے۔ ایک ادبی اسکول اگر قوم کے بُت کو زندگی کے مندر میں اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر اس کا پجاری بنتا ہے تو کوئی دوسرا ادبی سکول تحریکِ اسلامی سے اکتسابِ فکر کر کے انسانیت کے وسیع تر مشترک مفاد کا دیکھا ہو سکتا ہے۔ لٹریچر کی کوئی دنیا ایسی ہو سکتی ہے جو اس کائنات کو بے راجا کی اندھی نگری قرار دے کر فیصلے صادر کرے، لیکن کوئی دوسری دنیا ایسی بھی ہو سکتی ہے جو اسلامی فلسفۂ حقیقت کو اپنا کر عالمِ امکان کو ایک فوق الفوق حکمران کی منظم اور آئینی سلطنت قرار دے کر معاملات طے کرے۔ کوئی میرزا ادیب یہ کر سکتا ہے کہ وہ ادبی کاوشوں میں آخری معیار خیر و شر اپنے ذہن کو قرار دے اور مسلم ذہن رکھنے والا کوئی دوسرا میرزا ادیب ایسا بھی نمودار ہو سکتا ہے جس کے نزدیک فکری تضادات کے قطعی اور حتمی حل کا واحد وسیلہ الہامی ضابطہ ہو۔ ایک صاحبِ قلم عورت کو ہوس کا کھلونا بنا کر پیش کرنے میں ادبی کمال محسوس کرتا ہے تو کوئی دوسرا صاحبِ قلم ایسا بھی پایا جا سکتا ہے جو عورت کو ایک قابلِ احترام حیثیت دے کر اس کی عصمت و حیا کی پاسبانی کا فرض سرانجام دے۔

یعنی اسلام کا تحریکی نظریہ اسی طرح ایک امتیازی نوعیت کا فن کارانہ ذہن پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے دورِ حاضر کے مادہ پرستانہ نظریات! جیسے ان نظریات کے کھڑے کئے ہوئے ادبی اسکولوں کی منطق سمجھی جا سکتی ہے اسی طرح اسلامی ادب کی منطق بھی قابلِ فہم ہے۔

آج بھی اگر عالمِ انسانی کی تمام ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو وہ ان قدروں سے خالی نہیں ہیں جو اسلام کو ادب و فن کے دائرے میں مطلوب ہیں۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ یہی مشترک انسانی قدریں ہیں جو ادب کو عظیم بناتی ہیں۔ اور ہماری فطرت کو اپیل کرنے والی یہی قدریں کسی نگارش اور کسی

فنی تخلیق کو وہ ام بخشتی ہیں لیکن یہ قدریں جزء جزء ہو کر منتشر ہیں اور دوسرے متضاد اجزاء کے ساتھ آمیختہ ہیں حقیقت پارہ پارہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے میں مل جل گئی ہے۔ کچھ چمکتے ذرات ہیں جو ریت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسلامی ادیب یہ چاہتا ہے کہ ان ذرات کو چنے، سمیٹے اور مجتمع کرے۔ ان سے ایک کل تیار کرے۔ ان اوراقِ پریشاں کی شیرازہ بندی کر کے ایک نئی کتاب فن قلم بند کرے جو اوراق مرے سے گم ہو چکے ہیں ان کے خلاء کو پورا کرے۔ وہ پورے سلسلہ حقیقت کو بے آمیز کر کے یکجا لانا چاہتا ہے۔ حق اور باطل کے بے شمار مرکبات اس کے سامنے ہیں وہ اس ترتیب کو توڑ دینا چاہتا ہے اور دنیائے ادب میں فاروق بن کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دینا چاہتا ہے۔

اسلامی ادب اس ذہن سے پیدا ہوتا ہے جو انسان اور خدا، انسان اور انسان، اور انسان اور عالم مادی کے درمیان صحیح رشتہ دریافت کر سکے اور اس رشتے کو اپنی نگارشات کے ذریعے خیالات و جذبات کے عالم میں از سر نو استوار کر دے۔ یہ تین رشتے ہر نظریہ حیات نے اپنے اپنے طرز پر قائم کئے ہیں اور ہر نظریے نے ادب و فن کے دائرہ میں اپنا اثر چھوڑا۔ ان سب کی منطق سمجھ میں آسکتی ہے تو آخر ایک اسلامی نظریے کے تحت تشکیل پانے والے ادب کی منطق کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔

مگر یہ کوئی لڑائی جھگڑے کا معاملہ تو نہیں کہ کیوں سمجھ میں نہیں آتی ــــــــ واقعہ یہی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ اسلامی نظریہ ہمارے ذہنی عالم میں نووارد و پردیسی ہے۔ اس پردیسی کا تعارف ضرورت کی حد تک نہیں ہو سکا۔ یہ ہماری اپنی کوتاہی ہے مجبوراً سہی جس دن یہ نظریہ سمجھ میں آنے لگے گا اس دن اسلامی ادب کی منطق بھی معلوم ہو جائے گی۔

میرزا ادیب چونکہ اسلام کو مذہب سمجھ کر سوچتے ہیں اسی لئے وہ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ "اگر اسلام کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ رکھا جائے تو بہتر ہے۔" بات ٹھیک ہے، آخر ایک مذہب کو اس سے کیا غرض کہ کسی ملک کی سیاست کا کیا رخ ہے، اس کی معاشی تعمیر کن خطوط پر ہوتی ہے اس کا قانون کس ڈھنگ سے نشو و نما پا رہا ہے اور اس کا بین الاقوامی مرتبہ کیا ہے۔ مذہب کا کام تو یہ ہے کہ وہ فرد کو موضوع بنائے، اسے معاشرے کی تمام اجتماعی سرگرمیوں سے کاٹ کر الگ کسی غار میں لے جائے وہاں اسے وظائف بتائے اور چلے کھنچوائے، کشف کی سیر کرائے، دکھائے۔ روحانی کیف کا مشروب پلائے اور پھر نجات یا نجات کی سند دے کر چھوڑ دے۔ اس کے بعد وہ خود متقی اور پرہیزگار بن کر معاشرے کے اجتماعی نظام میں کسی کا ہاتھ بٹائے یا پردہ پوش ہو کر نظام کو چلانے والا بن جائے جو مجموعی ساخت کے لحاظ سے اس مذہب کا نقیض ہے۔ لیکن میرزا ادیب نے کبھی غور فرمایا کہ رسولِ اکرمؐ نے کیوں نہ اپنے اس مذہب کو اجتماعی دائرے سے الگ رکھا اور غارِ حرا سے فتحِ مکہ تک کی منازل کیوں طے کر ڈالیں؟ ــــــــ یہ سب کچھ اسلام کے تقاضوں کے تحت کیا یا (نعوذ باللہ) ان سے انحراف فرما کر؟ یہ خدا کا منشا تھا یا ذاتی امنگ تھی؟ پھر کیا آپؐ نے اسلام کو افراد کی انفرادی زندگی تک محدود قرار دے کر اجتماعی زندگی کے لئے اصول و قوانین کسی غیر اسلامی نظام سے مستعار لئے تھے یا وہ سب کچھ بھی اسلام کا اپنا تھا؟ پھر جو نظام برپا کیا اسے کسی خاص ملک اور زمانے کے لئے خاص قرار دیا یا اسے دوامی اور عالمگیر قرار دیا؟ اس نظام کے بنیادی اصول و احکام کو جوں کا توں قبول کرنے کا مطالبہ فرمایا یا قبول کرنے والے کلمہ گوؤں کو ان میں ترمیم و اصلاح کے اختیارات عطا فرمائے؟ ــــــــ ان سوالات کی روشنی میں جب میرزا ادیب از سر نو اپنے ذہنی عالم کا مطالعہ فرمائیں گے تو خود ان پر اپنے تضادات کی حقیقت کھل جائے گی۔

اور یہ سوال بھی تو ہے کہ اسلام کو اجتماعی زندگی سے الگ رکھنے کا مشورہ دینے والوں میں کتنے ایسے ہیں جن کی انفرادی زندگی ہی کم سے کم اسلام کے زیرِ تصرف ہو۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کو پوری طرح زندگیوں سے باہر نکال دیا جا چکا ہے اور اب اس کے نظریات و اصول پر سے

سے ایمان نہیں رہا بلکہ اس سے جو کچھ نسبت رہ گئی ہے اس پر بھی شرمساری و ندامت محسوس ہوتی ہے محض کچھ زبانی باتیں ہیں جو ذہنی بزدلی کی وجہ سے اسلام کی شان میں بطور تکلم احیاناً فرمائی جاتی ہیں۔ جیسے مشاعرے میں بیٹھ کر ایک شاعر کو داد دی جا رہی ہو اسی طرح کا ذہن ہے کہ جو "الحمد للہ کلمہ گو ہیں" کے الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کلمہ گو ہونا کیا بلا ہے۔ کمیونزم اور ترقی پسند مکتب ادب اور جمہوریت وغیرہ کے بارے میں کوئی اس طرح کی بات نہیں کرتا کہ ہم فلاں کے کلمہ گو ہیں۔ غریب اسلام ہی کے بارے میں یہ ایک نئی طرز نسبت پیدا ہو گئی ہے۔ اسلام کلمہ گو پیدا کرنے نہیں آیا اور وہ تو انسان کو ایک متحرک ذہن سے مالا مال کرنے اور ایک فعّال کردار پیدا کرنے آیا ہے۔ بدقسمتی سے آج وہ ایسے کئی کروڑ کلمہ گوؤں کے نرغے میں ہے جو اس کو مسجد و قبول میں پابجولاں کر کے خود اس کے مخالف نظریوں کی رضاکارانہ خدمت میں محو ہیں۔

اسی طرح رسولِ خدا کو سب سے بڑا انسان ماننا بڑی سعادت کی بات ہے اور ہر مسلمان سے یہی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن سب سے بڑا انسان ایک ہستی کو ماننے کے بعد اس کے دیئے ہوئے نظریۂ حیات کو عملاً مسترد کر کے دوسروں کے دروازے سے نظریات کی بھیک لینا اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کی ذہنی و عملی قیادت قبول کرنا ہم مسلمانوں کا ایک ایسا دردناک تضاد ہے کہ اپنا ہی ضمیر ماتم کرتا رہ جاتا ہے۔ "سب سے بڑا انسان" کے الفاظ سے جو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے، کیا ہمارا مجموعی طرزِ فکر اور ہمارا عملی کردار اس کی کچھ بھی شہادت دیتا ہے۔ فی الحقیقت ہم سب سے بڑا انسان ان لوگوں کو مانتے ہیں جن سے زندگی کا فلسفہ لیتے ہیں اور جن سے اپنے نظامِ حیات کے لئے بنیادیں حاصل کرتے ہیں۔

"اسلام اور انسانیت قطعاً متضاد نہیں ہیں" کے الفاظ مرزا ادیب کی زبان سے سن کر یقیناً ذکاء الرحمٰن صاحب کو مسرت ہوئی ہو گی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے "مگر" کہا ہو گا تو یہ چونکے ہوں گے، اور پھر جب یہ سنا ہو گا کہ "ان کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے" تو ان کی مسرت کا پیمانہ ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا ہو گا۔ جی ہاں! اسلام اپنے وقت کا تو بہترین ترقی پسند نظام تھا مگر اب زندگی اتنی آگے جا چکی ہے کہ اب اسلام ضروریات پوری نہیں کر سکتا اور "اب انسانیت" سے اکتسابِ فیض کر کے ہی اسلام کو مکمل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اس وقت انسانیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہا، انسانیت آگے بڑھ گئی ہے اور وہ پیچھے رہ گیا ہے، اب اس کو انسانیت کے مرتبے تک لانے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کیا کرنا ہے اور اسے کہاں کس طریقے سے کیا جا رہا ہے اور مرزا ادیب اس مہم میں کیا حصہ لے رہے ہیں، سوال یہ بھی تو سامنے آتا ہے کہ اگر انسانیت خود ترقی یافتہ ہے اور وہ اپنی جگہ مکمل ہے تو ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ اسلام کو پیچھے سے کھینچ کھانچ کر اس کے برابر لایا جائے۔ کیوں اس لایعنی کام پر وقت اور قوتوں کو بے جا طور پر صرف کیا جائے۔ ہم آج ایک تیز رفتار گاڑی پر اڑے چلے جا رہے ہیں، تو اب ایک خستہ بوگی کو جو تیرہ چودہ صدیوں کی دوری پر پیچھے رہ گئی ہے اس گاڑی کے ساتھ نتھی کرنے کے لئے کیوں چلتی گاڑی کو روکیں اور کیوں ایک انجن پیچھے بھیج کر اس کی واپسی کا انتظار کریں؟ یہ طرزِ فکر اسلام سے قطعاً مایوس اور بے نیاز کر دینے والا ہے۔ اسے آپ کتنے ہی خوبصورت اور دلخوش کن الفاظ میں لائیں، نتیجہ وہی پیدا ہو گا جو فی الحقیقت اس میں مضمر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فکر اور عمل کے تمام شعبوں میں جتنی ممکن شاہراہیں انسانیت کے سامنے آ سکتی تھیں ان سب کا جائزہ لے کر اسلام نے وہ شاہراہیں متعین کر دی ہیں جو انسانی فطرت کے لحاظ سے مستقیم ہیں اور جن پر چلنے میں نوعِ انسانی کی مشترک فلاح و بہبود منحصر ہے۔ اس لحاظ سے اسلام دینِ انسانیت، نظامِ انسانیت یا تحریکِ انسانیت ہے۔ وہ اپنے اصولوں کے لحاظ سے ماضی میں بھی انسانیت سے ہم آہنگ تھا اور آج بھی ہم آہنگ ہے۔ فرق یہ پیدا ہوا ہے کہ ہمارا ذہن اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہا اور کہنا یہ چاہیئے کہ اپنے ذہن

کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

میرزا ادیب نے نسیم حجازی کے ناولوں پر جو ناقدانہ رائے دی ہے افسوس ہے کہ وہ بھی تحزب کے پیدا کردہ جذبات منعکس کر رہی ہے۔ یہ حقیقت ادبی حلقوں میں معلوم عام ہے کہ ترقی پسندانہ مکتب ادب کے حلقوں میں نسیم حجازی بہت ہی مظلوم رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نسیم حجازی اس لحاظ سے واحد کامیاب مجلسی ادیب ہے کہ اس نے معاشرے کے سب سے کثیر التعداد خواندہ طبقے کو مخاطب بنایا ہے، جس کی طرف کسی ترقی پسند ادیب کو توجہ دینے کی مہلت نہ ملی۔ ہماری قوم جس میں تعلیمی ترقی کی رفتار بے حد سست ہے اور جس کے ادبی ذوق کا معیار بہت اونچا نہیں جا سکا، اس میں کچھ ادیبوں کا محض اپنے ذہنی تقاضوں سے اونچی اڑانیں اڑنا اپنی جگہ قابل قدر ہو تو ہو مگر تعمیرِ معاشرہ کے کام میں کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ نسیم حجازی کا ناقابلِ معافی جرم ان آسمان گردوں کی نگاہ میں یہ ہے کہ اس نے زمین پر رہنا پسند کیا ہے اور وہ زمین کے ان باسیوں کو جو اس کے گردوپیش جیسے ہوئے ہیں اپنے پیشِ نظر رکھ کر ادبی تخلیق کا کام کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس نے تعلیمی لحاظ سے متوسط ذہن کے لوگوں کو پکارا ہے جو تعداد کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عوامی حلقے میں کام کرنے والے ادیب کو اپنے مخاطب عنصر کے ذہن اور نفسیاتی ساخت کو دیکھنا ہے، ان کی سمجھ کا اسلوب اور ان کی گرفت میں آنے والی زبان اختیار کرنی ہے، ان کو اپیل کرنے والے موضوعات پیشِ نظر رکھنے ہیں۔ ہمارے آسمان پرواز ادیب جو مغرب کے موضوعات، اسالیب اور زبان کو جوں کا توں اٹھائے لئے چلے آ رہے ہیں نسیم حجازی جیسے عوامی اور قومی ادیب کے مسائل کا اندازہ ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ عالم بالا سے اس کی طرف نیچے جھانکیں گے تو حقارت کی نگاہ ڈالیں گے، مذاق اڑائیں گے، پھبتیاں کسیں گے اور اس کے کام میں کیڑے نکالیں گے۔

نسیم حجازی کا ایک گناہِ عظیم یہ بھی تو ہے کہ اس نے اپنی قوم کو اپنے سرچشمۂ فکر اور اپنے تاریخی میراث سے منحرف اور بے تعلق کر کے پرائے در کا بھکاری بنانا پسند نہیں کیا۔ وہ ہمارے ماضی اور ہمارے مستقبل کے درمیان رشتے کاٹنے والا ادیب نہیں، بلکہ ان دونوں کو مربوط رکھ کر درحقیقت ہمارے ملی ذہن کو تباہ کن خلفشار سے بچانا چاہتا ہے جسے برپا کرنا ترقی پسند ادیبوں کے پیشِ نظر ہے۔ اس کا گناہِ کبیرہ یہ بھی ہے کہ وہ مسلم ادیب ہے اور اسلام کی قدروں کے دیئے روشن رکھنے کی مہم میں لگا ہوا ہے۔ یہ حرکت ترقی پسند نقطۂ نظر سے ناقابلِ برداشت ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت نسیم حجازی کا ادبی کارنامہ بڑی بھاری تعمیری قدر و قیمت رکھتا ہے۔ وہ وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تاریخ کے ایسے ابواب ڈھونڈ کر لاتا ہے اور ان میں ایسے کردار چلتے پھرتے دکھاتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا عام آدمی اس کے ناولوں کو پڑھ کر ان کو اپنے حالات پر منطبق کرنے لگتا ہے اور ان سے عملاً اثر پذیر ہوتا ہے۔ معاشرے کے ذہن پر نسیم حجازی کے مقصدی ناولوں کے اثرات عالمِ واقعہ میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ میرزا ادیب نے ان پر تاریخی حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنے اور علمی بددیانتی سے کام لینے کا بہت ہی سنگین الزام لگایا ہے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی بحث نہیں کر سکتے، البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ ترقی پسند حضرات نے اب تک تاریخِ عالم اور تاریخِ اسلام کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی ہے اس کے ہوتے ہوئے نسیم حجازی پر یہ الزام کچھ پھبتا نہیں۔

نسیم حجازی کے ناولوں کو خطبات اور وعظوں کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے میرزا ادیب جیسے ذہین آدمی کو بہرحال ملحوظ رکھنا چاہیئے تھا کہ نسیم کس طبقے کو مخاطب بنا رہا ہے اور اس کے لئے کیا اسلوب کس درجہ موزوں ہو سکتا ہے۔

میرزا ادیب سے غائبانہ سہی، مگر ایک گونہ معاصرانہ و دوستانہ بے تکلفی ہے۔ اسی بنا پر یہ گذارشات پیش کی جا رہی ہیں۔ مطلوب کچھ سنوانا اور منوانا نہیں، محض سوچنے کے لئے کچھ اشارات و نکات مہیا کر دینا ہے۔ سوچنے ہی سے ہم ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔

اسعد گیلانی

تحریکی تصوف

صوفی محمد رفیق صاحب ہماری تحریک کے ایک سادہ دل کارکن ہیں۔ مدت سے وابستہ چلے آتے ہیں۔ ہر قسم کے حالات کے اتار چڑھاؤ میں ان کی وابستگی یکساں رہی ہے۔ نہ زیادہ تعلیم یافتہ، نہ دنیا کے معاملات میں زیادہ چاق چوبند۔ چند سمجھ دار دنیا دار آدمیوں کے درمیان بیٹھے ہوں تو شاید وہ انہیں کچھ وزن ہی نہ دیں۔ نہ ان کی باتوں میں وزن، نہ ظاہری معاملات کا گہرا فہم اور نہ ان کی صحبت میں ہنسی و دل لگی کی کوئی بات موجود

سادہ وضع، سادہ لباس اور سادہ فہم۔ اسی لئے رفقاء نے ان کو صوفی صاحب کہنا شروع کر دیا ہے۔ چہرے پر معصومیت اور سادگی لکھی ہوئی لباس میں ایک تہ بند اور ایک کرتا۔ اوپر سے ایک خستہ سا کوٹ یا کھدر کی چادر۔ ہر قسم کی چستی چالاکی اور فہمیدگی سے معرّا۔ زبان میں ٹھہراؤ بلکہ رک رک کر باتیں کرنے کی عادت۔ اجتماعات میں حاضری کے پابند۔ اگر کبھی غیر حاضر ہوں تو عذر معقول ہوگا۔ البتہ کبھی کبھی بھول جانے کا عارضہ ضرور لاحق ہے۔ اجتماعات میں مختصر اور سیدھی مطلب کی باتیں کریں گے اور اپنی ڈیوٹی سے غرض رکھیں گے

کیرو تھا۔ کے مہاجر ہیں۔ لوگوں نے آ کر بڑی بڑی دکانوں پر قبضے کئے لیکن انہوں نے الاٹ منٹ کو اپنے لئے حرام قرار دے لیا۔ ایک مڈل اسکول کے سامنے چھوٹی سی کیبن میں اسکول کے بچوں کی ضروریات کا کچھ مختصر سا سامان رکھا ہے جس میں صوفی صاحب بیٹھے ہیں۔ سلیٹیں، پنسلیں، کاپیاں، قاعدے اور کچھ بچوں کے کھانے کی چیزیں۔ بس یہی ان کی گزر بسر کا واحد ذریعہ ہے جسے وہ تحریکی کاموں کے ساتھ ساتھ چلا رہے ہیں۔ اجتماعات میں ہمیشہ اپنی ڈیوٹی جاننے کے خواہش مند اور بلا حیل و حجت اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تیار۔ نہ بحث، نہ مباحثہ، نہ مجادلہ، نہ فلسفہ، نہ تنقید۔

"صوفی صاحب یہ کام کل انجام دینا چاہیئے۔"

"اچھا جی" وہ جواب دیں گے۔

"صوفی صاحب آپ نے یہ کام ٹھیک طرح انجام نہیں دیا۔"

"اچھا جی۔ آئندہ بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"صوفی صاحب آپ نے جماعت کو کافی وقت نہیں دیا۔"

"اچھا جی۔ جو دن مقرر کر لیجئے دے دوں گا۔"

غرض صوفی محمد رفیق صاحب کے ہاں اپنی غلطی کے اعتراف، اپنے کام کی کوتاہی اور اپنی ڈیوٹی پر رضامندی کے لئے "اچھا جی" کے سوا اور کوئی کلمہ نہیں ہے۔ نہ لمبے عذرات، نہ لمبی تاویلیں، نہ لمبے فلسفے۔ عرب کے اس بدو کا نقشہ جو دُور دراز سے چل کر سرورِ عالم کے پاس آتا تھا اور کہتا تھا:

"یا رسول اللہ مجھے اسلام کی تفصیل بتائیے" ——— اور جب آپ نے اسے نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے احکام بتائے تو اس نے کہا،
"خدا کی قسم میں ان باتوں میں کچھ کمی بیشی نہ کروں گا"۔
آپ نے فرمایا تھا "اگر اس نے سچ کہا ہے تو کامیاب ہو گیا"۔
صوفی محمد رفیق صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ انہیں اتنا کام بتا دیجئے جتنا ان کے بس میں ہے۔ بس وہ عمل لگا کر دیں گے۔ جو نہیں کر سکے تو اس پر جو جی چاہے کہہ لیجئے، جواب ہو گا
"اچھا جی۔ آئندہ بہتر کرنے کی کوشش کروں گا"۔
بیت المال بالکل خالی تھا اور تبلیغی مقاصد کے لئے چند رفقا کو ایک مہم پر بھیجنا ضرور تھا۔ روپے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن نہ نقد موجود تھا اور نہ قرض لینا ممکن تھا۔ رفقاء کا خصوصی اجتماع بلایا گیا اور ان کے سامنے تحریک کی ضرورت رکھ دی گئی۔ سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دیا۔ بعض نے وعدے کر لئے۔ ایک صاحب نے جو اچھے کھاتے پیتے اور مالی اعتبار سے ساتھیوں میں کافی اچھی حالت میں سمجھے جاتے تھے اپنی تنگدستی کا عذر کر کے انکار کر دیا۔ اور پھر صوفی محمد رفیق صاحب کی باری آئی تو انہوں نے اپنے خستہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سی ریزگاری اور چند روپے نکالے اور گن کر دس روپے دے دیئے اور باقی کے چند آنے جیب میں ڈال لئے۔ وہ سیدھے دکان سے آئے تھے۔ ان کے اس مالی ایثار سے رفقاء نے بڑا اثر قبول کیا۔
ظہر کے بعد محلے میں میاں ان کا ملاقاتوں کا مشترکہ پروگرام تھا۔ میں ان کے مکان پر گیا تو دستک دینے پر وہ باہر آئے۔
"تھوڑی دیر تشریف رکھئے میرا کرتا سوکھ جائے" انہوں نے سادگی سے کہا۔ وہ اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے۔
"دوسرا پہن لیجئے، وقت ضائع ہو گا"۔ میں نے اچانک کہہ دیا۔
"وہ ایک ہی ہے"۔ انہوں نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا
اور میرا سر مزید جھک گیا۔

بقیہ: ایک دلچسپ خط و کتابت۔ از صفحہ ۱۵

... میں پیشکش کرتا ہوں کہ اسی کو جوں کا توں شائع کر دوں گا۔
ہاں ایک گزارش اور ——— یہ کہ آپ اپنی جگہ خود غور کریں کہ اگر ہم انسانیت کی سطح سے ایک بار گر جائیں تو کونسی قانونی کارروائی ہم کو اخلاق و شرافت کا درس دے سکتی ہے۔ اور اگر ابھی ایک دوسرے سے انسانیت کی تھوڑی بہت توقع کی جا سکتی ہو تو قانونی کارروائی کی گفتگو چھیڑ دینا افسوسناک ہے۔ ہمارے متعلق مایوس ہو جانے سے پہلے آپ کو اس طرح کی بات سوچنی نہ چاہیئے تھی۔
جواب کا انتظار رہے گا۔ نعیم صدیقی

نوٹ: اس خط و کتابت کو پڑھ کر اگر محمد مرتضیٰ اسکیپا صاحب کوئی تصریح فرمانا چاہیں تو ہم ان کو بھی موقع دینے پر تیار ہیں۔ (چراغِ راہ)

کوثر نیازی

غ

نگاہوں کی دولت، ادا کے خزینے — غزل کے اشارے، غزل کے قرینے

محبت کی منزل میں غم واپسی کا ؟ — یہیں پھونک دو رہروو! یہ سفینے

مریضِ معاصی سنبھل جائے شاید — ندامت کے آنے لگے ہیں پسینے

اِدھر بھی شہِ دوجہاں اک نظر ہو ! — کہ اُجڑے ہوئے ہیں دلوں کے مدینے

کسی قوم کا کب سہارا بنے ہیں؟ — عزائم سے خالی جوانوں کے سینے

وہ پہلی سی اب دشمنی بھی نہیں ہے — زباں پر خوشامد ہے، دل میں ہیں کینے

رہِ دوست میں مر مٹے کیوں نہ کوثرؔ

زیاں کا یہ احساس دیگا نہ جینے

نعیم صدیقی

غزل

وفورِ گریہ ہے! وہ آ گئے تو کیا ہوگا
وہ ساری بات معاً پا گئے تو کیا ہوگا

تمہاری پلکوں کے تارے بڑا سہارا ہیں
اگر یہ تارے بھی کجلا گئے تو کیا ہوگا

ہنوز شاخِ تمنّا پہ چار پھول تو ہیں،
یہ چار پھول بھی کملا گئے تو کیا ہوگا

یہ چہرے جن پہ ہے اب بھی وفا کی تابانی
یہ چند چہرے بھی سنولا گئے تو کیا ہوگا

یہ چند ذرّے ہیں تعمیرِ نو کا سرمایہ
بہم دگر یہی ٹکرا گئے تو کیا ہوگا

اُٹھے ہیں رند جو احیائے میکدہ کیلئے
فریبِ زُہد اگر کھا گئے تو کیا ہوگا

ہم اُن سے کیسی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں
وہ اُلٹا اور بھی تڑپا گئے تو کیا ہوگا

ارادے آہنی باندھے ہیں تیرے بندوں نے
خدائے دہر! یہ خم کھا گئے تو کیا ہوگا

وہ جن کی چارہ گری پہ ہمیں بھروسا ہے
جگر کو اور بھی برما گئے تو کیا ہوگا

حرم کے والیو! تم تو مراقبوں میں رہو
بتانِ دَیر یہاں چھا گئے تو کیا ہوگا

اِفتخار اعظمی

غ

یوں تو کیف اُن کی ہر اک بات میں ہے ‏— اور ہی بات اِشارات میں ہے

حرم و دیر میں باقی نہ رہی ‏— وہ مُروّت جو خرابات میں ہے

سازِ فطرت کی نوائے خاموش ‏— نفسِ صُبح کے نغمات میں ہے

وُہ لطافت جو بیاں ہو نہ سکے، ‏— چشمِ ساقی کے اشارات میں ہے

ایک ہنگامۂ انوارِ سحر ‏— شب کے تاریک حجابات میں ہے

وُہ تسلسل جو کبھی ختم نہ ہو ‏— دیدۂ تر کی حکایات میں ہے،

دلِ صد داغ کے پھولوں کی بہار ‏— چشمِ خوں بار کی برسات میں ہے،

نالۂ نیم شبی میں ہے گُداز

کیفِ سجدہ ہے تو بس رات میں ہے

نیلوفر

ضیاء الرشید

آج نیلوفر بے حد غمگین تھی !

اسٹوڈیو کے میک اپ روم میں بہت سی ایکسٹرا لڑکیاں دن بھر کی شوٹنگ کے بعد میک اپ اتارنے اور باتیں کرنے میں معروف تھیں۔
مگر نیلوفر آج خاموشی سے بھرے ہوئے چہرے کا رنگ اتار رہی تھی۔ دن بھر وہ ہیروئین کی درجن بھر سہیلیوں میں سے ایک بنی رہی۔ ہیروئین کی جھری
شادی کا روائتی منظر فلمایا گیا۔ حسب دستور بد نصیب ہیروئن کی یادیں گلیسرین کے گاڑھے آنسو بہاتی ہوئی دلہن کے ایکسٹرا لڑکیاں گدگدیاں لیتی رہیں
چٹکیاں لیتی رہیں بار بار اس کے گال نوچ کے اور ناک پکڑ کے مسرت کا اظہار کرتی رہیں، وقتاً فوقتاً اس کا گھونگھٹ اٹھا کے خود دیکھنے کے بہانے کیمرے
کو دکھاتی رہیں اور ساتھ ساتھ ایک بوز دھن والے کورس کے واہیات بولوں پر اپنے لب بھی ہلاتی رہیں۔
کھانے کے وقفے تک نیلوفر حسب معمول ہیروئین کے قریب تر رہنے کی کوشش میں منہمک رہی۔ مگر چونکہ ہر لڑکی اپنی جگہ یہی کوشش میں لگی ہوئی تھی اس
لئے ایک دفعہ تو ہیروئین جھنجھلا کر برس پڑی !

"توبہ ہے .... یہ لڑکیاں اوپر گری پڑتی ہیں"

کیمرہ مین نے کہا: "بھئی اطمینان رکھو تم سب کے "کلوز اپ" لوں گا"
سکرین پر چند سیکنڈ کے لئے "کلوز اپ" کی قیمت کوئی کسی ایکسٹرا لڑکی سے پوچھے۔ "کلوز اپ" کی امید پر ہی کسی ایکسٹرا لڑکی کے ذہن میں ستارے
جھلملانے لگتے ہیں اور وہ تصوراتی کہکشاں پر سرور کیف کے عالم میں کھلے گیسو، نیم وا لبوں اور نیم وا نگاہوں کے ساتھ حریری آنچل کی طرح لہراتی ——

...... دور بہت دور نکل جاتی ہے ....!!

"کلوز اپ" کا وعدہ سن کر لڑکیوں کی نگاہوں میں وہ چمک پیدا ہوئی جو کسی بھوکے کی آنکھوں میں روٹی دیکھ کر عود کر آتی ہے !
مگر .... ! جیسے کسی اندھیری غار میں ماچس کی تیلی جل کر بجھ گئی ہو !! ذرا سی دیر کے بعد لڑکیوں کے چہرے بھیڑوں کی طرح ملبوتر ہے
اور اداس دکھائی دینے لگے ...... کیونکہ ایک آدھ خوش نصیب لڑکی کے کلوز اپ کے بعد ہی ہیروئین کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوگئیں اور

کیمرہ اس کی طرف موڑ دیا گیا ....!!

کھانے کے وقفے کے بعد نیلوفر ایکا ایکی مغموم اور پریشان نظر آنے لگی۔

سردار بیگم اتی پروڈکشن منیجر "تاج دین" اور ایکسٹرا سپلائر لال محمد سے لڑکیوں کا حساب لے کر نیلوفر کی تلاش میں بڑبڑاتی اور پاؤں پٹختی

ہوئی آئی اور اُسے دیکھتے ہی بولنے لگی!

"ہائے تو ابھی تک یہاں ہی ہے۔ اندری' دلشاد سب موٹر میں تیری راہ دیکھ رہی ہیں۔ آج تاجے نے ہمیں پہلے ہی پھیرے میں بٹھادیا ہے....
......چل جلدی کر اب تو ساری دنیا میک اپ' اتار چکی۔"

سردار بیگم ایک جہاں دیدہ' دریدہ دہن' مضبوط ہاتھ پاؤں اور (اب) بھاری ——— تھل تھل کرتے ہوئے جسم اور اونچے سروں کی ایک قدآور عورت تھی۔ سردار کی شادی چودہ برس کی عمر میں ایک بند لفافے جیسے مہربلب قسم کے ڈاکئے سے ہوگئی۔ نور محمد ڈاکیہ اگرچہ گھر میں تقریباً اسی خاموشی سے رہا کرتا جس خاموشی سے وہ گھروں کے باہر لگے ہوئے لیٹر بکسوں یا بند دروازوں کی جھریوں میں خطوط ڈالتا چلا جاتا' مگر سردار بیگم کو وہ دل سے چاہتا تھا اور عید تہوار کے انعامات سے لے کر سرکاری تنخواہ تک جوں کی توں اس کے مہندی لگے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا۔

لیکن سردار کا یک جیسے تنگ و تاریک سرکاری کوارٹر میں گویا تاروں پہ کمندیں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سردار جاہل تھی مگر اس کا دماغ ڈاک خانے کے لفافے کی طرح سربمہر نہیں تھا۔ اور اس کا دل تو گویا چوراہے کا پوسٹ بکس تھا جس میں ایک رنگین زندگی کی رنگارنگ آرزوؤں کا ہر وقت ڈھیر لگا رہتا۔ تقریباً دو سال کے بعد سردار بیگم بھاگ کر فلم نگر جا پہنچی۔ اس نے بمبئی' لاہور' کلکتے' اور مدراس تک کے اسٹوڈیوز کی خاک چھانی۔ درجنوں فلموں میں ایکسٹرا رول ادا کئے۔ یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں سے وہ وابستہ رہی۔ اس میں "نیم مہذب"، "چا قو مار" سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ اور یہ سب بھی کسی نہ کسی رُخ سے فلم لائین ہی سے وابستہ تھے۔

الغرض جوانی ان ہی ہنگاموں کی نذر کر کے وہ فلم پارک کی ایک متروکہ بلڈنگ کے فلیٹ میں بوڑھی مکڑی کی طرح بیٹھ گئی کہ سب سے پہلے دلشاد اور اصغری فلمی ٹھوکریں کھاتی ہوئی اس کے فلیٹ میں آ پہنچیں۔ سردار بیگم نے فوراً ان کی سرپرستی قبول کر لی.... یوں بھی اس کا ہاتھ تنگ تھا!!

ان کے بعد سلمہ اور پھر سال بھر سے نیلوفر سردار کے سایۂ عاطفت میں آ چکی تھی۔

اب سردار بیگم خود بہت کم میک اپ کیا کرتی۔

فلم والوں سے لے کر پولیس والوں تک اُسے شب و روز واسطہ پڑتا تھا۔

نجم جس کا اصلی نام نور الٰہی تھا تین ماہ تک ایک ہوٹل میں نیلوفر کو رکھ کر آخر ایک روز خود کہیں غائب ہو گیا۔

نجم اتفاق سے کسی حد تک ملک کے ایک مشہور و معروف فلمی ہیرو سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے دوستوں نے اس کے اس احساس کو یقین میں بدل دیا۔ لہٰذا جو کچھ وہ فلمی ہیرو سکرین پر کرتا ہوگا...... نجم اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے کرنے لگا۔ فلمی ادب' کا مطالعہ تو وہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی کیا کرتا تھا۔ بنک میں کلرکی ملی تو فلمی رسائل کو دل کی باتیں سوالات کی صورت میں لکھنے لگا۔

جواب ہمیشہ اسی قسم کا ملتا۔ "پہلے حسین سہارا تلاش کیجئے"۔

نیلوفر نے آخر ایک روز اپنی سہیلیوں سے سینما ہال میں انٹرول کے دوران میں کہہ دیا کہ جلد ہی تم لوگ اسی سکرین پر میری فلم دیکھو گی۔

یہ بات کہنے کے بعد نیلوفر کو ——— محسوس ہوا جیسے اس کے سینے پر سے وہ بوجھ ہٹ گیا ہے جسے وہ کئی ماہ سے محسوس

پہنچی تھی۔

نجمہ کا ہم شکل فلمی ہیرو نیلوفر کا بھی محبوب اسٹار تھا۔ نجم کو وہ اکثر اسکول آتے جاتے محلے کے چوک میں پان کی دکان پر، راستے میں کیفے ڈی ول بہار کے دروازے پر، بس اسٹاپ پر ایکٹنگ کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی ــــــــ !!

فلمی انداز میں راہ و رسم پیدا ہوئی اور نامہ و پیغام سے "ریستورانی ملاقاتوں" تک پہنچی !!

اور پھر ایک روز ہیڈ کلرک خادم حسین کی بیٹی نیلوفر جس کا اصل نام کنیز فاطمہ تھا اپنے شہر سے دور نجم کے ساتھ .... خیالوں اور آرزوؤں کے تیز دھاروں پر بہتی ہوئی چلی آئی .... !!!

مگر آج نیلوفر اس رات سے بھی زیادہ مغموم تھی جس رات کے بعد نجم سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد نیلوفر "باسکٹ بال" کی گیند کی طرح ہاتھوں ہاتھ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں ہوتی ہوئی گویا لوہے کے چھلے سے نکل کر .... سردار بیگم کے فلیٹ میں آ پہنچی تھی۔

اُسے سردار بیگم اور لال محمد ایکسٹرا سپلائر کی وساطت سے کئی "ہیرو" اور "ہونے والے ہیرو" "ڈائریکٹروں اور ہونے والے ڈائریکٹروں" پروڈیوسروں اور ہونے والے پروڈیوسروں کے قرب کے مواقع میسر آئے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے نیلوفر کو اس کے چہرے کے خط و خال کی دلکشی، اس کے اعضاء کے حسن تناسب، اس کی نگاہوں کے جادو اور اس کی چال کے فتنے کا احساس دلایا اور اس "ضوفشاں مستقبل" کا ذکر کیا جس کے بارے میں وہ خود "فلمی ادب" کے مسلسل مطالعے سے بہت کچھ پہلے ہی جانتی تھی۔

اب تو نیلوفر کی قوتِ متخیلہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی فلمی اشتہار ہو، یا سائن بورڈ .... وہ دیکھتے ہی ہیروئین کے چہرے کی جگہ اپنا چہرہ اور نام کی جگہ اپنا نام محسوس کرنے لگتی۔ ہر گھڑی ہر پل وہ خود کو ایک شہرت یافتہ "ہیروئین" تصور کئے رہتی۔ وہ اپنے ماضی حال اور مستقبل سب سے بے نیاز ہو کر صرف اسی دل فریب خیال سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ اپنے اس بیداری کے خواب سے اکتا جاتی۔ یہ لمحات اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوتے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر سوچتی "کتنا بڑا ظلم ہے کہ میں سمندر کے کنارے پیاسی کھڑی ہوں .... فلم کمپنیاں کھل رہی ہیں .... فلموں کے مہورت ہو رہے ہیں .... فلمیں مکمل ہو رہی ہیں .... فلمیں ریلیز ہو رہی ہیں .... اور میں ؟

آخر نیلوفر نے بے بس ہو کر "شبنم کے قطرات" پر ہی قناعت کر لی .... وہ "ایکسٹرا گرل" بن گئی۔

ایکسٹرا سپلائر لال محمد اور سردار بیگم کی کمیشنوں کے بعد رات یا دن بھر کے چار پانچ روپے ہاتھ آ ہی جاتے۔ یا پھر کبھی کبھی کوئی شوٹنگ نہ ہونے کے باوجود "رات باہر گزارنے" کے چند روپے مل جاتے !

قسمت نے ایک دفعہ زور لگایا اور ایک فلمی پرچے کے کسی بوگس "فلمی اشتہار" کے آخر میں "اور نئی دریافت نیلوفر" کے الفاظ تک چھپ گئے۔ نیلوفر نے ان الفاظ پر امید کا ایک خوبصورت محل بنا لیا تھا ...... جو مسمار ہوا تو اسے فطری طور پر بے حد رنج پہنچا ......!

یوں نیلوفر کو آئے دن طرح طرح کے صدمات سے دوچار ہونا پڑتا تھا مگر آج تو اس کا غم سمندر کی غضب ناک موجوں کی طرح اس کے سفینۂ دل پر مسلسل حملے کئے جا رہا تھا ......!

نیلوفر اتنی افسردہ اس وقت بھی نہیں ہوا کرتی تھی جب اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فلم کمپنی جس کے سرپرستوں کے انتہائی قریب ہو کر اس نے "ہیروئن" یا "ہیروئن کی بہن" یا اس قسم کے کسی اور رول کا وعدہ لیا تھا .... حسب معمول ٹھپ ہو گئی ہے کئی ماہ کا کرایہ ادا نہ کرنے کی بنا پر مالک مکان نے دفتر کا فرنیچر، ہارمونیم کی پیٹی اور گھنگرو ضبط کر لئے ہیں۔ تیار ہونے والے فلم کے ٹل پاس پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ہیرو کی اپنی لکھی ہوئی کہانی، مکالمے اور گانے جلا دیئے ہیں۔ نئے چہروں کی تصویریں اور ان کی عرضیاں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی ہیں۔ کمپنی کا بورڈ پینٹر اتار کر لے گیا ہے کیونکہ اُسے ابھی تک آدھے پیسے نہیں ملے تھے۔ دفتر سے ملحقہ پان سگریٹ اور ہوٹل والے الگ آہیں بھر رہے ہیں اور وہ حضرت خود اپنے بیکار حواریوں کے ساتھ اب کسی سستے ہوٹل میں بیٹھے چائے پی پی کر غم غلط کر رہے ہیں اور ہر ہمدرد سے اپنی رُوداد کچھ یوں بیان کرتے ہیں :

" بھئی کیا بتاؤں .... کہانی، کاسٹ وغیرہ سب تیار تھی کہ عین وقت پر فنانسر نے دھوکا دے دیا .... !"

نیلوفر ایسے "دن سٹار بنا دینے" یا "بنا دینے" والے کہنہ مشق اوباشوں کی فلمی باتوں میں آ کر صدمے اٹھاتی رہی .... مگر اسے آج جتنا رنج کبھی نہیں ہوا تھا! اسے اکثر ہمت شکن اور المناک واقعات سے دوچار ہونا پڑتا تھا مگر آج جتنی محزون وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسا دل گیر غم اس نے گھر چھوڑنے کے بعد آج تک نہیں اٹھایا تھا۔ آج کے واقعے سے گویا اس کے احساس کے سوتے ابل پڑے تھے۔ جیسے وہ چونک کر کسی طویل خواب سے بیدار ہو گئی تھی .... جیسے وہ دفعتاً خود آگاہ ہو گئی تھی .... اور جیسے اب یہ ذاتی شعور اس کے دل کے لوتھڑے کو اپنے بے رحم ہاتھ سے مسل رہا تھا .... اور جیسے اس کے دماغ میں گھر چھوڑنے کے بعد آج تک کے واقعات چھوٹے چھوٹے سفید کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے ....

کمپنی کی سٹیشن ویگن "فلم پارک" کی طرف جا رہی تھی۔ سوگوار نیلوفر سڑک پر نگاہیں مرکوز کئے بیٹھی تھی .... ذاتی شعور کا ظالم ہاتھ ابھی تک اس کے دل کے لوتھڑے کو مسل رہا تھا .... وہ کیڑے ابھی تک اس کے دماغ میں کلبلا رہے تھے۔

باقی لڑکیاں کبھی کبھی آپس میں کوئی بات کر لیتیں ——— سردار بیگم کے سر میں آج پھر درد شروع ہو گیا تھا اور اس نے حسب عادت دوپٹہ سر پر پگڑی کی طرح کس کر باندھ رکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سردار بیگم نے گریبان میں سے گولڈ فلیک کی ڈبیا اور ماچس نکالی اور دو سگریٹ سلگا کر ایک ڈرائیور کے لبوں سے لگا دیا۔ اصغری نے سردار بیگم سے سگریٹ مانگا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح "نہ پیا کر" کہہ کر ایک اسے بھی دے دیا۔ دو تین کش لینے کے بعد سردار بیگم نے نیلوفر کی طرف دیکھ کر اصغری سے پوچھا "نیلوفر کو کیا ہوا ہے .... دوپہر سے چپ ہے"۔

اصغری اور سب لڑکیوں نے نیلوفر کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا مگر خاموش رہیں۔

ڈرائیور نے بھی آئینہ سٹ کر کے نیلوفر کا عکس دیکھا۔

آخر دلشاد نے بتایا کہ وہ سین جو نیلوفر کرنے والی تھی آج ایک دوسری لڑکی کو دے دیا گیا ہے .... !

نیلوفر اس سین کے مکالمے دو ماہ سے یاد کر رہی تھی۔ دو ماہ سے وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہیروئن کی خاص سہیلی کے اس مختصر رول کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دو ماہ سے اس کے سنہرے مستقبل کی ڈور اس سین سے بندھی ہوئی تھی .... دو ماہ سے وہ کئی بار لال مہا کیسٹرا سپلائر کے ساتھ ریہرسل کے لئے ڈائریکٹر صاحب کے گھر بھی جا چکی تھی .... !

مگر یہ سب تو نیلوفر کے ساتھ اکثر ہوا تھا!
ایسے غم تو وہ فلمی زندگی کے قدم قدم پر اٹھا چکی تھی!!
مگر آج اس کا غم شائد ایسے غموں سے عظیم تر تھا!!!
سردار بیگم نے فلم والوں کو حسبِ عادت ایک مردانی گالی دی اور پھر نیلوفر سے مشفقانہ لہجے میں کہا:
"غم نہ کر نیلو...... مجھے دیکھ میری تو برائی ان فلم والوں کے دم دلاسوں کی نذر ہو گئی ——— ہائے وہ کیا منحوس دن تھا جب میں اس فرشتے کا گھر چھوڑ کر بمبے (بمبئی) کی ریل میں جا بیٹھی"
یہ بات سردار بیگم انتہائی خلوص کے ساتھ افسردہ لہجے میں اکثر کہا کرتی اور خاص طور پر اس وقت جب اس کے سر میں درد ہو رہا ہو...
...... اور وہ فرشتہ نور محمد ڈاکیہ تھا...... جس کا نام سردار بیگم ہمیشہ احترام سے لیا کرتی تھی۔
ظالم ہاتھ نیلوفر کے دل کو اب اور سختی سے مسلنے لگا اور سفید کیڑے اس کے دماغ میں اور تیزی سے کلبلانے لگے ——— نیلوفر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا ......!
سردار بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کیا اسی لڑکی کو نیلو کا سین دیا گیا ہے جس کی آواز کی آج ٹرائی ہو رہی تھی ...... وہ جسے نیلے سوٹ اور کالی عینک والا آدمی لے کر آیا تھا ......؟"
"ہاں ——— ہاں وہی" دلشاد نے جواب دیا
"سردار ......!" ڈرائیور سگریٹ کا طویل کش لے کر ذرا کھانستے ہوئے بولا ...... "اس لڑکی کی بڑی پہنچ ہے ...... وہ سوٹ والے نجم صاحب ہی اسے کہیں سے اٹھا کر لائے ہیں ...... مالکوں سے نجم صاحب ......!!"
ڈرائیور نے آئینے میں نیلوفر کا عکس دیکھا جسے وہ خود ڈائریکٹر صاحب کے ہاں ریہرسل کے لئے لے جایا کرتا تھا ——— اور ہچکچاتے ہوئے اتنا کہہ کر چپ ہو گیا!
"تم .... تو جانتی ہو سردار!!"
نجم کا نام سن کر سردار بیگم اور سب لڑکیوں نے تقریباً ایک ساتھ نیلوفر کی طرف دیکھا۔ کئی سوالات ہر ایک کے لبوں پر آتے آتے رہ گئے۔
آخر سردار بیگم سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ہلکی سی آہ بھر کر بولی:
"ہاں ...... میں سب جانتی ہوں"۔
اور اس نے غصے میں زیرِ لب دو تین گالیاں دے دیں۔
جب سٹیشن ویگن فلم پارک میں ایک بلڈنگ کے سامنے ٹھہری تو گویا نیلوفر کے غم کے دھارے نے اپنی راہ کے پتھروں کو لڑھکا دیا ...... وہ زار و قطار رونے لگی "نہیں ...... میں اب یہاں نہیں رہوں گی"۔
سردار بیگم نے بڑھ کر کہا۔ "لو اور سنو! ہے نہ پاگل کہیں کی ...... چلو لڑکیو ...... دیکھتی کیا ہو ———

باقی صفحہ ۲۲ پر

محمد مرتضیٰ سکھیرا ——— شفیق الرحمٰن ——— اور ہم

(ایک دلچسپ خط و کتابت)

مشہور ادیب شفیق الرحمٰن سے لیا ہوا ایک انٹرویو محمد مرتضیٰ سکھیرا کے نام سے ہمارے ہاں شائع ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ فرضی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اسے ہم اشاعت کے لئے دے رہے ہیں۔ (ادارہ)

مکرمی، السلام علیکم۔

ادب ——— صحافت

ان دو لفظوں کی تکریم کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں آپ سے ایک گزارش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آپ کے معزز جریدے میں کسی محمد مرتضیٰ صاحب کا ایک مضمون ——— چند لمحے شائع ہوا ہے جو کئی لحاظ سے شفیق صاحب اور ان کے احباب کے لئے پریشانی اور افسوس کا باعث بنا ہے۔

آپ پر پوری طرح اعتماد کرتے ہوئے شفیق صاحب کا ایک خط آپ کی خدمت میں امانت کے طور پر بھجوا رہا ہوں۔ اسے آپ واپس کر دیجئے گا اور اس سلسلے میں ضرور کوئی مؤثر اقدام کیجئے

اس عنایت کے لئے پیشگی شکریہ۔

آپ کا صادق، محمد حنیف چودھری شعبہ اشاعت۔ مکتبہ جدید، لاہور۔

برادرم، السلام علیکم

امید ہے کہ میرا خط ملا ہو گا۔ آج آپ کا بھیجا ہوا یومِ آزادی کی مبارکباد کا خوش نما کارڈ ملا، شکریہ۔ سن لیتانگ کی کتاب کا تعارف آپ نے بہت اچھی طرح کرا لیا ہے۔

ایک صاحب نے کل اس مضمون کا ذکر کیا جس کی کٹنگ ملفوف ہے۔ اسے پڑھ کر بڑا غصہ آیا۔ بے حد ذلیل حرکت ہے۔ میں کسی مرتضےٰ کو نہیں جانتا۔ نہ اس قماش کے لوگوں سے ملتا ہوں۔ انٹرویو دینا تو ایک طرف رہا جو کچھ اس شخص نے لکھا ہے وہ نہ میں نے کہا اور نہ سُنا۔ دیدہ دلیری کی انتہا ہے کہ لوگ اپنے خیالات کو دوسروں کے نام سے پیش کرنے لگے ہیں، اور ایڈیٹر ہیں کہ چھاپ رہے ہیں۔ دو تین مہینے ہوئے

ایک رسالے میں ایک اور صاحب نے مجھ سے ملاقات کا ذکر کیا تھا، حالانکہ یہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس میں ایسی ذلیل باتیں نہیں لکھی تھیں، عصمت چغتائی نے اگر اسے پڑھا تو وہ کیا سوچیں گی۔ میں ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہر ایرے غیرے سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کرتا۔ اس شخص نے میرے منہ سے عصمت اور عبادت بریلوی کے متعلق ایسے سخت جملے نکلوا دیئے ہیں — جن صاحب نے اس مضمون کا ذکر کیا ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بالکل یہی مضمون بہاولپور کے کسی معمولی پرچہ کے سالنامے میں[1] چھپا تھا لیکن اس کا مصنف کوئی مسٹر سکھیرا تھا۔

برادرم اس سلسلے میں آپ ضرور کوئی مناسب کارروائی کیجئے۔ میں نے چراغ راہ والوں کو کچھ نہیں لکھا۔ آپ سے درخواست ہے کہ ان سے بھگتیں۔ ممکن ہے کہ اس مضمون کو دوسرے پرچے نقل کریں اور خواہ مخواہ کی بک بک شروع ہو جائے ایڈیٹر چراغ راہ کو چاہیئے کہ اگلے شمارے میں مناسب الفاظ میں معافی مانگے کہ ایسا غیر ذمہ دارانہ مضمون چھاپا ہے۔ اور یہ کہ مرتضیٰ یا کوئی اور شخص مجھ سے انٹرویو کرنے ہرگز نہیں آیا۔ جو کچھ اس مضمون میں ہے وہ کسی کے دماغ کی اختراع ہے۔ اگر اُردو صحافت اور اردو ادب کا یہ حال ہے کہ Black mail کرنے سے بھی نہیں چوکتے تو پھر قانونی کارروائی بھی جائز ہے ——— اسے پڑھ کر بہت پریشانی ہوئی، غصہ بھی بہت آیا۔ آپ کو ان پرچوں کا زیادہ تجربہ ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور بضرور اس سلسلے میں فوری کارروائی کریں گے تاکہ پھر کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔

مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ "سویرا" کا بھی انتظار ہے۔

شفیق۔

۱۔۱ے رسول پورہ، اچھرہ لاہور

۱۲ ستمبر ۵۶ء

بخدمت محمد حنیف چودھری صاحب

مکرم۔ السلام علیکم۔ شفیق صاحب کے شکوہ نامہ کے ساتھ آپ کا گرامی نامہ مرقومہ ۲۲ اگست، کئی مراحل طے کر کے مجھ تک آ ہی پہنچا۔ معاملہ جس شکل میں سامنے آیا ہے وہ میرے لئے بھی اتنا ہی رنج دہ ہے جتنا شفیق صاحب یا آپ کے لئے۔

محمد مرتضیٰ سکھیرا صاحب سے میرا کوئی براہ راست تعارف پہلے سے نہیں تھا، نہ اب ہی ان سے کوئی ذاتی رابطہ ہے۔ ان کا ایک خط آیا کہ میں کچھ ادیبوں سے ادبی مسائل کے بارے میں انٹرویو لینے کا ایک سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ سلسلہ چراغ راہ میں شائع ہو۔ میں نے لکھ دیا کہ آپ بھیجیں، اس طرح کا سلسلہ شائع ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پہلی کڑی موصول ہوئی اور وہ ہمارے ہاں شائع ہوئی۔ دراصل میں ایک گمنام اور تنہائی پسند آدمی ہوں۔ نہ ادیبوں سے میرے روابط ہیں نہ ان کے دھڑوں اور ان کی کھینچا تانیوں سے آگہی ہے۔ اور نہ ان چیزوں میں مجھے کبھی دلچسپی رہی ہے۔ لیکن حال ہی میں "منٹو ——— میرا دشمن" کے چند اقتباسات اپنے ہاں شائع ہونے والے ایک مقالے میں پڑھ کر ذہن میں یہ تاثر رہا کہ ہمارے ادیبوں کا ربط باہمی اس طرح کی صورتیں بھی اختیار کرتا ہے۔ اس تاثر کے

---

[1] واضح رہے کہ فی الواقع چراغِ راہ میں آنے سے قبل یہ انٹرویو بہاولپور کے ایک اخبار میں چھپ چکا تھا پس ہماری ذمہ داری ثانوی درجے کی رہ جاتی ہے۔ (چراغِ راہ)

سبب مجھے شفیق صاحب سے منسوب شدہ باتوں میں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں ہوا۔ علاوہ بریں یہ بات میرے گمان میں بھی نہ تھی کہ انٹرویو فرضی ہو سکتا ہے۔ یا اس میں کوئی غلط بات منسوب کی گئی ہے۔ ایسا شبہ اگر مجھے ہوتا تو میں اس مواد کی اشاعت نہ ہونے دیتا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ عملہ اور ذرائع و وسائل کی کمی کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ہر لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے مرسلہ مواد کی پہلے تحقیقات کر لیا کریں اور پھر اشاعت کے لئے دیں۔ اس طرز پر کام کرنا ہو تو ایک رسالہ چلانے کے لئے بڑی بھاری تنظیمی قوت کی ضرورت ہے۔ مجبوراً ذمہ داری کا ایک حصہ لکھنے والے پر ڈالنا پڑتا ہے۔ اور ادارہ مطبوعہ مواد میں صرف ایک حد تک ذمہ دار ہو سکتا ہے اس حد تک ادارتی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ ایک چیز کے متعلق ہمیں تردید موصول ہو تو ہم تردید کو بھی اشاعت کے دے دیں۔

ویسے اتفاق سے صورت ایسی ہوئی کہ محمد مرتضیٰ صاحب کا وہ خط ہم نے ایک ماہ قبل شائع کیا جس کے ساتھ انہوں نے شفیق صاحب سے لئے ہوئے انٹرویو کا مواد بھیجا تھا۔ اور اس خط میں موصوف کا نام لے کر اس مواد کا ذکر کیا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو چراغِ راہ' ماہ جولائی' عنوان "حلقہ یاراں" خط ملا)۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک مواد کے آنے پر ہم نے یہ نہیں کیا کہ عجلت سے اسے شائع کر دیا ہو اور اس سے بلیک میلنگ کا کام لینا چاہا ہو۔ بلکہ عملاً ہم نے توقف سے کام لیا۔ اب اگر جولائی کے شمارہ کی اشاعت پر ہمیں اطلاع مل جاتی کہ شفیق صاحب سے کوئی انٹرویو نہیں لیا گیا تو ہم اسے کبھی شائع نہ کرتے۔ اگست میں شائع کیا بھی تو اس پر ادارتی نوٹ میں محمد مرتضیٰ صاحب کی ایک کوتاہی کی طرف از خود اشارہ کیا کہ انہوں نے شفیق صاحب سے اس کی اشاعت کی اجازت لینے کی تصریح نہیں کی (میرا خیال یہ تھا کہ اجازت شاید عملاً لے لی گئی ہے' صرف خط میں اس کی صراحت نہیں کی گئی) اشاعت کا مقصد بھی اس نوٹ میں واضح کر دیا گیا کہ "چونکہ یہ ایک افادۂ عام کی چیز ہے اور ایک ادیب کے ذہنی مطالعہ میں اس سے مدد مل سکتی ہے اس لئے ہم اسے اپنے صفحات میں لے رہے ہیں"

جس مخلصانہ فضا کے اندر آپ نے ہمیں مخاطب ہے اس کے پیش نظر میں نے من و عن اصل صورت واقعہ بیان کر دی ہے۔ اس کے ساتھ میں آپ کے سامنے چراغِ راہ کی نو سالہ تاریخ رکھتے ہوئے کہوں گا کہ آج تک ایک صورت بھی ایسی پیش نہیں آئی کہ ہم نے دانستہ کسی شخص کے بارے میں کوئی خلاف واقعہ چیز درج کی ہو۔ کسی کو غلط رنگ میں پیش کیا ہو۔ بدنام کرنے کی مہم کسی کے خلاف چلائی ہو یا اور کوئی حرکت انسانیت سے گری ہوئی اختیار کی ہو۔ آپ حضرات اگر ہم سے کچھ بھی تعارف رکھتے تو بطورِ خود یہی رائے قائم کرتے کہ ایک ناخوش گوار چیز اگر واقع ہوئی ہے تو سہواً۔ اور ہم سے سہو کا اعتراف کرانے یا معذرت طلبی کو آمادہ کرنے کے لئے بہت زیادہ سخت خطوط کی ضرورت نہ تھی۔ دیر یہی مناسب تھا کہ چھوٹتے ہی بات "قانونی کارروائی" تک جا پہنچے۔ اگر ہم لوگوں میں انسانیت ختم ہو گئی ہو تو قانون بیچارا ہمیں آدمی تو نہیں بنا سکتا۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ ایڈیٹر کی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ وہ کسی شائع شدہ چیز کے بارے میں کسی متعلقہ فرد کی تردید شائع کرنے کے لئے بھی تیار ہو۔ مگر میں اس سے آگے تک جاؤں گا۔ کیونکہ میرے سامنے قانون نہیں انسانیت کا تقاضا ہے۔ میں مخلصانہ جذبات کے ساتھ آپ سے شفیق صاحب سے اور دوسرے متعلقہ احباب سے معذرت چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں ایک ایسی چیز شائع ہوئی جس سے کسی کو رنج پہنچا۔ یا جس کی وجہ سے ان کے باہمی تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس معذرت کو بلکہ اس پورے خط کو (ضرورت ہو تو) آپ کے

خطوط سمیت) شائع کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پوری خط و کتابت کا ہمارے اور آپ کے ہاں بیک وقت شائع ہو جانا مناسب ہے
گا۔ اگر یہ پسند ہو تو اکتوبر کے شماروں میں اسے لے لیا جائے۔ لیکن اگر یہ ناکافی ہو تو میں آخری حد تک فراخدلی سے کام لیتے ہوئے یہ پیش
کش کروں گا کہ آپ یا شفیق صاحب جو عبارت بھی اپنے جذبات کے مطابق مرتب کریں اسے میں اپنی طرف سے دے دوں گا۔ یہ
پیش کش اس لئے کرنا ضروری ہے کہ شفیق صاحب کے خط میں اس طرح کی خواہش کا بڑے جذباتی زور کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔
دونوں حضرات کے جواب کا انتظار رہے گا۔
آپ کی امانت (شفیق صاحب کا خط) واپس ارسال ہے۔

نعیم صدیقی۔

۱۔ اے رسول پورہ اچھرہ لاہور
۱۲ ستمبر ۷۶ء

بخدمت شفیق الرحمٰن صاحب

مکرمی السلام علیکم۔ آپ کا ایک خط چراغِ راہ میں شائع شدہ ایک مواد کے بارے
میں مکتبہ جدید کی معرفت دیکھنے میں آیا۔ افسوس ہے کہ پہلے سے ہمارے درمیان براہِ راست قسم کا کوئی تعارف نہ تھا ورنہ آپ ہمیں
تھوڑے سے حسنِ ظن کا مستحق ضرور سمجھتے۔ محمد مرتضیٰ اسکیلر صاحب سے میرا کوئی ذاتی رابطہ نہیں۔ نہ ان کے انٹرویو کے بارے میں یہ
شبہ ہوا کہ وہ غیر واقعی ہو گا۔ اور نہ کوئی وجہ یہ سمجھنے کی تھی کہ اس میں آپ سے کوئی بات غلط منسوب کی گئی ہو گی۔ پھر یہ کہ نہ ادیبوں کے
حلقوں میں میرے تعلقات ہیں نہ ان کی کھینچا تانیوں کا مجھے علم ہے، اور نہ ان چیزوں سے میں نے عمر بھر کبھی دلچسپی لی ہے۔ اس کا
ثبوت چراغِ راہ کا ۲۸ سالہ دورِ ادارت ہے۔ یہ میرے لئے نہ ممکن ہے، نہ قانوناً اور نہ اخلاقاً میری ادارتی ذمہ داری میں یہ داخل ہے کہ میں ہر
لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے مرسلہ مواد کے بارے میں پہلے تحقیقات کروں اور پھر اسے اشاعت کے لئے لوں۔ ہم اہلِ قلم کے ساتھ
معاملے کی ابتدا حسنِ ظن ہی سے کرتے ہیں۔ البتہ کوئی ایسی چیز شائع ہو جائے جو غلط ہو یا کسی کے لئے موجبِ تکلیف ہو تو اس کی تردید کو اپنے ہاں
جگہ دینے کے لئے تیار رہتے ہیں، اور ضرورت ہو تو اظہارِ معذرت بھی کرتے ہیں۔
سو اب جب کہ ہمارے ان شائع ہونے والے مواد کی صحت کی آپ تردید کرتے ہیں، اور آپ کو اور آپ کے دوستوں کو اس
کے سبب رنج پہنچا ہے میں آپ کے سامنے اخلاص کے ساتھ معذرت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں چند کلمات اشاعت میں بھی آ
جائیں گے یا اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے اسی خط کو (بلکہ اگر مناسب ہو تو آپ کے اور مکتبہ جدید کے خطوط سمیت) چراغِ راہ میں دے دوں۔
لیکن جب آپ کے خط میں یہ زوردار الفاظ دیکھتا ہوں کہ "ایڈیٹر چراغِ راہ کو چاہیئے کہ اگلے شمارے میں مناسب الفاظ میں معافی مانگے"
تو آپ کے جن جذبات کی تصویر میرے سامنے آتی ہے۔ ان کی بنا پر یہ سب کچھ کافی معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کی تسکین کی اب اغلباً بہترین
صورت یہی رہ گئی ہے کہ آپ یا آپ کی طرف سے مکتبہ جدید والے اپنے جذبات کے مطابق کوئی معافی نامہ مرتب کر بھیجیں باقی ص ۳

قند و نمک

مسٹر

پلیٹے اسمبلی سے ہیں پیران تسمہ پا
ان کو الکٹ کرکے پھنسے ہم عذاب میں

ریس، شراب و شاہد و رشوت ہیں سب حرام
مذہب ہمارا گویا ہے ہڈی کباب میں

ہے منتظر معمے کے انعام کا ہر ایک
بلی کو چھیچھڑے نظر آتے ہیں خواب میں

ٹنڈر نہ لوں تو پلٹے رقم کس طرح مری
لاکھوں لٹ ہوئے ہیں خرچ الکشن کے باب میں

جوش جنوں میں شادی کا وعدہ بھی کرلیا
ناگفتنی بھی کہہ گئے ہم اضطراب میں

تنظیم ہے، یقین ہے، وحدت بھی ہے مگر
لیڈر کی گفتگوؤں میں، درسی کتاب میں

کب تھا جناب شیخ کی ڈاڑھی پہ یہ شباب
دل کی سیاہی گھولی ہے شاید خضاب میں

ہوتی ہے ناچ گانے کی قرآں سے ابتدا
زمزم ملا رہا ہے زمانہ شراب میں

ملا سے بحث پردہ میں مسٹر جو کچھ دبے
اپوا نے بڑھ کے آگ لگادی نقاب میں

سبق سیکھا ہے ہم نے فیشن ایبل نوجوانوں سے
نہ ہو جب جیب میں پائی تو پہنو ریشمی جوڑے

مسلح ہو کے میک اپ سے حسیں نکلے ہیں بے پردہ
نظر حیران پھرتی ہے کسے لے اور کسے چھوڑے

کراکر مولوی نے کمپیٹیشن بند "بیوٹی" کا
ترقی میں ہماری سینکڑوں ہی اٹکا دیئے روڑے

مکاں بھی ہے، غذا بھی ہے، دوا بھی اور نوکر بھی
مہاجر رہتے اچھے گر وہ ہوتے "ریس" کے گھوڑے

نتیجہ مغربی تہذیب کا مسٹر یہ روشن ہے
مگر جب چل چکی گاڑی تو کون انجن کا رخ موڑے

[مشتاق صاحب۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۵۔ کراچی]

آپ کیا پڑھیں ———؟

ماہنامہ سوداگر ——— (اشاعتِ خاص)

جمعیت پنجابی سوداگرانِ دہلی کا یہ ترجمان آہستہ آہستہ بزمِ صحافت میں اپنے لئے ایک رتبۂ بلند پیدا کر رہا ہے۔ اس وقت اس کی تازہ ترین اشاعتِ خاص (نومبر دسمبر ۱۹۵۶ء) ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ ۲۳۴ صفحے کا یہ مجموعہ اپنے اندر دلچسپ، معیاری، مقصدی اور متنوع مواد رکھتا ہے۔

فکر و نظر کے زیرِ عنوان سات آٹھ مقالات ہیں۔ ابن احمد قرنی ایم اے نے اپنے مقالہ میں جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے دستور کا تجزیہ کیا ہے۔ ملک محمد طارق، متین طارق باغپتی اور انیس الرحمٰن کھتوریہ نے ایسے مسائل لئے ہیں جو موجودہ دور کے پورے عالمِ انسانی کی توجہ جذب کئے ہوئے ہیں۔ طیب عثمانی نے اقبال کے عشقِ رسول کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ یہ شخص جس کے نام کو منکرینِ حدیث غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں سنتِ رسول کی حجیت کا پرجوش علمبردار تھا۔ منظور احمد نے پاکستان خصوصاً اس کے مشرقی خطے کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر نگاہیں مرتکز کراتے ہوئے سیاسی و دینی قائدین کے خلاف ایک چارج شیٹ لگایا ہے جس کا اصل مقصد جھنجھوڑنا اور تحریک دلانا ہے، گو وہ اپنے جوش کی رو میں توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔

شعلہ و شبنم کے زیرِ عنوان بزمِ سخن آراستہ کی گئی ہے جس میں ماہر القادری کا مقام و لیتن ٹھہرا، کیونکہ دانش و ہنر کی بزمِ مشورت" کی منظوم رُوداد انہوں نے فکر و فن کے کمالات کے ساتھ پیش کی ہے۔ اسد ملتانی، عاصی کرنالی اور محشر رسول نگری کے شعر پارے خاص قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ دُوسرے شعراء بھی جو کچھ لائے ہیں خوب لائے ہیں۔ کمزور سی کچھ چیزیں بھی شامل ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ حصہ خوب ہے

قوس و قزح اور سنگ و خشت کے زیرِ عنوان علی الترتیب افسانے اور ڈرامے، اور طنزیات و مضحکات ہیں۔ ان حصوں کو پوری طرح دیکھا نہیں جا سکا، مگر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ نگارشات زندگی گریز رجحان کی منحوس پرچھائیں سے محفوظ ہیں اور ان میں لکھنے والوں نے اہم سیاسی و معاشرتی مسائل کو لیا ہے۔

آخر میں "اپنی باتیں" کے زیرِ عنوان پنجابی برادری کے اپنے تنظیمی، مالیاتی اور اصلاحی مسائل اور کچھ رودادیں اور حسابات وغیرہ مندرج ہیں۔

اس اشاعتِ خاص کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے اور چندہ سالانہ تین روپے۔

سلطان احمد (اللہ والے) اور جمیل الرحمٰن مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی ادارت میں یہ جریدہ اسلامی نقطۂ نظر سے مالا مال اور ادبی معیار کے لحاظ سے ترقی پذیر ہے۔

ماہنامہ "الارشاد" ——— شادی کمیشن نمبر!

یہ دینی جریدہ جزب اہلِ حدیث کل پاکستان" کا ترجمان ہے، ہمارے سامنے "شادی کمیشن" کے اٹھائے ہوئے طوفان کے سلسلے میں اشاعتِ خاص پیش کر رہا ہے۔ اس کے مرتب جناب حسن عزیز جاوید ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شادی کمیشن نے جو رپورٹ عائلی مسائل کے متعلق قانون سازی کے نئے خطوط معین کرنے کے لئے پیش کی ہے وہ ان

تمام اصول و تصورات کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہے جن سے ملت اسلامیہ کی اجتماعی فکر ترتیب پاتی ہے اور جن پر ہمارا سیاسی، اقتصادی اور قانونی نظام استوار ہے۔ ناگزیر ہے کہ قوم کے نہ صرف دینی علماء بلکہ متوازن طرزِ فکر رکھنے والے اصحابِ علم و تحقیق بھی اس چیلنج کو سمجھیں اور جرأت مندی سے قبول کریں اور اس کا بھرپور جواب دیں۔ الارشاد کا یہ نمبر بھی اسی مقصد سے نکالا گیا ہے۔

یہ اشاعتِ خاص اپنے اندر بعض نہایت بیش قیمت مقالات لئے ہوئے ہے جن کے لکھنے والوں میں جناب مدیر کے علاوہ شہزادی عابدہ سلطانہ بیگم ثریا احمد پائی صاحبہ، جسٹس لیاقت احمد قریشی، ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، مولینا عبدالماجد دریابادی، مولینا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولینا ظفر احمد عثمانی، علامہ توقیر مرزا صاحب، مولانا اعتدار احمد، مولینا ثناء اللہ صاحب، ڈاکٹر نامرس، مولینا قدرت اللہ مرادآبادی، مولینا احتشام الحق تھانوی اور عصمت جہاں صاحبہ شامل ہیں۔ گویا ہر طبقۂ خیال کی نمائندگی ہو گئی ہے۔ خصوصیت سے اسلام پسند خواتین کا شادی کمیشن کی فاسد رپورٹ کے استرداد کے لئے آگے آنا موجبِ اطمینان ہے۔

امید ہے کہ اس خاص نمبر کا مطالعہ وسیع پیمانہ پر کیا جائے گا۔

بقیہ "پاکستانی ثقافت" از صفحہ ۹

...... ایک ایسے سیاسی تغیر کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں مغرب زدہ طبقے کا زور ٹوٹ جائے۔ اور معاشرے کی باگ ڈور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔ پس ہمارا ثقافتی احیاء درحقیقت سیاسی احیاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ جدوجہد علمی و فکری اور سیاسی و انتخابی میدان میں بیک دم جاری رہنی چاہیئے۔

یعنی جس ثقافتی انقلاب کی ہمیں ضرورت ہے وہ محض چند مجالس کے انعقاد، چند اداریوں کی اشاعت کے انعقاد اور چند خطبات کے نشر کے نتیجے میں نمودار ہونے کا نہیں! ——— بلکہ اس کے لئے ایک ہمہ جہتی کشمکش کی ضرورت ہے جو ایک طرف نظریۂ اسلامی کو ذہنوں میں راسخ کرے، دوسری طرف ملک میں عملاً اسلامی ضابطہ و نظام کو برپا کرنے کی تگ و دو جاری رکھے اور تیسری طرف قوم کے اندر اسلامی ثقافتی شعور کو بیدار کر کے اسلامی اقدار و روایات کا تحفظ و احیاء کرے اور متضاد ثقافتی عناصر سے معاشرے کو پاک کرنے کی تدابیر بھی عمل میں لائے ؎

تین نئی کتابیں

مولانا مودودی کا دورۂ مشرقِ وسطیٰ ۱/۴

چوہدری علی احمد خان مرحوم ۳/۸

مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کا جائزہ ۱/۴

تاریخ اسلام

مصنفہ: مورخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی

تیرہ سو سال قبل فاران کی چوٹیوں سے ایک نور چمکا۔ اس کی ایک ہی کرن نے ظلمت کدۂ گیتی کو مطلع انوار بنا دیا۔ اس عالم گیر انقلابی آواز نے انسانیت اور حق و انصاف کی ایسی بنیادیں تعمیر کیں جن میں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور اخلاقی آزادی تھی۔ اسی شمع امن و سلامتی کے مٹھی بھر پرستار عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں سے صرف حق و صداقت اور توحید و رسالت سے مسلح ہو کر کبھی افریقہ کے میدانوں میں، کبھی چین کے چٹیل پہاڑوں میں، کبھی اسپین میں اور کبھی بت کدۂ ہند میں پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے افق عالم پر چھا گئے۔ مجاہدوں کے قافلے اپنی منزلیں طے کرتے رہے اور ہر منزل پر قدموں کے چند ایسے نشان چھوڑ گئے جن کو حوادثات زمانہ کی طوفانی موجیں آج تک نہیں مٹا سکیں۔ حقائق کی چٹانوں پر یہ سر بفلک مینار آج بھی اقوام عالم کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

یہ کتاب ان ہی مسلمان حکمرانوں، جانبازوں اور بہادروں کے زندہ جاوید کارناموں کی مفصل تاریخ ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھے گی اور آپ حق و صداقت کی راہوں پر دوبارہ گامزن ہو کر اپنا حال اور مستقبل بھی اتنا ہی شاندار بنا لیں گے جتنا آپ کا ماضی درخشاں رہا ہے۔

مغربی مورخین نے تاریخ اسلام کے واقعات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا، اور ایک عرصہ تک تاریخ اسلام کا طالب علم حقیقت سے ناواقف رہا۔ مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے برہا برس کی محنت سے یہ مفصل اور مستند تاریخ مرتب کی۔ جس کی ہر سطر اسلامی سطوت و عظمت کی آئینہ دار ہے۔ اس بلند پایہ کتاب کا انداز تحریر بے انتہا دلکش ہے۔ آج جب کہ ہم اہم ترین تاریخی دور سے گزر رہے ہیں ہمارے لئے تاریخ اسلام کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ وہ شہرۂ آفاق تاریخ اسلام ہے جس کے سات ایڈیشن پاکستان کے عالم وجود میں آنے سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔

ضخامت حصہ اول ۵۹۲ صفحات۔ ضخامت حصہ دوم ۶۷۲ صفحات

قیمت فی حصہ -/۱۲ روپے۔ قیمت ہر دو حصہ -/۲۴ روپے۔ بڑی سائز مجلد

ملنے کا پتہ

چوہدری محمد سلیم گاہندری۔ مالک نفیس اکیڈمی۔ بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱

بلند پایہ علمی کتابیں

دین و اخلاق

توضیحات — مولانا اصلاحی — ۳/۸
انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام — عبدالحمید صدیقی ایم اے — ۳/۸
مقالات الہلال — ابوالکلام آزاد — ۳/٠
قولِ فیصل — " — ۱/۱۲
مکالماتِ ابوالکلام — عقیل احمد صدیقی — ۳/۱۲
عیدین — ابوالکلام — ۱/۴
مقامِ دعوت — " — ٠/۸/٠
حقیقتِ صلوٰۃ — " — ۱/۴/٠
حقیقتِ حج — " — ۱/٠
مکاتیبِ ابوالکلام — " — ۲/۸
منصبِ امامت
اسماعیل شہیدؒ — ۲/۴

عقائدِ اسلام — مولانا محمد ادریس کاندھلوی — ۲/۸
حجیتِ حدیث — " — ۲/٠
علمِ کلام — " — ۴/٠
عقیدہ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو — عبدالحمید صدیقی ایم اے — ٠/۱٠/٠
افکارِ غزالی — محمد حنیف ندوی — ۷/٠
ملفوظاتِ رومی — عبدالرشید ایم اے — ۶/٠
حیاتِ محمدؐ — محمد حسین ہیکل — ۱۸/٠
سیرتِ مصطفیٰؐ — مولانا محمد ادریس کاندھلوی — ۵/۸
خلفائے محمدؐ — عمر ابوالنصر — ۱٠/٠
الحسین — " — ۲/۸
الزہرا — " — ۲/۸
سیف اللہ خالد — ابوزید شلبی — ۵/٠

سیر اسلاف

عمرو بن العاص — حسن ابراہیم — ۵/-
حیاتِ امام احمد بن حنبلؒ — محمد ابو زہرا — ۱٠/٠
سیرۃ ائمہ اربعہ — رئیس احمد جعفری — ۷/۸
الہارون — عمر ابوالنصر — ۵/٠
سقراط — ڈاکٹر محمد اجمل — ۱/۸
چنگیز خاں — ہیرلڈ لیمب — ۵/٠
امیر تیمور — " — ۷/٠
شہادتِ حسین — ابوالکلام آزاد — ۱/۸
حضرت یوسف — " — ۲/٠
اصحابِ کہف — " — ۲/٠
رسول اللہ صلعم کی سیاسی زندگی — ڈاکٹر حمید اللہ — ۵/٠
حیاتِ ولی — مولانا رحیم بخش دہلوی — ۶/٠

علمِ نفسیات

جیسے بولیں جادو ہے — ڈیل کارنیگی — ۷/٠
جینے کی اہمیت — لن یوتانگ — ۱۲/٠
آدابِ زندگی — محمد اقبال سلمان — ۲/٠
فرض شناسی — سیموئل اسمائل — ۴/٠
پریشان ہونا چھوڑئیے جینا شروع کیجئے — ڈیل کارنیگی — ۶/٠
جینے کا قرینہ — آندرے موروا — ۶/٠
کامیاب زندگی — ہربرٹ — ۱۲/۸
زندگی سے فائدہ اٹھائیے — کمال احمد رضوی — ۲/٠

مکتبہ چراغِ راہ — بیرون لوہاری دروازہ لاہور

بہتر زندگی کا
منصوبہ ...
کھیتی باڑی کے جدید طریقوں، گھریلو صنعتوں کی روز افزوں ترقی
اور اسکولوں نیز شفاخانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے گاؤں کے
باشندوں میں یقین اور خود اعتمادی کی ایک نئی روح پھونکدی ہے۔
پٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں کی حتی المقدور بالکفایت تقسیم کاری کے
ذریعہ برماشیل بھی پاکستان کی نشوونما اور ترقی میں
برابر کی شریک ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

مارچ
1957

روشنی ـــ گرمی ـــ حرکت

ماہنامہ

چراغ راہ

کراچی

احسن رقم

جلد نمبر ۱۱ | شمارہ نمبر ۳

قیمت فی پرچہ ۸ آنے
سالانہ چندہ ۵ روپے

مارچ ۱۹۵۷ء

ترتیب

دفتر ادارۂ تحریر: نعیم صدیقی - ۱۔ اے، محلہ رسول پورہ، اچھرہ - لاہور

دفتر اشاعت و انتظام: ماہنامہ "چراغ راہ" فیض محمد فتح علی روڈ - کراچی

سید کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغ راہ، فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

سوچ بچار

ماچھی گوٹھ

ادارہ

ماچھی گوٹھ ریاست بہاول پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کراچی جاتے ہوئے صادق آباد سے آگے کا پہلا چھوٹا سا اسٹیشن ہے جس پر مسافر گاڑیاں دو ایک منٹ کے لئے ٹھہرتی ہیں۔ لیکن اب پاکستان کے نقشے میں یہ نقطۂ نامعلوم یکایک ابھر آیا ہے اور اسے ایک تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ نام اخباروں میں نمایاں ہوا، سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں درج ہو گیا، اور ہمارے جماعتی لٹریچر میں اب اس کے لئے ایک اہم جگہ پیدا ہو گئی ہے ——— اور برسوں تک ہم اور ہمارے بعد میں آنے والے لوگ ماچھی گوٹھ کے اجلاس کا حوالہ دیا کریں گے کہ وہاں یہ اور یہ فیصلے ہوئے تھے۔

اصل میں ماچھیوں اور مچھیروں سے تحریکِ اسلامی کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ یہ تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قائم فرمایا تھا۔ آپ نے معاشرہ کے اونچے طبقوں کو بنجر پاکر دعوت کا رُخ ماہی گیروں کی طرف پھیر دیا اور ان کو پکار کر کہا کہ آؤ میں تم کو آدمیوں کا شکار کرنا سکھاؤں۔ یہ دیرینہ تعلق کم از کم ذہنی طور پر ایک بار پھر تازہ ہو گیا ہے

اس مقام پر ایپانی فیکٹری (جس کے مالک مشہور لغاری خاندان کی ممتاز ترین شاخ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایپانی کہلاتے ہیں) کے وسیع احاطے میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کا کل پاکستان اجلاس ۱۷ تا ۲۱ فروری منعقد رہا۔ اس اجلاس میں تحریکِ اسلامی کی پچھلی پندرہ برس کی تاریخ کا جائزہ لے کر آئندہ کے لئے خطوطِ کار معین کئے گئے۔ یہ تاریخی اجلاس حسب ذیل امتیازات کی بنا پر غیر معمولی نوعیت رکھتا ہے:

——— یہ اجلاس ارکان کے والہانہ جذبہ کا ایک روشن ثبوت ہے، کیونکہ حاضری کا تناسب دوسری جماعتوں کے مقابلے میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مالی مشکلات کے باوجود (مشرقی پاکستان کے لئے شرکتِ اجلاس کی غیر معمولی مشکلات بھی پیشِ نظر رہیں) میں سے ارکان حاضر ہوئے جن میں سے خواتین بھی تھیں، کچھ لوگ بیمار اور ضعیف تھے اور دو ایک رفقاء تو بالکل نابینا تھے۔

——— یہ اجلاس ایسے عالم میں ہوا جب کہ ارکانِ جماعت بعض وجوہ سے سخت ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ مگر اس کے باوجود صبر و سکون اور ضبط و نظم کی حدود میں رہتے ہوئے بڑی خوبی سے اہم ترین فیصلے کئے گئے۔

——— اس اجلاس میں جماعت کی پالیسی ایک چار نکاتی لائحہ عمل ——— دعوت الی اللہ، توسیع و تنظیم، اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ادارۂ حکومت ——— کی شکل میں صرف ۱۵ آراء کے اختلاف کے ساتھ طے پائی۔ ارکان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی دے دیا کہ پالیسی کے ان چاروں اجزا میں کسی کو بھی ساقط، معطل یا مؤخر نہیں کیا جا سکے گا۔ خصوصاً انتخابات کے بارے میں پوری طرح صراحت کر دی کہ جماعتِ اسلامی انتخابات سے بے تعلق بہر حال نہیں رہ سکتی، اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ، یا دونوں طرح حصہ ضرور لینا ہوگا۔ البتہ ہر انتخاب کے موقع پر اس امر کا فیصلہ کرنا کہ تینوں میں سے کس صورت کو اختیار کیا جائے، جماعت کی مجلسِ شوریٰ کی ذمہ داری ہوگی۔ اس فیصلے سے جماعت تذبذب سے نکل کر یکسوئی اور

یکجہتی کے مقام پر آگئی ہے۔ اس قرارداد نے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیا ہے کہ جماعت اسلامی محدود معنوں میں مذہبیت کی علمبردار نہیں بلکہ وہ تحریکی پیمانے پر نظریۂ اسلامی کو لے کے اٹھی ہے اور نظامِ حیات کو اس کے تمام شعبوں سمیت عملاً بدلنا چاہتی ہے

——— اس اجلاس میں امیرِ جماعت اور مجلسِ شوریٰ سے اختلاف کرنے والے رفقاء کو اظہارِ رائے کا جو آزادانہ موقع حاصل رہا ہے اس نے ہماری جمہوری روایات کو مستحکم کر دیا ہے

——— گزشتہ چند ماہ سے جماعت کے اندر اختلاف و انتشار پائے جانے اور دو گروہ بن جانے کے جو چرچے مخالف حلقوں میں ہو رہے تھے اس اجلاس کے فیصلوں نے ان کو بالکل بادِ ہوا بنا دیا ہے۔

——— جماعت کے دستوری ڈھانچے میں تغیر کرنے والی قراردادیں بہت ہی مختصر بحث کے بعد جس درجے کے اتفاقِ رائے سے نہایت خوشگوار فضا میں ارکان نے طے کی ہیں وہ گواہ ہے کہ اس جماعت کا اجتماعی ذہن پیشِ نظر مسائل و معاملات کو کیسی یکجہتی سے سوچتا ہے اور نئی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کتنا وسیع اجتہادی ظرف رکھتا ہے۔ ہماری جماعتی فضا نہ تو جمود کا شکار ہوئی ہے نہ انتشارِ فکر کی!

——— امیرِ جماعت کے استعفیٰ کو زیرِ غور لاتے ہوئے صدفی صد اتفاقِ رائے سے امیرِ جماعت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور موصوف کو استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح جماعت اور اس کا قائد باہم دگر پہلے سے زیادہ قریب ہو گئے ہیں اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا بالکل صفایا ہو گیا ہے۔

——— امیرِ جماعت نے چھ گھنٹے کی تقریر میں تحریک کی تاریخ اور جماعت کے طے کردہ سفر کی روداد شرح و بسط سے بیان کر کے منزلِ مقصود کو اور زیادہ متعین اور اس کی طرف جانے والے راستے کے نقوش کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اس تقریر نے ماضی اور مستقبل کو ایسا مربوط کیا ہے کہ اب نئے آنے والے شرکائے سفر بھی یہ محسوس کریں گے کہ گویا وہ پچھلے سارے سفر میں خود شریک رہے ہیں۔

——— اس اجلاس نے جماعت کے اندر یہ اعتماد بھی پیدا کر دیا ہے کہ خدا کے فضل سے یہ جماعت کسی دورِ اضطراب کو پار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

یہ جو کچھ ہوا اس میں جتنا بھی خیر ہے وہ اللہ کی مہربانی ہے اور اس میں جو کچھ بھی نقص رہا وہ ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم پچھلی نوازشات پر اپنے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آئندہ کے لئے اسی سے رہنمائی کی دعا کرتے ہیں

مشورہ ——— راسخ عرفانی

۱

سینکڑوں شعر کہے حسن کی توصیف میں بھی
اور کئی عشقِ جنوں خیز کے افسانے کہے
پھر چمن زار کی رُوداد کئی بار کہی
کئی مرغانِ نوا ریز کے افسانے کہے

۲

غم غلط کرنے کے رنگین بہانے سے کبھی
قلبِ مبہوت مرا غرقِ مے و جام رہا
سینکڑوں بار مجھے عیش کے لمحات ملے
پھر بھی میں محوِ غمِ گردشِ ایام رہا

۳

میں نے محبوب کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے
پائے اغیار پہ بھی ناصیہ فرسائی کی!
اور کئی روز بھرا دشت کی پہنائی میں
ہمرہِ قیس کبھی بادیہ پیمائی کی!!

۴

کب تلک قید رہوں زُلف کی زنجیروں میں
کب تلک حسنِ ضیا بار کی تعریف کروں
تا کجا مجھ کو رہے یُوں غمِ انساں سے گریز
تا کجا دامِ پری زاد میں محبوس رہوں

(۵)

یہ تو تسلیم ہے میں شاعرِ درماندہ ہوں

اور مرے پاس زر و سیم کے انبار نہیں

میں تہی دست سہی، مفلس و نادار سہی

پھر بھی میں خوش ہوں مرا دل تو ہوس کار نہیں

(۶)

مجھ کو ہے ناز ابھی قوتِ گویائی پر !!

یہ بھی کیا کم ہے کہ مَیں منہ میں زباں رکھتا ہوں

آنکھ ہے گوہرِ نایاب سے لبریز مری !

دل میں اک مخزنِ اندوہ نہاں رکھتا ہوں

(۷)

قصۂ کلفتِ فرہاد تو پارینہ ہے

آج بھی تیشہ سے مزدور کئی مرتے ہیں

وائے تقدیر کہ اک نانِ شبینہ کے لئے

آج بھی لوگ کئی کوہ کنی کرتے ہیں

(۸)

آؤ نمرود کی، شداد کی تذلیل کریں

واعظِ شہر کی تحقیر سے کیا حاصل ہے

جب مسلماں کو کوئی بُت سے سروکار نہیں

پھر صنم خانوں کی تعمیر سے کیا حاصل ہے

(۹)

جو یہاں بادۂ گلفام کے دلدادہ ہیں !

اُن کو ہم ساغرِ توحید سے سرشار کریں !

مدتوں زلف کی پرچھائیں میں ہم سوئے ہیں !

آؤ اے شاعرو اب قوم کو بیدار کریں !

ایک خط

ابنِ فریدؔ

——— جو لکھتے لکھتے مقالہ بن گیا!

گرامی قدر، السلام علیکم۔ ایک عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ آپ سے براہِ راست قلمی رابطہ قائم کروں، مگر عدیم الفرصتی نے مہلت نہ دی اب جنوری ۶۰ء کے شمارے نے پیدا کردی ہے۔ اس لئے پہلے جنوری ۶۰ء کے شمارے کے سلسلے میں ہی کچھ عرض کروں گا۔ امید ہے آپ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود اس سمع خراشی کو گوارا کرلیں گے۔

سید نظر زیدی صاحب اسلامی ادب کے حلقے میں حال ہی میں آئے ہیں۔ شروع شروع میں آپ نے ان کا تعارف جس انداز سے کرایا تھا اس سے اندازہ ہوا تھا کہ موصوف منجھی ہوئی تحریر اور فنی باریکیوں سے کماحقہٗ واقف ہوں گے۔ مگر یا تو ان کی کسل مندی یا بے اعتنائی ان کی طرف سے غلط تاثرات کی پرورش کی وجہ بن رہی ہے۔ میری ناقص رائے میں ان کو اپنے مرتبہ کو برقرار رکھنے کے لئے سخت مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ سہل پسندی کی وجہ سے نقصان اٹھا جائیں گے۔ افسانہ "دو سو لحاف" شروع کرتے وقت میری توقعات بے انتہا تھیں۔ اس افسانے میں نظر صاحب نے نہ تو تاریخی خیالی پلاٹوں کا سہارا لیا ہے اور نہ اندازِ بیان کے معاملے میں وہ بہکے ہیں، لیکن اس وحدتِ تاثر کو انہوں نے آخر میں جاکر مجروح کردیا۔ کلائمکس کی اثرانگیزی محض چند جملوں کی زیادتی کی وجہ سے مجروح ہوگئی ہے۔ افسانے میں ناول کی طرح ہر بات بالتشریح بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے ورنہ افسانہ کند چھری سے ذبح ہوجاتا ہے۔ جہاں افسانہ بے حد واضح ہوتا ہے وہاں ایک بند کلی بھی ہوتا ہے جسے خیال و فکر، تصور و تخیل کے ہلکے ہلکے جھونکے چھیڑتے ہیں اور وہ پھول بنتی ہے۔ "دو سو لحاف" میں ذرا ان سطروں کو قلمزد کرکے پڑھئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کا احساس بلیتے ...... "سے لے کر ......" خون کو برف کی طرح ٹھنڈا کردیا" تک اور پھر دیکھئے کہ اختتام کا تاثر کیا سے کیا ہوجاتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ نظر صاحب نے جو بات بالوضاحت کہنی چاہی ہے وہ مضمر ہی رہتی ہے۔

"نکتہ چیں ہے غمِ دل" کو آپ کیا کوئی ادبی مقام بھی دے سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں حیدر جعفری سید صاحب میں مزاح نگاری سے زیادہ المیہ نگاری کی صلاحیت ہے، کاش وہ اپنا صحیح رُخ متعین کریں ورنہ محض دل کی خواہش پوری کرنے سے کچھ نہیں بنتا۔ بدر النساء ذکی صاحبہ کی تحریر کم از کم میرے فہم سے بہت بالاتر ہے۔ جن جن جملوں کو ذہن پر زور ڈال کر سمجھنے کی کوشش کی ہے ان سے کفن کی بو آتی ہے۔ تحریر کا یہ انداز بہت فرسودہ ہوگیا ہے۔ موصوفہ کو واقعیت نگاری کی طرف توجہ دلائی جائے تو مناسب ہوگا۔

خالد احمد صدیقی صاحب نے گزشتہ خط میں "منٹو کا فن شخصیت کے آئینے میں" کو بہت سراہا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے حق ادا کردیا۔ لیکن اس مضمون کے ساتھ بہت سی ناحق باتیں بھی منسوب کی جا رہی ہیں۔ پہلے سید محسن ہاشمی صاحب نے اپنے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، اس کے بعد ضیاء الرشید صاحب نے بھی سرزنش فرمائی۔ موصوف نے ذکر کیا تو میرے ساتھ نعیم صدیقی صاحب

کوئی بھی نہیں سمجھتا ظ

بسی از زبانِ حال مرا جستہ جستہ گفت

میں نے اس سے کبھی سروکار نہیں رکھا کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ میری تحریروں کو لائقِ التفات تصور کرتے یا دیوار سے مار دیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی تحریروں کا سرد مہری سے جواب دیتا ہوں جو میری ہمت افزائی کے لئے لکھتے ہیں، کہ کہیں میرا نفس لذت حاصل نہ کرے۔ اور میرے لئے مقصد کی خاطر بہتر صلاحیتیں حاصل کرنے میں مانع ہو جائے۔ اسی طرح ان لوگوں کے عتاب اور تنقید کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں۔ جو کسی قدر انتہاپسندی اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ کہیں مدافعت کے جذبے کے تحت میں خودنمائی مداحی کے گناہ میں ملوث نہ ہو جاؤں۔ سید محسن ہاشمی صاحب کی تحریر کے سلسلے میں مَیں نے کچھ لکھنا اسی لئے پسند نہیں کیا تھا۔

اسی دوران سلمیٰ یاسمین نجمی صاحبہ نے میری مدافعت میں ایک مختصر سا مقالہ لکھ ڈالا لیکن بڑی معذرت کے ساتھ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ موصوفہ عورت ہیں اس وجہ سے طنز کے جواب میں کچوکے لگانے سے باز نہیں آئی ہیں۔ عورت کی فطرت ہے کہ زبان کے معاملے میں اُس سے کسی کی پیش نہیں چلتی، وہ اتنا ہی کاری وار کرتی ہے جتنا مخالف سمت سے ہوتا ہے۔ موصوفہ چونکہ ایک صالح ذہن رکھتی ہیں اس لئے ٹوٹتی ہوئی کمان کی گرفت کروں۔ معاملہ کو جس قدر حلم و تدبر سے سلجھایا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سید محسن ہاشمی صاحب کو میرے مضمون سے اتنی شدید چوٹ لگی تھی کہ وہ برداشت نہیں کر سکے۔ مضمون لکھتے وقت مجھے یہی احتمال تھا کہ منٹو کے مداحوں کے لئے یہ صرف تازیانہ ہی نہیں ایٹم بم ہوگا۔ لیکن میں نے اسے لکھا اور صرف اس وجہ سے لکھا کہ مُردہ پرستی نے اُس وقت ہمارے حلقے میں بھی منٹو کو مثالی فرد اور فنکار بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے منٹو کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، بقول انور صدیقی کوئی نئی بات نہیں کہی ہے اس پر کسی کو چونکنے کی ضرورت نہیں تھی، (حسن عسکری کے قول میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ) چونکانا میرا فن ہے نہ مقصد میں نے ان تمام باتوں کو مرتب کر دیا تھا جو منٹو کے سلسلے میں اس کے دوست، اس کے دشمن، اس کے ہم نوا اور اس کے مخالف کہا کرتے تھے۔ بہت سی ایسی باتیں جو میں اقتباسات کے طور پر نہیں پیش کر سکتا تھا اپنے الفاظ میں پیش کیں۔ یہاں تک کہ اس کے کسی افسانے کے سلسلے میں بھی رائے دینے سے میں نے حتی المقدور احتیاط برتی ہے۔ اب خدارا کوئی بتائے کہ میں نے کہاں فتنہ بازی یا بددیانتی سے کام لیا ہے؟

یہ تو تھا اس مضمون کا پس منظر۔ اب کچھ باتیں محسن صاحب اور ضیا صاحب کے عائد کردہ ان الزامات کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جن کو میں بے بنیاد تصور کرتا ہوں۔ میں دونوں حضرات کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میری گستاخی کے باوجود اب بھی ان کے دلوں میں مجھ بے بضاعت کے لئے کوئی گنجائش ہوگی۔

میں نے منٹو کی فنی چابکدستی کا دبے لفظوں میں نہیں کھلے الفاظ میں اقرار کیا ہے۔ محسن صاحب نے اگر میرے دوسرے مضامین بھی دیکھے ہوتے تو میرے اعتراف کے بارے میں صحیح اندازہ کر سکتے۔ مشکل تو یہ ہے کہ میں منٹو کی شخصیت کے بارے میں لکھ رہا ہوں اور تقاضا کیا جا رہا ہے اس کی فنی عظمت کے اقرار کا۔ مضمون میں جو باتیں میں نے منٹو کے بارے میں نہیں کہی ہے وہ میں یہاں کہہ سکتا ہوں کہ منٹو اپنی فنی چابکدستی کے باوجود عظیم نہیں تھا۔ یہ میرا ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ان تمام نقادوں کا دعویٰ ہے جن کے مرتبے کو محسن صاحب مسلّم مانتے ہوں گے۔

ہزارہا برس کے پٹے ہوئے پلاٹوں میں اپنی جولانیٔ طبع کے تحت منٹو نے اگر قدرے نیاپن پیدا کر دیا تو کون سا بڑا کمال کیا۔ شبلی ہی کا م کی تحریر منٹو سے متعلق پڑھیئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس چابکدست افسانہ نگار نے سرقے تک کئے ہیں۔ زمانہ اس کی عظمت کا قائل ہو لیکن تاریخ ادب میں بے جا پروپیگنڈہ کو منہ نہ لگایا جائے گا۔ تاریخ حقائق کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جاتی ہے، صرف میری آپ کی باتوں سے کچھ نہ بنے گا۔

محسن صاحب نے فرمایا ہے "منٹو کی موت کے بعد ان کا مکمل مطالعہ کئے بغیر اور ان کی شخصیت اور ان سے متعلق ذاتی معلومات سے کماحقہ واقفیت نہ ہونے کے باوجود ان پر اس قسم کا اتہام سراسر ظلم ہے" جہاں تک مطالعہ اور واقفیت ہے میں کوئی قابل فخر بات اپنے بارے میں نہ کہوں گا۔ میں کیا ہوں اور میری حقیقت کیا، لیکن اتہام لگانے کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ کیا یہ ساری باتیں ان لوگوں کی کہی ہوئی نہیں ہیں جو منٹو کی شخصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو اس سے قریبی تعلق رکھتے تھے اور جنہوں نے اس کے بارے میں ایک رائے قائم کی تھی؟ کیا میرا ان باتوں کو نقل کر دینا ہی اتہام ہو گیا؟ اگر ایسا ہے تو ابتدائے آفرینش سے کہ اب تک جس کسی نے کسی کی قبیح عادت کو کسی سے روایت کیا اس نے اتہام لگایا۔

عظیم فن کار اور ماہر فن کار میں بہت بڑا فرق ہے۔ تعمیر پسند اور اسلامی ادیب منٹو کو چابکدست پیشہ ور فن کار تو مان سکتے ہیں لیکن عظیم فنکار نہیں مان سکتے کیونکہ اس نے اپنے مقصدِ فن میں بھی کج روی سے کام لیا اور اس کی نجی زندگی بھی ناپسندیدہ تھی۔ اس کے ثبوت میں اپنے مضمون میں دے چکا ہوں۔ یہاں تکرار صرف اس لئے کر دی کہ محسن صاحب کا گرامی نامہ مجبور کر رہا تھا۔

محسن صاحب نے مجھے سستی شہرت پسندی کا خواہش مند قرار دیا ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ شہرت اگر کوئی دے دینے والی چیز ہوتی تو میں آج ہی اسے دے ڈالتا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ نہ میں مشہور ہوں اور نہ میں نے اپنے لئے وہ ادبی حلقہ منتخب کیا ہے جو منٹو کا تھا۔ اور نہ ایسے ادبی حلقے سے میرا کوئی ربط و تعلق ہے جو مجھ جیسے ہلدی کی ایک گانٹھ کے پنساری کو آڑھت کا بیوپاری بنا دے۔ اگر ادب کی خدمت کرنے سے صرف شہرت ملتی ہے تو اسے دور سے سلام! میرے مقاصد دوسرے ہیں، میری منزل دوسری ہے۔ جہاں مجھے اس کی طرف نشاندہی کرنی ہے وہیں اس راہ میں اگنے والے ہر جھاڑ جھنکار کے پودے کو اکھاڑ کر پھینک بھی دینا ہے۔

محسن صاحب فرماتے ہیں۔ "منٹو فرشتہ نہ تھے انسان تھے۔ ان میں خامیاں تھیں لیکن تمام انسانوں سے زیادہ نہ کم" لیکن کیا ایک "انسان دوست" کے لئے ان صفات سے مزین ہونا جو منٹو میں تھیں اور جن کا اعتراف محترم ناقد نے کیا ہے قابل تشویش بات نہیں؟ منٹو نے بردہ فروشی، شراب، جوئے، جنسی بے راہروی اور نہ معلوم کس کس موضوع پر طنز کیا ہے۔ لیکن کیا کوئی انصاف پسند یہ کہہ سکتا ہے جو خود اس آخور کے لد کیسے کو سر پر لئے پھر رہا ہو اور گلی گلی بکھیر رہا ہو وہ اس کا مصلح بھی ہو سکتا ہے؟ میں بھی محسن صاحب ہی کی طرح کہہ سکتا ہوں کہ "اس کا جواب ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی نفی ہی میں دے گا۔" اور جب یہ جواب نفی میں ہے اور گفتار و کردار کا تضاد میں نے ثابت کر دیا ہے تو مبہم ہونے کی کیا بات ہے؟

ایک الزام محسن صاحب نے مجھ پر یہ بھی لگایا ہے کہ میں نے نامکمل اقتباسات لئے ہیں۔ ان کا بالکل لفظی مطلب لیا ہے اور ان آراء کو نظر انداز کر گیا ہوں جو منٹو کی تعریف و توصیف میں تھیں۔ الزامات بڑے سنگین ہیں۔ اگر میں ان کا مرتکب ہوا ہوں تو یقیناً میں نے کذب و افترا

سے کام لیا ہے۔ لیکن میں گزارش کروں کہ میرے گناہوں کو مجھ پر کھول کر بیان کرنے کے لئے آپ نے ایک آدھ ثبوت یا مثال تو دی ہوتی۔
محض مماکات سے کوئی بات ثابت نہیں ہو جایا کرتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے محسن صاحب نے یا تو کسی عصبیت کے تحت میرا مضمون پڑھا ہے یا نا دانستہ ان جملوں کی طرف سے چشم پوشی ہو گئی ہے جو میرے مضمون کا TREND واضح کرتے ہیں۔ میں نے خالد احمد صدیقی صاحب کے خط ہی میں (جو فروری ۵۶ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے) تحریر کیا تھا کہ میں کیوں اس مضمون کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ پھر ادارہ نے مضمون کی پہلی قسط کے شروع میں ادارتی نوٹ میں میری خامہ فرسائی کی وجہ کا اعادہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ میں نے منٹو کی زندگی کا ایک رُخ پیش کیا ہے ناقد کے تجاہلِ عارفانہ کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

جہاں تک نامکمل اقتباسات کا تعلق ہے میں محترم ناقد سے استدعا کروں کہ وہ میرے کسی نامکمل اقتباس کو مکمل کر کے پیش کریں اور یہ ثابت کر دیں کہ اس سے دوسرا مفہوم پیدا ہوتا ہے (تاویل نہیں کی گئی ہے) تو واقعی میں سزاوار ہوں۔ بالکل لفظی مطلب لینے سے کیا مراد ہے میں سمجھ نہ سکا۔ کیا یہ حقیقت کہ منٹو شراب پیتا تھا کوئی اور باطنی معنیٰ بھی رکھتا ہے، یا وہ جوا کھیلتا تھا، طوائفوں کے پاس جاتا تھا، گالی بکتا تھا، فراریت پسند تھا، گھر والوں کو بھی دھوکہ دیتا تھا، خود غرض تھا، بدمزاج اور چڑچڑا تھا، محض لفظی معنیٰ کے تحت بیان کیا گیا ہے اور اس کے مرادی معنیٰ کچھ اور ہیں۔ میں نے اپنے سارے مضمون میں اقتباسات کے ساتھ یہی ثابت کیا ہے۔ تمام دلیلیں انہی لوگوں کی ہیں جو اس کو قریب سے دیکھ چکے تھے، جو اسے جانتے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ اختراع نہیں کیا ہے، میں کسی واقعہ کا واضع نہیں ہوں۔

ہاں اُن آراء کو ضرور نظرانداز کر گیا ہوں جو اس کے اوصاف کے بیان میں تھیں کیونکہ وہ میرے مضمون کی حدود سے باہر تھیں (یہاں پھر وہی ٹرینڈ TREND والی بات درپیش ہے)۔

محسن صاحب کا ایک اور سنگین الزام میرے خلاف یہ ہے کہ "تقسیم کے بعد معاشی مصائب اور شراب کی مکروہ عادت کے باعث منٹو نے زود نویسی یا بسیار نویسی شروع کر دی تھی جو ان کی گراوٹ کا سبب بنی۔ لیکن یہ کہنا کہ اُن کی تقسیم کے بعد کی تمام تحریریں خالص جنسی اور فنی مرتبہ سے گری ہوئی ہیں، سراسر کذب و افترا پر مبنی ہے"۔ محسن صاحب ایسے مومن و مسلم فرد سے ہم غلط توقع تو نہیں کر سکتے کہ ان کو کذب و افترا کے معنیٰ معلوم نہ ہوں گے۔ "سراسر کذب و افترا کا مرتکب میں اسی وقت ہو سکتا تھا جب میں نے کوئی بات بے دلیل کہی ہوتی یا اپنی طرف سے وضع کر کے بیان کر دی ہوتی۔ لیکن محترم ناقد ذرا غور فرمائیں کہ دوسروں کے گناہ کی پاداش مجھ کو دہ کیوں دے رہے ہیں؟ محسن صاحب دوبارہ مضمون کا مطالعہ فرمائیں تو ان پر واضح ہو گا کہ اس دعویٰ کا مدعی میں نہیں وقارِ عظیم ہیں۔ (ان کے بلند ادبی مقام کے تو آپ معترف ہوں گے؟) میں نے اگر ان کے جملوں کو (جو اقتباس کے طور پر پیش کر چکا ہوں) عبارت مربوط کرنے کی غرض سے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے تو خطاوار میں کیوں ہوا وقارِ عظیم کیوں نہیں؟ آپ انہیں شوق سے کاذب اور مفتری بنائیں لیکن یہ واضح رہے کہ وقارِ عظیم کم مایہ ہستی نہیں!

محسن صاحب میرے مضمون کی پہلی قسط مطبوعہ مارچ ۶۲ء کے صفحہ ۴۹ کا میرا تحریر کردہ پہلا پیراگراف پڑھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ "منظور" اور ایسے ہی دوسرے افسانوں کا ذکر موجود ہے، لیکن انہوں نے جوشِ غضب میں صرفِ نظر سے کام لیا ہے ورنہ درجنوں اچھے افسانوں کا ذکر نہ کرنا پڑتا جن میں بادشاہت کا خاتمہ"، "ٹوٹو" اور "اس منجدھار میں" کو بھی شامل کرنا پڑتا۔ اگر یہ افسانے جنس پرستی یا نفسانی بے راہ روی سے خالی ہیں تو پھر آپ "خوشیا"، "گوپی ناتھ" اور "کالی شلوار" کے بارے میں کیا کہیں گے؟ چھوڑیئے اس بات کو، کیونکہ آپ ان کے فنی مرتبہ کا اقرار کرانا چاہتے ہیں اور میں ان کے محرکات پر معترض ہوں۔ آپ کی ناگواری خاطر نے آپ کو مسئلے سے بہت دور لے جا کر چھوڑا ہے۔

اس سے آگے سید محسن ہاشمی صاحب نے میرے سلسلے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس کے سلسلے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ وہ مجھے اس سے بھی زیادہ سخت سست کہنے کا حق رکھتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میں نے منٹو پر لکھ کر ان کے دل کو دُکھ پہنچایا ہے۔ البتہ میں آپ سے ضرور یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ سید محسن ہاشمی صاحب کو منٹو کے سلسلے میں لکھنے کی دعوت دیں یا کھل کر تبصرہ کرنے کی دعوت دیں۔ اگر اس دوران میں وہ مجھے اور زیادہ متہم گردانتے ہیں تو میں اسے صبر و سکون کے ساتھ سننے کے لئے تیار ہوں کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو کہ ایک مومن و مسلم ذہن منٹو کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔

جناب ضیاء الرشید صاحب نے بھی کچھ اسی طرح کے اعتراضات کئے ہیں۔ ان کا لہجہ بھی تند و تیز ہے لیکن سوائے محاکات کے دلائل کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ان کے خط میں میرے مضمون کے آخری جملے کے حوالے سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے میرا مضمون پڑھا ہوگا، مگر بعض ایسے جملوں کا میری طرف منسوب کر دیا جانا جو میرے مضمون میں موجود ہی نہیں ہیں یہ گمان کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ شاید موصوف نے میرا مضمون پڑھا ہی نہیں ہے۔ مثلاً مجھے بتایا جائے کہ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ "منٹو نے ظلم کی کمائی سے شراب کے پیالے بھرے ہیں، شراب شراب کرتے دم توڑ دیا، اس کے ہاں اخلاقی مقصدیت نہیں ہو سکتی"۔ یہ بے تکی تحریر میں نے تلاش کی مجھے اپنے مضمون میں نہیں ملی۔ ایسے کم و بیش دو ایک جملے ہیں جن کو تحریر کر کے موصوف نے میرے خلاف فردِ جرم تیار کی ہے، لیکن درحقیقت بیان کی سہل پسندی کو عیاں کرتی ہے کہ انہوں نے میرا مضمون پڑھنے کے بجائے محسن صاحب کا خط اور اس کے حاشیے پڑھنے پر اکتفا کیا۔ خیر میں اس خط سے زیادہ تعارض کرنا نہیں چاہتا صرف دو ایک گزارشیں کرنی ہیں۔

میں نے منٹو کو موپاساں کی بدروح قرار دیا ہے، ضیاء صاحب اس پر معترض ہی نہیں برافروختہ ہیں اور اس اصطلاح کو سوقیانہ قرار دیتے ہیں۔ مجھے ان کے لہجے سے کوئی شکایت نہیں البتہ بصد ادب عرض کروں گا کہ "بدروح" کی اصطلاح کے ساتھ انصاف کیا ہوتا۔ اگر میں نے اپنا جملہ "یہ سراسر منٹو ہی کا قصور تھا کہ وہ موپاساں کے برابر پہنچنے کے بجائے اس کی بدروح بن گیا" کو یوں لکھا ہوتا: ————

"It was wholly and solely Minto's fault, that he, instead of reaching M aupassant's place, became his ghost."

تو ضیاء صاحب کیا کہتے؟ Ghost انگریزی میں اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ موقع و محل اچھے معنوں کا متقاضی

ہے۔ اس لفظ کے معنے اردو میں عام طور پر "بھوت" اور "بد روح" ہی کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ اب ضیا صاحب ہی فرمائیں
کہ منٹو کو "بھوت" بنانا سوقیانہ تھا یا "بد روح" قرار دینا۔ افسوس موصوف انگریزی سے واقف ہونے کے باوجود اس جملے کی قدر نہ کر سکے۔ البتہ
بد روح میں ذم کا پہلو بھی ہے، اور میں نے اسے شعوری طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ موپاساں کے حالات زندگی کچھ بھی رہے ہوں، اس کی ......
Abnormality اپنے ماحول میں اتنی قابل لحاظ نہیں جتنی منٹو کی ——— اس سے کہیں Abnormality موپاساں
کے ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے منٹو کو بد روح قرار دیا ہے کچھ اور نہیں۔ وہ کسی لحاظ سے بھی تو موپاساں کا ہم پلہ
نہیں تھا۔

محسن ہاشمی صاحب کے خط میں جوش غضب ضرور زیادہ ہے لیکن ضیاء الرشید صاحب کے گرامی نامہ میں تو اخلاقی معائب
کے لئے بھی تاویلات ہیں جنہیں ہم سب بالاتفاق ناقص قرار دیتے ہیں۔ مثلاً انسان دوستی کی کسوٹی کے سلسلے میں فرماتے ہیں "میرے
خیال میں تو ابن فرید صاحب کے اس معیار پر خدائی پیغمبروں کے بعد شاید ہی کوئی ذی روح پورا اتر سکتے" مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ ایک
بار پھر مجھے یہ ناگوار فرض ادا کرنا پڑتا ہے کہ موصوف کی توجہ معروف انسانی اقدار اور اسلام کے معیار مومن کی طرف مبذول کراؤں! کچھ
کہتے نہیں بن پڑ رہا ہے کیوں کہ کہوں کہ آپ پیغمبروں کی بات کرتے ہیں اور میں ان کے متبعین اور عاجز و خطاکار امتیوں کی بات کرنا چاہتا
ہوں۔ اور دور کیوں جائیے آپ نے خود محسن ہاشمی صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ میں موصوف کو نہیں جانتا۔ لیکن آپ کے
بیان پر اعتبار کر کے کہتا ہوں کہ کیا موصوف میرے معیار (جو دراصل اسلام کا معیار ہے) پر پورے نہیں اترتے ہاللہ کچھ تو انصاف کیا ہوتا۔

آپ نے نفسیات کی بات چھیڑی ہے۔ گستاخی ہوگی اگر میں عرض کر دوں کہ نفسیات میں مجھے بھی کچھ شد بد ہے۔ میں نفسیات
ہی کا طالب علم ہوں اس لئے آپکے تضاد بیان سے کم از کم مجھے مرعوب نہ کر سکیں گے۔ شخصیت کی نفسیات کے بارے میں آپ
نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک laymans knowledge سے آگے کی بات نہیں۔

میں نے گوناگوں کیفیتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ منٹو کی مستقل عادات (Habits) کا ذکر کیا ہے۔ اور عادات کے بارے میں آپ کو
بھی معلوم ہے کہ Watsonian Behaviorism بھی بسر تسلیم خم کر دیتی ہے۔

احساسات و خیالات میں تضاد وقتی اور اتفاقی ہوتا ہے، لیکن جب چند مخصوص اعمال، زندگی کے مختلف لمحوں میں تکرار کے ساتھ ہوتے
رہتے ہیں تو وہ شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے یقیناً ضیاء الرشید صاحب آگاہ ہوں گے۔ اور انہوں نے اگر میرا مضمون
پڑھا ہوگا یا اب پڑھیں گے تو وہ بآسانی اس امر کو اخذ کر لیں گے کہ میں نے منٹو کے حبس خبث باطن کی طرف بھی نشاندہی کی ہے اس کے
لئے ایک نہیں دو دو تین مثالیں دی ہیں۔ حالانکہ محسن ہاشمی صاحب نے اپنے گرامی نامے میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں نے محض
ایک اتفاقی واقعے کو چن کر "ایک کذب و افترا" کا دفتر لگا دیا ہے۔ محسن ہاشمی صاحب نے عصمت چغتائی سے منٹو کے چند ناموزوں کلمات
کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یہ محض ضد میں آکر منٹو نے کہے تھے اور میں محض ان کلمات کے لفظی معنی لے کر اور ان کے موقع و محل
کو نظر انداز کرتے ہوئے بغیر تصدیق یا ذاتی معلومات کے ایک عظیم فن کار پر اس کی موت کے بعد یہ بیہودہ الزام تراشی کر رہا اپنی زندگی میں

کا کیا انجام ہوا؟ منٹو کے ۴۷ء نے زمانے کو کیا دیا سوائے اس کے کہ چند بانوے وقت بھارتی، شش مظفر پوری وغیرہ کی صف میں ایک ماہر فن کا اضافہ ہو گیا (یہ بات بھی میری کہی ہوئی نہیں ہے۔ ہمالہ کے لئے م۔ نسیم صاحب کے اداریے پڑھیئے)۔ جس مقصدیت میں خلوص نہیں ہوتا اس میں بے اثری اور جھول ہوتا ہے، احساس جھول اور بے اثری کو میں نے مثالوں سے ثابت کر دیا ہے۔ منٹو کے یہاں (اگر کوئی مقصد ہے، جو نہیں ہے) اسی لغزش کی وجہ سے انسان دوستی کے بجائے انسان دشمنی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ضیاء الرشید صاحب نفسیاتِ انسانی کے ماہر ہوں گے، وہ جانتے ہوں گے کہ جب بعض اطوار تحت الشعور میں اتر جاتے ہیں تو وہ شعور پر انعکاس ضرور کرتے ہیں۔

ضیاء صاحب نے منٹو کی بڑی پر لطف مدافعت کی ہے۔ اسے پڑھ کر کبھی ہنسنے کو دل چاہتا ہے اور کبھی رونے کو ؎

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا

آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

یہ Repentance والی بات کیا ہوئی؟ احساس گناہ کے بعد اقرارِ گناہ اور استغفار یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے ایسے بندوں کو معاف کرنے کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ لیکن بقول پروفیسر آسی ضیائی یہ ......

Repentance اگر "ہاضمے کا چورن" بن جائے تو کیا اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب ہوگا؟ یعنی ایک شخص جوا کھیلتا ہے اور کہے کہ یہ بہت برا فعل ہے۔ ایک شخص طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر لگایا کرے اور کہے کہ یہ انتہائی شنیع فعل ہے، ایک شخص شراب پیتا رہے اور Repent کرتا ہے تو کیا اس اقرارِ محض سے دامن کے داغ دھل جائیں گے؟ اس دنیا میں کتنے انسان ہیں جو برے اعمال کو برے اعمال نہ سمجھتے ہوں؟ شاذ معدودے چند! باقی سارے کے سارے Repent ہی کرتے ہیں ضیاء صاحب اگر یہ Repentance ہی انسان دوستی کا مظہر ہے تو پھر آئیے کیوں نہ ہم آپ سب ہی منٹو کے حمام میں ننگے نہائیں۔! میں نے اس نام نہاد Repentance کی قلعی اپنے مضمون ہی میں کھول دی تھی لیکن افسوس کہ آپ کو مجھے صلواتیں سنانے کے لئے اور ہاشمی صاحب کی حاشیہ کے لئے کچھ پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

نعیم صاحب دو دن سے مسلسل یہ خط لکھ رہا ہوں، آپ کی سمع خراشی ہو رہی ہے، میرا ہاتھ تھک رہا ہے۔ بعض انتہائی ضروری کام متاثر ہو رہے ہیں مگر ضیاء الرشید صاحب کے گرامی نامے نے وہ عالم پیدا کر دیا ہے کہ ؎

دو چیز ہیں یادگارِ دوراں

تیرا ستم اپنی جاں فشانی!

موصوف نے جنسیت کو انسانی زندگی کا Governing Factor قرار دیا ہے۔ اگر موصوف نے تحلیل نفسی کے نقطۂ نظر سے کہا ہے تو یہ اصطلاح ضرور بامعنی ہو جاتی ہے ورنہ اپنی فہم سے "بہت بالاتر"! اسلام نے تو اسے زندگی کے بہت سے ......

Governing Factors میں سے ایک قرار دیا ہے نہ کہ واحد! ضیاء صاحب نہ معلوم کہاں سے کہاں بہک جاتے ہیں۔ کبھی وہ انسان دوستی کی طرف بڑھتے ہیں، کبھی اسلام کی طرف، اور کبھی مادی نظریاتِ زندگی کی طرف! (موضوع میں اس قدر ......

Excitement? متوازن فکر کی نمائندگی نہیں کرتا۔

"جنسیت" شرمناک تو نہیں، لیکن "جنسیت" کو روزی کمانے کے لئے آلۂ کار بنانا ضرور شرمناک ہے۔ اس درمیان میں نے "اسلامی ادب اور تصورِ جنس" پر ایک مضمون لکھا ہے۔ حالانکہ میں نہ بلند مقام رکھتا ہوں اور تنقید نگاروں کی صف میں میرا کوئی مرتبہ ہے (اس امر سے ہر دو حضرات خوب واقف ہیں) مگر اتنی گزارش تو ضرور کروں گا کہ جس طرح منٹو والا مضمون پڑھ کر آپ حضرات نے تضیعِ اوقات کی ہے اسی طرح معیار میرٹھ کے خصوصی نمبر ۱۹۵۰ء کا مطالعہ کر کے میرے ان ناقص خیالات سے بھی آگاہی حاصل کر لیں۔ جنسیت کا ذکر اگر معاشرہ کی بہبود، عائلی زندگی کے توازن اور جنسی داعیات کے لئے اعتدال کا باعث ہو تو یہ میرے نزدیک ہی نہیں ہر اسلامی ادیب کے نزدیک خطرناک نہیں مستحسن ہے۔ ہم اس داعیہ کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے (جیسا کہ میں نے اپنے مذکورہ مضمون میں کہا ہے) ہم اس ارتفاع (Sublimation) کے قائل ہیں، خانقاہی ادب والوں کی طرح امتناع (Repression) کے نہیں۔ اور نہ منٹو، عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، عزیز احمد وغیرہ کی طرح بہیمی (Primitive) بنا دینے کے۔ منٹو نے جس طرح جنس کا تذکرہ کیا ہے اگر آپ نے میرا مضمون پڑھا ہوتا تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ میں اس کے Approach پر معترض ہوں، سرے سے جنس کے تذکرے پر نہیں!......

ہمارے ضیاء الرشید صاحب کو یہ ملکہ تو ضرور حاصل ہے کہ اپنی تحریر میں نہیں تو اپنی تحریر کے ذریعے دلچسپی کا پورا پورا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جو توجیہیں کی ہیں اور ان کا تجزیہ کر کے اُن کی حقیقت میں نے عیاں کی ہے، آپ نے بھی اندازہ کیا ہوگا کہ ان سے اچھی خاصی تفریحِ طبع ہو گئی ہے، اب ویسی ہی دو ایک چیزیں اور ملاحظہ ہوں۔ موصوف نے منٹو کے ناقدین کو منٹو سے بدرجہا بہتر قرار دیا، مگر اس سے نفسِ مضمون پر کیا اثر پڑا؟ صرف اتنا کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس لئے صحیح ہے کہ وہ منٹو سے بھی اچھے ہیں! پھر تو منٹو ان سب سے اچھا ہوا کیونکہ منٹو سے بدرجہا بہتر افراد اُسے اچھا کہتے ہیں (منطقی استدلال تو یہی ہوا)۔ اچھا صاحب مان لیا کہ وہ سارے کے سارے سگریٹ بھی نہیں پیتے، مگر اس سے تنقیدی زاویہ نظر کا قرب کیوں کر ثابت نہیں ہوتا؟ کیا آپ ریاض خیرآبادی کو بھول گئے! انہوں نے شراب نہیں چکھی لیکن شراب کے ثناخواں رہے۔ آپ امیر مینائی کو بھی تو نہ بھولے ہوں گے؟ اس عابد و زاہد نے اپنی ساری زندگی تقویٰ و پارسائی میں گزار دی مگر شاہدِ مجازی کے لئے رطب اللسان رہا۔ باقی اور بہت سی مثالیں چھوڑ دیئے۔ کیا اس سے زاویۂ نظر کا قرب ثابت نہیں ہوتا؟ ؎

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند کہ
وہ ماجرا جو لائقِ شرح و بیاں نہیں

میرے محترم بزرگ، میں پاکیزہ زندگی گزارنے والے تمام ناقدین کی قدر کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض میرے اساتذہ بھی ہیں، میں نے انہیں اس قدر قریب سے دیکھا ہے جتنا میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں کو قریب سے دیکھا ہے، لیکن نعیم صاحب! آپ نے جو بات کہی ہے اس کا علاقہ اس پاکیزگی سے نہیں نظریۂ فکر کی ژولیدگی سے ہے۔ ان تمام تنقید نگاروں کا (جنہوں نے منٹو کی حمایت کی ہے) نقطۂ نظر وہی ہے جو ایک مادہ پرست تنقید نگار کا ہو سکتا ہے۔ وہ اسی نقطۂ نظر کے محدب شیشے سے

منٹو کے جنسی تلذذ سے لبریز ادب کو دیکھتے ہیں اور اس کی مدآمی کرتے ہیں۔ اب ہمارا ان کا عہدہ امداعزاز، تو یہ ان کی ظاہر بے راہروی کے لئے وجہِ جواز تو نہ بن جائے گا!

لیجئے یہ ایک اور بڑی پرلطف بات ہے ضیا صاحب کی طرف سے! اگر نقوش کا منٹو نمبر، منٹو کے سلسلے میں سیر حاصل معلومات فراہم کرنے کے لئے کافی ہو تو کیا اس کے حوالے سے کوئی مضمون ڈالنا بری بات ہے؟ میرا جہاں تک خیال ہے ضیاء صاحب تو شائد ایسی صورت میں وقار عظیم، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، عبدالحمید قریشی، عبادت بریلوی، آل احمد سرور، احتشام حسین اور نہ معلوم کتنوں ہی کے کام پر پانی پھیر دیں گے جنہوں نے بعض اوقات محض چند خطوط، ایک نظم، ایک افسانہ یا ایک مضمون سامنے رکھ کر کچھ لکھا ہے۔ اگر یہ سب لوگ قابلِ عتاب ہیں تو میں بھی موصوف کی گلوٹین پہ گردن رکھ دوں گا۔ مگر ٹھہرئیے ابھی رسی نہ کھینچئے chapter کو ختم نہ دیجئے، ابھی suspense باقی ہے۔ میرے مضمون کے اقتباسات کے نیچے درج شدہ حوالوں پر غور کیجئے اور ضیاء صاحب کے محاکمے کی داد دیجئے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

ایک بار پھر یہ پردہ فاش ہوتا ہے کہ موصوف نے میرا مضمون پڑھا ہی نہیں ہے ورنہ اس غلط بات کے کہنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا موصوف یہ چاہتے تھے کہ میں نے منٹو کے سلسلے میں جتنے منٹو نمبر پڑھے تھے اور جتنی کتابیں اور رسالے پڑھے، مضمون کے شروع میں ان کی فہرست دے دیتا اور کہتا کہ لوگو دیکھو میں نے منٹو پر اتنا پڑھا ہے تم اطمینان رکھو میں تمام باتیں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ رہا ہوں، جعل سازی، ملمع سازی، دھوکہ بازی نہیں ہے۔ مگر ستم تو یہ ہے کہ کھنے والا تیر پھر بھی نشانہ پر لگتا اور منٹو پرست ذہن تلملا اٹھتا۔

"مطلب کے فقرے چھانٹنے" والا الزام ضیاء صاحب نے بھی لگا دیا، مگر کوئی دلیل دینے سے محسن صاحب کی طرح انہوں نے بھی احتراز کیا ہے۔ اس دعویٰ بے دلیل کا اعادہ کب تک ہوتا رہے گا؟ میں نے "وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ" والی بات نہیں کہی ہے ضیا صاحب اطمینان رکھیں کیونکہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن میری ان گزارشات کو پڑھنے والا پڑھ کر یہ ضرور اندازہ کر سکتا ہے کہ میرے دونوں کرم فرماؤں نے "رَاعِنَا" کو "رَاعِیْنَا" ضرور بنانے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ جن صفات کو دونوں کرم فرماؤں نے ایک نقاد کے لئے ضروری قرار دیا ہے میں ان سے بہ کمال و تمام متصف نہیں ہوں، اس کی ایک وجہ بھی ہے جو شائد معقول معلوم ہو۔ میں نقاد نہیں ہوں، نہ نقاد بننا چاہتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی اس کا احساس ہے کہ اس کے لئے جس قدر ریاضت اور مجاہدہ کی ضرورت ہے وہ میں اپنی دوسری دلچسپیوں کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے لئے نفسیات کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور باقی ماندہ وقت میں افسانہ نگاری کو مخصوص کر لیا ہے، اور یہی کرتا رہتا ہوں۔ اپنی چار پانچ سالہ ادبی زندگی میں میں نے مشکل سے تین چار مضامین لکھے ہیں، میں سمجھتا

ہوں کہ تنقید نگاری تنقید نگاروں ہی کو کرنی چاہیئے وہی اس کا حق ادا کر سکتے ہیں البتہ جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک حقیقت بار بار آشکار ہونے کے باوجود ہمارے تنقید نگاروں کی توجہ مبذول کرانے سے محروم رہ جاتی ہے تو میں مجبوراً قلم اٹھاتا ہوں بمقام شکر ہے کہ میری یہ خام کوششیں بھی اصحاب نظر کا التفات حاصل کرلیتی ہیں۔ اس سے مجھے اسلامی نقطہ نظر رکھنے والوں تنقید نگاروں کے مستقبل کے امکانات روشن معلوم ہوتے ہیں۔ میں آسی ضیائی، محمد حمید اللہ صدیقی، سید محسن ہاشمی، جمیل احمد فاروقی ایسے تنقید نگاروں سے آپ کے توسط سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے رخشِ قلم کو تیز کریں، باطل کے میدان سر ہونے کے لئے تیار رہیں۔
خط ختم کرنے سے پہلے میں وہی شعر جو موصوف نے آپ کو مخاطب کر کے درج کیا ہے، انہی کو مخاطب کر کے درج کرتا ہوں ؎

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

اور یہ بھی کہوں گا اگر گستاخی نہ ہو کہ ؎

یاں تغافل میں اپنا کام ہُوا　　تیرے نزدیک یہ جفا بھی نہیں

اس سے قبل بھی ایک خط روانہ خدمت کر چکا ہوں، وہ ذرا کچھ دفتری نوعیت کا تھا۔ آجکل دو تین کتابیں لکھنے میں ایسا مشغول ہوں کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ چراغ راہ کے لئے ایک عرصے سے لکھنے کا عزم کر رہا ہوں مگر رخشِ عمر ہے کہ تیز گامی کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دم مارنے کی بھی مہلت نہیں۔ بہر حال اللہ مالک ہے۔ آپ کی مصروفیات تو آج کل ضرورت سے زیادہ ہوں گی ان ہی کا خیال کر کے پہلے بھی براہِ راست مخاطب نہیں ہوا تھا، اور اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو چار سال کی کسر پوری ہو گئی۔ کبھی کبھی تو اس نااہل کو بھی نواز دیا کیجئے۔　　رفقا کو سلام علیک

والسلام　ابن فرید۔ رامپور۔ ۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء

بقیہ "جگنو ناچ" از صفحہ ۱۴

بقیہ "جگنو ناچ" از صفحہ ۱۴

مگر اس نے رات کی بقیہ گھڑیاں تکیئے پر سر رکھے روتے روتے گزار دیں!

وہ خلوتوں میں روتی، جلوتوں میں ہنستی اور ہنساتی تھی!
رونا اور ہنسنا ——— کھلنا اور مرجھانا ——— جلنا اور بجھنا ——— اندھیرا اور روشنی ———
"جگنو خانم"! ———
——— ایک تو گرفتار طوائف!!!

کشمیر ——— نرکی نہاکانی

(شاعر نے یہ نظم کچھ عرصہ قبل لکھی تھی۔ اس میں کشمیر کی جو فریاد گونج رہی ہے، وہ نظم کی اشاعت سے قبل ہی
زمانے سے خراجِ اثر کچھ نہ کچھ وصول کر چکی ہے، مگر ابھی کیا معلوم ———!)

تمام رات مری جاگتے کٹی لیکن
سحر ہوئی تو اُجالوں نے مجھ کو لوٹ لیا
شعاعِ نور نے پہنا دیں بیڑیاں مجھ کو
مرے ہی حُسن کے ہالوں نے مجھ کو لوٹ لیا
تمام رات رہا مجھ کو انتظارِ سحر
تمام رات تڑپ کر گزار دی میں نے
اس آس پر کہ اب آئے گا ایک دورِ نشاط
بہارِ حُسن کے جلووں کا اہتمام کئے
نوائے درد و طلب کو نویدِ جام کئے
فلک سے عیش و طرب کا پیام آئے گا
فروغِ حُسن سے بدلے گی شب کی تاریکی
سحر کا نور فضاؤں میں پھیل جائے گا
مگر بہارِ طرب کی نمود کے بدلے
سحر ہوئی تو ہوا اور ظلمتوں کو فروغ
کچھ اور بڑھ گئے شامِ حیات کے سائے
کچھ اور ہو گئے بے نور زندگی کے چراغ
ہوائیں تیر گئے میری آہِ غم کے شرار
فضا میں گونج گئی میری بے بسی کی پکار

وہ ساز جس سے برستا تھا کیفِ سرمستی
وہ ساز دینے لگا مجھ کو تلخیوں کے پیام
وہ لب جو مجھ کو سُناتے تھے شوق کے نغمے
وہ لب ہی دینے لگے مجھ کو موت کا پیغام
بڑھے تھے ہاتھ جو لے کر نشاط کے ساغر
انہی نے لُوٹ لیا میری سرخوشی کا سہاگ
انہی نے پھونک دیا میری زندگی کا چمن
انہی نے دے دی مری وادیٔ سکون میں آگ
جو لوگ مجھ کو دکھاتے تھے راہِ آزادی
انہی نے آن کے پہنا دیں بیڑیاں مجھ کو
کھلا دیئے مری راہوں میں خون کے لالے
مرے لہو سے کیا کشتِ زعفراں مجھ کو
سحر کا نور بنا ایک آگ کا طوفاں
دھوئیں نے جس کے کیا میری وسعتوں کو اسیر
جُھلس جُھلس کے ہر اک شے کو جس کے شعلوں نے
مٹا دیا مری خوش پوش وادیوں کا جمال
سیاہ پوش کیا جس نے میرے جلووں کو
جلا کے راکھ کیا جس نے میرا باغِ حیات

مری فضاؤں میں چھوٹے لہو کے فوارے
گلے کٹے مری گلیوں میں نوجوانوں کے
سکون و امن کا پیغام دینے والوں نے
چڑھائے نیزوں پہ سر میرے بے زبانوں کے
کہیں پھرایا مری بیٹیوں کو بے پردہ
کہیں جلا دیئے گھر میرے پاسبانوں کے
کچھ اس طرح سے ہوا منتشر نظامِ چمن
بکھر کے رہ گئے تنکے بھی آشیانوں کے

وہ برف پوش ہمالہ کے آئینہ خانے
وہ زندگی کے حسیں منظروں کے شیش محل
تھیں جن کے سائے میں رقصاں بہار کی حوریں
تھا جن کے سر پہ زرافشاں شباب کا آنچل
بنے ہیں چشم زدن میں بس ایک راکھ کا ڈھیر
وہ میرے سینے پہ بہتے ہوئے حسیں چشمے
وہ رقص کرتا ہوا حسن آبشاروں کا
ہیں تا بہ حدِّ نظر سرخیاں شفق کی عیاں
ملا ہے خون میں میرے لہو بہاروں کا
قدم قدم پہ بھڑکتے ہیں آگ کے شعلے
ہے پاپیادہ رواں قافلہ چناروں کا

نہ آئی راس مجھے آہ آرزوئے سحر
ہوا ہے زہر مجھے آبِ مشکبوئے بہار
جلا گیا ہے کچھ اس طرح مجھ کو شعلۂ غم
سلگ رہے ہیں ابھی تک نشاط و شالامار
ہوئے ہیں لالہ و گل داغِ قلبِ سوزاں کے
بنے ہیں سروِ چمن دودِ آہ کے مینار

نہ کام آئی مرے، وقت کی کوئی تدبیر
خود اپنی شومئ تقدیر بن گیا ہوں میں
اُمڈ کے آئی ہے چاروں طرف سے تاریکی
اندھیری رات کی تفسیر بن گیا ہوں میں
مری فضاؤں کی اس تیرگی میں میرے سپوت
تلاشِ نور میں مثلِ کلیم دوڑ اٹھے
مگر وہ نور کہ تھا ایک آگ کا طوفاں
زمیں سے تا بہ فلک ہو گیا فضا پہ محیط
جھلس جھلس کے ہر اک شے کو جس کے شعلوں نے
مٹا دیا مری خوش پوش وادیوں کا جمال
جلا کے راکھ کیا جس نے میرا باغِ حیات
ہوا میں تیر گئے میری آہِ غم کے شرار
فضا میں گونج گئی میری بے بسی کی پکار
مثالِ ابر اُٹھے اشک و آہ کے طوفاں
مگر زمانے پہ اک بے حسی رہی طاری
سُنی نہ سارے جہاں میں کسی نے میری پکار
سُنے نہ نالے کسی نے مرے یتیموں کے
پکارتے رہے رو رو کے اُف یہ سینہ فگار

میں چیختا ہوں میں چلّا رہا ہوں مدّت سے،
غضب خدا کا ادھر کوئی دیکھتا ہی نہیں
بھڑک رہی ہے مری وادئ سکون میں آگ
میں جل رہا ہوں مگر کوئی دیکھتا ہی نہیں!

کشمیر

——— نرائن کی نہ آکانی

(شاعر نے یہ نظم کچھ عرصہ قبل لکھی تھی۔ اس میں کشمیر کی جو فریاد گونج رہی ہے، وہ نظم کی اشاعت سے قبل ہی
زمانے سے خراجِ اثر کچھ نہ کچھ وصول کر چکی ہے، مگر ابھی کیا معلوم ——— !)

تمام رات مری جاگتے کٹی لیکن
سحر ہوئی تو اُجالوں نے مجھ کو لوٹ لیا
شعاعِ نور نے پہنا دیں بیڑیاں مجھ کو
مرے ہی حُسن کے ہالوں نے مجھ کو لوٹ لیا
تمام رات رہا مجھ کو انتظارِ سحر
تمام رات تڑپ کر گزار دی میں نے
اس آس پر کہ اب آئے گا ایک دورِ نشاط
بہارِ حُسن کے جلووں کا اہتمام کئے
نوائے دردِ طلب کو نویدِ جام کئے
فلک سے عیش و طرب کا پیام آئے گا
فروغِ حسن سے بدلے گی شب کی تاریکی
سحر کا نور فضاؤں میں پھیل جائے گا
مگر بہارِ طرب کی نمود کے بدلے
سحر ہوئی تو ہوا اور ظلمتوں کو فروغ
کچھ اور بڑھ گئے شامِ حیات کے سائے
کچھ اور ہو گئے بے نور زندگی کے چراغ
ہوا میں تیر گئے میری آہِ غم کے شرار
فضا میں گونج گئی میری بے بسی کی پکار

وہ ساز جس سے برستا تھا کیفِ سرمستی
وہ ساز دینے لگا مجھ کو تلخیوں کے پیام
وہ لب جو مجھ کو سُناتے تھے شوق کے نغمے
وہ لب ہی دینے لگے مجھ کو موت کا پیغام
بڑھے تھے ہاتھ جو لے کر نشاط کے ساغر
انہی نے لُوٹ لیا میری سرخوشی کا سہاگ
انہی نے پھونک دیا میری زندگی کا چمن
انہی نے دے دی مری وادیٔ سکون میں آگ
جو لوگ مجھ کو دکھاتے تھے راہِ آزادی
انہی نے آن کے پہنا دیں بیڑیاں مجھ کو
کھلا دیئے مری راہوں میں خون کے لالے
مرے لہو سے کیا کشتِ زعفراں مجھ کو
سحر کا نور بنا ایک آگ کا طوفاں
دھوئیں نے جس کے کیا میری وسعتوں کو اسیر
جُھلس جُھلس کے ہر اک شے کو جس کے شعلوں نے
مٹا دیا مری خوش پوش وادیوں کا جمال
سیاہ پوش کیا جس نے میرے جلووں کو
جلا کے راکھ کیا جس نے میرا باغِ حیات

مری فضاؤں میں چھوٹے لہو کے فوارے
گلے کٹے مری گلیوں میں نوجوانوں کے
سکون و امن کا پیغام دینے والوں نے
چڑھائے نیزوں پہ سر میرے بے زبانوں کے
کہیں پھرایا مری بیٹیوں کو بے پردہ
کہیں جلا دیئے گھر میرے پاسبانوں کے
کچھ اس طرح سے ہوا منتشر نظامِ چمن
بکھر کے رہ گئے تنکے بھی آشیانوں کے

وہ برف پوش ہمالہ کے آئینہ خانے
وہ زندگی کے حسیں منظروں کے شیش محل
تھیں جن کے سائے میں رقصاں بہار کی حوریں
تھا جن کے سر پہ زر افشاں شباب کا آنچل
بنے ہیں چشم زدن میں بس ایک راکھ کا ڈھیر
وہ میرے سینے پہ بہتے ہوئے حسیں چشمے
وہ رقص کرتا ہوا حسن آبشاروں کا
ہیں تا بہ حدِ نظر سرخیاں شفق کی عیاں
ملا ہے خون میں میرے لہو بہاروں کا
قدم قدم پہ بھڑکتے ہیں آگ کے شعلے
ہے پا پیادہ رواں قافلہ چناروں کا

نہ آئی راس مجھے آہ آرزوئے سحر
ہوا ہے زہر مجھے آبِ مشکبوئے بہار
جلا گیا ہے کچھ اس طرح مجھ کو شعلۂ غم
سلگ رہے ہیں ابھی تک نشاط و شالامار
ہوئے ہیں لالہ و گل داغ قلبِ سوزاں کے
بنے ہیں سروِ چمن دودِ آہ کے مینار

نہ کام آئی مرے، وقت کی کوئی تدبیر
خود اپنی شومئ تقدیر بن گیا ہوں میں
اُمڈ کے آئی ہے چاروں طرف سے تاریکی
اندھیری رات کی تفسیر بن گیا ہوں میں
مری فضاؤں کی اس تیرگی میں میرے سپوت
تلاش نور میں مثل کلیم دوڑ اٹھے
مگر وہ نور کہ تھا ایک آگ کا طوفاں
زمیں سے تا بہ فلک ہو گیا فضا پہ محیط
جھلس جھلس کے ہر اک شے کو جس کے شعلوں نے
مٹا دیا مری خوش پوش وادیوں کا جمال
جلا کے راکھ کیا جس نے میرا باغ حیات
ہوا میں تیر گئے میری آہِ غم کے شرار
فضا میں گونج گئی میری بے لبسی کی پکار
مثالِ ابر اُٹھے اشک و آہ کے طوفاں
مگر زمانے پہ اک بے حسی رہی طاری
سُنی نہ سارے جہاں میں کسی نے میری پکار
سُنے نہ نالے کسی نے مرے یتیموں کے
پکارتے رہے رو رو کے اُف یہ سینہ فگار

میں چیختا ہوں میں چلّا رہا ہوں مدّت سے،
غضب خدا کا ادھر کوئی دیکھتا ہی نہیں
بھڑک رہی ہے مری وادئ سکون میں آگ
میں جل رہا ہوں مگر کوئی دیکھتا ہی نہیں!

ترجمہ: جعفر رضا

تاریخ اسلام کی جون آف آرک

شہزادی آمینہ الاماویہ

— ۱ —

جاڑے کی ایک اندھیری رات تھی۔ جنگ کی خوفناک چکی اپنے سابق عروج پر تھی۔ تلواروں کی جھنکار، نیزے اور ڈھال کی ٹکراہٹ فضا میں ایک خوفناک گونج پیدا کر رہی تھی۔ دفعتاً ایک للکارتی ہوئی سپاہیانہ آواز ہوا میں اُبھری: "اسلام کے جانبازو! بزدل ہسپانیوں کو اپنی پشت مت دکھاؤ۔ تم اس قوم کے فرزند ہو جنہوں نے فرار پر موت کو ترجیح دی۔ بڑھو اور دشمن کو بتا دو کہ ان کی کثرت تمہارے آہنی بازوؤں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی" یہ الفاظ مٹھی بھر عربوں کے لئے جادو کا اثر رکھتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ اور ولا غالب الا اللہ کے پُرشکوہ نعروں کے ساتھ وہ اپنی تمام تر قوت سے ٹڈی دل ہسپانیوں پر ٹوٹ پڑے۔

لیکن ڈوبتا ہوا سورج اپنی شعاعوں کے آخری تیر پھینک رہا تھا۔ خیموں میں آگ لگ جانے سے، ہوا میں بوجھل پن کا احساس تھا۔ زخمیوں کی کراہ، مرنے والوں کی چیخ، ہتھیاروں کی کھنک تدریجی طور پر کم ہو رہی تھی۔ لیکن چند عرب اب بھی کثیر التعداد ہسپانیوں سے بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ ان کی موت بھی ان لاکھوں اموات سے مختلف نہیں جو مالقہ، بانا، اشبیلیہ اور الحمرا کی دیواروں کے نیچے واقع ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی جنگلوں میں بھاگ کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن ایک مقدس جذبہ، ایک تابناک روایت، ان کے قدموں میں زنجیر کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ وہ روایت، وہ جذبہ کیا تھا؟ کوئی قلم اسے تحریر نہیں کر سکتا۔

آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب آخری عرب سپاہی نے کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے دم توڑ دیا۔ رات پُرسکون ہو چکی تھی اور مرنے والے عربوں کے چہرے پر اندلس کی تمام خوبصورتی عود کر آئی تھی۔ رات کسی سوگوار بیوہ کی طرح غم زدہ اور اداس تھی۔ چند ہسپانوی سپاہی ہاتھوں میں مشعلیں لئے زخمیوں میں کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ ایک مردہ عرب کو بغور دیکھ کر ایک سپاہی بڑبڑایا:

"اس قدر کم تعداد میں بھی اُس کی صورت پہچاننا ناممکن نظر آ رہا ہے۔ جب کہ تمام کی تمام صورتیں ایک ہی جیسی دکھائی پڑتی ہیں لیکن انعام کی خاطر ——"

"دوڑو، خنجر لاؤ" چند قدم پر ایک دوسرا سپاہی بدحواسی میں چلایا

پہلے نے جلدی سے کمر سے خنجر کھینچا اور آگے بڑھا

"لاؤ خنجر مجھے دو۔" دوسرے سپاہی نے اپنے قریب پہلے سپاہی کو محسوس کرتے ہوئے "پانی پانی" کی ایک نحیف آواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

[illegible]

"یہی ہے وہ" دوسرے نے پھرتی سے زخمی کے سر کو پکڑ کر خنجر بلند کیا۔ دوسرے لمحے فضا میں ایک دردناک چیخ گونجی۔ اور پہلا سپاہی مشعل زمین پر پھینک کر بدحواس بھاگا۔ دوسرے دن رات کے موقع واردات پر چند سپاہی آئے۔ رات والا زخمی عرب مر چکا تھا۔ ٹھیک اس کے پہلو میں رات والے دوسرے سپاہی کا جسم ایک نیزہ پر نصب تھا سپاہی کا ہاتھ ابھی تک خنجر بلند کئے ہوئے تھا اور آنکھیں ہیبت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

ہسپانوی سپاہیوں نے جھک کر بغور مردہ عرب کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"یہ فرڈی نینڈ ڈی والدری ہے[۱]"

سب نے اطمینان و مسرت کا سانس لیا اور فرڈی نینڈ کا سر کاٹ کر نیزے پر نصب کر کے ایک جلوس کی شکل میں غرناطہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

— ۲ —

"اچھا تو فرڈی نینڈ مر گیا" ایک شخص جو یہودی النسل معلوم ہوتا تھا اپنے ایک ہم نسل سے مخاطب تھا۔

"تو پھر مجھے ازابیلا کو اس کی ضرور خبر دینا چاہیئے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دوست سے رخصتی مصافحہ کیا اور البیاسن[۲] کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ چند لمحے بعد وہ قصر الحمراء کے باب العدل پر تھا۔

"کون ہو تم" - دربان دور ہی سے للکارا۔

"میں سینوریٹا ازابیل سے ملنا چاہتا ہوں"

"تو پھر تمہیں القائد جوان الواریز[۳] سے اجازت نامہ لینا ہوگا"——

"اجازت نامہ" اسرائیلی نے مسکراتے ہوئے جیب سے ایک سکہ نکال کے دربان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"اچھا جاؤ" دربان نے سکہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جلد واپس آجانا"

اسرائیلی الحمراء کے مختلف بڑے بڑے کمروں سے گھومتا ہوا "ہال آف دی ٹو سسٹرس" کے دروازے پر پہنچا۔ دستک کی آواز کیساتھ ایک مترنم آواز گونجی: "کون؟"

"یہ میں ہوں ازابیل" دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور ایک حسین چہرہ نمودار ہوا۔

"تو یہ تم ہو یعقوب!"

"ہاں میری بچی!" یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کو بازوؤں سے لگا لیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ بری خبر جو وہ لایا تھا اس سے لڑکی کو فی الحال خبردار نہیں کرے گا۔ لیکن بازوؤں ہی میں اُسے محسوس کر کے وہ جذبات و احساسات کے تند دھارے پر قابو نہ پاسکا اور

۱- Ferdinand de Valera [illegible] Jean Monnery [illegible] Hall of the two sisters

انتہائی کوشش کے باوجود گرم گرم آنسو اس کے چہرے سے پھسل کر لڑکی کے بازوؤں پر گرے۔ لڑکی نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے یعقوب؟"

"کچھ نہیں میری بچی، کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اس قید کے عالم میں دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔"

"لیکن یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے یعقوب! تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو اور ہاں ایک بات تو میں کہنا بھول ہی گئی کہ ادھر چند دنوں سے میں کچھ عجیب پراسرار قسم کی آوازیں سن رہی ہوں۔ وہ مجھے خبردار کرتی ہیں کہ جنوبی علاقے میں عربوں اور عیسائیوں میں ایک خوفناک جنگ ہو رہی ہے۔ پھر وہ مجھے تاکید کرتی ہیں کہ میں ان کی مدد کے لئے جاؤں۔ میں ہزار بار ان آوازوں کی سمت بھاگی لیکن کوئی نشان نہ پا سکی۔ یقین مانو یعقوب میں کل رات بالکل نہیں سو سکی۔ ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ پراسرار آوازیں مجھے عربوں کی مدد پر کیوں ابھار رہی ہیں جبکہ میں ہسپانوی نژاد کیتھولک ہوں۔"

"تو تم نصف حقیقت سے باخبر ہو گئی ہو! کاش کہ بقیہ نصف بھی وہ غیبی آواز بتلا دیتی۔"

ازابیلا جھنجھلا کر چلائی "تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو یعقوب! خدارا صاف صاف بتاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤنگی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لمبے بال نوچ ڈالے۔

یعقوب نے ترحم خیز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پرسوز انداز میں کہا۔ "پیاری بچی تم نہ تو ہسپانوی ہو نہ کیتھولک عیسائی۔ درحقیقت تم ایک مسلمان ہو اور خاندان امیہ کی ایک بے کس و مجبور شہزادی۔"

"کیا؟" ازابیلا کی آنکھیں حیرت و تعجب سے پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں" یعقوب پرسکون انداز میں بولا "تم شہزادہ محمد بن امیہ کی لڑکی ہو جو عیسائی بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کا عیسائی نام فرڈی نینڈ دی والوری رکھا گیا۔ لیکن اس نے عیسائیوں کے خلاف ایک منظم بغاوت کی اور آخر کار موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وہ ٹھیک اسی جگہ مارا گیا جس کی خبر تم کو پراسرار آواز کے ذریعہ مل چکی ہے۔"

"میری پیاری بچی" یعقوب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بچپن ہی میں چرا لی گئی تھیں۔ بڑے ہونے پر تمہیں ملکہ کی خادمہ خاص بنانے کی کوشش کی گئی لیکن تمہاری عربی حمیت اور شاہی خون نے یہ کسی طرح گوارا نہ کیا۔ بالآخر تمہیں قصر الحمراء میں نظر بند کر دیا گیا۔ تاکہ تم کسی سے مل نہ سکو۔ تمہارا عربی نام امینہ بنت محمد ہے۔"

امینہ یا ازابیلا پر بیہوشی کا غلبہ ہو چکا تھا۔ وفعتاً وہ چکرائی اور فرش پر گر پڑی۔ یعقوب نے گھبرا کر نبض ٹٹولی اور پانی لانے کے لئے کمرے کی طرف بھاگا۔ تھوڑے سے پانی کے چند چھینٹوں نے امینہ کے ہوش و حواس واپس لانے میں بڑی مدد دی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں [illegible] یعقوب کی طرف یاس بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے انتہائی نقاہت میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا۔

"تم نے مجھے [illegible] یعقوب! میری زندگی [illegible] گویا، عزیز باپ کی جان [illegible]"

"کیا ؟" یعقوب دفعتاً چونکتا ہو کر غرایا

"میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں یعقوب!" امینہ نے جواب دیا۔

ڈون جوان الوارز الحمراء کا گورنر مجھے بری نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں نے اب تک اپنی تمام قوت سے اس کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ لیکن اگر میں یہاں اور ٹھہری تو پھر وہ ذلیل اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"لعنت ہو اس پر!" یعقوب غصے میں ابل پڑا "اس کتے پر ہزار بار لعنت ہو، کیا وہ ذلیل بھول گیا کہ پہلے وہ بھی ایک مسلمان تھا اور اس کا نام 'الوارز' عربی کے لفظ 'الفارس' کی بگڑی ہوئی شکل ہے"۔

"شائد اسے یہ سب کچھ یاد ہے"۔ امینہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن رومن کیتھولک مذہب نے اس کے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے۔ خیر! میرا ایک کام کرو گے یعقوب؟" اس نے یعقوب سے سوالیہ انداز میں پوچھا اور چہرے سے جواب کا اندازہ لگا کہ وہ یوں گویا ہوئی:

"میں پائیں باغ کی دیوار میں ایک دروازہ بنا سکی ہوں۔ امید ہے آج رات کو بالکل مکمل ہو جائے گا۔ تم اگر دو گھوڑوں کا انتظام کر سکو تو ہم آج ہی کی شب فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بالکل یقین ہے کہ تم بھی اس ملک سے ویسے ہی نفرت کرتے ہو جیسے کہ میں!"

"تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ امینہ! عربوں کے زوال کے بعد یہ ملک یہودی دلیل کے لئے بھی جہنم بن چکا ہے۔ میں نے تمہارے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ تمہارے الفاظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں آج رات باغ کی دیوار کے سائے میں دو گھوڑوں کے ساتھ تمہارا انتظار کروں گا۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ دربان بری طرح بگڑ رہا ہوگا" یہ کہتے ہوئے یعقوب نے پرنم آنکھوں سے امینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر جانے کے لئے مڑا۔

"یعقوب!" امینہ کی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔ یعقوب نے پلٹ کر دیکھا

"کیا تم اپنا خنجر تھوڑی دیر کے لئے مجھے دے سکو گے؟"

یعقوب کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار تھے۔

امینہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔ پھر بھی احتیاطاً"۔

یعقوب نے خاموشی سے خنجر کھول کر امینہ کو دے دیا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا بڑے دروازے پر پہنچا جہاں دربان بری طرح آگ بگولا ہو رہا تھا۔

"تم بدمعاش یہودی! تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی کو تقریباً خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جوان الوارز کے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ اور دوبارہ اپنی شکل نہ دکھانا"۔

شکریہ تمہاری مہربانی اور اعلیٰ ہسپانوی سلوک کا "میرے دوست" یہ کہتا ہوا یعقوب سڑک پر ہو لیا۔

"آؤ، آؤ میری پیاری ازابیلا" ڈان جوان نے امینہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "زندگی کی مہلت تھوڑی ہے۔ ہمیں اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ایک بار، صرف ایک بار تم میری آغوشِ محبت میں آجاؤ پھر تم محسوس کرو گی کہ تم کتنی غلطی پر تھیں۔"

"دُور ہٹو! کمینے! بزدل"

"یہ کتنی بُری بات ہے ازابیل کہ میں تمہیں فرشتہ سمجھتا ہوں اور تم مجھے کمینہ پکارتی ہو۔ مقدس روح تمہارے اس ناپاک خیال کو تمہارے دل سے نکال دے۔"

"مقدس روح میرے لئے بالکل بے معنی چیز ہے۔ میں ایک مسلمان ہوں"

"مسلمان؟ ہا ہا ہا۔ ہا" ڈون جوان ہسٹیریائی انداز میں ہنسا۔

امینہ غرّائی "اور وہی تم ہو غدار! کمینے"

"اوہ! تو بات کچھ سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ تم میرے عقیدے پر کیچڑ اچھال رہی ہو۔ میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں ایک راسخ العقیدہ کیتھولک ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ امینہ کی طرف ہاتھ پھیلائے بڑھا۔

"خبردار!" امینہ نے خنجر نکالتے ہوئے کہا۔

ڈون جوان نے پھر ایک قہقہہ لگایا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اس ننھے سے کھلونے سے ڈر جاؤں گا۔ نہیں میری جان۔ یہ چیز ہماری محبت میں حائل نہیں ہو سکتی"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے امینہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور قریب تھا کہ اس کے ہوس بھرے ہونٹ امینہ کے ہونٹ پر منطبق ہو جاتے کہ دفعتاً وہ زور سے کانپا اور چیخ مار کر لہرا کر زمین پر گر پڑا۔ لہو کی ایک تیز دھارا اس کی پشت سے نکل کر قیمتی قالین کو داغدار بنا رہی تھی۔ امینہ نے آہستگی سے اس کی پشت سے خنجر کھینچا اور خنجر کو اس کے کپڑوں سے صاف کر کے پائیں باغ کی طرف بھاگی۔ دیوار میں بنائے ہوئے سوراخ نما دروازے سے نکل کر اس نے دیکھا کہ یعقوب مع دو گھوڑوں کے انتظار کر رہا ہے۔ نصف شب کا وقت ہو چکا تھا اور سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔

"یہ رہا تمہارا خنجر! چلو اب جلدی سے سوار ہو جاؤ" یہ کہتے ہوئے امینہ ایک ہی جست میں گھوڑے کی پشت پر تھی اور تھوڑی دیر میں دونوں گھوڑے سنسان راستے پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ یعقوب نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا:

"میں نے خنجر پر خون کا دھبہ دیکھا تھا"

"ہاں میں نے ڈون جوان کو قتل کر ڈالا——"

"کیا! واقعی!"

"ہاں! وہ میری [illegible]"

"مت چھوڑو میری بچی! وہ اپنے کئے کی سزا پا چکا۔ ہم لوگ اب تھوڑی دیر میں جنبشوں کے اس ملک سے باہر ہوں گے۔"

— ۴ —

گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ یعقوب کا چہرہ خوشی سے معمور تھا لیکن امینہ اداس و خاموش تھی۔

"کیا بات ہے امینہ! کیا تم اسپین چھوڑنے پر خوشی محسوس نہیں کرتیں"

"یہ بات نہیں ہے یعقوب! بلکہ مجھے شبہ ہے کہ آیا ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ پراسرار آواز پھر مجھے سنائی دے رہی ہے"

"پُراسرار آواز؟"

"ہاں، وہ مجھے شہادت کا جاں فزا پیغام سنا رہی ہے۔"

"وہ آواز صرف تمہارا وہمہ ہے امینہ"

"نہیں یہ تم بھی جانتے ہو کہ وہ آواز جھوٹ نہیں کہتی۔"

صبح کا سپیدہ پھوٹ چکا تھا۔ جبرالٹر کی بندرگاہ اب پوری طرح نظر آ رہی تھی۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں ایک عجیب پُرلطف منظر پیش کر رہی تھیں۔ امینہ کچھ متاثر ہو کر بولی۔

"یہی وہ تاریخی جگہ ہے یعقوب جس کی خاک نے سب سے پہلے عربوں کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ اور یہی وہ یادگار جگہ ہے جہاں سے حکمران عرب بری طرح ذلیل و خوار ہو کر جہازوں پر سوار ہوئے لیکن میں جانتی ہوں یعقوب کہ ہم میں سے کوئی اس سمندر کو عبور نہیں کر سکتا"

یعقوب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا: "ہم سمندر سے بالکل قریب ہیں۔ سامنے کشتیوں کا ایک قطار سی لگی ہوئی ہے اس پر یہ سوچنا کہ ہم اب گرفتار ہو جائیں گے نرا احمقانہ تصور ہے امینہ"

"لیکن اس کا کیا علاج کہ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ تم کچھ سن رہے ہو یعقوب"

"کیا؟"

"گھوڑوں کی ٹاپوں کی بے شمار آوازیں!" امینہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

یعقوب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد و غبار کا ایک طوفان ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ شہسواروں کے ٹاپوں کی آواز قریب آ گئی۔ تھوڑے عرصے بعد وہ ایک مضبوط دائرے کی شکل میں ان کے گرد ایک گھیرا ڈال چکے تھے۔ سپاہیوں نے بہت جلد ڈون جوان کا پتہ چلا لیا تھا اور چاروں طرف شہسواروں کے دستے قاتل کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیئے گئے تھے۔ گھوڑے از حد تھکے نظر آ رہے تھے اور ان کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہے تھے۔

سپاہیوں نے دونوں مفروروں کو زنجیروں میں جکڑا اور فتح و کامرانی کے نعرے لگاتے غرناطہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تیسرے دن ... کی ہسپانوی عدالت نے تاریخ ظلم و ستم میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یعقوب یہودی کی زندہ کھال کھنچوا کر اس میں بھس ...

باقی صفحہ [illegible]

راسخ عرفانی

کب تک ٹھہرے جانے والا — آئے گا کب؟ آنے والا

چارہ سازو، ہاتھ اٹھاؤ — جاتا ہے اب جانے والا

کس حسرت سے آج اٹھا ہے — تیرے ناز اٹھانے والا

میرے دل کی بات سنائے — ہر غنچہ مرجھانے والا

کب تک دل میں آگ چھپائے — تیرا راز چھپانے والا

مجھ کو سمجھانے سے پہلے! — خود سمجھے سمجھانے والا

اوجھل ہوگا کیسے مجھ سے؟ — لاکھ چھپے شرمانے والا

راسخ نبضیں ڈوب چلی ہیں — کب آئے گا آنے والا

غزل

حبیب کیفوی

غزل

سکون و امن کی صورت نظر تو آئی ہے

بلا سے مرگ سہی دل مگر بہل تو گیا،

خبر بھی ہے کہ گزرنا ہے کن مراحل سے؟

جمال و ناز کی محفل میں دل مچل تو گیا!

جفائے دوست بہ عنوان لطف ہوتی ہے

مزاجِ شعلہ رُخاں کچھ نہ کچھ بدل تو گیا

نہ جانے بجلیاں اب کیا تلاش کرتی ہیں

اُڑی ہے خاکِ چمن! آشیانہ جل تو گیا

مری تباہی پہ افسوس کی ضرورت کیا

تمہارے دل کا جو ارمان تھا نکل تو گیا

دعائیں دے مرے ذوقِ نظر کو جس کے طفیل

تری نگاہ کا جادو کسی پہ چل تو گیا

بیتاب زیدی

ع

پہنچ کر آہ ہمیں منزلِ محبت پر
پتہ چلا کہ سرِ رہگذار اچھے تھے

گذر گئے جو ترے انتظار میں اے دوست
وہ صبح و شام وہ لیل و نہار اچھے تھے

زبانِ شوق بھی پابندِ ہوش ہے اب تو
اس اختیار سے بے اختیار اچھے تھے

خزاں نصیب تھے مانا مگر یہ حال نہ تھا
چمن میں آئی نہ جب تک بہار اچھے تھے

خدا گواہ کہ اب لطفِ زندگی نہ رہا
سکون یہی ہے تو ہم بیقرار اچھے تھے

جنہیں رہائی ملی قیدِ و بندِ ہستی سے
وہ خوش نصیب سزاوارِ دار اچھے تھے

مرے خلوص پہ بیتاب حرف آتا ہے
مجھے یقیں ہے مرے غمگسار اچھے تھے

انوار ظہوری

غزل

یاد آرہا ہے لطفِ تبسم بہار کا — اب ذکر کیجئے نہ غمِ روزگار کا

کیا حال پوچھتے ہو دلِ بیقرار کا — سب پر عیاں ہے رنگ کسی اضطرار کا

اک آگ سی لگی ہے چمن میں اِدھر اُدھر — شعلہ بھڑک اٹھا ہے چراغِ بہار کا

پہلو نے انتظار میں اک عمر کاٹ دی — لیکن صلہ ملا نہ غمِ انتظار کا

بربادیٔ چمن کو خزاں کہہ رہے ہیں لوگ — بگڑا ہوا ہے رنگ مزاجِ بہار کا

ہمدم! رفیق کیوں نہ رہے التفاتِ ناز؟ — ہے داغ اک نشان مِرے افتخار کا!

ہر ایک رہگذار دھندلکوں میں چھپ گئی — دیکھا! فریب زندگیٔ مستعار کا!

انوار سرفراز ہوں غربت کے باوجود

مجھ پر بڑا کرم ہے مرے کردگار کا!

جگنو ناچ

نعیم صدیقی

وہ گم سم بیٹھی تھی!

اس کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی جسے اس نے دائیں زانو تلے داب رکھا تھا۔ وہ مسافر خانے کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ گویا ساری دنیا سے بھاگ کر اس نے یہاں آ پناہ لی ہو۔ وہ ٹکٹکی لگائے، کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جو آتے جاتے آدمیوں، مسافر خانے کی روشنیوں، سرخ وردی والے قلیوں، مسافروں کے اسباب کے ڈھیروں اور عمارت کے آہنی ستونوں میں سے آر پار ہو کر ——— اور شائد ہفت آفاق سے گزر کر کسی عالمِ نامعلوم کو گھور رہی تھیں۔ یہ عالمِ نامعلوم اس کی اپنی ہی روح کے اندر آباد تھا۔ اور آج اس میں بڑی ہلچل تھی، اس میں بڑی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں کی چھوٹی سی ابھرتی دنیا میں اپنے بھائی سے ——— جسے وہ پیار سے "لالا" کہا کرتی تھی ——— آخری ملاقات کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ماں جایا زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا ایک بڑے سے پنجرے میں بند ہے۔ کالی کالی خوفناک شکلوں والے کچھ بھتنے ——— جن کی کہانیاں وہ بچپن سے سنتی سناتی آئی تھی ——— پنجرے کے آس پاس پہرہ دے رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں، وہ ڈرتی کانپتی قریب جاتی ہے اور اسے دیکھتے ہی ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگتی ہے۔ وہ پکارتا ہے۔ مریاں! مریاں!! ——— میری مریا، نہ رو۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی آبرو کو بچانے کے لئے حق، سچ کی راہ میں جان دی۔ میری غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ اس شیطان فتو کی گندی نظر تیرے ماتھے کی پاکیزگی کو میلا کرے۔ اب مجھے مرنا ہے، میں شہید ہو رہا ہوں۔ مریاں! تو رو نہیں، اس پہ خوشی منا کہ تیرا لالا ایسا تھا اور وہ کام آگیا۔ اب تو رو نہیں، اب تو میری جگہ خود مرد بن، ——— اور ہاں! غم کی ماری ماں کو جا کر میرا اسلام کہنا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا کہ مجھے دودھ کی دھاریں بخش دے ———!"——— اور مریاں نے دیکھا کہ کالے بھتنے زور سے چلانے لگے اور ان کی آنکھوں سے نیلے پیلے شعلے اور لال رنگ کے دھوئیں کے مرغولے اور زیادہ تندی سے نکلنے لگے۔ پھر اس نے دیکھا کہ انہوں نے اس کے لالا کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا اور کلمۂ شہادت کی گھٹی ہوئی آواز گونجی ——— مریاں خیالی دنیا میں بیہوش ہو کر گر پڑی اور اس کے جسم میں جیسے کوئی حرکت نہ رہی ہو۔ یہاں پہنچ کر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور خیالوں کی دنیا ایک تاریک خلاء کے سمندر میں ڈوب گئی۔

●

"کھمیاں کھنڈاں دے پیڑے!" ——— اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ پیڑوں والا اپنا تھال لئے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ہیں نیچے کئے اسی طرح ہلے جلے بغیر ـــــ جیسے وہ پتھر کا ایک مجسمہ ہو ـــــ اپنے خیالوں کے جالے میں از سر نو الجھنے

پیڑے والا کھنکارا اور ذرا اور قریب ہو کر کہنے لگا۔ "کاکی! اڑے ودھیا پیڑے نے ـــــ آنے آنے! "دراصل یہ اپنے فن

کا استاد تھا اور نت ہزاروں نئے انسانوں سے سابقہ پڑنے کی وجہ سے، بو سکنے والے گاہکوں کو پہچاننے کی مہارت رکھتا تھا کئی

کے تجربے کی بنا پر وہ یہ سمجھتا تھا کہ دیہاتی لوگ اور جو کبھی کبھار شہر آتے ہیں اس کے "کھوٹے نے پیڑے" اکثر لیتے ہیں خاص طور پر

اور بھولی بھالی عورتیں اس کی رزق رسانی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ مگر مریاں نے کوئی توجہ نہ دی، اسے یاد آیا کہ ایک بار اس کا لالا کتنے

سارے پیڑے لے کر گیا تھا، پھر دونوں بہن بھائیوں میں پیڑے کھاتے کھاتے جھگڑا ہو گئی، مریاں نے پیڑے اٹھا کر پرے

پھینکے ـــــ اور اس کا لالا ہنستا ہنستا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ مریاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پیڑے والا ہکا بکا ہو کر اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا "کاکی! گھروں لڑ کے تے نہیں آئی ناں ـــــ !"

"نہیں بھرا تو جا اپنا کم کر، میرا کوئی گھر نئیں، گھر اجڑ گیا، میرا اکو لالا سی، اس نوں پھانسی دی سزا ہو گئی اے، دنیا اُتے

اوہدی چیکڑ دی رات اے" ـــــ اور وہ اور زور سے سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"او، ہا! کاکی! ـــــ تقدیر دے لکھے پورے ہوندے نیں ناں۔ تے تیرا کوئی والی وارث نہیں سی؟" پیڑے والے

دلچسپی لیتے کہا۔

مریاں نے اسے بتایا کہ یہاں لاہور میں اس کا دور کا ایک چچا کسی دفتر میں چپڑاسی ہے اور اس نے خط لکھا کہ وہ اسٹیشن پر

ملے گا اور ساتھ لے جائے گا، مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔

پیڑے والے نے ایک پیڑا تھال میں سے اٹھایا اور قریب کر کے دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "کاکی! آنے آنے اے ـــــ توں بھکی

ماندی ہویں گی!"

اور کاکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ منہ نیچے کر کے رونے لگی۔

پیڑے والا کچھ بیزار ہو کر چلا گیا۔ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کم بخت نے ایک پیڑا بھی نہیں لیا! ٹھیک ہے اس کے لالے کو

پھانسی ہو جائے۔ ایسے نکھد جانے روز کتنے ہی پھانسیوں چڑھ جاتے ہیں۔ خس کم، جہاں پاک!

اور ایک بار پھر فرا دور سے اس کی آواز گونجی: "کھوئیاں تے کھنڈاں دے ودھیا پیڑے!"

●

مسافر خانے میں ایک جغادری گرہ کٹ شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ گھنٹے بھر میں ابھی تک اس کا ہاتھ کسی پر نہ پڑ سکا تھا۔ اچانک

اس کی نظر کونے میں پڑی اس انسانی گٹھڑی پر پڑی۔ وہ ایک چکر لگا کر اس نے ابتدائی جائزہ لیا۔ اسے بھی یہ خیال گزرا کہ گھر سے نعمتہ

کے نکلی ہوئی اکیلی دکیلی چھوکری ہے، یہ ضرور اپنا زیور نکال کر لائی ہو گی، جبھی تو پوٹلیا کو خوب اچھی طرح گھٹنے تلے دبا رکھا ہے۔

اور ہلتی جلتی نہیں۔ اس کے تیز طرار دماغ نے پل بھر میں سکیم بنا لی۔ اس نے اپنے ایک شاگرد چھوکرے کو بھیجا۔ چھوکرا لپکا ہوا آیا۔

"بی بی جی! بی بی جی! کِتھے چلنا ہے، میں گٹھڑی لے چلاں گا، اک آنہ دے دینا!"

مریاں نے ایک نظر اس کی طرف اٹھائی اور بیزاری کے لہجے میں اس سے کہا: "کِتھے وی نئیں جانڑاں"!

چھوکرا ٹھاکا ٹیاں تھا۔ اس نے پینترا بدلا: "بی بی جی! ایتھوں چلے جاؤ، ایتھے ڈِھل ساری میٹن دا حکم نہیں ہے، کوئی سپاہی آ گیا تے او کھے ہو وو گے —— نال ای سراں لے، میں چھڈ آؤناں!"

مگر مریاں تو پیا کے انتظار میں تھی، وہ کیسے جا سکتی تھی۔

●

کوئی اور گاڑی آ پہنچی تھی، مسافروں کا ایک ریلا شور اور ہنگامے کے ساتھ نکلنے لگا۔ آنے والوں میں ایک شاعر بھی تھا اتفاق کی بات سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کی جویائے حسن نگاہیں مریاں پر پڑیں۔ وہ ٹھٹک گیا۔ وہ گھور رہا تھا۔ نظر نظر میں وہ اس جلوۂ ناگاہ کو اپنے اندر جذب کر جانا چاہتا تھا۔ اس کے تاثرات کے ساتھ ساتھ ذہن میں الفاظ رقص کر رہے تھے۔

"ابرو جیسے کسی شاہانہ تعمیر کی، کسی تاج محل کی محرابیں ہوں —— سنگِ سیاہ سے تراشی ہوئی!"

"آنکھیں —— جیسے نیلم کے دو پیمانے ہوں —— چھلکتے ہوئے کھنکتے ہوئے!"

"پلکیں! جیسے میکدے کی چلمنیں ہوں —— کبھی اٹھا لی جائیں، کبھی چھوڑ دی جائیں"

"وہ ماتھے پر لٹکتی ہوئی ایک لٹ، جیسے چاند کے ایک کنارے پر چھوٹی سی بدلی آ جائے"

"چہرے پر کچھ صحت کی سرخی، کچھ سیاہ کا رنگ، کچھ اداسی و ویرانی کا پرتو —— ایک غزل ہے غزل!"

"حسنِ سادہ —— "گدڑی میں لعل" —— اور کیا کیا کچھ"

"سفید پھٹکیوں والا کھدر کا سُرخ دیہاتی آنچل —— جیسے یہ کوئی ہیر بہوٹی ہو۔"

اب مریاں کا کوئی لالہ یہاں موجود نہیں تھا جو اس راہ چلتے فتنہ کی نگاہوں کی زد سے مریاں کو بچاتا۔

شاعر کو اچانک بوجھ اٹھا کر گزرنے والے قلی کی ٹھوکر لگی اور وہ حقائق و واقعات کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے تو ابھی جا کر مشاعرے میں شریک ہونا ہے۔ گھڑی دیکھی صرف ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ تھا۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگا، مگر ایک قدم رکھتا اور ایک نگاہ مریاں پہ ڈالتا۔ اس کے صنم خانۂ فن میں ایک نئی معارفی نظم تشکیل پانے لگی تھی —— عنوان ایک مصرع تھا

"مرے سوئے ہوئے جذبوں کو جگانے والی!"

سامنے یکایک مشاعرہ کی مجلسِ استقبالیہ کے ارکان ہار ہاتھوں میں لئے شاعر کی طرف لپکے۔ تھوڑی دیر میں موٹر فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور شاعر گنگناتا ہوا اپنی تازہ نظم مکمل کر رہا تھا۔

نظم مشاعرے میں جب الاپی گئی تو سماں بندھ گیا ہر طرف سے داد کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ بس شاعر پورا مشاعرہ لوٹ لے گیا۔ شاعر کو تین سو روپیہ کا نقد انعام داعیان کی طرف سے پیشکش ہوا۔

مریاں اچھے داموں بک گئی!

مگر مریاں تو ابھی مسافر خانے میں ایک گٹھڑی بنی پڑی تھی ——— اور پھانسی چڑھنے والے لالا کے تصور میں گم سم! اس کا چچا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

●

کسی کالج کے لڑکوں کی ایک ٹورنگ پارٹی بھی اسی گاڑی میں سوار ہونے کے لئے ادھر سے ہو کر نکلی۔ ایک لڑکا فوٹوگرافر بھی تھا اور کیمرہ کندھے سے لٹکائے ہوئے مٹکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا کیمرا برابر کام کر رہا تھا۔ اس کیمرے کی پلیٹ پہ اچانک مریاں کی تصویر جگمگا اٹھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹک گیا۔

اسے یاد آگیا کہ ایک انگریزی اخبار میں فوٹوگرافی کا انعامی مقابلہ ہو رہا ہے اس کا موضوع تھا "حسنِ دیہاتی" اور "حسنِ دیہاتی" کا بہترین شاہکار سامنے موجود تھا۔

فوٹوگرافر ٹولی سے پیچھے رہ گیا۔ اس کے ساتھی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ایک نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فوٹوگرافر کیمرہ نکال کر ایک جلوۂ حسن کو کیمیاوی رنگوں کے جال میں پھانسنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"تم تو بڑے خبطی ہو گئے ہو یار!" مڑ کر دیکھنے والے نے بے ساختہ کہا اور ساری ٹولی متوجہ ہو گئی

مگر فوٹوگرافر پورے انہماک میں تھا۔ اب وہ مختلف زاویوں سے کھڑا ہو ہو کر دیکھنے لگا کہ کدھر سے کامیاب صید افگنی ممکن ہے۔

کلک کی ایک آواز کے ساتھ کیمرے کی برقِ تاباں نے اپنی آنکھ جھپکی اور مریاں کے حسنِ معصوم کا ایک پرتو ہمیشہ کے لئے کیمیاوی رنگوں کے جال میں جکڑا گیا۔

آنکھیں چندھیا دینے والی اس یک آئی چمک کو مریاں کچھ نہ سمجھ سکی، اس نے خیال کیا کہ شہری لڑکے آپس میں کوئی تماشا کر رہے ہیں ——— اور منہ دیوار کی طرف کر کے وہ ایک بار پھر خیالوں ہی خیالوں میں اپنے لالا سے آخری ملاقات کرنے چل دی۔

یہ تصویر مقابلے میں آئی اور لڑکا پہلا انعام لے گیا۔

تصویر چھپی اور کئی ہزار مردوں اور عورتوں سے اس نے مسرت کا خراج وصول کیا، مگر اس تصویر کے رنگین پردوں کے پیچھے ایک دکھیاری دیہاتی لڑکی لاہور اسٹیشن کے مسافر خانے کے ایک کونے میں پڑی غم کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہی تھی اور کوئی نہیں تھا جو اس کا ہاتھ تھامے، اسے سہارا دے، اسے کنارے پر لا ڈالے!

●

ریلوے پولیس کا ایک کنسٹیبل مسافر خانے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی تھی۔ اسے سردی لگ رہی تھی اور وہ چائے پینا چاہتا تھا۔ اسے سگریٹ بھی خریدنے تھے، گھٹیا سگریٹ پینا اس نے مدت سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ گولڈ فلیک سے کم پر کبھی نہیں آتا تھا۔

"ایک روپیہ ——— کم سے کم ایک روپیہ!" ——— اسکی خواہش پکار پکار کر مطالبہ کر رہی تھی۔

وہ ہر طرف نگاہ جستجو کے دام پھینک رہا تھا مگر ایک روپیہ کا مرغِ زریں کسی طرف سے رام نہیں ہو رہا تھا

"کوئی تانگے والا ———— کوئی بے ٹکٹ مسافر ———— کوئی مجہول الحال آدمی ———— کوئی خوانچے والا! کوئی تو ہونا چاہیئے جو ایک روپیہ کا مطالبہ پورا کر دے۔ آخر ہم پبلک کی خدمت کرتے ہیں، ٹھٹھر ادینے والی سردی میں راتوں کو ڈیوٹی دیتے ہیں ہمیں تنخواہیں کم ملتی ہیں، ضروریات بڑھ گئی ہیں، ہمارے باپ نے کوئی جاگیر تو نہیں چھوڑی کہ اس سے خرچ چلے۔ ایسی تیسی اس نوکری کی کسی نہ کسی سالے کو ایک روپیہ دینا پڑے گا۔" کنسٹیبل ٹہل رہا تھا اور اپنی ذہنی دنیا میں اپنے آپ ہی کو مخاطب بنا کر تقریر کرتا چلا جا رہا تھا اور اس کی متجسسانہ نگاہ مریاں پر جا پڑی۔

وہ ڈنڈا ہوا میں ہلاتا ہوا ذرا تیز قدم ہو کر اس کی طرف لپکا

"کون ہو تم؟ کب سے یہاں پڑی ہو، میں تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم گھر سے کسی کے ساتھ اغوا ہو کر آئی ہو اور کیا مال چوری کر کے لائی ہو، دکھاؤ گٹھڑی ———— اٹھو چوکی پر چلو۔"

"میں ——— میں ——— " لکنت کے ساتھ کہہ کر مریاں تھر تھر کانپنے لگی اور بات پوری نہ کر سکی۔

"اٹھ، خبیث کہیں کی! ———— کہاں ہے تیرا خصم، جس کے ساتھ نکلی ہے ———— اٹھ جلدی!" کنسٹیبل چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

ایک قلی، ایک دہی بڑوں والا اور ایک گرہ کٹ اس پاس آ کے کھڑے ہو گئے۔ ایک مولوی صاحب جو قریب ہی چادر تانے لیٹے ہوئے تھے، منہ سے کپڑا کھسکا کر دیکھنے لگے۔

بڑے والے نے چوہدری جی کہہ کر کنسٹیبل کو مخاطب کیا اور بتایا کہ یہ کافی عجیب سی بات بیان کرتی ہے کہ اس کے بھائی کو پھانسی دی جانے والی ہے اور اس سے ملاقات کرنے آئی ہے اور یہاں اپنے چچا کے انتظار میں ہے۔

چوہدری جی اور گرم ہو گئے۔ "اوئے چھڈ توں اپڑیں بکواس! ———— بڑی آئی اسے بھرا دی بھین، ایہو جیہاں حرام زادیاں روز نہیں ساڈے کابو آندیاں! ایہہ بڑیاں دکھیاریاں بن بن کے کہانیاں سنادیاں ....ن! ایہہ بجھارتاں اسی ای بجھ سکدے آں!"

"چوہدری اوراں سچ فرمایا، قرآن وچ بھی انہاں بڈھیاں دے چھل فریب دا بیان اے۔" گرہ کٹ نے چوہدری جی کی تائید کی۔

"اٹھ، چک گنڈھ اپڑیں، کی ناں اے تیرا۔ میں چوکی ٹیلیفون کرداں" کنسٹیبل یہ کہتے ہوئے کھٹ کھٹ کرتا چلا گیا۔

قلی اب تک چپ چاپ کھڑا اس ڈرامے کو دیکھتا رہا اور اس نے نہ جانے کتنے ایسے ڈرامے نت اس مسافر خانے میں دیکھے ہوں گے۔ وہ چوہدری جی کی نفسیات کا رازداں تھا۔ اس نے مریاں کے قریب ہو کر اس سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے سمجھایا کہ سپاہی چائے پانی کے لئے تم سے روپیہ دھیلی لینا چاہتا ہے، پاس کچھ ہو تو دے کر جان چھڑاؤ۔ مریاں نے روتے ہوئے اور کانپتے ہوئے آنچل کا بندھا ہوا کونا کھولا، اس میں ایک روپیہ کا نوٹ تھا اور تین دونیاں! ———— ایک روپیہ کا نوٹ اس

نے نکال کر تلی کی طرف اس طرح پھینک دیا جیسے کسی کتے کو ٹکڑا ڈالا جاتا ہے۔

تلی نے مریاں کو تسلی دلائی کہ وہ خود حرام کی ایک رتی بھی اپنی کمائی میں نہیں ملانا چاہتا، وہ صرف اسے آفت سے بچنے کا راستہ بتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ نوٹ اٹھا کر گیا اور چوہدری جی کی مٹھی گرم کر آیا۔

تلی بچارے کا دل اس ساری کارروائی میں پچھتا رہا کہ نہ جانے وہ نیکی کر رہا ہے یا بدی۔ اس پر ایک عجیب رقت سی طاری تھی وہ سوچتا رہا کہ اگر اسے توفیق ہوتی تو وہ پاس سے ایک روپیہ دے دیتا۔ مگر اس نے تو ابھی ایک ہی گاڑی دیکھی تھی اور فقط ایک اٹھنی اسے ملی تھی۔ واپس آکر اس نے مریاں کو دلاسا دیا کہ اب سپاہی کا غصہ ٹل گیا ہے، وہ ادھر نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی سرخ قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اٹھنی مریاں کے آگے ڈال دی اور مریاں کے ردعمل کا انتظار کئے بغیر لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جیب کترے نے دل ہی دل میں کہا اچھا ہوا ناں، حرام زادی قابو میں نہیں آرہی تھی۔ اب خود ہی گرہ کھولی ٹپی نلں!

اور پیڑوں والا اپنا تھال ہتھیلی پر رکھے ٹہلتے ٹہلتے دور ہی دور سے مریاں کو گھور گھور کر نگاہوں ہی نگاہوں میں اس سے خطاب کر رہا تھا "اب چکھا ناں مزا، ایک آنے کا پیڑا نہیں لیتی تھی، روپیہ کھول کے دیا ناں!"

ساتھ ہی اس کی آواز گونجی "کھوئیاں تے کھنڈاں دے ددھیا پیڑے!"

اور چوہدری جی سامنے کے ٹی سٹال پر گرم گرم چائے کی چسکیاں لے رہے تھے جس کے ہر گھونٹ میں مریاں کے آنسو ملے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیوں میں گولڈ فلیک کا سگریٹ تھا۔ چائے کے ہر گھونٹ کے بعد سگریٹ کا ایک کش!———— دوہرا کیف تھا!

مولوی صاحب وضو کر کے آئے اور جانماز بچھا کر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے!

●

موٹر کاروں کی قطار میں سفید رنگ کی ایک جہازی کار کھڑی تھی جس کا ڈرائیور انگڑائیاں لے لے کر انتظار کی بوجھل گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔ یہ کار ایک ماڈرن جوڑے کو لائی تھی۔ یہ لوگ کچھ مہمانوں کو لینے آئے تھے۔ پلیٹ فارم پر گھومے، گاڑی دیکھی، لیکن آنے والی پارٹی نہیں آئی تھی۔ مایوس ہو کر باہر آئے تو چلتے چلتے ایک عزیز سے ملنے کا خیال آگیا جو تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں بکنگ کلرک تھا۔ ادھر آئے تو بدقسمتی سے وہ بھی نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ ابھی وہ گڈز آفس گیا ہے اور چند منٹ میں آجائے گا۔ یہ جوڑا اس کے انتظار میں ٹہلنے لگا۔ چلتے چلتے بیگم کی نگاہ مریاں پر پڑی۔

"ڈیر!———— دیکھو وہ گرل کتنا ہینڈسوم ہے!"

"وہ تیج گرل معلوم دیتی ہے۔ نیچر نے اسے خوب بلڈ کیا ہے، ڈارلنگ!"

"اس کا بیوٹی میک اپ کے بغیر کتنا چارمنگ ہے"

"———— ڈارلنگ! یاد آیا———— بے بی کے لئے آنا کی ضرورت ہے، پوچھو تو شاید نوکری کرنا مانگے"

"نو نو! یو مے فال ان ٹو ہذ ہر———— بر چارم از ویری ڈینجرنس!———— اس کے چیکس کے شعلوں سے

میرا پیراڈائز مل سکتا ہے۔ اَئی ڈیئر!! ـــــــ فرنز!"

" تم ـــــ تم ـــــ تم۔ بیگم! تم نے مجھے انسلٹ کیا۔ الفاظ واپس لو"

اور اتنے میں بکنگ کلرک آگیا ـــــ جوڑا چلا گیا۔

●

گاڑی سے اترنے والے مسافروں کو تانگے والے گھیر گھیرے جاتے رہے۔ لیکن ایک تانگے والا ابھی قسمت کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مسافر خانے میں ایک آخری نگاہ ڈال رہا تھا کہ شاید کوئی رہی سہی سواری مل جائے۔ دور سے اسکی نگاہ مریاں پر پڑی۔ اکیلی دیہاتی عورت دیکھ کر دل ہی دل میں وہ ایک نقشہ بنانے لگا۔ اس نے سوچا کہ یہ کہے گی مجھے قلعہ گوجر سنگھ جانا ہے۔ اور میں اسے بتاؤں گا کہ بی بی! وہ تو بڑی دُور ہے۔ رات کا وقت ہے دو روپے سے کم نہیں لوں گا۔ پھر اسے تانگے پر بٹھا کر سیدھا موچی دروازے کا رُخ کروں گا، وہاں سے چیمبرلین روڈ، ہال روڈ گزرتا میکلوڈ روڈ پر پڑوں گا اور یوں چکر لگا کے اسے قلعہ گوجر سنگھ اتار دوں گا۔ اس دیہاتن کا سر ان سڑکوں کے پھیر میں ایسا چکرائے گا کہ دو روپے خوشی خوشی دے کر اپنا رستہ لے گی۔

اس نے مریاں کے پاس پہنچ کر پوچھا "بی بی! قلعہ گوجر سنگھ جانڑاں جے!"

"نہیں، کتے وی نہیں جانڑاں! میں آپئیں چاچے نوں اڈیک رہی آں" ـــــــ مریاں نے جواب دیا!

اور تانگے والے کا سارا خیالی قلعہ دھڑام سے گر پڑا۔

مولوی صاحب نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ کر رہے تھے۔

●

اس دوران میں گھنٹہ بھر پہلے ایک غنڈہ چکر لگا کر مریاں کو دیکھ گیا تھا۔ اس نے ایک اسکیم سوچی اور جا کر پارٹی کو جمع کیا۔ اب وہ پارٹی موقع پر آپہنچی تھی اور اس کے معزز ارکان ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

مریاں کو کیا معلوم کہ عورت کا عورت پن کتنا بڑا خطرہ ہے اور خود خوبصورتی ایک گندی سوسائٹی میں کیسی آفتِ جان ہوتی ہے! ـــــ اور اس کے ساتھ تو کوئی محرم بھی نہ تھا!

اس نے دیکھا کہ لمبی لمبی مونچھوں والا، لال لال آنکھوں والا، سر پر پگڑ سا باندھے، کاندھے پر رومال ڈالے، لٹھے کے تہمد کے لڑ لٹکائے اور سال بھر کے نیچے کو گود میں لئے سیدھا اس کی طرف چلا آرہا ہے اور کچھ ہنس بھی رہا ہے۔ وہ حیرانی سے مجسّم سوال بنے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے اونچی آواز میں کہا "میں ہار گیا، تیرے بناں اے بال نہیں رہ سکدا، توں اس طراں گھر اجاڑ کے نہ چلی جا بھن وی جا!"

"پھر! اُٹھ، توں کوئی ایں، میرا کوئی بال نہیں، میں پردیسی آں" مریاں بے ساختہ کہتی چلی گئی۔

آنے والے نے بچے کو آگے بڑھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ مگر مریاں نے بچے کو دھکیل دیا۔ بچہ گرا اور اس نے چلانا شروع کر دیا ——— "ہائے بے بے، ہائے بے بے"!

مونچھوں والے نووارد نے بچے کو دو ہتڑ سے پیٹنا شروع کر دیا اور چیخنے لگا "حرام زادے! بے بے بے بے کر دا ایں، تے بے بے مونہہ نہیں لگاؤندی! جا، بے بے نال توں وی دفان ہو"!

مونچھوں والے کے ساتھی ادھر ادھر سے آ کے اکٹھے ہو گئے۔ پیڑے والا بھی آ گیا۔ گرہ کٹ بھی آ پہنچا۔

"کی گل اے، کی گل اے" ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں۔

مونچھوں والے نے چلا چلا کر واویلا کرنا شروع کر دیا کہ یہ میری بیوی ہے، روٹھ کر گھر سے نکل آئی ہے اور ایک سال کے بچے نے رو رو کر جان ہلکان کر لی ہے۔ اب میں اسے لینے آیا ہوں کہ یہ گھر چلے۔

مریاں رو رہی تھی اور ہچکیاں لے رہی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر مونچھوں والے کا شور اور بچے کی چیخیں کسی کو کچھ سننے نہیں دیتی تھیں۔ اس کے ساتھی جو اجنبی بنے کھڑے تھے وہ بھی ڈرامے میں حصہ لینے لگے۔ ایک نے مریاں سے کہا "چل بی بی! چھڈ غصہ، بیبیاں اڑیں گھراں چہ سوہدیاں نے۔ لے ویخ، تیرا ایہ بال ہونک ہونک کے مر جائے گا، سام ایس نوں"! دوسرے نے مونچھوں والے سے کہا: "میاں! چھیتی لاہ لے تے چار لا دے، آپے ٹرُ پوے گی!" پیڑے والے کی زبان بھی ہلی "میں تے لگدے ہی سمجھ لیا سی بئی دال وچ کجھ کالا جیہا اے"!

غرض تھوڑی دیر ایک طوفان مچا رہا اور آخر کار مونچھوں والے نے اور اس کے آدمیوں نے با دست دگرے، دست بدست دگرے مریاں کو سے جا کر اسی تانگے پر ڈال دیا جس کا کوچوان سواری نہ ملنے کی وجہ سے ٹھر ٹھر کر رہا تھا۔

مریاں آخری بار چلائی: "ہائے میرے لالا"! اس کے بعد مونچھوں والے شیر ببر نے اس کا گلا دبا دیا۔

مولوی صاحب تسبیح کے دانوں کو اور زیادہ تیزی سے حرکت دیئے جا رہے تھے!

سامنے دیوار پر "یقین، اتحاد، تنظیم" کے جلی الفاظ جیسے اور بھی جلی ہو گئے تھے!

●

عین اس وقت، جب مریاں کو تانگے پر لادا جا رہا تھا، ایک اخباری رپورٹر سائیکل لئے گزرا۔ بریک لگائی اور سائیکل تھامے تانگے کے پاس سے پہنچا۔ شائد کوئی اہم خبر ملے!

"کیوں جی، کیا معاملہ ہے؟"

"کوئی معاملہ نہیں جی۔ آپڑیں گھر دا معاملہ اے"

اور تانگہ چل دیا۔

رپورٹر نے اب آس پاس کے لوگوں سے ٹوہ لگانی شروع کی۔ مریاں کی کہانی کے اجزا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے ہاتھ لگے۔

ضروری باتیں نوٹ بک میں درج کیں۔ دفتر پہنچ کر ایک چڑکتی ہوئی سرخی کے ساتھ خبر مرتب کی۔

صبح ایک ہی اخبار تھا جس میں سنسنی خیز خبر کو کاغذی دامن آراستہ کئے نکلا۔ اس وقت تک مریاں کا بھائی پھانسی کے تختے پر دم توڑ چکا تھا اور اب اس کی لاش اتاری جا رہی تھی۔ اس کے والی وارث کوئی نہ آئے تھے۔ اس کی لاش جیل کے قبرستان میں دفن کر دی گئی!

اخبار خوب بکا! ——— مریاں خوب بکی!

●

چھ مہینے گزر گئے!

الحمرا میں فنونِ لطیفہ کا ایک انعامی مقابلہ ہوا۔ پہلی رات مشاعرہ تھا، دوسری رات موسیقی کا مظاہرہ تھا، تیسری رات رقص کی مجلس تھی!

پہلے ایک نسائی گروپ آیا، اس نے ناگ ناچ ہنگاموں کے ساتھ پیش کیا اور جانے کتنے ہی دل ڈسے گئے۔ دوسرے مخلوط گروپ نے "من تو شدم تو من شدی" کے عنوان سے ایک عجیب و غریب قسم کا ڈانس پیچ پیش کیا۔

پھر مردوں کی ایک پارٹی ٹکٹک ناچ کے لئے آئی اور خوب دھما چوکڑی مچی۔ اس کے بعد جاتشہ بنگال نامی رقص کا بنگالی مخلوط گروپ نے مظاہرہ کیا اور یہ گروپ اپنے پیش رووں سے بازی لے گیا۔

آخر میں آرٹ کے انفرادی اسالیب سامنے لائے گئے۔

"مقطع" واقعی لاجواب تھا ——— صحیح معنوں میں مقطع!

عجیب آفاقی تراش کا ایک چہرہ ——— کالی ریشمی پشواز ——— لمبے بال کمر تک لٹکے ہوئے جن میں موتی پروئے گئے تھے۔ اور خوب افشاں چھڑکی ہوئی تھی ——— جسم کا بالائی حصہ، تھوڑے سے رقبے کے علاوہ لباس سے آزاد! لاہور کے اہلِ ذوق کے لئے یہ بالکل نئی فن کارہ تھی!

نگاہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔ ایک حضرت آپ چونک کر اپنی امتیازی کرسی پر سیدھے ہو بیٹھے، اس مجلس کا افتتاح ان کے ہاتھوں سے ہوا تھا اور اب انہی کو سنہری تمغہ کسی خوش نصیب کو عنایت کرنا تھا!

نام کا اعلان ہوا ——— "جگنو خانم"! اس اعلان کے ساتھ ہی کیمرے چاروں طرف جگنوؤں کی طرح چمک گئے!

ان کے فنی مظاہرہ کا عنوان بھی بتایا گیا ——— "مال مفت کا"!

سازوں کے تار جھنجھنائے اور جگنو نے اپنے سراپا کو چند شعر و نغمہ بھری حرکات میں ڈھال دیا۔

تال بہت ہی انوکھا تھا ——— بہت ہی سادہ!

"تان .... تن .... تان ....تن"

"تان" پر سنسنیاں چلتیں، "تن" پر تھپتیں ——— اسی کے مطابق جگنو خانم کا بدن خم پر خم کھا رہا تھا۔ وہ ساتھ کے ساتھ پرگداز لہجے میں نغمہ الاپ رہی تھی۔ یعنی سازوں کی آواز، جگنو کے دوہرے لب، اس کی حرکات اور تال کے مطابق سنسنیوں کی جلی بجھی ——— گویا فن

یا جگنو بن گیا تھا۔ سنیئے :۔

" بھورے بھورے بال ہیں
نیلے نیلے نین ہیں
گورے گورے گال ہیں
آنکھوں آنکھوں لوٹیئے   رُشیے کھسوٹیئے ! ——— مال مفت کا !

مجمع تڑپ گیا۔ داد و تحسین کی صدائیں چاروں طرف سے اُمنڈ پڑیں۔

وہ اپنے آپ میں مگن متحرک رہی تھی ——— روشنی کی لہریں، آواز کی لہریں، دلوں کی دھڑکنیں، سانسوں کا اتار چڑھاؤ
ری ذہنی فضا میں ایک قیامت بچ رہی تھی۔

ہاں تو سنئے :

" پیڑے کھوئے کھانڈ کے
آنے آنے اٹھ گئے
آسپاہی! گانٹھ کاٹ   چائے پی کے ہونٹ چاٹ ! ——— مال مفت کا !

اور ایک سپاہی جو الحمراء کے ہال کے دروازے پر آج پہرا دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مریاں کا نقشہ پھر گیا، مگر وہ جھوم رہا
تھا ! ——— کہاں مریاں، کہاں جگنو خانم !
فن کے جگنو ہر طرف چمک رہے تھے !

تھوڑی دیر کے لئے حرکات میں نئی ابھار آگیا ——— اس کے آواز دھیمی ہو گئی، ساز بھی مدھم ہو گئے ——— جیسے بہت
ہی دور سے ——— لاہور اسٹیشن کے مہمان خانے سے ——— آواز آ رہی ہو ——— "مال مفت کا" ——— "مال مفت کا !
——— "مال ...."

اور ہال سے آواز آئی "انمول" "انمول" ———

نغمہ و رقص کے اسی آغاز کے دوران میں جب کہ روشنی بھی مدھم ہو کر آنکھیں جھپک رہی تھی، دور کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اذان
کی آواز سنائی دی ———

" اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے ....
میں اعلان کرتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ....
میں اعلان کرتا ہوں کہ محمدؐ اس اللہ کا پیغام لانے والے ہیں ....

یہ گرجتی آواز رقص و نغمہ کی دھیمی آواز سے ٹکرا گئی ——— جیسے شراب کے جام میں کسی نے لیموں نچوڑ دیا ہو۔ اور ہال کی فضا عجیب

کر رہی تھی کہ زندگی کے میدان میں یہ آوازیں بڑی طرح ٹکرا رہی ہیں۔ ایک پرانی آواز ہے دوسری نئی۔ ایک ماضی کی صدا ہے، دوسری مستقبل کی! ایک نوحۂ غم ہے، دوسری نغمۂ شادی! ایک روحِ مشرق ہے، دوسری روحِ مغرب! ایک فرض کی نفیر، دوسری خواہش کی پکار! ایک من کا اضطراب، دوسری تن کا ابال!

———— اور یہ فضا ایک انسانی دماغ کی طرح امید و بیم کی کشمکش میں گھٹی جا رہی تھی!

ادھر ایک دم جگنو ناچ چڑھاؤ میں آ گیا

"کیمرے والے ٹھنک!

لوٹ لے میری جھلک

شاعرِ نازک خیال

لے مرے آنسو سنبھال

آنسوؤں سے شعر ڈھال شعر ڈھال اور پیٹ پال ———— مال مفت کا!

مال مفت کا ———— مفت کا ————!

وہ .... تان .... تن .... تان .... تن .... تھرک رہی تھی، لوچ دکھا رہی تھی، بل کھا رہی تھی، پشواز اٹھا رہی تھی، بال لہرا رہی تھی! ———— عزت مآب اور سارے تماشائی دم بخود تھے!

مریاں کی تصویر لینے والا فوٹوگرافر یہاں موجود تھا، اس نے جگنو خانم کے کئی پوز لئے اور لے رہا تھا۔ اتفاقاً اسے ریلوے اسٹیشن والی انعامی تصویر یاد آ گئی ———— مریاں اور جگنو خانم میں کتنی مشابہت تھی۔ مگر وہ تو حسن و جمال کی ایک گٹھڑی بندھی پڑی تھی اور یہ چاندنی کی طرح بکھر رہی تھی۔

وہ شاعر بھی اگلی صفوں میں اس جنتِ فن میں گم شدہ تھا۔ مریاں کے حسن سے متاثر ہو کر اس نے جو کامیاب نظم لکھی تھی اس پر اسے بجا طور پر فخر تھا، کیونکہ وہ تین سو روپے دلا گئی تھی ———— مگر آج وہ اس نظم کی فضا سے بہت اونچا اڑ رہا تھا اور فنونِ لطیفہ کے آسمان سے تارے توڑ کر ایک نیا شاہکار پیش کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ایک مشاعرہ اور! پانچ سو روپیہ اور! بیٹی کے لئے جھمکے اور گلوبند! ———— ایک ساری، ایک برقع! ———— شادی کی تاریخ قریب آ گئی تھی!

جگنو اسی طرح وقت کو نچا رہی تھی ———— انگلیوں کے اشاروں سے نچا رہی تھی ————

"مورکھ! ارے مورکھ!

بیٹھ کے تسبیح رول

دیکھتا جا، کچھ نہ بول"

ایک مولوی صاحب بھی کھسیانے بیٹھے تھے، انہوں نے اس مجلس کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کیا تھا۔ ان بیچارے کو اول تو سرے سے

یہ پتہ نہ تھا کہ اصرار کیا بلا ہے، آرٹ کیا ہوتا ہے اور مجلس کا پروگرام کیا ہے۔ تلاوت کے بعد وہ ایک بار ہوجم کر بیٹھے تو غش بھر کر رکھنے کی وجہ سے کچھ دیکھ نہ سکے اور دل ہی دل میں آئت کریمہ کا ورد کرنے کی وجہ سے سُن بھی کچھ نہ سکے۔ لیکن مولوی کا لفظ سن کر وہ چونکے۔ انہیں ایسے لگا جیسے کہ انہی کو مخاطب کیا جا رہا ہو۔ انہیں کیسے بھول سکتا تھا کہ مریاں جب مسافر خانے میں لٹ رہی تھی تو وہ پاس ہی جائے نماز پہ بیٹھے گڑھ بھی رہے تھے اور ذکر میں بھی محو تھے ——— لیکن وہ ہاتھ سے تو کجا، زبان سے بھی اس کا بچاؤ نہ کر سکے! ——— خیال آیا اور گزر گیا اور وہ غش بھر کے پھر اپنے ورد میں محو ہو گئے۔ پاک لوگوں کی شان نرالی ہوتی ہے، کنول گندے پانی میں رہ کر بھی پاک دامن رہتا ہے۔

جگنو نے پھر اپنے بول دُہرائے :-

"مولوی! رے مولوی!

بیٹھ کر تسبیح رول

دیکھتا جا، کچھ نہ بول

موٹھوں والے بھیڑیو!

کھال تک ادھیڑ لو

ہڈیوں کو توڑ لو

بوٹیاں بچوڑ لو   خون بھی نچوڑ لو ——— مال مفت کا!

تان ——— تن ——— تان ——— تن ——— تان ——— تن ——— تان ——— تن!

"عزت مآب مولوی والی چوٹ پر بہت ہی خوش ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے اسلام کے ہر نام لیوا کے سینے میں تیر ترازو ہو گیا ہے اور خون کی دھاریں بہہ رہی ہیں! خون کے فوارے چھوٹ گئے ہیں اور لال لال قطرے فضا میں رقص کر رہے ہیں ——— اسی تال پر ——— مال مفت کا"

اس قیامت خیز فن کارہ نے آخری گردش شروع کی ——— آواز پنچم میں چلی گئی ———

"لالا پھانسی چڑھ گیا

مائی گھر گر گئی

دوڑ فتو! دوڑ آ   سارا جسم نوچ کھا ——— مال مفت کا!

ان بھارتوں کو کون پوچھتا ——— لوگ تو جگنو کے جسم کی بے لفظ شاعری، سازوں کی بے رنگ مصوری اور روشنیوں کی بے آواز موسیقی میں مدہوش تھے!

نیر جگنو ناچ اول آیا۔ عزت مآب کے ہاتھوں سے جگنو خانم نے سنہرا تمغہ مسکراتے ہوئے لیا، آداب بجا لائی اور پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

قند و نمک

قلم توڑ افسانہ نویس کی نگاہِ کرم

یہ ایک تمغہ یافتہ ہستی کا گرامی نامہ ہے۔ مطبوعہ کاغذِ خط کی پیشانی پر انگریزی میں یہ عبارت درج ہے:

گولڈ میڈلسٹ آتھر جینیس ہمل ورلڈ قلم توڑ افسانہ نویس ، مشیر ادیب —— مصنف: جدید بہرام کی گرفتاری، جدید نیل چھتری، بے گناہ قیدی، سیرت النبیؐ، جنگ ہسپانیہ، نقلی کوتوال، جنٹلمین ڈاکو، خوفناک عورت، مسز شیلا بی۔ اے وغیرہ وغیرہ!

اب اصل خط ملاحظہ فرمائیے:

تسلیمات! آپ کا رسالہ چلبلا (؟) دیکھا گیا۔ اس میں کسی اعلیٰ مضامین نویس کا مضمون نہ پایا گیا۔ مضمون ہی ایک ایسا رسالہ میں ہونا چاہیئے جو دلکش اور کشش آمیز ہو تو مالک رسالہ کی مالا مال ہونا ہی منحصر ہے۔ اگر مضمون رسالہ میں دلآویز نہ ہو۔ تو رسالہ کی کوئی عظمت نہیں۔ آپ کی توجہ سطورِ ذیل کی طرف دلاتے ہوئے تحریر ہے کہ مظہر پانچ ہزار سٹوری افسانہ کا مصنف ہے۔ مظہر کی سٹوریاں مایہ ناز فرم فضل بک ڈپو میں شائع ہو کر ہندوستان کے تمام ریلوے بکسٹالوں پر فروخت ہو کر قدردان معززین کے ہاتھوں میں دیکھی گئی ہیں۔ مظہر کی تحریر میں کمال اثر ہوتا ہے جو دلکشی سے خالی نہیں ہوتی۔ ایک بار نہیں بلکہ ناظرین بار بار پڑھتے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر ایک بھی سٹوری مظہر کی آپ شائع کریں گے تو یقینی ہوگا کہ آپ کے رسالہ کی اشاعت لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ کہنا حق بجانب رہے گا کہ مظہر پینتیس سال سے سٹوری نویس فسانہ نویس ہے۔ تجربہ کار ہے۔

اگر آپ نے مظہر سے ہاتھ ملایا۔ اور تصنیفات شائع کیا تو آپ کا رسالہ کمال عروج پر دیکھا جاوے گا۔

باعثِ تحریر یوں ہوا کہ سرِدست ایک سٹوری۔ افسانہ تیار ہے۔ اگر آپ فرماویں تو آپ کو بذریعہ رجسٹری ارسال کیا جاوے۔ آپ اس کو ملاحظہ فرماویں۔ اگر پسندِ خاطر ہو تو اجرت اس کی ساتھ تحریر ہوگی جو آپ کو بذریعہ ٹیلی گرام ارسال کرنا ہوگا۔ اگر ناپسند ہو تو فوراً فل الفور واپس کرنا ہوگا۔

اگر آپ نے قدردان نگاہ سے مظہر کے فسانہ سٹوری کو دیکھا تو ہمیشہ کے واسطے آپ سے رشتہ تصنیف پیوست کیا جاویگا۔

جواب کا منتظر مشیر ادیب قلم توڑ سٹوری نویس

معرفت حضرت مولینا مولوی صاحب سوداگر چائے

بیرون موچی۔ نزد پولیس چوکی۔ لاہور۔

مرسلہ بیجئے ملاحظہ ہوں —— Medialist

یارانِ حلقہ

(خطوط)

مکرمی و محترمی جناب نعیم صاحب - السلام علیکم - فروری کا ماہنامہ "چراغِ راہ" نظر سے گذرا۔ میرے متعلق آپ نے جو حوصلہ افزا فقرات استعمال فرمائے وہ کچھ اس قسم کے ہیں کہ میں ان کا مستحق نہ تھا۔ بہرحال یہ آپ کی کرم گستری اور ذرہ نوازی ہے ——— میں تشکر اور امتنان کے بڑھے الفاظ سے اس خلوص اور شفقت کو مجروح نہیں کرنا چاہتا جو آپ کے دل میں میرے لئے ہے۔

میں امتحان کے قرب کی وجہ سے عدیم الفرصت ہوں۔ اس لئے شاید یہ خط لکھنے کی نوبت نہ آتی لیکن چند ایک امور ایسے ہیں کہ جن کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ سطور تحریر کرنا پڑیں۔

آپ کے مؤقر پرچے میں آپ ہی کے قلم سے ایک مضمون "محمد مرتضیٰ سکیرا، شفیق الرحمان اور ہم" شائع ہوا ہے۔ محمد مرتضیٰ صاحب نہ صرف میرے ہم جماعت ہیں بلکہ ایک بے تکلف دوست بھی ہیں۔ اور مجھے ان کی پرخلوص دوستی پر ناز ہے۔ لیکن انہوں نے اس انسانیت سوز حرکت کا ارتکاب کر کے نہ صرف اپنی نیک شہرت اور عزت کو نقصانِ عظیم پہنچایا ہے۔ بلکہ اپنے متعلق میرے جذباتِ صادق کو بھی کند چھری سے ذبح کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب ان پر محض الزام لگایا گیا ہو اور شفیق الرحمٰن صاحب کو اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث' اپنا انٹرویو دینا یا وہ الفاظ کہنا جو مرتضیٰ صاحب نے ان سے منسوب کئے ہیں' یاد نہ رہا ہو۔ بہرکیف میں مرتضیٰ صاحب کی طرف سے نہیں بلکہ اُن جذباتِ دوستی کی جانب سے' جو میرے دل میں مرتضیٰ صاحب کے لئے پائے جاتے ہیں، شفیق صاحب سے اور آپ سے تہِ دل سے معذرت خواہ ہوں ——— لیکن کیا میں شفیق الرحمٰن صاحب سے مخاطب ہونے کی جرأت کر سکتا ہوں : شفیق صاحب! اگر تلخ نوائی ناگوار نہ گذرے تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مرتضیٰ صاحب نے تو جو حرکت کی سو کی، لیکن آپ نے اپنے گرامی نامہ میں یہ ہتک آمیز الفاظ استعمال کر کے اپنے کردار کے کون سے پہلو کو اجاگر کیا کہ "ایڈیٹر چراغ راہ کو چاہیئے کہ وہ مناسب الفاظ میں معافی مانگے" ——— ؟ کیا آپ نے اپنی شہرت کی پرشکوہ عمارت کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ایک معزز پرچے کے مدیر پر نگاہِ التفات تو رہی الگ کم از کم ادب سے گرے ہوئے الفاظ کے پتھروں کی بارش نہ کی ہوتی ؟ ———

محترم! یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ مدیرِ چراغِ راہ کو آپ کے کرم آمیز الفاظ کی قطعاً ضرورت نہیں۔ لیکن آپ کا مقام آپ سے متقاضی ہے کہ آپ کو ایک معزز شخص کے متعلق، شائستہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں اور پھر جبکہ اس بے چارے کا کوئی قصور بھی نہ ہو .....

اچھا نعیم صاحب! اجازت چاہتا ہوں۔ اپنی طویل مختصر نظم تجدید پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے ——— میں نے

[illegible] انشاء اللہ ۱۷ مارچ تک یہ انٹرویو
احسان صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد ارسالِ خدمت کر دوں گا۔ مخلص ذکاء الرحمن۔ ۲۱ فروری [illegible]

محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ سب سے پہلے تو میں اس افسوسناک ذہنی الجھن اور پریشانی پر سخت ندامت کا اظہار کرتا ہوں جو میری وجہ سے آپ کو اور دوسرے متعلقہ اصحاب کو پیش آئی۔ اور اس کے بعد میں اصل صورتِ واقعہ کو آپ کے سامنے رکھے دیتا ہوں شاید کہ آپ میری پوزیشن کو سمجھ کر میرے اصل قصور اور شفیق الرحمان صاحب کی نوازش سے کسی نہ کسی حد تک باخبر ہو جائیں جو انہوں نے میرے حال پر فرمائی ہے۔

میرا اصل قصور صرف اتنا ہے کہ میں اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے شفیق الرحمن صاحب سے اس گفتگو کی اشاعت کی اجازت نہ لے سکا جو میرے اور ان کے درمیان ہوئی جسے میں نے انٹرویو سمجھا لیکن شفیق الرحمن صاحب کی یہ بات درست نہیں کہ میں نے خود اختراع کر کے یہ خیالات ان کی طرف منسوب کر دیئے ہیں جن سے اب وہ برأت کا اظہار فرما رہے ہیں۔ دراصل شفیق الرحمن صاحب کے اس افسوسناک طرزِ عمل کی کچھ مخصوص وجوہات ہیں جن کی طرف میں مختصر اشارات پر اکتفا کروں گا

پہلی چیز تو یہ ہے کہ شفیق الرحمن صاحب اس گفتگو کو پرائیویٹ سمجھ رہے تھے اور انہیں اس بات کی قطعاً توقع نہ تھی کہ یہ اشاعت پذیر بھی ہو سکتی ہے اور ان کے خیالات کا علم ان لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے جن کے بارے میں ان کا اظہار کیا جا رہا ہے

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ شفیق صاحب اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ اگر کسی یقینی ثبوت کی غیر موجودگی میں کبھی اپنے حقیقی خیالات کسی کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تو اس میں ہرج کی بات نہیں ہے کیونکہ اس شکل میں انکار کی گنجائش بالکل واضح ہے۔

لیکن شفیق صاحب کی خدمت میں عرض کر دوں کہ میرے پاس اس ملاقات کا ثبوت موجود ہے جس سے وہ انکار فرما رہے ہیں اور جس کے بارے میں انہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ میں کسی مرتضیٰ کو نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ گمنام سے شخص کو اپنے حافظہ میں جگہ نہ دے سکے ہوں لیکن انہوں نے میری اس خواہش کہ اگر ہم میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی، پر صاد کرتے ہوئے اپنے دستِ مبارک سے اپنا [illegible] تحریر فرما دیا تھا جسے میں اس خط کے ساتھ مرسل کر رہا ہوں۔

آخر میں میں آپ کو اس خط کی طرف متوجہ کرتا ہوں جو آپ نے چوہدری محمد حنیف صاحب کو لکھا ہے۔ اس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے "اُن کا ایک خط آیا کہ میں کچھ ادیبوں سے ادبی مسائل کے بارے میں انٹرویو لینے کا سلسلہ شروع کر رہا ہوں اگر آپ پسند کریں تو یہ سلسلہ "چراغِ راہ" میں شائع ہو۔" اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ دراصل ماہنامہ معیار میرٹھ کا ایک اقتباس ڈرامہ سٹیج کے بغیر آپ نے "چراغِ راہ" اکتوبر [illegible] میں شائع فرمایا تھا۔ وہ اقتباس میں نے میرزا ادیب صاحب اور امتیاز علی تاج صاحب کو بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں جو خطوط مجھے ان حضرات کی طرف سے موصول ہوئے ان کی اشاعت کے سلسلے میں آپ سے خط و کتابت

دلی میں اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا "ان کی اشاعت مناسب ہو تو ہم لے لیں گے"۔ اس لئے بہت میں آپ ہی ا
اپنی نامہ ارسال کر رہا ہوں۔
شفیق الرحمٰن صاحب کے پتہ کی چٹ اگر مناسب سمجھیں تو مطالعہ کے بعد واپس کر دیجئے۔
فقط والسلام۔ محمد مرتضیٰ مکھیرا۔ ہارون آباد (بہاول نگر)

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:
ع تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے فضل من اللہ صاحب کا مضمون پڑھا۔ بقول آسی ضیائی مجھ جیسے "نو مشقوں" نے اہل قلم اصحاب
راہ ہی مسدود کر دی، دوسرے خود بھی سودا کے ہجو کے گھوڑے بن گئے کہ کوئی پکارتا ہے "دھکے دیجئے" کوئی کہتا ہے "پہیئے لگائیے".....
حال میں اپنی جگہ نادم ہوں۔ مانتا ہوں کہ عرقِ انفعال کو شان کریمی تو خون سکتی ہے مگر یہ کوئی ایسا تیل تو نہیں جس سے "چراغِ راہ" جلتا رہے۔
کریں کہ اللہ تعالیٰ توفیق خیر عطا فرمائے، اور نیکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن جاری رہے۔ گھبرائیں نہیں۔ یہ بقول صالہ
زلوں کا عذاب مسلط کرنے کا نوٹس نہیں ہے۔ میں تو بڑا PROSAIC واقع ہوا ہوں۔ ایک چیز منسلک کر رہا ہوں اپنی تو نہیں
، مگر چیز اچھی ہے۔ اگر اس کا کچھ بن سکتا ہو تو بنا لیں۔ خالدِ بیمار کا دردناک خط آیا ہوا ہے، انہیں سلام عرض کر دیں۔ حضرت عابدِ بیمار
زین العابدین بن امام حسینؓ) کے متعلق اپنے ایک ہم وطن شیعہ بزرگ کا ایک شعر یاد آیا ؎

مہارِ ناقہ تھامے عشق کی منزل کو طے کرنا،
تجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا!!

والسلام احقر فروغ احمد۔ ڈھاکہ۔

مدیر محترم۔ سلام و رحمت۔ گذشتہ کئی اشاعتوں سے "چراغِ راہ" سیاسی کم اور ادبی زیادہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہ ادبی ذوق رکھنے
والے قارئین کے لئے خوشی کی بات ہے۔ خصوصاً نومبر ۱۹۶۰ء کا شمارہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔
میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں، اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، کہ یہ "چراغِ راہ" ہی ہے جس نے مجھے ذوقِ
دار کی اور انفرادیت پسندی کے مرض سے نجات بخشی اور جماعتی زندگی کا خوگر بنایا، اور میری جملہ صلاحیتوں کو ایک ہی راہ پر
راہِ حق پر لگا دینے کے لئے آمادہ کیا۔ اور یہ چراغِ راہ ہی ہے جس نے میرے ادبی ذوق کو تسکین بخشی، میری ادبی صلاحیتوں کو پروان
چڑھایا اور بالخصوص مجھے ادبِ اسلامی کی صفوں میں در آنے کی جرأت عطا کی۔
نومبر دسمبر ۱۹۶۰ء کا مشترکہ شمارہ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے "چراغِ راہ" اپنی پچھلی روایات دہرانے کا عزم لے کر آیا ہے۔
ی ترتیب وہی رنگ ہو ہی ادبیت اور وہی چاشنی۔ کیونکہ اشاعتِ خصوصی ۱۹۵۷ء کے بعد چند ہی شمارے ایسے دیکھنے میں آئے،

کہ جو ترتیب مضامین، ادبی رکھ رکھاؤ اور اپنی معانی شوخی تحریک کے آئینہ دار تھے۔ ورنہ اس کے بعد سے اب تک بتدریج چراغِ راہ کے اوراق کثری تنقیدات، ٹھوس علمی مقالات، سیاسی و پارلیمنٹری تبصرے اور تحقیقی مضامین سے بوجھل ہی آتے رہے ہیں۔

بلاشبہ "چراغ راہ" جیسا بلند ادبی جریدہ ملک کے تغیر پذیر حالات ——— خصوصاً سماجی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی حالات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ان ہنگامی مسائل پر بھی اپنی بنیادی پالیسی کے تحت اپنے حلقہ قارئین کی رہنمائی کرے۔ مگر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے صرف ادارتی کالم کے مخصوص اوراق ہی مستعمل ہونے چاہئیں تاکہ دیگر اصنافِ ادب اور ان کے واجبی حقوق کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جا سکے۔

شکایاتِ دبستاں کے ضمن میں بر سبیلِ تذکرہ ایک دیرینہ شکائت بھی تحریر کردوں وہ یہ کہ اشاعت خصوصی ۵۳ء کے بعد کسی شمارہ میں "چراغ راہ" نے جب "ادب اسلامی" کی نمائندگی کے سلسلہ میں اپنی خاموشی کا اعلان کیا تو اس کے ناخوشگوار اثرات کسی نہ کسی جہت سے خود چراغ راہ پر بھی مترتب ہوئے ہوں گے، حلقہ قارئین پر بھی اور وابستگانِ "ادب اسلامی" پر بھی۔ کیونکہ "ادارہ ادب اسلامی" سے متعلق اہل قلم اور سخن ور حضرات کو متحرک رکھنے کے لئے ادارہ کی تنظیموں کے ساتھ ساتھ ادارہ کے نمائندہ رسائل کی سعی و جہد کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ایک ادبی آرگن نہ صرف موجودہ ساتھیوں میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی تحریک پیدا کرتا ہے، بلکہ از خود نئے ساتھی بھی فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بہرکیف "چراغ راہ" کے اس اعلان کی جو کچھ بھی وجوہات ہوں تاہم اس بارے میں بھی میں نے اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے۔ چونکہ ان معروضات کی تحریک کا اصل سبب دسمبر ۵۶ء کا شمارہ ہے اس لئے اس شمارے کے بارے میں بھی مختصراً اظہارِ خیال ضروری ہے وہ ان شاء اللہ آئندہ اشاعت کیلئے جلد ہی روانہ کروں گا۔ فقط طالب خیر احمد پرویز فیروزآبادی

بقیہ: "تاریخِ اسلام کی جون آف آرک" از صفحہ ۲۵

تشہیر کرایا گیا۔ جب کہ شہزادی امینہ کے لئے ایک انوکھی وحشیانہ سزا سوچی گئی۔

۲ مارچ ۱۵۰۷ء کی ایک سوگوار صبح، امینہ کے نازک بدن کو ایک کھمبے سے رسیوں میں جکڑ کر لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں شعلے بھڑک کر نرم و نازک مقدس جسم کو بوسہ دینے لگے۔ دفعتاً امینہ کی باوقار آواز ابھری:

"تم میرے جسم کو جلا رہے ہو لیکن میری روح تمہاری دسترس سے باہر ہے۔ میں خوش ہوں کہ اس طرح تم نے آنے والی نسل کے لئے ایک زندہ مثال قائم کر دی۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ وہ دن قریب ہے جب تمہاری اس بربریت اور وحشت کا جواب طلب کیا جائیگا جو تم نے اندلس کی حسین سرزمین پر روا رکھی ہے سارے وحشیوں کی جماعت! مجھے تم پر ترس آتا ہے، اس لئے کہ یہ آگ اس جہنمی آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو تمہارے لئے وقف ہے۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں لیکن وہ ہزار ہا معصوم روحیں جن پر تم نے نت نئے مظالم کے پہاڑ توڑے، تمہیں کبھی معاف نہ کریں گی"۔

شعلے اب ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ لکڑیوں کی چیخ پکار سے امینہ کی آواز دبتی گئی۔ حتیٰ کہ اسلام کی جون آف آرک شہزادی امینہ بنت محمد کی مقدس روح جنت الفردوس کو پرواز کر گئی۔

(اسلامک ریویو)

آپ کیا پڑھیں ——— ؟

• تحفہ اثنا عشریہ (اُردو)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے قلم مبارک سے یہ کتاب ایک ایسے دور میں لکھی گئی تھی جبکہ شیعیت سیاسی دائرے میں اقدام
کے لئے سخت کش مکش کر رہی تھی۔ شاہ موصوف نے شیعیت کے جملہ مدارس فکر کی حقیقت خاص و عام کے سامنے اس کتاب میں
لے رکھ دی۔ اب اس علمی و تحقیقی کتاب کا ترجمہ مولینا سعد حسن خاں یوسفی نے اردو زبان میں کر دیا ہے نور محمد کارخانہ تجارت کتب
غ، کراچی نے اسے اچھے معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد ۱۲ روپے۔

• طبقات

جناب احسان دانش کو آپ جانتے ہیں۔ شہرِ زندگی کا کون سا حقہ ایسا ہے جس کی کوچہ گردیاں اس ستم کش روزگار نے نہ کی
ہوں کوچہ گردیوں کا ایک فکری و جذباتی حاصل ہے جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے پیدا کردہ وہ تمام مسائل جو دلوں
ں پیدا کرتے ہیں انہیں سامنے رکھ کر احسان صاحب نے نہایت دلفریب نکات کی شکل میں حقیقتوں کی جھلکیاں دکھانے کی
ش کی ہے۔ ان کے چٹکتے ہوئے جملوں میں فلسفیانہ گہرائی بھی ہے اور شاعرانہ شوخی بھی۔ ضروری نہیں کہ ہم آپ ان کے ہر نقطہ سے
اتفاق کریں، لیکن بہرحال اس کتاب کو پڑھ کر بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے
کتاب مکتبہ دانش، ایبک روڈ، انارکلی لاہور کی شائع کردہ ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چار روپے ہے جو عام معیار سے زائد ہے۔

چوہدری علی احمد خاں (مرحوم)

چوہدری علی احمد خاں مرحوم محض جماعت اسلامی کے ایک قیمتی فرد ہی نہ تھے، قوم اور انسانیت کے سرمایۂ رجال کا ایک جزو تھے۔
فرض شناسی اور جد و جہد کے ایک مجموعے کا نام تھا چوہدری علی احمد خاں! ——— ناگہانی موت نے رفقا و احباب کے دل
دیئے۔ ان کے تاثرات کا یہ مجموعہ اس شخصیت کی پاکیزہ تصویر سامنے آتا ہے جو ہمارے ہاتھوں سے چھن گئی۔ اس کتاب
سے یہ بیش قیمت نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ ایک نظریہ صداقت اور ایک پاکیزہ نصب العین کس طرح افراد کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔
کے قریب ترین رفیق اسعد گیلانی نے اس مجموعہ کو مرتب کیا اور شرکت احباب مرحوم کی نگرانی میں مکتبہ تعمیرِ انسانیت
ن موچی دروازہ لاہور نے دیدہ زیب طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا۔

——— قیمت چار روپے۔

• نئی نسلیں —— سالگرہ نمبر

م نسیم اور طیب عثمانی کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونے والا یہ معیاری ماہنامہ تعمیری و اسلامی ادب کا نمائندہ و ترجمان ہے۔ اپنی تھوڑی سی عمر میں اس مجلے نے ایک نمایاں مقام ارباب فکر و نظر کی نگاہوں میں حاصل کر لیا ہے۔ سالگرہ نمبر ہمارے سامنے ہے جسے اگرچہ پڑھنے کا موقع ابھی نہیں ملا مگر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نگارشات کے انتخاب اور ان کی ترتیب اور طباعتی معیار کے لحاظ سے ایک قابل قدر چیز سامنے آئی ہے۔ بہت سے اچھا لکھنے والے متعدد مقالات، افسانے، نظمیں اور غزلیں محفل ذوق میں لاتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ حاصل محنت خراج تحسین وصول کرے گا۔ قیمت سالگرہ نمبر ایک روپیہ ۔ چندہ سالانہ تین روپے۔

• حقوق انسانی

محترمہ رقیہ بنت علامہ خلیل عرب علم و فکر سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت ہی دردمند دل رکھتی ہیں۔ موصوفہ نے اپنی اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ اسلام نے خانوادۂ انسانیت کے مختلف عناصر و افراد کو ایک دوسرے کے مقابل میں کیا حقوق عنایت فرمائے ہیں۔ ضمناً متعدد علمی موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور خاصا معلوماتی سرمایہ ان اوراق میں پھیلا ہوا ہے۔

اس کتاب کو پاکستان میمن خواتین ایجوکیشنل سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ مکتبہ رونق اسلام گرلز سکول —— پرنس اسٹریٹ نانک واڑہ کراچی ۲ (ایضاً) کھارادر نزد پنجابی کلب کراچی، نیز ریاض سنز ناشران و تاجران کتب نول روڈ کراچی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ قیمت چار روپے پانچ آنے۔

• جدید انشائے فارسی

یہ کتاب انٹرمیڈیٹ درجے کے فارسی زبان و ادب کے طلباء کو ذہنی امداد بہم پہنچانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اسے پروفیسر اسرار احمد خاں اور پروفیسر عبدالغفور خاں نے مل کر مرتب کیا ہے۔ امتحان میں نصابی کتب سے متعلقہ حصہ کو چھوڑ کر باقی ساری ضروریات کو مرتبین نے پیش نظر رکھا ہے۔ فارسی انشاء میں مشق حاصل کرنے کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ تاریخ ادبیات ایران سے متعلق ہے اور اس میں ادباء و شعراء کے حالات اور ان کے فن پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرا حصہ حکایات پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ خط و کتابت سے متعلق ہے۔ چوتھے حصہ میں چند موضوعات پر مضمون نگاری کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں چند ضرب الامثال درج ہیں۔

شاہ ہاؤس، بازار گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ نے اسے شائع کیا ہے۔ لاہور میں نفیس پبلیکیشنز، ۴۰۔ لوئر مال سے مل سکتی ہے۔ قیمت ۴/۴

بلند پایہ علمی کتابیں

تاریخ و سوانح

رحمۃ للعالمین ۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری
تین حصے -/۳ ، ۵/۸ ، ۵/۸ روپے غیر مجلد

کتاب	مصنف	قیمت
حیات محمدؐ	محمد حسین ہیکل	۱۸/۱۲
سرور عالمؐ	غلام رسول مہر	۲/۸
سید احمد شہیدؒ	"	-/۱۲
جماعت مجاہدین	"	-/۷
سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری	-/۶
الفاروق	شبلی نعمانیؒ	۲/۸
تذکرۃ الاولیاء		-/۳
انوار الاولیاء	رئیس احمد جعفری	-/۱۰
زندگی کے نمونے		۱/۸
مختصر تاریخ اسلام	غلام رسول مہر	۳/۸
تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی ۔ کامل ۳ جلد	-/۳۶
اسوۂ ابراہیم	عبد المجید قریشی	-/۳
سیرۃ الصدیقؓ	حبیب الرحمان خاں شروانی	۲/۸
جمال الدین افغانی	رضا ہمدانی	۱/۱۲
مسلمان حکمران	رشید اختر ندوی	۱۰/۸

علم و معرفت

کتاب	مصنف	قیمت
اورنگ زیب (بار سوم)	رشید اختر ندوی	-/۹
صلاح الدین (بار دوم)	"	۶/۸
مسلمان سپہ سالار اور فاتح	سید نصیر احمد جامعی	-/۴
اسماء الرجال	شیخ ولی الدین تبریزیؒ	-/۳
سیاست الٰہیہ	امام ابن تیمیہؒ	۲/۸
مضامین جمال الدین افغانیؒ	جمال الدین افغانی	-/۵
اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی	۳/۸
مرد مومن	ڈاکٹر میر ولی الدین	۲/۴
نہج البلاغۃ	حضرت علی کرم اللہ وجہہ ۔ جلد اول	-/۱۵ دوم
قرآنی دعوت انقلاب	محمد علی ایم اے کینٹب	۳/۸
مقالات قرآنی	علامہ عبد اللہ العمادی	-/۳
اسلام کا نظریۂ جہاد	حیدر زمان صدیقی	-/۲
اسلام کا نظریہ سیاست	"	-/۲
اسلام کا معاشیاتی نظام	"	-/۲
اسلام کا نظریۂ اجتماع		۲/۱۲

مکتبہ چراغ راہ ۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے طلب کریں۔

چمچہ بھر صافی
صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے
سے آپ نہ صرف خرابیٔ خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہیں گے
بلکہ صافی آپ کے دوران خون میں توازن پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ
خون کی لہر دوڑا دے گی۔ صافی آپ کے معدہ کے فعل کو درست بنائے گی۔
قبض سے محفوظ رکھے گی اور بھوک بڑھائے گی۔
موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے
کی عادت ڈالئے اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی
بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔
نوٹ: بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بہت مفید ہے۔
ہمدرد دواخانہ، کراچی

روشنی ——— گرمی ——— حرکت

ماہنامہ

چراغ راہ کراچی

احسن رقم

اپریل ۱۹۵۷ء

شمارہ نمبر ۴ - جلد نمبر ۱۱

فہرست

سالانہ چندہ : ۵/- روپے - فی پرچہ ۸ آنے

دفتر ادارۂ تحریر : نعیم صدیقی - مکتبہ چراغ راہ - بیرون لاہوری دروازہ - لاہور

دفتر اشاعت و انتظام : دفتر چراغ راہ - فیض محمد فتح علی روڈ - کراچی

سید کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپا کر دفتر چراغ راہ - فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا -

سمیع بہار

ـــــ سال گزر گیا !

۲۳ مارچ ۵۶ء کو نیا دستور نافذ ہوا ـــــــ اسلامی دستور !

قوم نے خدا کے ساتھ اور حکمران طاقت نے قوم کے ساتھ ایک تحریری پیمان باندھا۔ پیمان باندھا کہ اب سے ارضِ پاک میں خدا کی حاکمیت کا دور دورہ ہوگا، خدا کے قانون کی عملداری ہوگی، کتاب و سنت کے دیئے ہوئے رہنما اصولوں کی مشعلیں جادۂ حیات کو روشن کریں گی، قوم کو اسلام کی تعلیم دی جائے گی اور مسلمانانِ پاکستان کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلامی ضابطۂ حیات کے سانچے میں ڈھال لیں۔ زنا، قمار، شراب اور ربا کے انسداد کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں گی، اسلامی اخلاق کی تعمیر نو عمل میں آئے گی، دائرۂ معیشت میں طبقاتی تفاوت کم کیا جائے گا، بیواؤں یتیموں اور معذوروں کو سہارا بہم پہنچایا جائے گا، نسلی و علاقائی عصبیتوں کو ختم کرکے یک جہتی و یک آہنگی پیدا کی جائے گی اور اس طرح ایک نئے نظامِ حیات کی بنائیں اٹھائی جائیں گی۔

اس پیمان کو باندھے پورا ایک سال ہم نے گزار دیا۔

آؤ اب جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے قول کو پورا کرنے کے لئے ہم نے اب تک کیا کیا اور اس ایک سال میں ہم نے کتنے قدم میدانِ عمل میں صحیح سمت پر بڑھائے !

بتاؤ کہ تمہارے کارنامے کیا ہیں ؟

بتانا کسے ہے، اپنے ضمیر کے سامنے اپنا اعمال نامہ پیش کرو۔ اپنی ہی خودی کو جواب دو۔ اپنی ہی روح کو مطمئن کرو۔ اپنے خالق و مالک کے سامنے کارگزاری کا ریکارڈ رکھو۔

تاریخ تم سے پوچھتی ہے کہ تم نے اس میں کیا اضافہ کیا۔ تہذیب سوال کرتی ہے کہ تم نے اسے کیا دیا۔ علم و فن کے افلاک دریافت کرتے ہیں کہ تم نے کتنے نئے ستارے ان پر آراستہ کر دیئے۔ انسانیت جاننا چاہتی ہے کہ تم نے اس کی کیا خدمات سرانجام دیں۔ تمہاری اپنی ہی ملی امنگیں استفسار کرتی ہیں کہ تم نے ان کے تقاضے پورا کرنے کے لئے کون سی جاں فشانیاں کیں۔

تم میں سے جو جتنا زیادہ ذمہ دار ہے وہ آج اتنا ہی زیادہ جواب دہ ہے۔ سب سے بڑھ کر تمہاری قیادت جوابدہ ہے اسے ایک دن خدا کی عدالت میں حساب دینا ہوگا۔ وہ بتائے کہ اس نے جس دستور کو حلف لے کر قبول کیا تھا......

باقی بر صفحہ ۸

ادارہ (ترجمہ و تلخیص)

مسلمانانِ عالم اقدام کرتے ہیں

دنیا کی دو بڑی متصادم طاقتوں —— اشتراکی روس اور جمہوری مغرب —— کی توجہ جنگِ عظیم ثانی کے بعد کرۂ ارضی کے اُس حصے پر روز بروز زیادہ مرتکز ہوتی جا رہی ہے جس میں مسلم اقوام آباد ہیں۔ یہ آبادی انسانیت کا ایسا عظیم جزء ہے جو انحطاط کا ایک دَور گذار کر از سرِ نو ترقی کی فضاؤں میں اڑنے کے لئے پرفشاں ہونے والا ہے۔ روس اور مغرب دونوں کے دائرے میں جو انسانی معاشرے بستے ہیں ان کا ایک ذہن بن چکا ہے اور انہوں نے اپنے لئے ایک نہ ایک تمدنی و سیاسی ہیئت مخصوص کر لی ہے اور اپنے اپنے نظامِ حیات کو برسوں کی محنت و کاوش سے تعمیر کر لیا ہے۔ لیکن ان دونوں متصادم طاقتوں کے حلقہ ہائے اثر کے درمیان جگہ پانے والی مسلم اقوام بڑی کشمکش کے بعد ابھی غلامی کی تاریکیوں سے نکل کر آزادی کی روشنی میں آ رہی ہیں اور اب ان کے سامنے اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ اولین اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ "اُمتِ وَسَط" نہ صرف اپنے اصل اسلامی نظریات کے لحاظ سے اقوامِ عالم کے لئے تاریخی طور پر وسطی اہمیت کی حامل رہی ہے، بلکہ جغرافی لحاظ سے بھی اس کو ایک درمیانی موقف حاصل ہے اور اب تو بین الاقوامی سیاسیات کے قائم کردہ موجودہ توازنِ قوت کو آخری شکل دینا بھی اسی پر منحصر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ گویا ایک عالمی پاسنگ بن گئی ہے جو اگر میزانِ تاریخ کے سُرخ پلڑے میں وزن ڈال دے تو وہ جھک جائے گا اور اگر وہ سفید پلڑے میں جا پڑے تو وہ بوجھل ہو کر زمین سے جا لگے گا۔ لیکن اگر وہ پاسنگ بننے کی ادنیٰ پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے اپنی حقیقت کو پہچانے اور اپنے لئے نظریات و مفاد کے اس دورِ کشمکش میں ایک مستقل مقام پیدا کر لے تو کوئی بعید نہیں کہ ترازو کی ڈنڈی اس کے ہاتھ آ جائے۔ اس کا ہاتھ ترازو تھامنے والا ہو۔ اسکی نظر قسطاس کو جانچنے والی ہو اور اس کی زبان فیصلے دینے والی قرار پائے۔ اس امتِ وسط کے شایانِ شان درحقیقت یہی مقام تھا اور یہی ہونا چاہیے جسے یہ گم کر چکی ہے اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کی امنگ اسکی فرضی فضاؤں میں از سرِ نو پھڑ پھڑانے لگی ہے۔ اس مقام کے حاصل کرنے کے لئے مسلم اقوام کو بڑے مراحل طے کرنے ہیں اور اس میں بڑا وقت لگے گا۔ لیکن اگر ایک بار واضح طور پر رُخ اِدھر ہو جائے تو کم سے کم یہ منزل زیادہ دُور نہیں رہ جاتی کہ دنیا کی مسلم طاقت سُرخ و سفید لہروں کے درمیان حاجب بھی بنے، ان کے توازن کو برقرار رکھے، ان کو تصادم سے بچائے اور ان کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بنے اور اس وسطی مقام کے طفیل اپنی نشو و نما کے تقاضے بطرزِ احسن پورے کر سکے۔

اس طرح گویا مسلم طاقت دنیا کے مسئلۂ امن و جنگ کا ایک خوشگوار حل عملاً پیدا کرسکتی ہے۔

یہی اہمیت ہے مسلم طاقت کی، جس کے سبب روس اور مغرب دونوں کی انتہائی توجہ مشرق قریب، مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے ان علاقوں پر شدت سے مرتکز ہو چکی ہے جن میں مسلم طاقت کا یہ سمندر ——— کچھ یخ بستہ اور کچھ پگھلتا اور برف کے تودے تراتا ہوا ——— پھیلا ہوا ہے۔ دونوں عالمی طاقتوں کی چشم ہائے بصیرت بغور اس سمندر کا جائزہ لے رہی ہیں ——— اس کی زیر سطح فکری لہروں کا، اس کی جذباتی رووں کا، اس کے واقعاتی گردابوں کا! دونوں طرف سے ہمارے اعتقادات و رسوم، ہمارے نظام مذہب و اخلاق، ہمارے تمدنی امتیازات اور ثقافتی رجحانات، ہمارے سیاسی و معاشی نظریات اور ہماری تاریخ کے ریکارڈ کا خوردبینی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ خصوصیت سے مغرب ——— جسے روس کے مقابلے میں ہمارے اندر اتر کر دیکھ بھال کرنے کے مواقع زیادہ حاصل ہیں ——— ہماری زندگی کے ایک ایک شعبے اور ایک ایک پہلو کو ٹٹول رہا ہے۔ سفارتی اداروں، معاملاتی نظام، ثقافتی وفود اور سیاحتی گروہوں کے پیرائے میں بہترین دماغوں کو بھیجا جا رہا ہے کہ وہ ہم مسلم اقوام کے باطن کو پڑھیں اور رائے قائم کریں کہ کروڑوں انسانوں کے یہ انبوہ کن نظریات و مقاصد کو لے کر کس رُخ اقدام کرنے والے ہیں۔ برطانیہ، یورپ اور خصوصاً امریکہ کی یونیورسٹیوں میں مشرق قریب و وسطیٰ اور دوسرے مسلم ممالک کے معاشرتی، تمدنی اور ثقافتی نظاموں کی تحقیق اور خود اسلام کے فکری، قانونی، سیاسی اور تہذیبی جائزے کے لئے مستقل علمی شعبے قائم ہو چکے ہیں اور ان شعبوں کے تحت بہت وسیع پیمانے پر کام ہو چکا ہے۔ انہی کاوشوں کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ، مسلم اقوام اور اسلام کے متعلق عالمی دائرے میں نت نئی کتابیں آرہی ہیں

اس جائزہ و مطالعہ کے کام کے ساتھ ساتھ دوطرفہ اثر و نفوذ بڑھانے کی کوشش ہر ممکن شکل میں ہو رہی ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں کچھ نظریات ڈالے جائیں، ہمیں کچھ خاص سیاسی میلانات کے راستے پر ڈال دیا جائے، ہمارے اندر کلچر اور آرٹ کے رنگین پیرائے میں بیرونی اثرات پہنچا دیئے جائیں، معاملات کے ذریعے ہمیں اپنے ساتھ باندھ لیا جائے، بین الاقوامی کشمکش مفاد میں سوداگرانہ اسلوب پر معاملہ کرکے ہمیں زیر اثر رکھا جائے اور ہمارے برسر اقتدار طبقوں کو ذہنی لحاظ سے رام کرکے آلۂ کار بنا لیا جائے۔ ہم ایک رسہ کشی کی زد میں ہیں اور ہمیں گویا دو طرف سے کھینچا جا رہا ہے۔ ہم ذہنی لحاظ سے ٹکراتے ہوئے نظریات اور مفادات کا ایک اکھاڑہ بن گئے ہیں۔ یہ پُرہنگامہ دنگل ہو رہا ہے اور ہمارا نظریہ ایک طفلک معصوم کی طرح اپنے گہوارے میں سر اُٹھا کر دیکھ رہا ہے۔

بدقسمتی سے دوسروں کی جتنی توجہ ہماری طرف ہے، اتنی ہماری اپنی توجہ ہم پر صَرف نہیں ہو رہی، بلکہ ہم عالم خود فراموشی میں پڑے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو خود پوری کاوش سے دیکھا ہی نہیں۔ ہمیں ہماری تاریخ ———

آپ بیتی سنانے والے ہماری ثقافت سے تعارف کرنے والے، ہمارے سیاسی و معاشی نظریات کا مفہوم سمجھانے والے، اور ہمارے بین الاقوامی مفادات سے آگاہ کرنے اور ان کے لیے راستہ سمجھانے والے دوسرے ہیں۔

اس مقصدی پس منظر کے ساتھ عالم اسلام کے متعلق جو لٹریچر لایا جا رہا ہے، اسی سلسلے کی ایک تازہ کتاب ہمارے زیر مطالعہ ہے، یہ سطور اس کا تعارف کرانے کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔ کتاب کا عنوان ہے :-
"Muslims on the March" اسی عنوان کا ترجمہ ہم نے ان سطور کی پیشانی پر درج کیا ہے: "مسلمانانِ عالم اقدام کرتے ہیں !"

مصنف اور اس کا مقام

اس کتاب کا مصنف فریڈرک ولہلم فرناؤ (Friedrich Wilhelum Fernau) ہے۔ یہ شخص ۱۹۱۳ء میں جرمنی کے ایک مقام گارلز (Gorlitz) میں پیدا ہوا۔ اس نے لیپزگ (Leipzig)، میونخ (Munich) اور برلن (Berlin) کی یونیورسٹی میں تعلیم و مطالعہ کا دور گزرا اور ۱۹۳۷ء میں سیاسیات کے دائرے میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے السنۂ شرقیہ کا مطالعہ کیا تاکہ مسلمانوں کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کا محققانہ جائزہ لے سکے۔ چنانچہ ایک مدت تک بالکل اسی میدان کے لئے یکسو اور مخصوص ہو کر کام کیا۔ آزاد جرمنی میں مسلسل چار برس تک مشرقِ قریب کے مسائل کے ماہر کی حیثیت سے کاوش جاری رکھی۔ پھر جرمن نظام سفارت کے تحت ایک عہدہ قبول کر کے استنبول کو مستقر بنایا۔ ۱۹۴۲ء سے خاتمۂ جنگ ۱۹۴۵ء تک جرمنی کے ایک ممتاز اخبار (Near & Middle East) کے ادارہ میں منسلک رہ کر خصوصی وقائع نگار کی خدمات انجام دیں گذشتہ دس یا کچھ زیادہ سال مسلمان ممالک کا دورہ کرنے میں صَرف کئے اور مسلم اقوام کے حالات کو قریب سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۷ء سے ڈاکٹر فرناؤ واشنگٹن میں مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ کے رکن ہیں۔

غایتِ تصنیف

اپنے اس ماہرانہ مقام کے ساتھ ڈاکٹر فرناؤ نے اپنی کتاب جس غایت سے لکھی ہے، وہ پبلشر کے الفاظ میں بڑے کامیاب اجمال سے سامنے آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کتاب کا مقصد مغرب کو اس نوخیز قومیت اور جذبۂ احیائے اسلام کا مفہوم سمجھانا ہے جو آج مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں ساری تحریک کا محرک ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی توجہ کے ساتھ مسلمانوں کے اندر روسی اثر و نفوذ پر بحث کی گئی ہے۔

لیکن مصنف نے مقدمۂ کتاب میں اپنے مدّعا کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ وہ مغرب کے سامنے یہ صورتِ حال رکھتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط سے انسانیت دو عالمگیر تصادموں کی زد میں ہے۔

ایک وہ تصادمی عمل ہے جو سوویٹ یونین اور اطلانتک مغرب کے درمیان ہو رہا ہے۔

دوسرا وہ ہے جو ایشیائی اور افریقی اقوام کی حیاتِ نو کی صورت میں درپیش ہے۔

ڈاکٹر فرناؤ کا مطالعہ یہ ہے کہ اس دوسری تعادمی رَد کو مغرب میں ثانوی اہمیت دی جا رہی ہے اور اگر اس پر خاص توجہ دی جاتی ہے تو صرف بُحرانی مواقع پر جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر فرناؤ کی رائے میں اگرچہ روس اور عالمِ اسلام سے اُٹھنے والی دونوں رَدویں تاریخ کے سمندر میں مربوط ہو کر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہوئی اپنا عمل کر رہی ہیں، لیکن یہ دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل طاقتیں ہیں اور جداگانہ توجہ کی متقاضی ہیں۔ وہ مغرب کو متنبہ کرتا ہے کہ مشرقِ قریب و بعید کے حادثاتی مدوجزر کو محض اس "سرد جنگ" پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے نہ دیکھا جائے جو روس اور مغرب کے درمیان جاری ہے۔ اس کا نتیجۂ فکر و کاوش یہ ہے کہ انسانی آبادی کے اس حصے میں حالات کا ارتقاء جہانی پیمانے پر تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اس کو محض روس اور مغرب کی آویزش کے محدود زاویے سے نہ دیکھا جانا چاہیئے۔ وہ ادھر بھی کم سے کم اتنی ہی توجہ دینا ضروری سمجھتا ہے جتنی کہ روس کے معاملات میں صرف کی جا رہی ہے۔ ورنہ اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے میں اگر مغرب نے کوتاہی کی تو تاریخ کے اس باب پر حسرت آمیز انداز میں ایک دن ان الفاظ میں تبصرہ کرنا پڑے گا کہ جو کچھ کیا گیا بہت کم تھا اور بہت بعد از وقت!

مصنف اس ختم ہونے والے دور کا تذکرہ کرتا ہے جس میں جدید یورپ کا توسیعی رجحان اٹھا اور عالمِ اسلام ہندو انڈیا اور چین کے قدیم تمدنوں پر ایک طوفانی موج کی طرح چھا گیا۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں تاریخ نے ایک پلٹی کھائی۔ ابتدائً تبدیلی کے اس دھارے کی حرکت سست تھی اور غیر واضح! — مگر جنگِ عظیم ثانی کے بعد ایک خوفناک بُحران کے زیرِ اثر — جو ابھی تک جاری ہے — ایک سیلاب امڈ پڑا جس نے کنارے توڑ دیئے۔ دنیائے قدیم کی غیر اروپائی اقوام یورپ کے تسلط سے نجات پانے کے لئے مضطرب تھیں۔ ان کا مقصود صرف سیاسی اور اقتصادی آزادی ہی نہ تھی بلکہ وہ اپنی زندگیوں کا نقشہ اپنی پسند کے مطابق خود اپنے ہاتھوں بنانے کی آزادی کے درپے تھیں۔ وہ اپنے لئے یہ فیصلہ کرنے کا حق چاہتی تھیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ یہ خواہش اور یہ تڑپ بڑی وسیع الاثر اور ہمہ گیر ہے۔ اسے "نو آبادیاتی قوموں کا مشترک محاذ" کے زیرِ عنوان رکھنا مصنف کی رائے میں بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

ڈاکٹر فرناؤ مغرب کے سامنے یہ حقیقت بھی نمایاں کرتا ہے کہ مشرقِ بعید اور ہندو انڈیا کی تہذیبیں تاریخ و فلسفہ کی مخصوص اصطلاح میں "ایشیائی تہذیبیں" ہیں۔ لیکن اسلام نہ "ایشیائی" ہے، نہ "مغربی"! اس ڈاکٹر کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے یہ ایک اہم ترین نازک نکتہ گرفت میں لے لیا ہے جسے شاید بہت سے مسلمان خود نہ سمجھتے ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اور عالمِ اسلام ایشیا اور یورپ کی درمیانی کڑی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عین اپنے اس وسطی مرتبے کی بنا پر جو راہِ عمل بھی مسلمان اختیار کریں گے اسے تمام دنیا کے مستقبل کے بناؤ اور بگاڑ میں نہایت ہی نازک قسم کی اہمیت حاصل ہوگی۔ مسلمانوں نے اگر مغرب کی مخالفت کی رَو میں اپنے آپ کو منقطع کر لیا تو اس حادثہ

کے معنی یہ ہوں گے کہ ایشیا، افریقہ، اور یورپ کو ملانے والے پُل مسدود ہو جائیں گے۔

گویا وہ مغرب کو سبق دے رہا ہے کہ کسی طرح عالم اسلام ——— جس میں سے وہ ترکیہ، مصر اور پاکستان کو وہ درجہ اول کی اہمیت دیتا ہے ——— کو سنبھالا جائے اور اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ لیکن اس مقصد کے لئے وہ گزشتہ دور کی حکمت عملی کے استعمال کو صحیح نہیں سمجھتا۔ وہ صاف کہتا ہے کہ یہ سمجھنا ایک بھاری غلطی ہوگی کہ آج بھی مغرب جبراً عالم اسلام کو جس سمت بھی چاہے ہانک لے جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے اس کی نگاہ میں واحد راستہ یہ باقی ہے کہ "مشترک مفاد" کی اساس پر قائم کردہ "دوستانہ روابط" کے ذریعے اس تاریخی طاقت کو ساتھ لگا رکھا جائے۔

بس یہ ہے غائت جس کے لئے ڈاکٹر فرناؤ نے جہاں گردی بھی کی ہے اور عرق ریزی بھی، اور وہ اپنے حاصلِ محنت کے طور پر یہ کتاب دنیا کے سامنے لایا ہے۔

عالمی قوت کی کلید

عالم اسلام کا تاریخی اور جغرافیائی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فرناؤ قارئین کو اس نتیجے تک لے جاتے ہیں کہ عالمی قوت کی کلید انسانی آبادی کے اسی خانوادے کے قبضے میں ہے عالم اسلام قدیم دنیا کے دو بڑے متمدن خطوں ——— مغرب میں یورپ اور مشرق میں انڈیا اور چائنا ——— کے درمیان واقع ہے۔ جنوب میں اس کی وسعت استوائی افریقہ تک پہنچتی ہے اور یہ ایسا علاقہ ہے جسے مستقبل میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہونے والی ہے۔ یورپ، مشرق بعید اور افریقہ کے درمیان کام کرنے والے نظام رسل و رسائل کو ہر حال میں عالم اسلام کا منت کش ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر اسے بہت بڑی غلط فہمی قرار دیتا ہے کہ اسلام کو افریشیائی طاقت سمجھا جائے۔ اور اسے بدھ مت اور ہندومت کے ساتھ ایشیائی تمدنوں کے زیرِ عنوان رکھا جائے۔ اس کی نگاہ میں اسلامی نظام تمدن مشرق بعید کے تمدنوں کے مقابلہ میں دنیائے مغرب کے ساتھ زیادہ اشتراک رکھتا ہے۔ یہ رائے اس لحاظ سے بڑی وقیع ہے کہ جدید یورپ خود بالواسطہ طور پر خود اسلام ہی کی زیر بار احسان ہے اور تمدن حاضر آزادیٔ خیال اور جمہوریت و مساوات کی ان لہروں سے سیراب ہوا ہے جو اسلام نے تاریخ میں اٹھادی تھیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یورپ کے خلاف موجودہ عالمی تصادم میں عالم اسلام کو ایشیا کی ایک سرحدی چوکی قرار دینا بالکل غلط ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک مستقل دنیا ہے

ظہورِ اسلام کے ابتدائی ایک ہزار سالہ دور میں مسلمان اپنے اس وسطی مرتبے کا شعور رکھتے تھے اور انہوں نے جہانی پالیسی کو حسب مراد منضبط رکھنے میں پوری پوری توجہ صرف کی۔ اس دور میں مغرب، چین اور ہندوستان یا تو محض مدافعانہ موقف پر رہے، یا کشمکش سے کنارہ کشی اختیار کئے پڑے رہے۔ اٹھارویں صدی میں حالات کے دھارے نے رُخ بدلا۔ جب سے اب تک اسلام کا گھرانا بیرونی ریاستوں کے پیدا کردہ نزاعات کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔

لیکن اس بین الاقوامی دور میں بڑی سلطنتوں نے بھانپ لیا ہے کہ جہانی طاقت کی کنجی عالم اسلام کے بین المملکتی ماحول ——— خصوصاً مشرق قریب و وسطیٰ ——— کے قبضے میں ہے۔ یہ بین المملکتی طاقت اپنے عروج و تسلط کا دائرہ خلیج فارس، نیل اور سندھ کے وسیع درمیانی خطے میں پھیلا کر پوری قدیم دنیا کے بری علاقوں کو اپنے اشاروں کا پابند بنا سکتی ہے۔ ایک بار اگر طاقت کی یہ شاہ کلید جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مشترک تصرف میں چلی آ رہی ہے، دنیا کی آبادی کے سب سے بڑے بین المملکتی واحدے کے ہاتھ میں چلی گئی تو پھر کسی سے بڑی بحری طاقت کے بس میں نہ رہے گا کہ وہ مختلف براعظموں کے توازنِ قوت کو جوں کا توں قائم رکھ سکے۔ عالم اسلام بحیرۂ روم کے جنوبی اور مشرقی سرے تک اپنا پھیلاؤ رکھتا ہے اور یہاں سے یورپ کے نازک ترین نقاط کو بآسانی زد میں لیا جا سکتا ہے پھر مسلمانانِ عالم انڈیا سے رابطہ رکھنے کے تمام دروازوں پر قابض ہیں ——— نہ صرف درۂ خیبر اور کوہ ہندوکش ان کے قبضے میں ہے بلکہ دریائے سندھ اور دریائے گنگا کے درمیان بھی وہ ایک حاجب آبادی رکھتے ہیں۔ وہ کاکیشیا کے سامنے بھی پاسبان کی حیثیت میں موجود ہیں۔ اور عالم اسلام کے شمال مشرق کو جانے پر وہ کثیر الاستعمال گزرگاہ بھی ان کے زیر اثر ہے جو صحرائے گوبی اور سرلینک پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اسی طرح ارضِ سبز فام کو جانے والا واحد راستہ جو وادیٔ نیل اور سویز کے درمیان سے ہو کر جاتا ہے، بحری طاقت کے اثر سے بالکل آزاد ہے۔ اگر جنوب مشرقی ایشیا کی مسلم آبادیوں کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تو بحرِ ہند کی طرف رُخ کرتے ہوئے عدن، سویز اور آبنائے ملاکا کے بحری راستے ایسے علاقوں سے ہو کے جاتے ہیں جہاں مسلمان آباد ہیں ——— الا آنکہ جنوبی افریقہ یا آسٹریلیا کے لمبے متروک راستوں پر وقت اور مال ضائع کیا جائے۔

عالم اسلام کا یہ بین المملکتی خطہ اوائل ہی سے عالمی تجارت و رابطہ کے لئے ناگزیر واسطہ رہا ہے۔ چین اور ہندوستان سے یورپ کا تجارتی تعلق اسی واسطے سے قائم رہا۔ مسلمان عالمی تجارت کے بری راستوں کے گویا واحد اجارہ دار تھے۔ دنیائے جدید کا نظام تجارت بھی اس صورتِ واقعہ کو نہیں بدل سکا کہ مسلمان یورپ اور مشرقِ بعید کے درمیان... ذریعۂ اتصال ہیں۔ بیچ میں کچھ وقفے کے لئے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ عالم اسلام کا یہ بین الاقوامی مرتبہ ختم ہو رہا ہے جبکہ انڈیا جانے کیلئے جنوبی افریقہ کا بحری راستہ اور مشرقِ بعید کے لئے سائبیریا کا بری راستہ زیرِ استعمال آنا شروع ہوا تھا۔ چنانچہ مسلمان اقوام معاشی طور پر انحطاط کا شکار ہونے لگیں۔ خصوصیت سے اس دور میں عثمان علی جس نے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے کو زیرِ نگیں کر لیا تھا، عالمی تجارت سے بے توجہ رہا۔ چنانچہ یورپ کے تاجروں کو موقع ملا کہ وہ مسلمانوں کی اجارہ دارانہ مداخلت سے بے نیاز ہو کر پاؤں پھیلائیں۔ تقریباً پانچ صدی تک ..... دنیائے اسلام کا بین المملکتی واحدہ پڑا سوتا رہا ——— تا آنکہ نہر سویز وجود میں آئی۔ اس نہر نے نہ صرف یہ کہ مشرق و مغرب کے تجارتی تعلقات کے لئے نئے امکانات پیدا کر دیئے بلکہ اس کے سبب سے

دنیا کے نقشے پر سیاسی و جنگی اہمیت کے نئے نقاط پیدا ہو گئے جو بری اور بحری طاقتوں کے توازن کو متاثر کرنے والے تھے۔

ادھر ہوائی طاقت کے نشو و نما نے دنیائے اسلام کے جمود کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ ہوائی جہازوں کی پرواز کے لئے تجارت اور رسل و رسائل کی قدیم شاہراہوں کا احیاء ناگزیر ہو گیا۔ اب مغرب سے جنوبی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا، ہانگ کانگ یا آسٹریلیا جانے کے لئے ٹرائی پولی، قاہرہ، بیروت، دمشق، طہران اور کراچی کے اسٹیشنوں کا منت کش ہونا ناگزیر ہے اور تمام ہوائی راستے مسلمان ممالک میں سے ہو کر جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرنانڈ تیل کے ان خزانوں کی اہمیت کو پیش نظر رکھتا ہے جو عالم اسلام کے قبضے میں ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے تیل کے ذخائر کا آدھا حصہ مسلمانوں کے پاس ہے اس سے قبل عالم اسلام کے اہم ترین وسطی خطے کے پاس وادی نیل اور ترکستان کی کپاس کے سوا کوئی جنس برآمد موجود نہ تھی جو اس کی اقتصادی قوت کی تعمیر کا وسیلہ ہوتی۔ لیکن اب یہ امکان سامنے آ گیا ہے کہ مسلمان تیل کے سیال سونے کی بنا پر اقتصادی لحاظ سے ایک ہی جست لگا کر دوسری انتہا تک جا پہنچیں۔ بعید نہیں کہ مشرق قریب و وسطیٰ کے متعلق سیاسی و جنگی قوت کے لحاظ سے مغرب کے تمام موجودہ اندازے یکسر بدل جائیں۔ اسلام کا گھرانا دنیا کی اب تک کی دریافت کردہ مادی قوتوں میں سے سب سے زیادہ اہم قوت کے خزانوں کا امانت دار ہے

(باقی)

بقیہ: احسان دانش کے ساتھ چند لمحے۔ از صـ ۲۴

جب وہ کسی جگہ چپراسی اور چوکیدار تھے ———— اللہ اللہ یہ درویش بے گلیم ———— جب ہم ان سے رخصت ہوئے تو میرے دل پر اس بے لوث انسان نے ایسے اثرات چھوڑے تھے کہ مجھ پر رقت طاری تھی ————

احسان دانش سے یہ ملاقات مجھے تمام عمر یاد رہے گی۔

کوثر نیازی

غ

ذرّے میں بھی ہے وسعتِ صحرا کہیں جسے
اُس چشمِ خاص کے لئے بینا کہیں جسے

ہم سرکشوں سے دیکھئے سرزد ہوا تو ہے
وُہ ایک جرم تیری تمنّا کہیں جسے

اے مبتلائے عشرتِ امروز ہوشیار
ہے کھیل دھوپ چھاؤں کا دنیا کہیں جسے

میری نظر میں آپ کے قدموں کی دھول ہے
ظاہر پرست اوجِ ثریا کہیں جسے

کوثر فضائے مکر و ریا میں کوئی تو ہو
ہم پورے اعتماد سے اپنا کہیں جسے

اِفتخار اعظمی

غ

ظُلمتِ ہجر سہی، نور کا پیغام تو ہے
ایک تارا مری پلکوں پہ سرِ شام تو ہے

ابتدائے رہِ جنوں کی نہیں معلوم تو کیا
غمِ آغاز نہیں ہے غمِ انجام تو ہے

ناز ساقی کے اُٹھاؤں میں وُہ مے نوش نہیں
ساغرِ دل میں ابھی بادۂ گلفام تو ہے

وصل کی صبح جو قسمت میں نہیں ہے، نہ سہی
چشمِ خونبار میں رنگین سی اِک شام تو ہے

جامِ جمشید بنائیں گے ترے رند اُسے
اُن کے ہاتھوں میں شکستہ سا ابھی جام تو ہے

نہ سہی تیری محبت میں خوشی، غم تو ملا
حاصلِ عیش نہیں، حاصلِ آلام تو ہے

گرچہ وہ کیفِ محبت ترے رندوں میں نہیں
ساقیا! پھر بھی زبانوں پہ ترا نام تو ہے

آثم میرزا

زندگی، یُوں بھی نکھرتی ہے......!

اس کی چال میں نقاہت تھی جیسے برسوں کا مریض ہو۔ اس کے چہرے کی جھرّیوں میں عجیب ویرانی اور نامرادی کی پرچھائیاں گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے مسلسل فاقوں نے اسے زندگی سے بیزار بنا دیا ہو۔ اس کا پھٹا پرانا لباس ماحول کی بے رحمیوں کی تصویر تھا۔ جیسے مدت سے اسے پانی اور صابن میسّر نہ ہوا ہو۔ حالانکہ نہ تو وہ مریض تھا اور نہ ہی فاقہ زدہ اور تنگ دست تھا۔ یہ بہروپ اس نے صرف بھیک مانگنے کے لئے بنا رکھا تھا اور وہ اس سے بھی زیادہ اپنی ظاہری حالت کو بگاڑنے اور رحم طلب بنانے کی فکر میں لگا رہتا تھا ——— راہگیروں کو واقعی اس کی حالتِ زار پر ترس آجاتا تھا۔ اور اس کی پیسہ جمع کرنے کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ اور دوسرے بھکاریوں سے حسد کا جذبہ بھی تقویت پکڑتا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے سوا شہر میں اور کوئی بھکاری نظر نہ آئے۔ ہر سڑک پر اسی کا قبضہ ہو۔ اور رات کو جب وہ اپنی جھونپڑی کی طرف قدم اٹھائے تو بھیک کی کمائی کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری ہو جایا کرے۔ دوسرے بھکاری شائد ایسا نہ سوچتے ہوں ——— مگر وہ تو اپنے اس خواب کی حسین تعبیر کے حصول کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اب بھی اس کی آمدنی دوسرے بھکاریوں سے زیادہ ہی تھی۔ خاص طور پر جب وہ گلیوں میں اپنی مخصوص دردیلی آواز میں التجائیں کرتا تو بڑی بوڑھیاں رقت آمیز لہجے میں اس کی حالتِ زار کو اپنی باتوں کا موضوع بنا لیتی تھیں۔

”بے چارہ سائیں حستو۔ مدت سے سسک سسک کر جی رہا ہے“ ———

——— ”غریب کا اللہ کے سوا کوئی آسرا نہیں“ ———

”کیسی قابلِ رحم حالت ہے۔ کتنی منتوں کے بعد ماں باپ نے اسے حاصل کیا ہوگا اور اب زندگی ایک عذاب بن گئی ہے“

حستو کو بھی اپنے متعلق ان سب خیالات کا علم تھا۔ اور وہ ان بڑی بوڑھیوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتا تھا۔ ان کا وجود اس کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ان کے پروپیگنڈہ سے اس کی ہوس کو تقویت پہنچتی تھی۔ کمزور دل کی عورتوں کو متاثر کرنے کیلئے یہ پروپیگنڈا بہت سودمند تھا۔ جس محلہ میں بھی وہ نکل جاتا۔ اس کی خستہ حالت بہت جلد لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیتی ——— اس نے شہر کو سات حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہفتہ میں ایک بار ایک حصّہ میں اس کا پھیرا ہوتا تھا۔ اور سات دن کے بعد اس کی دردیلی آواز کسی کے کانوں کو ناگوار نہ گزرتی تھی۔ بلکہ لوگوں کو اس کی یہ عادت بہت بھلی لگتی تھی۔

”بے چارے کو پیسہ جمع کرنے کی ذرا حرص نہیں۔ دوسرے فقیر تو دروازہ اکھاڑ کر لے جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کیسے ڈھٹائی سے جمے رہتے ہیں۔ جیسے کوئی قرض وصول کر رہے ہوں۔ اور ایک یہ غریب ہے کہ صدا لگائی۔ کسی نے کچھ دے دیا تو

لے لیا۔ ورنہ آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔۔"

اپنے متعلق اکثریت کے یہ خیالات اس کے لئے حوصلہ افزا تھے۔ اسے بہت کم ایسا موقع نصیب ہوتا تھا کہ پہلے پھیرے ہی میں اس کا جھولا آٹے سے نہ بھر گیا ہو۔۔۔۔۔۔ ورنہ اس کی تو یہ حالت ہوتی تھی کہ کئی بار اسے معراج دین کریانہ مرچنٹ کے گھر جھولا خالی کرکے جانا پڑتا تھا۔ اور روٹیوں اور سالن کو تو سنبھال نہ سکتا تھا۔ یہ تو محلے کا حال تھا۔ اور بازار میں بھی اس کی ساکھ جمی ہوئی تھی۔ ہر دکان سے پیسہ دو پیسے اسے ضرور مل جاتے تھے۔ اور دوسری آمدنی کی بدولت اس کی پونجی میں اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ سگریٹ مفت پینے کو مل جاتے تھے۔ گڑگڑی کے لئے تمباکو بھی مفت حاصل کر لیتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور روٹیاں تو کئی آدمیوں کے لئے کافی ہوتی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور دوسرے تیسرے دن وہ سوکھی روٹیاں گوالوں کے پاس فروخت کر دیتا تھا۔۔۔۔۔۔ شام کا قرمزی آنچل جب سیاہی میں ڈوب جاتا اور پرندوں کی ٹولیاں دور افق میں گم ہو جاتیں تو وہ ایک فتح مندانہ جذبے کے تحت اپنی جھونپڑی کی طرف قدم بڑھاتا۔ جھونپڑی میں پہنچ کر وہ روٹیاں مٹی کے مٹکے میں ڈال دیتا۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاتا۔ چلم کے لئے آگ بناتا اور گڑگڑی پکڑ کر چارپائی پر نیم دراز ہو جاتا۔ جب اس کی تھکاوٹ دور ہو جاتی تو وہ دن بھر کی کمائی کا حساب کرتا۔ پھر چارپائی کو سرکا کر پائے کے نیچے سے پھٹی پرانی بوری اٹھاتا اور مٹی کھود کر دبی ہوئی لوہے کی پرانی گاگر کے منہ سے زنگ آلود تھالی ہٹا کر سب رقم اس کے پیٹ میں داخل کر دیتا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ہر چیز کو پہلی حالت میں ٹھیک طرح سے جماتا۔ اور سونے کے لئے لیٹ جاتا اور اس کے خوابوں میں دولت کی جھنکار فلمی حسیناؤں کی مانند رقصاں ہو جاتی تھی۔

۔۔۔۔۔۔ آج شہر کے جنوب مشرقی حصے کی باری تھی۔ رحمان پورہ کی آبادی کی اکثریت متوسط طبقہ پر مشتمل تھی۔ چند کرایہ داروں کی اندرونی زندگی اگرچہ کھوکھلے ستون کی مانند تھی پھر بھی وہ ظاہرداری کو نباہ رہے تھے۔ سائیں حستو کے نظریے کے مطابق اس حصے کی آبادی کی اکثریت رحم دل اور لکیر کی فقیر تھی۔ اور اس کی قدر و منزلت یہاں دوسرے حلقوں سے زیادہ ہی تھی۔ بعض عورتیں تو اس کی آواز کی منتظر رہتی تھیں۔ اس نے جونہی صدا لگائی وہ بچوں کو گود میں اٹھائے دم کرانے کی خاطر دہلیز وں میں آکھڑی ہوئیں۔۔۔۔۔۔ یونہی منہ میں بڑبڑا کر وہ پھونک مارتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور عورتوں کی آنکھیں عقیدت مندانہ تبسم سے چمک اٹھتی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ان کی سادہ لوحی اور اپنی چالاکی پر مسکرا اٹھتا۔ اس کے متعلق ان عورتوں میں جو ایک حسن ظن پیدا ہو گیا تھا اس کی بنیادیں کمزور کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ وہ اپنی آمدنی کے ذرائع محدود کرنے پر کسی صورت میں بھی تیار نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا۔ پھونک مارنے سے اس کا کیا بگڑ جاتا ہے۔ یہ تو دوکانداری ہے۔ جتنی زیادہ تڑک بھڑک ہوگی اتنے ہی زیادہ گاہک پھنسیں گے۔ یہاں کے بچے بھی اسے تنگ نہ کرتے تھے۔ اس کے پیچھے تالیاں نہ پیٹتے تھے بلکہ اس کی آمد پر کھیل چھوڑ کر اس کے لئے آٹا لانے کی خاطر گھروں میں گھس جاتے تھے۔ غنی بڑھئی کی چھوٹی لڑکی ہاجرہ تو جب تک وہ محلے سے باہر نہ نکل جاتا اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اور اسے بھی اس حلقہ میں پہنچ کر قدرتی طور پر ہاجرہ سے ایک لگاؤ سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بڑے لاڈ پیار سے پچکار کر وہ اسے واپس لوٹاتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ہاجرہ اس کی اتنی گرویدہ کیوں ہے

سات دن کے بعد رحمان پورہ کی طرف بڑھتے ہوئے اُسے ایک دم ہاجرا کا خیال آجاتا تھا۔ ہاجرا کے ساتھ اس کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے چڑیا گھر کا کوئی جانور کسی تماشائی سے مانوس ہو گیا ہو ——— اور چھٹی کے دن وہ اس جانور کی فراست کو پرکھنے چڑیا گھر پہنچ جاتا ہو ———

رحمان پورہ کی آبادی قریب آرہی تھی اور سائیں حسو خیرات کی بہتات کے تصور سے خوش ہو رہا تھا۔ صدا لگاتے اور خیرات لیتے ہوئے وہ مسجد کے سامنے میدان میں آگیا۔ مختلف کھیلوں میں مشغول بچے گھروں کی طرف بھاگے۔ مسجد کے دائیں طرف تین مکان چھوڑ کر غنی بڑھئی کا مکان تھا۔ دروازہ پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردہ میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ سائیں حسو ٹکٹکی باندھے دروازہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ہاجرہ کو باہر نکلتے نہ دیکھ کر اسے یونہی ایک الجھن سی محسوس ہوئی۔ بچے تھالیاں پکڑے اس کی طرف آرہے تھے۔ اور وہ آٹا جھولے میں ڈالتے ہوئے بھی غنی کے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے ایک لڑکے سے پوچھ ہی لیا :

"ہاجرہ بیٹی نظر نہیں آئی ؟ کیا انہوں نے مکان چھوڑ دیا ہے ؟"

لڑکے نے جواب دیا "وہ بیمار ہے۔ گھر سے باہر نہیں آسکتی"

"بیمار ہے !" سائیں حسو کے دل میں ایک پھانس سی چبھی اور چند منٹ پہلے کی تمام خوشیاں خزاں زدہ پتوں کی مانند کانپنے لگیں۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہ دروازہ پر آگیا پردہ ہٹانے کیلئے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ درد میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"آپ دو ماہ سے بیمار پڑے ہوئے ہیں۔ جو کچھ بچا رکھا تھا، دوا دارو پر خرچ ہو چکا ہے ——— ہاجرا کی دوائی کے لئے ایک پائی تک باقی نہیں بچی ——— مکان کا مالک الگ کرایہ کا تقاضا کر رہا ہے ——— اب کیا ہو گا !"

مرد کی نحیف آواز بلند ہوئی۔ "نا اُمید مت ہو زُہرہ۔ کم ہمتی انسان کو موت کے اندھیروں کے سپرد کر دیتی ہے، اور جواں ہمتی سے ہر کانٹا پھول بن جاتا ہے"۔

زہرہ غم ناک لہجے میں بولی "آپ کی مسلسل بیماری نے پہلے ہی مجھے بدحواس بنا رکھا تھا۔ اب معصوم بچی بھی بخار میں پھنکی جا رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ! کہاں جاؤں۔ اب تو بھیک مانگنے کی نوبت آگئی ہے ———"

"بھیک ! کیا کہہ رہی ہو زہرہ ——— کیا تم پسند کرو گی کہ ہم ... بزدل ... ناکارہ ... اور بے شرم بن کر۔ زندگی کو بہاروں کی گود سے چھین کر خزاں کا کفن پہنا دوں ! موت سے پہلے یہ نوبت نہیں آسکتی۔ حضورؐ نے تو انسانیت کو اس توہین سے بچانے کی خاطر ہمیں حرکت، روشنی اور عمل کا پیغام دیا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو اعلیٰ مقام سے گرانا چاہتی ہو ———"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر مرد کی پرعزم آواز سنائی دی :

"باعزت زندگی گزارنے کے لئے ابھی ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ پیتل کے چند برتن جو بچے ہیں انہیں بیچ کر کل صبح تم بُھنے ہوئے

چنے، میٹھی گولیاں اور بسکٹ خرید لانا۔ میں دروازہ کے سامنے خوانچہ لگا کر بیٹھوں گا" ——

سائیں حستو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے دماغ میں مڑے منہ والی میخ گاڑ رہا ہو۔ ایک اذیت ناک درد اس کے رو ئیں روئیں میں سرایت کر گیا گلے میں لٹکا ہوا جھولا اسے منوں بھاری محسوس ہونے لگا ...... دروازہ سے ہٹ کر وہ بازار کی طرف تھکے تھکے قدم اٹھانے لگا۔ اس نے بھکاریوں کے متعلق اس سے پہلے بھی بہت سی جلی کٹی باتیں سنی تھیں۔ گالیاں اور طعنے سن کر بھی وہ اپنی ڈگر سے پیچھے نہ ہٹا تھا۔ اور اب ماجرہ کے باپ نے جس حقیقت سے روشناس کرایا تھا وہ بہت بھیانک اور کرب ناک تھی۔ اس نے اس کے ہر گوشے کو جھنجھوڑ دیا تھا ——

خلافِ معمول وہ بہت پہلے ہی اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا۔ اس نے نہ تو چلم کے لئے آگ سلگائی۔ اور نہ ہی کھانے کیلئے روٹی نکالی۔ جھولا ایک طرف پھینک کر وہ چارپائی پر گر پڑا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ جیسے اس کے سینے میں الاؤ دہک رہا ہو۔

—— "یہ سب کچھ میں کس کے لئے جمع کر رہا ہوں؟" وہ اپنے آپ پر اپریشن کرنے لگا۔ "حرص نے مجھے حیوانوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ میں کہاں ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جانا ہے؟" —— اور یک دم اس کی نظروں میں بابا مہر کا چہرہ ابھر آیا —— وہ بھی اسی کی مانند حرص کا غلام تھا۔ آمدنی بڑھانے کی خاطر نت نئے سوانگ رچاتا رہتا تھا۔ وہ بھی اکیلا تھا۔ مگر دن بھر یوں التجائیں کیا کرتا تھا جیسے ایک بہت بڑے کنبے کی روٹی کا مسئلہ سلجھا رہا ہو... چند دن ہوئے وہ ایک ٹرک کی زد میں آ کر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ مرتے وقت اس کی زبان پر اپنے دفینے ہی کا ذکر تھا۔ اور ہاتھ یوں پھیلا رکھے تھے جیسے اب بھی وہ بھیک مانگنے سے باز نہ رہ سکا ہو۔ سائیں حستو کو جب اس کی موت کی خبر ملی تو... افسوس کا اظہار کرنے کے بعد اچانک اسے بابا مہر کی جھونپڑی کا خیال آ گیا اور اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یقین تھا کہ بابا مہر نے بھی اسی کی طرح جھونپڑی ہی میں اپنی دولت دبا رکھی ہو گی۔ لالچ نے اسے موت کے روح فرسا تصور سے بے نیاز بنا دیا۔ جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو رسا پکڑ کر مسرورانہ انداز میں بابا مہر کی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اسے اندر روشنی کی لکیریں نظر آئیں۔ اور وہ دھک سا رہ گیا

"اندر کون ہو سکتا ہے؟ اس کا تو کوئی والی وارث نہ تھا!"

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دبے دبے قدم اٹھاتا دروازے پر پہنچ گیا۔ بڑی سی جھری میں سے اس نے اندر جھانکا۔ اور اس کی آنکھوں میں دھندلکے پھیل گئے۔ حمیدا چرسی، علیا مراثی اور دو دوسرے بدمعاش اندر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے زمین کھود کر بابا مہر کی ساری پونجی باہر نکال لی تھی اور وہ اب حصہ بانٹ رہے تھے —— سائیں حستو نے بڑی مشکل سے اپنی شکست کے احساس پر قابو پایا اور بے دلی سے واپس قدم اٹھانے لگا

—— اور اب اپنے متعلق سوچتے ہوئے بابا مہر کا انجام اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا ——

"کیا میرا بھی یہی حشر ہو گا؟ میری پونجی بھی غنڈوں کے کام آئے گی؟" اس کا ذہن چکرانے لگا

"کتنا غیرت مند ہے باجرہ کا باپ ۔ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی انسانی وقار کی شکست برداشت نہیں کر سکتا اور میں تندرست ہوتے ہوئے بھی ذلّت آمیز زندگی بسر کر رہا ہوں "

—— اضطراری حالت میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے باجرہ اس کے گھٹنوں سے لگی سسکیاں بھر رہی ہو —— وہ رمبا پکڑ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین کھودنے لگا —— زنگ آلود گاگر نکال کر اس نے اپنی میلی چادر پر الٹ دی ۔ ریزگاری کا ڈھیر لگ گیا ——

—— جب وہ ساری دولت اٹھائے غنی کے مکان کی طرف بڑھنے لگا تو وہ یوں ایک تازگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا —— جیسے اس نے زندگی کو خزاں کے مدفن سے نکال کر بہاروں کی گود میں رکھ دیا ہو ۔

بقیہ : حجاب و نقاب از صفحہ ۳۰

دیتا ہے ۔ لذتِ سعی ، طلب و شوق اور جستجو کے جذبے سے تڑپ کر اٹھ بیٹھتا ہے اور حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے مگر ؟ ؎

قبلۂ مقصد نگاہِ نیاز   پھر وہی پردہ عماری ہے

یہ سرمستِ ازلی حسنِ حقیقی کی بس ایک جھلک دیکھ لینے کے لئے بے تاب ہے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ کہ اٹھائے نہ بنے

اور اضطراب میں منہ پر لاکھ لاکھ سخن لا کر دعوتِ نظارہ یہ اظہار تا ہے ؎

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

پھر عشق کی سمجھ میں آتا ہے کہ ان آنکھوں میں اس حسن جہاں سوز کی تابِ نظارہ کہاں ۔ وہ حسن تو کل کائنات پر محیط ہے ۔ اس جہانِ رنگ و بو میں ہر شے پر حسنِ حقیقی پرتو فگن ہے ۔ یہاں چشمِ ظاہر بیں کام نہ دے گی ۔ دیدۂ دل کو وا کر پھر سمجھ میں آئے گا کہ یہ سبزہ و گل ، یہ پری چہرہ لوگ ، یہ رعنائی و رنگینی ، یہ ہواؤں کی سرمستیاں اور یہ جوشِ بہار رنگ و بو اس حسن کے جلوہ کی نقاب ہی تو ہے ؎

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

استفسارات

ادب میں مقصدیت اور اسلام

(ادارہ)

مکرمی و محترمی! السلام علیکم۔ میں کالج کا ایک اسلام پسند طالبعلم ہوں۔ تحریک اسلامی کے ساتھ میرا گہرا تعلق ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگلہ ادب کو ہندوئیت سے پاک و صاف کر کے صحیح اسلامی رنگ دینا اشد ضروری ہے اور یہ کام کئے بغیر یہاں اسلامی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں خود بھی اس خدمت میں حصہ لینا چاہتا ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف رغبت دلاتا ہوں۔ اور جماعت اسلامی کے مختلف رسالے اور دیگر ادبی کتابیں خصوصاً چراغ راہ کی مطبوعات کو زیر مطالعہ رکھتا ہوں۔ یہاں کی ادبی مجالس میں شرکت کر کے اسلامی ادب کا تذکرہ کرتا ہوں۔ مگر یہاں کے لوگوں کے نزدیک یہ بات بالکل نئی ہے کہ اسلامی ادب بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ بھلا اسلام ایک مذہب ہے اسے ادب سے کیا دلچسپی؟

کم علمی کی وجہ سے میں لوگوں کو سمجھا نہیں سکتا ہوں کہ ادب کا کیا مقصد ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ ادب کا موجودہ تصور اور مقصد غلط ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیوں اور کن کن پہلوؤں سے غلط ہے۔ پھر ادب مقصدی ہونا چاہیئے یا نہیں۔ ہونا چاہیئے تو کیوں؟ کیا ادب کو حصول مقصد کے لئے پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنانا صحیح ہے یا نہیں۔ پھر اسلامی ادب کسے کہتے ہیں، اس کی نوعیت اور مقصد کیا ہے، اس کی تخلیق کہاں سے کس طرح کی جا سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ اس خاص موضوع پر روشنی ڈالیں اور مجھے مواد کا پتہ بتا دیں تو میں یہاں کے مخالفِ اسلام ادب کے حامی کمیونسٹ طلبہ کو دندان شکن جواب بھی دے سکتا ہوں اور دوسرے طلبہ کو جو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اسلامی ادب کی طرف بلا سکتا اور ان کے سوالات کے جوابات دے سکتا ہوں۔ اس طرح ان کو اسلام کی طرف لا سکتا ہوں توقع ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے والسلام۔

منتظر جواب۔ سید محمد علی ڈھاکہ۔

آپ کا جذبہ ہمیں بہت سی امیدیں دلاتا ہے۔ بنگلہ کو ہندوانہ کلچر اور خرافیات اور سنسکرت کی گہری پرچھائیں سے نجات دلانے کے لئے ایک جہاد کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے ہماری آدھی قوم کی زبان اسلام کے تحریکی اور ثقافتی پیغام کو اٹھانے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں آپ کی زبان آپ کے دل سے تعاون نہ کر سکے گی۔ دل و زبان کا یہ فاصلہ زندگی کو ہمیشہ فساد کا شکار رکھے گا۔

جی ہاں! یہ تصور کہ "اسلام ایک مذہب ہے" نہ جانے کتنی بے شمار لاینحل الجھنوں کا موجب بنا چلا آرہا ہے

جب تک اسلام کو ایک تحریک اور ایک نظام کی حیثیت سے نہیں جانا جاتا "اسلامی ادب" کی اصطلاح کو بھی سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں ہے کسی تحریک اور نظام زندگی کی نوعیت ایک جوئے رواں کی سی ہے اور مذہب ایک جوہڑ یا تالاب کے کھڑے پانی کی مانند ہے۔ بدقسمتی سے تحریک اسلامی کو بھی ہماری دس بارہ صدیوں کی تاریخ نے ایک مذہبی جوہڑ میں بدل دیا ہے۔ آپ اگر اب اس کے بند میں شگاف کر کے اسے دوبارہ بہاؤ میں لانے کی تدبیریں کر بھی رہے ہیں تو بھی جوہڑ میں رہتے رہتے ذہنوں میں جو تصور بیٹھ گیا ہے اسے اتنا جلد دُور نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک سے بیگانہ لوگ تو خیر دُور رہے، اسے اپنا لینے والے دل و دماغ بھی تاریخ کے اثرات سے آزاد ہونے میں بڑی مدت لگاتے ہیں۔ وہ اس جوئے رواں میں پیرتے ہوئے بھی بار بار کھڑے پانی کے مسائل کو لے بیٹھتے ہیں۔

تحریک وہ اصولی و نظریاتی طاقت ہوتی ہے جو اجتماعی نظام کو چیلنج کرتی ہے۔ بخلاف اس کے مذہب فرد کو اجتماعی نظام سے بالکل الگ کر کے لیتا ہے اور تمدنی ماحول کو اپنا موضوعِ فکر اور میدانِ عمل بنائے بغیر فرد کو تقوٰی سے آراستہ کرنے میں مگن رہتا ہے اور فاسد سے فاسد نظام کے تحت وہ بزعمِ خویش اسے کامل بنا سکتا ہے اس کے نقطۂ نظر سے نیکی کے بلند ترین مراتب اور بدی کے غلیظ ترین گڑھے بس فرد کی انفرادی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ مذہب فرد کو تمدنی ہنگاموں سے دُور اپنی خانقاہِ تزکیہ میں لے بیٹھتا ہے اور دنیوی زندگی کو سجانے سنوارنے کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر بالا بالا مُکتی اور نروان کے مرحلے طے کرانا چاہتا ہے۔ اور وہ اس کشمکش سے فرار اختیار کرتا ہے جو غلط تمدنی نظام کے ساتھ کرنی پڑتی ہے، لہٰذا مذہب کے پرسکون اور خواب آور ماحول میں نہ نظریات کے معرکے ہوتے ہیں، نہ اقدار کا ٹکراؤ پیش آتا ہے، نہ جذبات میں تند و تیز لہریں اٹھتی ہیں، نہ ایک نوعیت کے کرداروں کے بالمقابل دوسرے طرز کے کردار آتے ہیں۔ اس لئے مذہب کے دائرے میں ادب کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ مذہب فرد کی زندگی میں تو جھوٹ اور ظلم کی چھوٹی سے چھوٹی اشکال کو اپنی مکاشفاتی باریک بینی سے چھانٹتا ہے اور ان کو ختم کر دینے کے لئے پورا زور لگاتا ہے لیکن وہ بڑا ظلم اور وہ بڑا جھوٹ اور وہ مہاپاپ جو کسی فاسد نظام تمدن کی صورت میں اس کے سامنے جاری رہتا ہے اور ہزارہا افراد کی زندگیوں کا ہر آن ستیاناس کر رہا ہوتا ہے، اس کے لئے کبھی درخورِ اعتنا نہیں ہوتا۔ وہ فرد کی ذرا سی لغزش پر مضطرب ہو جاتا ہے مگر ظالم طبقوں، فاسد تنظیموں اور باطل قیادتوں کے ہاتھوں ایمان و اخلاق کی جو تباہی مچتی ہے اس کو دیکھ کر بے چینی کی خفیف سی لہر بھی اس کے اعصاب پر سے نہیں گزرتی۔ وہ سیاست سے ——— یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی زندگی کی واقعاتی تاریخ کے مدوجزر سے بالکل بچ بچا کے رہتا ہے۔ وہ اس عالم حوادث کی طرف متوجہ ہونے میں اپنے لئے آلودگیوں کے شدید خطرات نمایاں دیکھتا ہے۔ وہ اپنے تیار کردہ افراد کو اس رزمگاہِ خیر و شر سے بچا کے رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے تصور کی رُو سے وہ اِدھر آئے نہیں کہ ان کے اخلاقی گھروندے ویران نہیں ہوئے۔

ان احوال و کوائف کے ساتھ، ظاہر ہے کہ مذہب کو ضرورت "ادب" کی نہیں "وعظ" کی ہوتی ہے۔ ادب تو پیدا ہی ہوتا ہے فکری و جذباتی کشمکش سے! ——— کشمکش میں بڑھئے تو نتیجہ ہوگا، زندگی افروز تحریکی ادب، اور مار کھا کر پسپا ہو جئے تو حاصل ہوگا کسی نہ کسی نوعیت کا فراری ادب! لیکن سرے سے رزمگاہ کو چھوڑ جائیے تو ادب کی موت ہے۔

مذہب کے خلاف تحریک ـــــــ خصوصاً اسلامی تحریک ـــــــ اصلاً جس غرض سے اٹھتی ہے وہ نظام تمدن کو بدلنا اور اپنے ڈھب پر لانا ہے۔ تحریک اس بڑے پیمانے کے جھوٹ اور ظلم اور اس وسیع اثرات رکھنے والی بدی کو ختم کرنا چاہتی ہے جو کسی معاشرے کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی ادارات کے بل بوتے پہ کارفرما ہو۔ لہٰذا وہ زندگی سے دور بھاگ کر کوئی خانقاہ نہیں بناتی، بلکہ واقعاتی تاریخ کی رزمگاہ میں اُتر کر پنجہ آزمائی کرتی ہے۔ وہ افراد کو ایک نظریے، ایک ذہنی حرکت، ایک جذباتی ولولے اور ایک اساسی اخلاقی حس کے اسلحہ سے آراستہ کر کر کے میدان میں اتارتی چلی جاتی ہے۔ یہی حالت کش مکش خیالات حسیات اور جذبات میں سبب ہلچل مچاتی ہے تو ادب پیدا ہوتا ہے۔

پس ادبی کام کو آگے بڑھانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری کام یہی ہے کہ ہم لوگ اپنے کو موجودہ مذہبیت کے قفس سے نکال کر تحریکی شعور کی کھلی فضا میں لائیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مخاطب حلقوں پر بار بار پوری صراحت کے ساتھ اور دلائل کے زور سے واضح کر دیں کہ اسلام ایک اجتماعی تحریک ہے اور ہم لوگ اسے مذہب کی حیثیت سے نہیں بلکہ نظام حیات کی حیثیت سے لے کے چل رہے ہیں۔ یہ تحریکی شعور جتنا جتنا ہمارے اندر راسخ ہوگا اور جتنا جتنا ہم اسے دوسروں کے سینوں میں اتار سکیں گے اتنا ہی اتنا ہماری ادبی شاہراہ ہم پر بھی واضح ہوتی جائے گی اور دوسروں کی نگاہوں میں بھی اس کا تعارف بڑھتا جائے گا۔

آپ نے جو متعدد سوالات اپنے خط میں جمع کر دیئے ہیں ان کا جواب حاصل کرنے کے لئے آپ کو محنت سے وہ تمام چیزیں جمع کر کے پڑھنی چاہئیں جو انہی مسائل کے متعلق پچھلے دس برس میں لکھی جا چکی ہیں۔ خود میرے قلم سے متعدد مقالے نوٹ سوالات کے جوابات چراغ راہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ فائل حاصل کر کے انہیں دیکھئے۔ میرا ایک مقالہ ترجمان کے سالنامہ ۵۲ء میں، ایک مقالہ "تعمیر انسانیت" میں پچھلے سال شائع ہو چکا ہے، ان کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ پھر ان میں جو چیزیں کارآمد معلوم ہوں ان کا ترجمہ بنگلا میں ہونا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ "اسلامی مکتب ادب" کے شعر و افسانہ کے جو معیاری نمونے اب تک نمودار ہو سکے ہیں ان میں سے ایسی چیزیں چھانٹیئے جو ہمارے نظریہ ادب کی پوری طرح ترجمان ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ اسلامی ادب سے مراد کیا ہے۔ ایسی خاص خاص چیزوں کو بنگلہ میں لائیے، ان کے ساتھ تعارفی، توضیحی اور تنقیدی نوٹ لکھوائیے۔ پھر ایسی منتخب چیزوں کا ایک اچھا مجموعہ اشاعت میں لے آئیے۔

ادب میں مقصدیت کے موضوع پر بات چھڑیں تو ایک کلیہ ہمیں سامنے رکھنا ہوگا کہ انسانی زندگی میں بالکل کسی بے مقصد چیز کا وجود ناقابل تصور ہے۔ مقاصد بلند و پست اور نیک و بد ہو سکتے ہیں۔ لیکن بے مقصدی تو اپلے تھاپنے میں بھی نہیں پائی جاتی، کجا کہ شعر و افسانہ کی نگارش کو بالائے مقصد قرار دیا جا سکے۔ اگر کسی ادب کا حاصل محض تفریح ہو تو اس صورت میں بھی مقصد ثابت ہے، خواہ اسے کوئی صحیح قرار دے یا غلط۔

یہ ظاہر ہے کہ ادب انسانیت یا زندگی کے اندرون کا ایک ایسا اظہار ہے جس میں جو فطری رد عمل ہے خارج کے بے شمار فکری و جذباتی عوامل ـــــــ اور جس کے اندر تخلیقی خیال روح بن کر جلوہ گر ہوتا ہے اور جسے ذوق جمال ایک

پیرایہ عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اظہار کا صحیح مقصود اور صحیح نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ تخلیق غیال مدنیت کو مسخر کرے اور جمالیت زندگی کو سنوارنے، اُسے حسن و خوبی سے مالا مال کرنے اور اس میں رنگِ مسرت کو بڑھانے میں مدد دے۔ ان دونوں باتوں کو جمع کر کے ایک ہی جملہ میں لے آئیں تو کہیں گے کہ ادب زندگی کے ارتقاء کا معاون ہے، یا اسے ایسا ہونا چاہیئے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ خارج کا ردِ عملی اظہار ہمارے اندرون سے ہمیشہ اس شعور کے مطابق ہوتا ہے جو ہم اپنے بارے میں، کائنات کے بارے میں اور خود زندگی کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہ شعور اگر باطل یا فاسد ہوتا ہے تو ہمارا تخلیقی اظہار بھی باطل اور فاسد ہوتا ہے۔ اگر یہ شعور درست ہو تو ہمارا اظہار بھی صحت مندانہ ہوتا ہے۔ ہم ادب میں خیال و جذبہ کی جن لہروں کو منعکس کرتے ہیں وہ آخر کار دو حصوں میں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ایک سفید لہریں ہیں دوسری سیاہ: ایک ہمارے اندرونی کرب کی ترجمان ہوتی ہیں، دوسری طمانیت کی! ایک یہ بتاتی ہیں کہ زندگی میں کیا ایسا ہے جو نہ ہونا چاہیئے، دوسری یہ بتاتی ہیں کہ زندگی میں کیا ایسا نہیں ہے جس کی ضرورت ہے۔ انہی دو گونہ لہروں کے ذریعے درحقیقت ادب زندگی کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اب اگر ادب کی تخلیق کرنے والے ذہن میں حقیقت اور زندگی کا صحیح شعور موجود ہے تو یہ دو گونہ لہریں مطابقِ حقیقت اٹھیں گی اور زندگی کو ارتقاء کی سمت سفرِ صحت کے ساتھ بتائیں گی۔ صحیح شعور موجود نہیں ہے تو یہ خود بخود باطل ہو جائیں گی۔ اور باہم دگر گڈمڈ ہو کر ایسے بھنور پیدا کر دیں گی جن میں زندگی کی کشتی بُری طرح گھر جائے گی۔

حقیقت اور زندگی کا صحیح ترین شعور وہ ہے جو اسلام دیتا ہے۔ وہ ہمیں خدا کے سامنے عبدیت کے مقام پر رکھتا ہے، انسانوں کے ساتھ مساوات و اخوت کے رشتے سے مربوط کرتا ہے اور مادہ پر چند اٹل اخلاقی حدود کے اندر نیابتی حکمرانی کا حق دیتا ہے۔ اسلام کے دیئے ہوئے اس مقام کو قبول کرنے سے جو شعور پیدا ہوتا ہے وہ ہمارے سرچشمہ تخلیق کے بہاؤ کے لئے ذوقِ جمال کی ایک خاص حد دگا بنا تا ہے۔ اس اسلامی شعور کے ساتھ جب ہم زندگی کے ہنگامے میں شریک ہوتے ہیں تو ہمارے اندرون کا ردِ عملی اظہار دوسروں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ یہی مختلف طرزِ اظہار ہمارے ادب کو جو خاص معنوی رنگ دیتا ہے اس کی وجہ سے ہم اسے اسلامی ادب کہتے ہیں۔

پروپیگنڈہ اور ادب میں بڑا بھاری فرق ہے۔ پروپیگنڈہ وہ اظہار ہے جو خالص سیاسی دائرے میں کش مکش کرنے والی پارٹیوں اور قیادتوں کی حمایت و مخالفت میں کیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے ادب زندگی کا وہ تخلیقی اظہار ہے جو بحیثیت مجموعی پوری زندگی کی ہماہمیوں میں گھر کر پارٹیوں اور قیادتوں اور افراد سے بالاتر ہو کر حقیقت کے جامع شعور کے ساتھ ایک فطری عمل کے طور پر واقع ہوتا رہتا ہے۔ نظریۂ اسلامی اور تحریکِ اسلامی کی وسیع تہذیبی کش مکش کے زیرِ اثر جو تخلیقی اظہار ہو رہا ہے وہ تو ادب کی تعریف میں آتا ہے اور جماعتِ اسلامی یا کسی دوسری پارٹی کی خالص سیاسی انتخابی جد و جہد کے زیرِ اثر وقتاً فوقتاً جو نگارشات نمودار ہوتی رہتی ہیں وہ ادبی پروپیگنڈہ کی تعریف میں داخل ہیں۔ دونوں ہی طرح کے اظہار ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ان باتوں کا کچھ نہ کچھ حصہ آپ کے لئے مفید رہے گا۔

ذکاء الرحمن

احسان دانش کے ساتھ چند لمحے

(ایک دلچسپ گفتگو)

اف کتنی اداس شام تھی وہ ــــــــ

اور شامیں تو ہمیشہ اداس ہی ہوتی ہیں۔ جب سورج کی ہر طرف پھیلی ہوئی نرم و نازک اور اجلی کرنیں، جھٹپٹوں میں تحلیل ہو جاتی ہیں تو ساری فضا مغموم ہو جاتی ہے۔ ہر چیز سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر ذرے کا دل غیر محسوس گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس ہوتا ہے ــــ اور پھر یہ اداسی اپنے بازو پھیلاتی ہے حتیٰ کہ کائنات کا ہر شخص اس اداسی کے ناقابلِ تسخیر قلعے میں محصور ہو جاتا ہے ــــ اسی لئے میں شاموں سے ہمیشہ دور بھاگتا ہوں ــــ مجھے نور و تاریکی کی یہ درمیانی کیفیت قطعاً پسند نہیں۔ اس وقت میرا دل بری طرح دھڑکنے لگتا ہے ــــ آپ اسے نفسیاتی اثر کہہ لیجئے یا کچھ اور لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری زندگی میں جتنے المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں وہ سب شام کے وقت ہوئے ہیں ــــ

خیر تو لاہور کی اس اداس شام کو میری یہی ذہنی کیفیت تھی ــــ بلکہ اس شام تو بری عجیب حالت تھی ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی نبضیں ڈوب رہی ہیں ــــ میں اس کیفیت سے گھبرا کر، اپنے ایک عزیز دوست یوسف اختر کے ہاں پہنچا۔ پھر ہم دونوں مل کر ایک اور دوست ظہیر علیم صدیقی کے گھر گئے۔ اسے بڑی مشکل سے ساتھ چلنے پر رضامند کیا، اور تھوڑی دیر بعد ہم انارکلی کے رنگین بازار میں سرگشت کر رہے تھے۔ وہاں ہم نے پروگرام بنایا کہ قلعہ دیکھا جائے ــــ محمد وارث کامل صاحب ہفت روزہ "چٹان" کے لئے مضمون کا کئی بار تقاضا کر چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ لاہور کے قلعے پر ہی مفصل مضمون لکھ کر وارث صاحب کے حوالے کر دوں گا۔ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی میرے قدم اور تیزی سے لاہوری گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم ایک روڈ عبور کر ہی رہے تھے کہ یکایک قطب الدین ایبکؒ کا خیال آیا۔ اور میں اس کی تربت پر فاتحہ پڑھنے کے لئے اس طرف مڑ گیا۔ میرے دونوں دوست اس لاابالی پن پر کچھ جھنجلائے لیکن میری طبیعت سے واقف تھے لہٰذا خاموش ہو رہے ــــ قطب الدین ایبکؒ کی تربت اس حالت میں ہے کہ دیکھ کر کم از کم میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک دھار بہہ نکلی اور منہ سے بے اختیار نکلا "اے اللہ! صرف تیری عظمت کو دوام ہے" ــــ کیا خوب کہا ہے بہادر شاہ ظفر نے کہ ؎

نہ گورِ سکندر ہے نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو کر میں نے پھر قلعے کی طرف اپنے قدم بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن میرے دوستوں نے اب قلعہ دیکھنے کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ ہم لوگ رتن چند سرائے کی طرف مڑ گئے تاکہ وہاں سے بس میں بیٹھ کر اپنے گھر ماڈل ٹاؤن پہنچ سکیں ابھی ہم رستے میں ہی تھے کہ میری جو نگاہ اٹھی تو ایک فرسودہ سے بورڈ سے ٹکرا کر رہ گئی۔ بورڈ پر جلی الفاظ میں مرقوم تھا "مکتبۂ دانش"

——— یہ پڑھتے ہی میرے ذہن میں احسان دانش کا نام گھومنے لگا ——— ہند و پاک کا ایک نڈر، شعلہ نوا اور درویش شاعر ——— جس کی للکار سے بارہا اقتدار کے ایوانوں میں سختئ قانون کا دل ڈوب گیا ——— یکایک مجھے Strike ہوا کہ میں نے ماہنامہ چراغِ راہ میں اچھے "مقرے" لکھنے والے اہم ادیبوں سے ملاقات کر کے، ان کے ذہنی پس منظر کو واضح کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے میں مکتبۂ دانش میں گھس گیا۔ میرے دوستوں کو بھی مجبوراً میرے پیچھے آنا پڑا ———

جب ہم مکتبہ دانش میں گھسے تو ایک ناٹے قد کا، بھرے بھرے جسم والا، کالا کلوٹا سا شخص، دکان کے پچھلے حصہ میں چائے بنانے میں مصروف تھا۔ اور اس کی دو آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہم اجنبیوں کو دیکھ کر، وہ چائے کی پیالی دائیں ہاتھ میں پکڑے اور اس میں چمچی ہلاتے ہوئے، ہمارے قریب آیا، اور ہمارے چہروں پر اپنی نظریں گاڑ دیں ——— میں کچھ گھبرا سا گیا۔

"میں احسان دانش صاحب سے ملنا چاہتا ہوں" ——— میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا "جی فرمائیے، مجھی کو احسان دانش کہتے ہیں" ———

یہ سن کر میرے ہوش و حواس ایک لمحہ کے لئے غائب ہو گئے کہ احسان دانش اور اس حالت میں۔ پھٹا ہوا کوٹ، کالر سے عاری قمیص، فرسودہ سی ٹوپی اور ملگجا سا پاجامہ ——— میں خود پر قابو پا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ احسان صاحب کے ہونٹوں کو پھر جنبش ہوئی۔ "کہیئے کیسے آنا ہوا۔ چائے پئیں گے آپ؟" ———

"جی نہیں شکریہ ——— میں تو ایک تکلیف دینے حاضر ہوا تھا ——— اگر اجازت ہو تو عرض کر دوں"؟ ——— میں نے سراپا نیاز بنتے ہوئے کہا۔

"فرمائیے" ——— احسان صاحب نے چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ذرا سنبھل کر کہا "جی وہ خاکسار نے .... ماہنامہ چراغِ راہ میں اہم ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو لینے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" ———

چراغِ راہ کا نام سن کر گویا ان کے چہرے پر گلاب کھل گئے۔ "اچھا اچھا! آپ چراغِ راہ کے لئے میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں ——— بھئی میں ضرور دوں گا اس کے لئے اپنا انٹرویو ——— بڑا سنجیدہ اور باوقار پرچہ ہے چراغِ راہ بھی۔ اور اس کے مدیرِ محترم بھی بڑے ذہین آدمی ہیں ——— لیکن ...." اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "لیکن کیا"؟ میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"لیکن یہ" احسان صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا "کہ نعیم صدیقی صاحب کو چاہیئے کہ وہ زیادہ پھیلنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ زیادہ پھیلنے سے دریا پایاب ہو جاتا ہے اور اس میں گہرائی نہیں رہتی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے دریافت کیا۔

احسان صاحب نے ہمیں تشریف رکھنے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: "دیکھئے نا آپ کہ نعیم صاحب سب کچھ لکھتے ہیں۔ افسانہ، ڈرامہ، نظم، غزل، مضمون، طنز، مزاح، تنقید غرضیکہ ادب کی کونسی صنف ہے جو اُن سے چھوٹی ہے ——— لیکن اگر وہ ایک چیز لکھیں تو ان کی تحریر میں اقبال ایسی شگفتگی، غالب ایسی پختگی، مومن ایسی گہرائی اور انیس ایسی روانی آ سکتی ہے" ———

اس کے بعد سکوت طاری ہو گیا۔ احسان صاحب نے کل اسی وقت انٹرویو دینے کا وعدہ کیا ——— اور ہم اُن سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

پھر اگلے دن ہم تینوں دوست، احسان صاحب سے انٹرویو لینے جا پہنچے۔ اب کے وہ اپنی کسی نئی نظم کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور جس کاغذ پر نظم لکھی تھی وہ لپیٹ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ عینک اتار کر میز پر رکھی۔ اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں پوچھیئے جو پوچھنا چاہتے ہیں"...

سوال کے لئے میرے لب ہلا ہی چاہتے تھے کہ ایک خوبصورت سے نوجوان، سوٹ بوٹ میں ملبوس تشریف لے آئے۔ احسان صاحب نے ان کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ——— تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ آپ مشہور جواں سال مصنف جناب قاسم نوری تھے۔ جب اُن سے ذرا مفصل گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ آپ اردو ادب کی اسلام پسند تحریک سے کافی متأثر ہیں بخصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلوب نگارش پر تو فدا تھے۔ کافی دیر بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ اور جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو احسان صاحب نے وہی نظم جس کی وہ کاٹ چھانٹ میں مصروف تھے سنانی شروع کر دی۔ نظم کا عنوان تھا "ماحول" ——— غضب کی نظم تھی۔ احسان صاحب ایسی تراکیب اور استعارے تراش کر لائے تھے کہ میں تو بس مزا ہی لیتا رہ گیا۔ کمیونسٹوں اور اربابِ اقتدار پر ایسے لطیف انداز و پیرائے میں چوٹیں کی تھیں کہ بس دل خوش ہو گیا۔ ایک شعر تو مجھے بہت پسند آیا (یاد رہے کہ مجھے شعر عام طور پر صحیح یاد نہیں رہتے۔ یہ میری کمزوری ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ شعر میں اس کی اصلی حالت میں نہ دہرا سکوں۔ لیکن پھر بھی شعر کچھ اس غضب کا ہے کہ صحیح یا غلط دہرائے بغیر چارہ نہیں) ہاں تو شعر کچھ ایسا ہی تھا۔

چمن میں جاتے ہیں تو اُسے بنا دیتے ہیں قفس،
قفس میں آتے ہیں تو اُسے چمن نہیں کرتے!

وقت بھاگا چلا جا رہا تھا اور اصل مقصد کی بجائے دوسری باتیں چل نکلی تھیں۔ آخر میں نے احسان صاحب کو خبردار کیا۔ میں نے کہا "احسان صاحب، وہ انٹرویو والی بات تو رہ ہی گئی" ———

"ہاں ہاں صاحب ضرور پوچھیئے" ۔ جواب ملا۔

اور میں نے بغیر کسی توقف کے سوال کرنے شروع کر دیئے ۔

"آپ کو اپنی نظموں غزلوں میں سے کون سی نظم اور غزل پسند ہے ؟"

"کوئی بھی نہیں ۔"

"تو پھر آپ شعر کیوں کہتے ہیں ؟"

"میں تو شعر نہیں کہتا"

"پھر ؟"

"مجھے تو شعر مجبور کرتا ہے کہ میں اُسے کہوں"

"قدیم شعراء میں سے آپ کو کون سا شاعر سب سے زیادہ پسند ہے ؟"

"قدیم شعراء میں سے میں نظیر اکبر آبادی کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں ۔"

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ نظیر اکبر آبادی ایک عوامی شاعر تھا۔ اس کے کلام میں آپ کو عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ملیں گی۔ وہ اپنے کو عوام سے بالا اور برتر نہ سمجھتا تھا بلکہ ان کے درمیان رہ کر، اُن کے مسائل کو اپنے کلام میں سموتا تھا۔ اور اس معاملے میں قوت اور اقتدار نے ایک سنگِ گراں بن کر اس کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو اس کے کلام میں اور تلخی پیدا ہو گئی ۔ اور جب اس پر بے انتہا جبر کیا گیا تو اس تلخی نے ایک آگ کی صورت اختیار کر لی ۔ ایسی آگ جس نے اپنی راہ میں اٹکے ہوئے سنگِ گراں کو پگھلا کر رکھ دیا ——— اس کے علاوہ یہ کہ اُس کے ہاں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہم ایک لائحہ عمل پاتے ہیں۔ اس کے ہاں خوشگوار مستقبل کی نوید ملتی ہے ۔ ایک پیغام ملتا ہے" ———

"موجودہ شاعروں میں سے آپ کس کو بے حد پسند کرتے ہیں ؟"

"موجودہ شاعروں میں سب سے اونچا درجہ میں جوش ملیح آبادی کو دیتا ہوں ۔ اس کے ہاں زبان کی لطافت، الفاظ کی میناکاری اور تند و تیز جذبات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ جوش صاحب بنیادی طور پر نواب ہیں ۔ لیکن پھر بھی ہمیں ان کا کلام پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں اتنی جان ہے کہ وہ مستقبل میں بھی زندہ رہ سکے ۔ اس کے بعد اگر کسی کے ہاں مستقبل میں زندہ رہنے کے امکانات ہیں تو وہ احمد ندیم قاسمی ہیں ۔ اگرچہ ان کے کلام پر اشتمالی فکر کی چھاپ ہے لیکن پھر بھی مستقبل کا نقاد انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا ۔"

"فیض احمد فیض کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"

"فیض احمد فیض کے ہاں سب کچھ ہے لیکن ان کے کلام میں اتنی جان نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی زندہ رہ سکے ۔ اُن کے

ہاں ہمیں ماضی کا ماتم اور حال کی جھلک بڑے بے تکے انداز میں ملتے ہیں"۔

"کیا آپ نے کوثر نیازی صاحب کی کتاب "زرگل" کا مطالعہ کیا ہے ؟"

"جی ہاں کوثر صاحب کی یہ کتاب میرے زیر مطالعہ ہے"

"اب تک آپ نے جتنا مطالعہ اس سے کیا کیا تأثر آپ پر مرتسم ہوا ؟"

"یہ کہ کوثر صاحب کے ہاں بڑی جان ہے - جذبہ ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ایک شعر میں ہونا چاہیئے - اگرچہ بعض مقامات پر انہوں نے نوآموز ہونے کی وجہ سے زبان کے معاملے میں ٹھوکریں کھائی ہیں"

"موجودہ تنقید نگاروں کے متعلق آپ کا خیال ہے ؟"

"بھائی دراصل بات یہ ہے کہ فن اب ختم ہو چکا ہے - ہمارے زمانے میں فن مسجد کے مدرسوں میں سکھایا جاتا تھا - لیکن اب زمانے نے اتنی "ترقی" کر لی ہے کہ فکر و فن کی طرف توجہ دینا اپنی ہتک سمجھا جاتا ہے - فنی قحط کے اس زمانے میں ظاہر ہے کیسے تنقید نگار پیدا ہو سکتے ہیں - آج کل تو تنقید کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ادب پارے میں کسی نہ کسی طرح کیڑے ڈالے جائیں - خواہ اس ادب پارے میں چاند کا حسن اور آفتاب کا نور اور تمازت ہو - بہرکیف میں موجودہ تنقید نگاروں میں آل احمد سرور کو سب سے اونچا درجہ دیتا ہوں - اور ان کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ابو اللیث صدیقی کا نمبر آتا ہے - لیکن عبادت بریلوی کے ہاں تفصیل و تشریح اس قدر زیادہ ہے کہ قاری کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے"

"مارکسی نظام حیات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"میں محض روٹی کو خدا ماننے کے لئے قطعاً تیار نہیں" -

احسان صاحب اب مختصر جواب دینے پر اتر آئے تھے اور تھک جانے کی وجہ سے تفصیل و تصریح سے گریز کر رہے تھے - میں بھی یہ چیز بھانپ گیا اور سوال ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت چاہی - لیکن انہوں نے اصرار کر کے چائے پینے کیلئے ٹھہرا لیا - ہم نے بہت کہا مگر آپ بولے "بھئی میں نے آج تک شام کی چائے اکیلے نہیں پی" —— آخر مجبور ہو کر ہم ٹھہر گئے - احسان صاحب نے جلدی جلدی چپل پہنے اور دکان کھلی چھوڑ کر ہمیں لئے ہوٹل کی طرف چل پڑے - میں نے حیران ہو کر کہا ، " ایں ...... احسان صاحب ، دکان کو تو بند کر جائیے "

لیکن احسان صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " اس دکان پر اللہ کے فضل و کرم سے کوئی گاہک نہیں آتا "

" لیکن ...... احسان صاحب ......" میں نے کہا -

احسان صاحب نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا " لیکن ویکن چھوڑو آؤ چائے پیتے ہیں - دیر ہو رہی ہے " یہ کہہ کر انہوں نے دکان کے دوسرے کواڑ بھی کھول دیئے اور ہمیں لے کر "انارکلی کے" زرفشاں ہوٹل میں گھس گئے - وہاں وہ چائے پیتے رہے - سگریٹ کے دھوئیں کے پیچ دار مرغولے بناتے رہے - اور اپنے اس وقت کے حالات سنانے لگے جب

باقی صفحہ ۹ پر

کشمکش

نعیم صدیقی

(۱)

ایک خواہش وہ اک نگارِ حسین!　　　روحِ مضطر کو گدگداتی ہے
ایک بے حرف شعر کہتی ہے　　　ایک بے صوت نغمہ گاتی ہے
بن کے کانٹا کھٹک رہی ہے مگر　　　پھول کی طرح مسکراتی ہے
مثلِ بادِ شمال چلتی ہے　　　اک گھٹا بن کے اُڑی آتی ہے
قاف کی اِک پری اڑان میں ہے　　　بال و پر کیسے پھڑپھڑاتی ہے
ناچتی ہے اُتر کے صحرا میں　　　سارے ماحول کو نچاتی ہے
گھونگھرو بج رہے ہیں پاؤں میں　　　چوڑیاں اپنی جھنجھناتی ہے
چہرہ کھولے تو صبح ہوتی ہے　　　گیسو کھولے تو رات چھاتی ہے
استعارے، کنائیتیں، رمزیں　　　آنکھوں آنکھوں میں قہر ڈھاتی ہے
کیسے ترسا رہی ہے جذبوں کو　　　جام بھرتی ہے، مے لنڈھاتی ہے
تتلیوں کی ادائے رنگیں سے　　　دُور ہٹتی ہے، پاس آتی ہے
جیسے بچپن کی شانِ معصومی　　　رُوٹھتی ہے، کبھی مناتی ہے
آنکھ کی پتلیوں میں جیسے نظر　　　جا کے آتی ہے، آ کے جاتی ہے
جیسے جگنو کوئی چمکتا ہو　　　کھوئی جاتی ہے، پائی جاتی ہے
خرمنِ جاں میں ڈالتی ہے شرار　　　سوئے فتنوں کو پھر جگاتی ہے
پُر سکوں جھیل میں وہ کود گئی　　　موج اٹھاتی، بھنور بناتی ہے
مندمل ہو رہے تھے جو گھاؤ　　　چھیلتی ہے، انہیں دُکھاتی ہے
تازہ کرتی ہے داغِ دیرینہ　　　کہنہ یادوں کو ڈھونڈ لاتی ہے

بھولی بسری کہانیاں کتنی
رات بیٹھ کر سناتی ہے

ہر حقیقت سے دور لے جا کر
خواب کا اک نگر بساتی ہے

سارا دن دل کو رکھ کے آوارہ
رات بھر شوق کو جگاتی ہے

کھینچتی ہے عجیب تصویریں
کچھ بناتی ہے، کچھ مٹاتی ہے

رنگ بھرتی ہے موقلم لے کر
فن کے سو معجزے دکھاتی ہے

صورتوں کو وہ دیتی ہے پیکر
روح بھر کر انہیں نچاتی ہے

بے زباں پیکروں کو جادو سے
بن زباں بولنا سکھاتی ہے

خود ہی کچھ کھیتیاں اگائے گی
خود ہی پھر بجلیاں گراتی ہے

شعلے بھڑکا، چھڑکے خود شبنم
کیا لگاتی ہے، کیا بجھاتی ہے

کس ہنر سے فریب دیتی ہے
کس سلیقے سے ورغلاتی ہے

(۲)

تازہ تازہ کٹا پھٹا سا سِل
پل میں آکر گزر گیا طوفان

ایک بھونچال جیسے آکے گیا
دل کی نگری پڑی ہے اب ویران

قصرِ ادراک میں اندھیرا ہے
سارا ایوانِ شوق ہے سنسان

عقل گم سم پڑی ہے دبکی ہوئی
سانس روکے کھڑا ہے وہ وجدان

زخم کھا کر سسک رہا ہے ضمیر
ادھ موا سا پڑا ہے وہ ایمان

شخصیت کے منارے ٹوٹ گرے
عمر بھر کی کمائی کا یہ زیان

فرض پامال! مدعا برباد!
زندگانی ہے بے سر و سامان

دو گھڑی کی ذرا سی لذت پر
لٹ گئی ساری عظمتِ انسان

آدمیت کا نور بجھ سا گیا
رہ گیا محض کھوکھلا حیوان

آرزو جس نے خود ستم توڑا
آرزو خود کھڑی ہے اب حیران

سسکیاں بھر کے رو رہا ہے "انا"
بیٹھ کر مثلِ طفلکِ نادان

آنسوؤں سے دھلے گا بر سوں سے
داغ داغ آبرو کا ہے دامان

دل نے توبہ کے جوڑے سے پھر ٹکڑے　　بندھ رہا ہے وہ اک نیا پیمان
اب تو پلکوں سے ٹوٹتے ہیں شرار　　اور لبوں پر ہے سورۂ رحمٰن
کچھ فرشتے سہارا دیتے ہیں　　ہنس رہا ہے پرے کھڑا شیطان
زخم کھا کر گرا سپاہی، اٹھا
کشمکش کے ہیں پھر نئے ارمان

غزل

وقت گزرے تو کون پہچانے　　کون اپنے ہیں کون بیگانے
کس نے کیا کہہ دیا خدا جانے　　بات سنتے نہیں ہیں دیوانے
مجھ سے دامن چھڑا لیا تو نے　　رہ گئے نا تمام افسانے
موت کچھ دیر انتظار کرے　　مجھ کو بہلا لیا ہے دنیا نے
ابتدا جو کی اک قیامت ہے　　ہم نے دہرا لئے وہ افسانے
آ گیا کون بے نقاب یہاں　　محو حیرت ہیں آئینہ خانے
اُن کے اِک اشکِ غم بہانے سے　　مسکرائے ہیں کتنے افسانے
ہم بھی گزرے ہیں غم کی راہوں سے　　سارے رستے ہیں جانے پہچانے
ایسے میکش بھی ہیں یہاں ساقی　　توڑ دیتے ہیں خود جو پیمانے
کتنی شمعیں جلائی ہیں پرواز
جب ڈھلے ہیں سحر کے پیمانے

—— نصیر پرواز صدیقی ——

نیئر بانو

حجاب و نقاب

اکیلے میں فرصت میں دیوانِ غالب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ غالب کی معانی آفرینی، نزاکتِ خیال، اس کا تخیل، شوخی و شگفتگی کس کا دل نہیں موہ لیتی۔ جہاں کسی شعر و پارۂ ادب کی دلکشی متاثر کرتی ہے وہیں قاری کے اس وقت کے خاص موڈ کا بھی اس تاثر میں دخل ہوتا ہے۔ اگر طبیعت شگفتگی پر مائل ہے تو اس کی نظر شگفتہ و شوخ اور رنگین مضامین پر جائیگی۔ اگر دل کچھ اداس اور افسردہ ہے تو پرسوز اور درد بھرے اشعار کا تاثر زیادہ ہی قبول کریگا۔ اتفاق سے اس وقت میری نظر نقاب و حجاب کے چند اشعار پر آکی کی اٹکی رہ گئی۔ نقاب و حجاب کا تصور خالص اسلامی ہے۔ اس کا رواج دورِ جاہلیت میں بھی رہا ہوگا۔ مگر اسلام نے اس کو قطع و برید کے بعد نکھار کر ذہنوں میں گہرا اور پختہ کر دیا یہاں تک کہ یہ تصور اسلامی تہذیب کا ایک لازمی اصول قرار پایا۔ اسی لئے اسلام کے علاوہ اور کسی مشرقی یا مغربی تہذیب میں یہ تصور اتنا گہرا رچا ہوا نہیں کہ شاعروں سے اتنے خوبصورت اور بلند پایہ اشعار کہلا سکے۔ شاعروں نے اس تصور کے زیرِ اثر وہ زورِ بیانی دکھائی ہے اور اپنے تخیل سے ایسے حسین و جمیل پیکر تراشے ہیں اور ایسے ایسے شوخ و خوشنما رنگ بھرے ہیں کہ ہمارے ادب کے خزانے مالا مال ہیں۔ اگر اس زمانہ میں نقاب کا رواج نہ ہوتا تو غالب کو اپنے تخیل کی رنگینیاں اور فکرِ رسا کی جولانیاں دکھانے کو یہ میدان نہ ملتا۔ اور ہم شعر و ادب کی دنیا میں ان دلکش اشعار سے محروم رہ جاتے۔ غالب نے اپنے دسیوں اشعار میں اس مضمون کو بڑی خوبی سے باندھا ہے۔ اور یہ تخیل کی خوبصورتی اور مضامین کی دلکشی اسی وقت تک ہے کہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور نگاہ پردہ اٹھنے کی منتظر رہتی ہے۔ جذبہ کی شدت اور لذت محض انتظار میں ہوتی ہے۔ نامعلوم کو معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے شوق سے تجسس بیدار ہوتا ہے۔ تمام شوق و تجسس کسی بھید کو پالینے کا ہے۔ خواہ وہ بھید کھلے یا نہ کھلے اس لئے کہ وہ جو اک لذت سعیٔ بے حاصل میں ہے۔ یہ لذت سعی و شوق کو پائندہ اور تازہ دم رکھتی ہے اور کارزارِ حیات میں سعی و شوق کی تازگی اور پائندگی بے حد اہم ہے۔ اگر حقیقت پردہ میں نہ ہو اور وہ بالکل ظاہر اور آنکھوں کے سامنے رہنے والی ہو تو نامعلوم تک رسائی کا شوق کیسے پیدا ہوگا۔ کس بھید کو پانے کیلئے تجسس و سعی ہوگی۔ معرکۂ دار و رسن کی نوبت کہاں آئے گی۔ کوہکنی کی آزمائش کے لئے کون قدم آگے بڑھائے گا۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کو کوئی ہاتھ نہ اٹھے گا۔ لذتِ سعی اور شوق کی تازگی رخصت ہو جائے گی۔ کارزارِ حیات کی گرم بازاری سرد ہو جائے گی۔ میدان خالی اور صبِ ساقی پہ محض ایک صلاء۔

نقاب اٹھنے سے پہلے — تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں

اور نقاب کے بعد یہ کیفیت رہ جاتی ہے — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

میں تو غالب کو پڑھ رہی تھی۔ تخیل نے مجھے کہیں اور لا کھڑا کیا۔ میں نے پھر دیوان کی ورق گردانی شروع کی

اول اول شاعر نقاب کو ایک ناقابلِ تغییر حقیقت مان کر قناعت کر لیتا ہے اور چہرہ پر نقاب کے کھلنے ہی کو کافی سمجھتا ہے ؎

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ۔ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

لیکن کسی حقیقت کو کافی سمجھ کر اس پر قناعت کر لینا انسان کی فطرت میں نہیں ۔ جو کچھ مل چکا اس پر بس نہیں کرتا ۔ مزید کی طلب ہوتی ہے اور خوب سے ہے خوب تر کہاں کی تلاش رہتی ہے ۔ اسی میں انسانی عظمت کا راز ہے ۔ یہی شوق و تجسس اور تلاش اس سے دنیا میں اہم سے اہم معرکے سر کراتے ہیں ۔ یہی معلوم سے نامعلوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ کبھی ان دیکھی راہوں پر قدم بڑھاتے ہیں کبھی تخیل کو پر پرواز عطا کرتے ہیں اور شعر و ادب کے خزانے مالا مال کرتے ہیں اور پھر نقاب کی شکن چڑھی ہوئی تیوری بن جاتی ہے ؎

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

کبھی شوخی کو جی چاہا تو کہہ بیٹھے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر آئینہ ہے دائم نقاب میں

رشک بھی ساتھ لگا ہوا ہے ؎

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اگر کبھی تغافلِ تمکیں آدا سے بھول چوک ہو گئی تو نظارہ خود نقاب بن گیا ؎

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جذبہ شوق کی شدت نے اگر بندِ نقاب کھلوا دیئے تو اسی شوق کی غیرت کی دوسری انتہا یہ کہ نگاہ بھی غیر ٹھہری ؎

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

نالوں کی رسائی تو ستاروں سے بھی آگے ہے یہاں تو معاملہ ابھی زمین پر ہی چل رہا ہے ۔ شوق رنگ لائے بغیر نہیں رہتا ۔ کوئی التجا در پردہ درِ قبولیت تک پہنچ گئی شائد

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

حُسن کتنا ہی تغافل اور سنگدلی پر مائل ہو ، وہ لاکھ تھم تھم کر چلے مگر اس کی پائلوں میں بھی گیتوں کی چھم چھم بھری ہے حسن کی فطرت بھی آخر انسانی ہے ۔ جواب تو افلاک سے بھی آتا ہے ۔ ارضِ مقدس پر بھی حجاب اٹھتے ہیں ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

عشق مچل گیا کہ ایسے نہیں ؎

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

اب حجاب میں از خود بے حجابی کی کیفیت آ گئی ۔ جب شرم و حجاب اپنی حد سے بڑھ کر ناز و ادا کی سرحد میں داخل ہو جائے تو لاگ یا لگاوٹ کا پردہ بن جاتا ہے ؎

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

اس کیفیت کو سمجھ کر شوق ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ التجا نیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ مدنہ یاد رکھیئے اس کی نگاہ تو خود ہی نقاب بن جانے کی عادی تھی ؎

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب　　کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

جب حسن نے اس شوخی پر سرزنش کے لئے لال پیلے ہو کر آنکھیں دکھلائیں تو بجائے شرمندہ و خاموش ہونے کے تجربہ پر یہ بدخوئی خلافِ توقع پرلطف ثابت ہوئی۔

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں　　نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیز عریاں ہے

ایک عشق اور ہزار سودا۔ اب وہ ایک ماہرِ نفسیات بن کر نیا پہلو بدلتا ہے۔ آنکھوں کے بعد چہرہ کا مطالبہ کرتا ہے کہ دیکھو ؎

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی۔　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دامنگیر ہوتا ہے کہ اگر حسن نے بے نقابی کی روش اختیار کر لی تو ہم بھی مجنون ہوں گے ؎

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر　　ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

لیکن اب حسن ان دیوانوں کو کب خاطر میں لاتا ہے اس نے بھی کئی ڈھب سیکھ لئے ہیں ؎

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

اب عاشق ہزار واویلا کرے۔ لاکھ سر پٹکے۔ تیر کمان سے نکل چکا۔ بے حجابی کے ساتھ مے پرستی بھی حسن نے شعار کر لی خود بین و خود آرا پہلے ہی تھا ؎

مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب　　اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

حجاب کے اس طرف کیا ہے یہ بھید بھید نہ رہا۔ حسن سے پردہ اٹھ گیا تمام معمے حل ہو گئے۔ تخیل کی فسوں کاریاں نہ رہیں۔ حسن ستم ظریف نے یہ اور غضب کیا کہ حجاب و نقاب کے ڈھکوسلوں کے ساتھ اس اہل نظر عاشق کو بھی بزم ناز سے اٹھا دیا۔ اب کیا رہ گیا تھا جس کی کوئی تمنا کرتا۔ شوق مردہ ہو گیا۔ تجسس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سعی کی لذت ختم ہو گئی۔ عشق کو موت سے آ گیا۔ اس سے اپنی یہ رسوائی نہ دیکھی گئی۔ جس دل پر اسے ناز تھا وہ نہ رہا۔ اپنے آپ کو عرضِ نیازِ عشق کے ناقابل پا کر بساطِ عشق لپیٹ دی ؎

شرم کی رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں۔ ختم ہے تجھ پہ الفت کی پردہ داری ہائے ہائے

مدتوں کے بعد اسے ایک آوازِ تہ خاک بے چین کر دیتی ہے۔ وہ نوائے سروش ؟

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس بیچے عاشق کی آنکھوں سے پردہ اٹھنے لگتا ہے جس طلب و شوق کی چنگ حسنِ مجازی نے دل میں لگائی تھی اس نے حسنِ حقیقی کا متوالا بنا دیا۔ سرچتا ہے اس حسنِ ناپائدار کے لئے سر پھوڑتا کیا۔ پھر وہی عشق زندہ و بیدار ہو کر تنِ مردہ میں نئی روح پھونک

باقی برصفحہ

عدالت کا انتظار

اسعد گیلانی

سیاست کی چکی چلتی رہی۔

اور اس چکی کے دو پاٹوں میں ساجدہ بیچاری پس گئی۔ اس کا گھر، اس کا سکون، اس کا شوہر، اس کے بچے، اس کا مستقبل، اس کی ساری کائنات اس چکی کے دو پاٹوں میں پس کر چور چور ہو گئی۔ اس کے پاس آہوں کے غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

اس نے کب کہا تھا کہ اسے آزادی دلاؤ۔ اس نے کب کہا تھا کہ اسے اس کے جنم بھوم سے اکھیڑ پھینکو۔ اس نے کب کہا تھا کہ اسے آباؤ اجداد کے مکان اور زمینیں ناپسند تھیں۔ اس نے کب کہا تھا کہ اسے اپنے شہر اور گاؤں کی گلیاں ناپسند تھیں۔ بس ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اس طوفان نے اس کی ساری ہستی کو اپنے اندر ڈبو دیا۔

اب وہ کراچی کے فٹ پاتھ پر پڑی ہینچتی ہے۔ اس کا ننھا اختر اپنے ہاتھ میں سوکھی روٹی کا ٹکڑا لئے ویران ویران آنکھوں سے دنیا والوں سے پوچھتا ہے کہ اسے اس کا قصور بتایا جائے۔ کسی کی نکسیر پھوٹ جاتی تھی تو پنچائت بیٹھ کر فیصلہ کیا کرتی تھی۔ کوئی کسی کو میلی آنکھ سے دیکھتا تھا تو پولیس اور عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے تھے۔ کسی کے صحن میں کوئی بلا اجازت داخل ہو جاتا تھا تو مقدمے چل جاتے تھے۔ لیکن یہ کیا ہو گیا کہ اس کے پیارے ماموں کو جو مدت دراز سے کانپور میں باعزت زندگی گزار رہے تھے، ان کے اپنے شہر بلکہ اپنے محلہ والوں نے گلی کے نکڑ پر بکرے کی طرح ذبح کر دیا اور کوئی پنچائت نہ بیٹھی۔ اس کے میرے بھائی کو دل کے پھاٹک پر گولی مار دی گئی اور کسی پولیس یا عدالت کا دروازہ نہ کھٹکا۔ غنڈوں کے جتھے اس کے گھر میں گھس کر سب کچھ لوٹ لاٹ کر لے گئے، لیکن کسی کو مدافعت کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے تھانے بند ہو گئے۔ عدالتیں مقفل ہو گئیں۔ جمہوری حقوق کی حفاظت کے دستور معطل ہو گئے۔ کوئی اس کا مقدمہ بھی یو۔ این۔ او میں لے جاتا کہ بے گناہ ساجدہ جو ملک ہندوستان کی ایک معزز مسلمان گھرانے کی خاتون تھی، کس طرح تباہ و برباد کر دی گئی، تاکہ قوموں کی اسمبلی اس پر غور کرتی۔ لیکن دنیا کے اس نقار خانے میں جہاں ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں کے دھماکوں سے چھوٹی چھوٹی قوموں کی آواز سنائی نہیں دیتی، وہاں ساجدہ کی آواز کون سنتا۔

اس طوفان تباہی و بربادی میں اس کی بربادی کی کیا حیثیت تھی۔ ہاتھی لڑ پڑے تھے اور ان کے پاؤں تلے ایک چیونٹی جو اپنا رزق خاموشی سے اپنے منہ میں لئے سلامتی اور امن کی راہ پر چلی جا رہی تھی اور کسی کے تنازعہ میں کوئی فریق نہ تھی ——— کچل کر مر گئی۔ مر گئی تو ہاتھی کیا کریں۔ کیا وہ لڑنا چھوڑ دیں۔ کیا وہ تباہی مچانا چھوڑ دیں۔ کیا وہ کمزوروں کو کچلنا چھوڑ دیں۔

ممکن ہے اس سوال کا جواب کسی ایسی عدالت سے مل سکے جہاں چیونٹی کو بھی اپنا مقدمہ پیش کرنے کا حق حاصل ہو سکے بس اسی عدالت کا انتظار ساجدہ کو بھی تھا۔ سیاست کی چکی کے دو پاٹوں میں پس جانے کے بعد اس کے پاس بے بس آہوں کے سوا کوئی اثاثہ نہ تھا جس کی مدد سے وہ کسی کو اپنی بات سنا سکے۔

مجھے اس سے بڑا دکھ ہوا کہ ایک خاتون برقعہ پہنے کراچی مسافر خانے کے ایک کونے میں بیٹھی ایک چھ سات سالہ نیم فاقہ کش بچے کو میری طرف اشارہ کرکے آمادہ کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے آکر بھیک مانگے۔ جب کہ میں پلیٹ فارم سے باہر آکر ایک شناسا سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ جب اس بچے نے میرے پاس آکر اپنے ہاتھوں کو ملتجی نگاہوں سے میرے سامنے پھیلایا تو مجھے بچے پر بڑا رحم آیا اور وہ بیٹھی ہوئی اس کی ماں پر شدید غصہ آیا۔ غصہ بھی اتنا کہ میں نے بچے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بالکل یوں گویا وہ ہاتھ اس عورت کا تھا، جو اپنے بچے کو یوں سرِ بازار ذبح کر رہی تھی۔ اس کی خودی، اس کی عزتِ نفس، اس کا مستقبل، بلکہ اس کی انسانیت کو یوں ذلت آمیز طریقے سے ہمیشہ کے لئے ختم کر رہی تھی۔ یہ ماں تھی یا ڈائن۔ آخر اس کی مامتا کہاں گئی تھی۔

وہاں سے ہٹ کر میں سیدھا اس عورت کے قریب گیا۔

"خاتون تمہیں اپنے بچے پر رحم کھانا چاہیئے۔ اسے گداگر نہ بناؤ۔ محنت مزدوری کرو اور اسے گداگری سے بچاؤ"۔ میں نے تلخ انداز میں کہا۔

"میں کیسے بچاؤں۔ جب اس کے باپ نے کہا ہے کہ اسے گداگر بناؤ۔ میں تو اسی کے حکم کی باندی ہوں"۔ خاتون نے کہا۔ اس کے بعد اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔ لیکن وہ ضبط نہ کر سکی اور رو پڑی اور روئی بھی ایسے جیسے کسی غنڈے نے اسے برچھا مار دیا ہو اور وہ جاں بلب ہو۔ زخم سے چور اور درد سے بے تاب۔ میں پریشان سا ہو گیا۔

مجھے بتاؤ بات کیا ہے، شائد میں کچھ کر سکوں"۔ پریشانی سے میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"میاں صاحب سب کرنے والے نہ کریں تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا"۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"میری فریاد تو وہی سنے گا جو بن کہے بھی سنتا اور بن مانگے بھی دیتا ہے۔ کوئی اور شائد اس دنیا میں ایسا نہیں ہے جو میرے ساتھ انصاف کر سکے۔ جو اپنے تھے بیگانے ہو گئے۔ اور جو بیگانے ہیں ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے چھوڑ دیا۔ میں اپنا دکھ کیا بیان کروں۔ یہ اکیلی ساجدہ کا دکھ نہیں ہے۔ مجھے تو اب ہر طرف یہی نظر آتا ہے کہ خون سفید ہو گیا ہے اور قیامت سر پر آ گئی ہے۔ بس وہیں پر انصاف ہو گا"۔

میں نے اسے مکان کا پتہ دیا۔ تاکہ وہ میری اہلیہ سے مل سکے۔

اُمِّ فاروق سے جو حالات اس نے بیان کئے وہ بہت دکھ دینے والے تھے۔

"میں کانپور کے محلہ امیر گنج کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد سجاد علی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہمارے دو مکان تھے۔

ایک میں رہائش تھی اور دوسرا کرائے پر تھا۔ والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے گھر کا سارا انتظام میرے ہی سر پر تھا۔ میرا چھوٹا بھائی
ابھی پڑھ رہا تھا۔ اس لئے بھی گھر کی نگہداشت تمام تر میرے سر تھی۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک دیہات میں کچھ زمین تھی اور ایک باغ
بھی تھا۔ والد صاحب نے ایک یتیم لڑکے کو جو دور کے عزیزوں میں سے تھا خود پڑھایا تھا اور اس کی امداد کیا کرتے تھے۔ جب تک اُن
کے پاس رہا فیس معاف رکھی تھی کالج میں گیا تو اس کی کفالت کرتے رہے۔ بیوہ کا لڑکا تھا اس لئے اس میں دوسرے لڑکوں کی خو بُو
نہ تھی۔ مسکین تھا۔ والد صاحب نے اُسی سے میری شادی کر دی مجھے مڈل تک تعلیم دلوائی تھی۔ شادی کے بعد والد صاحب دونوں
ماں بیٹوں کو اپنے ہی گھر لے آئے اس طرح شادی کے بعد میں اپنے سُسرال نہیں گئی بلکہ سسرال میرے گھر آئی۔

والد صاحب نے کوشش کر کے انہیں سرکاری ملازمت بھی دلوا دی تھی۔ اور ہم بڑے اطمینان سے رہ رہے تھے چھوٹا بھائی
زیر تعلیم تھا۔ گھر کا سارا انتظام میرے ذمہ تھا۔ مکانات کا کرایہ بھی آتا تھا دیہات سے باغات کا سالانہ ٹھیکہ بھی مل جاتا تھا۔ گزربسر
فارغ البالی سے ہو رہی تھی۔ میرے شوہر رجب علی سے والد صاحب نے کبھی کچھ نہیں لیا نہ گھر میں ان کا خرچ ہونے دیا۔ اس لئے
کہ شروع میں ان کی تنخواہ بھی قلیل تھی اور والد صاحب نہ چاہتے تھے کہ ان پر کسی قسم کا کوئی بوجھ ہو۔ چنانچہ گھر کے اخراجات سے
وہ پوری طرح آزاد تھے۔ اور ایک پُرسکون زندگی گزر رہی تھی۔ یہ تک معلوم نہ تھا کہ سورج کب نکلتا ہے اور کب ڈوبتا ہے۔
گہما گہمی اور مصروفیت کی زندگی میں کوئی فقر و فاقہ نہ تھا۔

اچانک انہوں نے اپنا سر نکالا اور بٹ بانٹ کی باتیں چلیں۔ فساد شروع ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں خود اپنے
شہر اور محلے اور گلیاں بھی محفوظ نہ رہے۔ حکومتیں ادل بدل ہو گئیں اور رنگا رنگ کے لوگ ادھر سے ادھر آنے جانے لگے۔
رنگا رنگ کے نعرے لگنے لگے۔ بڑا عمل غباڑہ چل پڑا۔ روز جلسے۔ روز فساد۔ روز دہشت غرض ساری دنیا ہی جیسے بدل
گئی۔ روز خون خرابہ ہونے لگا۔ اور مسلمانوں کی تو بس شامت ہی آگئی۔ جن ہمسایوں کے ساتھ رہتے رہتے مدتیں گزر گئی تھیں
ان کے مکانوں سے اینٹیں برسنے لگیں اور ان کے چہرے بدل گئے کسی کو کسی پر بھروسہ نہ رہا۔

لوگ بھاگ بھاگنے لگ گئے۔ مکان چھوڑ کر پاکستان جانے لگے۔ میرے میاں رجب علی بھی ملازمت کے سلسلے میں تبدیل
ہو کر پاکستان چلے گئے لیکن ہم نے تو تہیہ کیا تھا کہ کہیں نہ جائیں گے جس کو اپنے گھر میں پناہ نہیں اسے کہیں بھی پناہ نہیں۔۔۔
والد صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔ گزربسر کے لئے جائداد کی آمدنی موجود تھی اس لئے ہم نے بچ دبک کر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک روز شہر میں بڑے زور کا فساد ہوا مسلمانوں کی دکانیں لٹ گئیں۔ کئی مکانات کو آگ لگا دی گئی اور کئی لوگ جان
سے گئے۔ ان میں میرے اپنے سگے ماموں بھی تھے جن کا مکان ہمارے ہی محلے کی عام گلی میں تھا جب شور مچا تو وہ دکان بند کر کے
جلد جلد گھر کی طرف چل دیئے۔ جب گلی کے نکڑ پر پہنچے تو سامنے سے غنڈوں کی ایک ٹولی آ گئی جس نے انہیں وہیں ذبح کر دیا لاش
گھر لائی گئی تو دکان کی چابی اسی طرح مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔ اس روز گھر کی عورتوں کو
غش پر غش آتے رہے لیکن ہمارے اعمال کی شامت ہمارے سامنے تھی۔

پھر ملوں میں ہڑتالیں ہوئیں۔ مزدوروں نے اجرتیں بڑھانے کے مطالبے کئے۔ لیکن وہ ہڑتالیں بھی فساد بن گئیں اور میرا ایک ممیرا بھائی مل کے پھاٹک پر پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ ظالموں نے تاک تاک کر مسلمانوں کو نشانہ بنایا۔ اس کے بعد گویا ہماری یہ حالت ہو گئی کہ ہم مُردوں میں شامل ہو گئے۔ ایک بھنگی اور کنجڑا اور گوالا بھی ہم پر رعب جماتا تو ہم دبک جاتے۔ وہ بات ہی نہ رہی جو پہلے تھی۔ اچانک معلوم ہوا کہ ہم اپنے مقام سے بہت نیچے گر گئے تھے اور ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہنے لگا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے پنجرے میں چوہا بند کر کے اس کے گرد بلیوں کو چھوڑ دیا جائے جیسی کچھ اس کی جان مٹھی میں رہتی ہے وہی حال ہمارا ہو گیا۔ ہر فرد، ہر شخص، ہر کھٹکے بلکہ ہر آواز سے ہم ڈرتے تھے اور کوئی ہماری بات بھی نہ سنتا تھا۔

میرے میاں کے خطوط آتے رہے۔ وہ بھی وہاں کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ گھر والے ان کو یاد آتے تھے اور ہندوستان کی خبروں سے بار بار پریشان ہو ہو کر خط لکھتے تھے۔ ہم لوگ خود ان کے لئے پریشان تھے۔ ہمارا چھوٹا بچہ اختر بھی ابا کو یاد کرتا تھا۔ آخر دو سال کے بعد وہ آئے تو وہ بہت کچھ بدلے ہوئے تھے۔ صحت پہلے سے اچھی تھی۔ مکان بھی مل چکا تھا۔ ملازمت میں بھی کچھ ترقی ہو گئی تھی۔ وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن ابا کے لئے جانا مشکل تھا کہ جائداد کیسے چھوڑیں۔ میں الگ پریشان تھی کہ ابا اور چھوٹے بھائی کو کیسے چھوڑ کر جاؤں۔ چھوٹا بھائی میٹرک میں تھا۔ اس کے بعد اسے کالج میں جانا تھا۔ بالآخر وہ اپنی ماں کو لے کر پاکستان چلے آئے۔ البتہ انہوں نے باقاعدہ میرے اخراجات کے لئے کچھ رقم بھیجنی شروع کر دی۔ جو پہلے براہ راست اس کے بعد مختلف ذرائع سے مجھے ملتی رہی۔

اُن کے چلے جانے کے بعد گویا میرے لئے نصف دنیا رہ گئی۔ میں بس یوں معلق تھی کہ جیسے کوئی آسمان سے گر چکا ہو لیکن زمین پر ٹک نہ سکا ہو۔ بس ایک اطمینان تھا کہ میں ایک خدمت انجام دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ بھائی تعلیم سے فارغ ہو گا تو پھر یہ ہندوستان یا پاکستان کے دونوں گھر میرے ہی ہیں۔ میں دونوں گھروں کی مالک ہوں۔ دن جیسے تیسے بیتتے رہے۔

کسی نے رپورٹ کر دی کہ فلاں مکان کا مالک پاکستان چلا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں کسٹوڈین نے ہمارے ایک مکان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہزار سر پٹخا اور شور مچایا اور دُور دُور تک درخواستیں دوڑائیں لیکن وہ کسی شرنارتھی کو الاٹ کر دیا گیا اور ہمارے قبضہ سے نکل گیا۔ گاؤں کی جائداد اب ہندو مزارعین کے ہاتھوں میں تھی جن سے جا کر ہمیں بٹائی تک پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ باغ الگ اجڑنے لگا اور اس کی نگرانی باقاعدہ نہ ہو سکی۔ ابا بیمار رہنے لگے۔ پاکستان سے میاں کے خطوط وقتاً فوقتاً آتے تھے اور وہ بھی اکثر لمبے وقفے سے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سورج غروب ہو گیا ہے۔ شفق کی روشنی کم ہو رہی ہے اور رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ چاروں طرف چھایا جا رہا ہے جو ہمیں اپنے تاریک بازوؤں میں لپیٹتا جا رہا ہے۔ میاں کی طرف سے روپیہ ملنا بھی اب بے قاعدہ ہو گیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے گزر بسر کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے بھائی تعلیم سے فارغ ہوا۔ والد صاحب نے سب سے پہلے اس کی شادی کی اور پھر ملازمت کا چکر شروع ہوا لیکن ملازمت کی کوئی سبیل نہ تھی۔ بڑی مشکل اور بھاگ دوڑ

اسے کسی پرائیویٹ تجارتی کمپنی میں کوئی جگہ ملی - دوسری طرف والد صاحب کا انتقال ہو گیا -

والد صاحب کا انتقال کیا ہوا ہمارے جہاز کا لنگر ٹوٹ گیا - اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں آبادی سے ویرانے میں آ گئی اور جس شاخ پر میں نے برس ہا برس سے آشیانہ بنا رکھا تھا وہ خشک ہو کر ٹوٹ گئی - بھابی آئی تو گھر کے حالات پہلے سے کشادہ نہ تھے ایک ذاتی مکان، ملازمت کے ماہانہ ڈیڑھ سو روپے اور سال میں کچھ رقم یا جنس زمین سے آتی تھی - ایسے حالات میں مجھے میاں کی طرف سے امداد کی ضرورت تھی - لیکن ادھر سے کئی ماہ سے کوئی خط نہ تھا اور نہ کوئی امداد تھی - خطوط کے جواب بھی مختصر اور کبھی کبھی آتے - میں ان کی مجبوریوں کو سمجھتی تھی - میں نے محسوس کیا کہ اب گھر کا فرش میرے پاؤں تلے سے نکل رہا تھا گھر کا کاروبار اب دوسرے کی مرضی پر چلنے لگا تھا - میں اپنے چھ سالہ اختر کے ساتھ گھر میں تنہا ہی ہوتی جا رہی تھی بھابی بات بات پر ناراض ہو جاتی گھر میں میری وجہ سے بار ہا بدمزگی پیدا ہونے لگی - مجھے چھوڑ کر مر جانے والوں اور مجھے چھوڑ کر چلے جانے والوں کو کوسا جانے لگا اور گھر کی چار دیواری میرے لئے تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی گئی - بھابی نے بھی کئی دفعہ سنایا کہ میاں کے پاس پاکستان چلی جاؤ اور بھائی کا منہ بھی خشک رہنے لگا - آخر میں نے سمجھ لیا کہ اب یہ گھر ساجدہ کو پسند نہ کرتا تھا

پتہ چلا کہ کچھ لوگ کھوکھراپار کے راستے پاکستان جا رہے تھے اب مجھے وہیں ٹھکانا نظر آتا تھا - اپنا گھر اب بیگانہ ہو گیا تھا اور دور دیس میں ہی امید کی کرن نظر آتی تھی - میں نے پاکستان چلے جانے کا خیال ظاہر کیا تو گویا میرے اس اظہار نے گھر کو رونق بخش دی - میں نے گھر والوں کے دل کی بات کہہ دی تھی - میں نے اختر کے ابا کو پہلے اطلاع دے دی کہ وہ کھوکھراپار آ کر ہمیں لے جائیں اور پھر میں اپنے ابا کے گھر سے اس روز اس طرح وداع ہوئی جس طرح میت کو قبرستان لے جایا جاتا ہے کہ پھر اسے اس گھر میں کوئی فرد بھی واپس لانے پر تیار نہیں ہوتا -

بہن کچھ نہ پوچھو کہ وہ سفر کس قیامت کا سفر تھا - اختر ننھی سی جان میرے ساتھ تھا اور میں زندگی میں پہلی بار گھر سے نکلی تھی - بھائی نے جہاں تک کا ٹکٹ مل سکا لے دیا اور میں روتی ہوئی روانہ ہو گئی - ہم میں سے کسی کے پاس پاسپورٹ نہ تھا اور سرحد پر جو ظالمانہ زیادتیاں ہمارے ساتھ ہوئیں وہ محض بتانے سے سمجھ میں نہیں آ سکتیں - گاڑی سے اتر کر ہم کئی ایک مرد اور عورتیں اور بچے چھپ چھپا کر اور ہندوستانی سپاہیوں کی نظریں بچا کر پاکستان کے علاقے میں داخل ہوئے - کئی میل ریت کے اندر ہم نے پیدل سفر کیا - رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھائیں - بھوکے پیاسے رہے - ایک جگہ ہاتھ کی انگوٹھی دے کر ہم نے پانی پیا - ایک جگہ کان کی بالیاں دے کر ہم نے سرحد کے سپاہیوں سے جان چھڑائی اور جب حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو مجھ سے بچے کا حال نہ دیکھا جاتا تھا جو سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا - میرا اپنا حال یہ تھا کہ کھڑی ہوتی تھی تو نیچے ٹانگیں کانپتی تھیں - ہاتھوں سے چوڑیاں خود بخود گرتی تھیں -

ہر آدمی پر اختر کو ابا کا شبہ ہوتا تھا اور میں خود بھی بیتاب تھی لیکن اسے بہلاتی تھی - میرے میاں ہزاروں میں ہوں تو انہیں پہچان لوں لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے - نہ کھوکھراپار کیمپ میں - نہ ریلوے اسٹیشن پر - نہ پھر حیدرآباد اسٹیشن پر - پوچھ پاچھ کر کے کہ

ساتھ لئے کراچی کی گاڑی میں بیٹھ گئی تو محسوس ہوا کہ جیسے بھیانک جنگل میں سے نکل کر انسانوں کی آبادی میں آگئی ہوں۔ کئی برس سے جو خوف اور دہشت کا غبار چاروں طرف پھیلا ہوا تھا گویا اچانک چھٹ گیا۔ سانس اطمینان سے آنے لگا۔ لوگوں کے چہروں پر اعتماد نظر آنے لگا اور محسوس ہونے لگا کہ ایک بھاری سل سینے پر سے اتر گئی تھی۔

کراچی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہر بابو کو جستجو اور تلاش کی نظر سے دیکھا جیسے کوئی اندھیرے میں روشنی ڈھونڈ رہا ہے۔ آدمیوں کے ریلے ادھر سے ادھر آتے جاتے تھے لیکن میرے میاں کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ہر آنے والے کو میں امید بھری نظروں سے دیکھتی تھی کہ شاید وہ ہوں یا ان کا بھیجا ہوا کوئی آدمی ہو۔ ہر جانے والے مسافر کے بارے میں خیال ہوتا تھا کہ اس سے پوچھوں شاید ان کو جانتا ہو یا ان کا ہمسایہ ہو لیکن یہ دل کی دھڑکنیں دل کے اندر ہی رہیں۔ مجھے بہت کچھ اطمینان تھا کہ میں اس شہر میں آگئی تھی جو میرے میاں کا شہر تھا۔ جہاں میرا اپنا گھر تھا جس گھر کی میں مالکہ تھی۔ جہاں سے مجھے کوئی نکالنے والا نہ تھا جہاں میرا انتظار نہ تھا۔ دل نے کہا ان کو چھٹی نہ ملی ہوگی یا خط نہ پہنچا ہوگا۔ یا نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہوگی۔ بہرحال کوئی تشویش نہ تھی دل خوش بخوش تھا کہ اب میرے لئے کسی خوف و خطر کا موقع نہ تھا میرے پاس ان کے دفتر کا بھی اور ان کے کوارٹر کا پتہ موجود تھا۔

"بابو رجب علی رضوی بی اے۔ ہیڈ کلرک۔ ری ہیبی لی ٹیشن سیکشن۔ وزارت بحالیات دفاتر گورنمنٹ آف پاکستان۔ فریئر روڈ۔ کراچی"

گھر کا پتہ تھا

کوارٹر نمبر ۸۴ مارٹن کوارٹرز۔ کراچی نمبر ۵۔

چنانچہ میں نے اطمینان سے رکشا کرائے پر لیا اور اسی اطمینان سے جیسے کسی زمانے میں کانپور کے اپنے پرانے گھر میں جایا کرتی تھی پتہ بتا کر رکشا میں سوار ہوئی اور روانہ ہو گئی۔

ہر موڑ پر میرا دل وہڑکتا اور مسرت سے اچھل پڑتا۔ رکشا کے ہر پہیے کے چکر سے میری منزل قریب آ رہی تھی نئی نئی عمارات کو دیکھ دیکھ کر اختر کے چہرے پر بھی اب رونق آ رہی تھی اور میں تو گویا لمبی مسافتیں طے کر کے منزل پر پہنچنے کے اطمینان سے سرشار تھی۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد رکشا بڑی سڑک چھوڑ کر کوارٹروں کے درمیان کے راستے پر چل پڑا جو کچا تھا لیکن رکشا چل سکتا تھا چلتے چلتے وہ ایک جگہ جا کر رک گیا۔ سامنے وہ کوارٹر تھا جس کا نمبر ۸۴ تھا۔ جس کے صحن میں چاروں طرف بڑے بڑے اونچے سرسبز پودے لگے ہوئے تھے جو باہر باڑھ کا کام بھی دیتے تھے، سائے کا بھی اور پردے کا بھی۔ پودوں کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف کانٹے دار تار لگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ایک دروازہ تھا جو نیم وا تھا اور اس دروازے پر ایک تختی لگی تھی۔

"بابو رجب علی رضوی۔ بی۔ اے۔"

میرا جی چاہا میں لپک کر اندر داخل ہو جاؤں۔ میرا دل چاہا میں اس تختی کو، اس نام کو، اس دروازے کو چوم لوں۔ میرا دل چاہا میں اس چوکھٹ کو چوم لوں جس پر سے میرے میاں آتے جاتے روزانہ گزرتے تھے۔ میں جہنم سے نکل کر جنت کے دروازے پہ آگئی تھی۔ میرا اختر اپنے گھر پہ آگیا تھا۔ سارا خوف، ساری دہشت، سارا غم، سارے آلام اور ساری آفات پیچھے چھوٹ گئی تھیں اور اب میرے مستقبل کی جنت کا دروازہ میرے سامنے تھا جس پر میرے میاں کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ رکشا والے سے ڈیڑھ روپیہ طے کیا تھا، میں نے اسے دو روپے دیئے۔ اختر کو اچھل کر اندر جانے سے روکا۔ اپنے جذبات پر ضبط کا بند باندھا اور سکون، اطمینان اور وقار سے اندر جانے کے ارادے سے سامان ایک طرف رکھ کر دروازے کا پٹ کھولا۔

یہ شام کا وقت تھا اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ دفتروں سے سب لوگ آچکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے میاں گھر پہ ہی ہوں گے اور ان کو کیسی خوشی ہوگی۔ وہ مسرت سے بیتاب ہو کر اختر کو گود میں اٹھا لیں گے۔ میرے سفر کی ساری کہانی مجھ سے سنیں گے۔ میری ساس میری آمد پر خوشی کا اظہار کریں گی۔ گھر کا سُونا پن چلا جائے گا اور چاروں طرف رونق ہی رونق نمودار ہو جائے گی۔

اسی رونق کو لانے کے لئے میں نے دروازے کا پٹ کھولا۔

سامنے صحن میں ایک میز کے گرد دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر رجب علی تھے۔ میرے اختر کے ابا تھے۔ بالیقین وہ میرے میاں ہی تھے۔ اور دوسری پر دو چوٹیاں کئے، پوڈر لپ اسٹک لگائے، بے حیائی سے دوپٹہ کاندھے پر ڈھلکائے کوئی نوجوان عورت تھی ——— یہ کون عورت تھی جو میرے میاں کے پاس اس جگہ بیٹھی تھی جہاں مجھے بیٹھے ہونا چاہیئے تھا ——— مجھے چکر سا آگیا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا "ارے ———" میری زبان سے آہ بن کر بیساختہ نکل گیا۔ گویا میں غلطی سے کسی بیگانے کے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

"ارے" میرے میاں کی زبان سے بھی نکل گیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ پہ بیٹھے رہے۔ "کیا تم لوگ بلا اطلاع آگئے" انہوں نے معمولی خفگی کا سا اظہار کیا۔

میں نے دل میں سوچا یہ خاندان کے رشتہ داروں میں سے مہمان عورت ہوگی۔ زیادہ پڑھ لکھ کر یہی حال ہوتا ہے۔ یہ بھی سوچا کہ شاید میرا خط میرے میاں کو نہ مل سکا تھا اس لئے وہ اسٹیشن پر نہ آسکے۔ یہ بھی سوچا کہ وہ مہمان عورت کی موجودگی میں اپنی مسرت کا اظہار نہ کر سکے اور اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکے۔

میں نے اور اختر نے خود ہی سامان باہر سے اٹھا کر اندر برآمدے میں رکھا اور پھر اندر ساس کے پاس چلی گئی۔ جو باورچی خانے میں بیٹھی چائے تیار کر رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نہ انتظار تھا، نہ ان کے جواب میں گرمی تھی، نہ انہوں نے بیٹھنے کے لئے کہا، نہ انہوں نے حال پوچھا۔ وہ اپنا کام کرتی رہیں۔ میں حیران بے زبان

بنی ان کے پاس کھڑی رہی۔ اختر بھی سہما ہوا میرے پاس کھڑا رہا۔

ساری حقیقت مجھ پر کھل گئی۔ میں آسمان سے گر پڑی تھی۔ لیکن زمین پر ٹک نہ سکی تھی۔ ہواؤں کا دوش مجھے سہارنے کے لئے تیار نہ تھا۔ زمین کا سینہ میرے لئے تنگ تھا۔ آسمان کی آغوش میں مَیں سما نہ سکی تھی۔ میں اب کہیں کی نہ تھی۔ ہندوستان میں میرا گھر چھن گیا تھا۔ پاکستان میں میرا گھر لُٹ گیا تھا۔ میں اب کسی کی کچھ نہ لگتی تھی۔ کوئی میرا اب عزیز نہ تھا۔ میں نے مزدور بن کر لوگوں کے گھر بنائے تھے۔ گھروں والے آکر اپنے اپنے گھروں میں بس گئے تھے۔ اور مزدور کے لئے کوئی چھت نہ تھی۔

دو مہینے سوکن، میاں اور ساس کی منتیں خوشامدیں اور خدمتیں کرنے کے باوجود وہ مجھے خادمہ بنا کر بھی نہ رکھ سکے اور بالآخر کل شام دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

بھائی کو پکارتی ہوں تو وہ بھابھی کے کان سے سنتا ہے۔ میاں کو پکارتی ہوں تو وہ بدل گیا ہے۔ آسمان اونچا ہے زمین سخت ہے، کہاں جاؤں؟ میری فریاد کون سُنے؟ وہ عدالت والا جب عدالت لگائے گا تو وہی سُنے گا۔ بس اُسی کی عدالت لگنے کا اب انتظار ہے"!

بقیہ: سوچ بچار از صفحہ ۲

.... اس دستور کے اسلامی تقاضے پورے کرنے کے لئے سال بھر میں اس نے کیا کیا۔

جو قوم، جو جماعت، جو پارٹی اور جو شخصیت اپنے منہ سے بولے ہوئے بول کو خود ہی پامال کرنے پر اُتر آئے، جو اپنے ہی آپ کو فریب دینے پر تُل جائے، جو اپنے ہی حق میں منافق ہو ٹھہرے وہ کوئی ترقی نہیں کر سکتی، وہ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتی ——— وہ زندہ نہیں رہ سکتی

گزرے ہوئے سال کا ریکارڈ دیکھو اور سالِ نو کے لئے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو کہ کیا ذمہ داریاں سامنے ہیں اور ان کو کس طرح سرانجام دینا ہے!

یارانِ حلقہ

برادرِ گرامی قدر! سلام و نیاز! 'چراغِ راہ' کا تازہ شمارہ جون پورے ہو کر آج مجھے ملا۔ حسبِ معمول میں نے از اوّل تا آخر پڑھ ڈالا۔ آپ کی نظم 'تجدید' کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر چیز نظر نہ آئی۔ کوثر نیازی کی غزل بھی سرمایۂ نشاط نہ بہم پہنچا سکی۔ کیا وہ بھی پُرگوئی کے شکار ہو گئے۔ وہ تو بہت سنبھل کر کہنے والوں میں ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ بھی کبھی کبھی "لغزشِ یک گام" کر جاتے ہیں۔ ان کی غزل میں ایک نعتیہ شعر بھی شامل ہے۔ یہ شعر اگر کسی مکمل نعت کا جزو ہوتا تو گوارا ہو جاتا مگر غزل میں کھپ نہیں رہا ہے۔

واقعی آپ نے ایک عرصہ بعد ایک طویل نظم لکھی ہے۔ طویل نظموں میں قدم قدم پہ ناکامیوں کا خطرہ رہتا ہے بیانیہ شاعری (Narrative Poetry) میں اکثر حسن کی عدم ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ بھی اس خطرے سے نہیں بچ سکے ہیں۔ مثلاً جہاں آپ نے رسولِ مقبول پر سختیوں کا تذکرہ کیا ہے وہاں حسنِ بیان نذرِ المزود پڑ گیا ہے اس موقع پر تو آپ کو کامیاب ہونا چاہیئے تھا اس وجہ سے کہ آپ نے اسی راہ میں بہت سی عقوبتوں کا سامنا کیا ہے ——— اور آپ اس راہ کے پیچ و خم کی سختیوں سے عملاً دوچار ہو چکے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے صرف ان عقوبتوں کی تخئیلی ترجمانی (Imaginative Expression) سے ہی کام لیا ہے۔ اس موقع پہ آپ اپنے سوزِ دروں کا اظہار بھی کر سکتے تھے اور موضوع سے اپنی شخصیت کو ہم آہنگ بھی۔ موضوع سے شاعر کی یہ ہم آہنگی اکثر بڑے ادب کو جنم دیتی ہے ——— مگر افسوس ہے کہ آپ ایسا نہ کر سکے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ تحریکی مرحلوں پہ اس نکتے کو سامنے رکھیں گے۔ ———

اس نظم میں مجھے جو بات پسند آئی وہ ہے اس کا رمزیاتی اور کنایاتی اسلوب۔ امتِ مسلمہ کی روحانی تاریخ کو بڑا حسین ملبوس دیا ہے آپ نے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اب رمزیاتی شاعری کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر رہے ہیں بلکہ اجاگر بھی کر رہے ہیں ——— بقول ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) عظیم شاعری پولیس کے ڈنڈے کی طرح سیدھی نہیں ہوتی۔ علامتوں کا استعمال اکثر ہنگامی موضوعات کو بھی ابدیت بخش دیتا ہے ——— اب ادب میں راست اندازِ بیان کا زور گھٹتا جا رہا ہے ——— ہمارے یہاں کم ادیبوں نے اس بات کو محسوس کیا ہے۔ مبلغانہ اور واعظانہ شاعری کا دور گیا۔ آج کے سامع اور قاری پہ کوئی بات اوپر سے لادی نہیں جا سکتی۔

شاعر صرف بعض بنیادی حقائق کی طرف اشارے کر سکتا ہے اور یوں بھی بقول اقبالؒ ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست

حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اور پھر آپ کی یہ نظم زندگی کی حدیثِ سوز و ساز بھی ہے اور اس حدیثِ سوز و ساز کا مزاج بھی میرے خیال میں جلوتی سے زیادہ خلوتی ہے

ایک نمایاں بات اور بھی نظم میں محسوس ہوئی، وہ یہ کہ آپ نے ایک کھلی معاشرتی فضا اور نظام کو اپنا محبوبِ نگہ و نظر بنا کر پیش کیا ہے۔ آپ نے اس محبوب کے ہجر میں آنسو بہائے ہیں، چوٹیں سہی ہیں، زخم کھائے ہیں اس محبوب کی موجودگی نے نظم کو عشق کے تب و تاب سے مملو کر دیا ہے۔ آپ نے اس محبوب کے ماتھے کو اُفق پر چمکتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کی بوئے پیرہن محسوس کی ہے۔ شعر و ادب کے لئے بہر حال ایک محبوب کی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ محبوب کوئی پیکرِ محسوس ہو یا کوئی نظریۂ زندگی۔ آپ کی نظم کی نمایاں خصوصیت یہی ہے اور غالباً مجھے اسی وجہ سے پسند بھی آئی۔

ان باتوں کے علاوہ آپ نے فطری تمثیلیں (Natural Imageries) بہت اچھی طرح پیش کی ہیں۔ کالی گھٹا کو جل پری بتا کر آپ نے میرے جمالیاتی ذوق کی تسکین کی ہے ——

اب آخر میں آپ کی نظم کی چند لسانی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔ آپ نے بھگانے کے لئے لفظ "کھدیڑنا" استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اچھا لفظ استعمال کر سکتے تھے۔ یہ لفظ بہر حال عامیانہ ہے۔ "نرگس کی آنکھوں کا مٹکنا" بھی گراں گزرتا ہے اور ذہن میں جو تصویر بنتی ہے وہ بھی انتہائی غیر جمالیاتی ہے —— اس طرح کی اور بھی لسانی غلطیاں ہیں، جن سے آپ آسانی سے دامن بچا سکتے تھے —— آپ کی اکثر نظموں میں اس طرح کی غیر مانوس ترکیبوں اور الفاظ کی وجہ سے کمزوری پیدا ہو جاتی ہے —— جہاں آپ بہت کچھ پڑھتے ہوں گے وہاں اگر اردو کے کلاسیکی ادب کے مطالعہ کے لئے بھی تھوڑا وقت نکال لیں تو اس کی خامیاں ایسی نہیں جو دور نہ ہو سکیں —— پھر بھی مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب آپ تعمیری شعر و ادب میں نئے فارم اور نئے اسالیب کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کی یہ تمام کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں اگر آپ اپنے ادب الاساتذہ کا بھی خاطر خواہ مطالعہ کر لیں۔ اس لئے کہ بقول T.S. ELIOT ہر ادیب کو نیا بننے کے لئے بہت کچھ پرانا بھی بننا پڑتا ہے۔ امید ہے کہ آپ ہمیشہ کی طرح میری معروضات پر غور فرمائیں گے اور جو اختلافات ہوں گے انہیں بھی لکھیں گے۔ میں آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آ گیا ہوں۔ انگریزی ادب سے ایم اے کرنے کے لئے —— —— بہت سارا وقت مطالعہ میں چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کچھ تخلیقی کام کرنے کا موقعہ ذرا کم ہی ملتا ہے

پچھلی گرمیوں میں ضرور کچھ نظمیں لکھی تھیں۔ ان میں سے اکثر میری اہلیہ قدسیہ نکہت کے پاس محفوظ ہیں میں ان کے پاس لکھ رہا ہوں کہ وہ براہِ راست آپ کے پاس میری تخلیقات بھیج دیں۔ ہفتہ عشرہ میں چند نظمیں آپ کو ضرور مل جائیں گی۔ ابنِ فرید صاحب نے اب کی مرتبہ لکھنؤ کی ادبی کانفرنس میں بتایا تھا کہ خالد احمد صاحب نے شعر و ادب کی تنقید کے سلسلے میں کوئی نیا پروگرام بنایا ہے اور اس سلسلے میں میرا پتہ بھی مانگا ہے۔ میں بہر حال ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ میرا پتہ یہ ہے : انور صدیقی۔ ذوالفقار منزل، دودھ پور، علی گڑھ (یو۔پی)

امید ہے کہ اپنی اولین فرصت میں آپ جواب سے نوازیں گے۔ خالد صاحب کی خدمت میں سلام شوق پیش کریں۔

آپ کا انور صدیقی

عزیزِ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اپنی نظم "تجدید" کی ایک قدر و قیمت آپ کا خط پاکر میری نگاہ میں پیدا ہوگئی ہے۔ اس نظم نے آپ کو عالمِ خود فراموشی سے ڈھونڈھ نکالا اور دیرینہ روابط کی تجدید کرادی۔

اس نظم پر جس محبت آمیز انداز سے آپ نے خصوصی نگاہِ تنقید ڈالی ہے اس سے بہت متاثر ہوا۔ بہ حیثیت مجموعی آپ کے نکات سے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان سے استفادہ کرنا واجب ہے۔ مشکل یہ رہی کہ اس نظم کی نوعیت ——— اس منصوبہ بندی کے مطابق جو میرے ذہن میں تھی ——— کچھ ایسی تھی کہ معنویت، فن اور اسلوب کے ہر جہتی تقاضوں کو مرتبۂ اول پر پورا کرتے جانا پوری طرح ممکن نہ تھا۔ نظم کی اصل روح فلسفیانہ تھی ——— شاعرانہ جذباتیت کے لئے میدان تنگ تھا۔ اسی سبب سے میں نے اس میں دو باتیں پیدا کیں، ایک تو جمالِ فطرت کو اس میں حل کیا اور دوسرے زندگی کو ایک معشوق کا مرتبہ دے کر رومانوی جذباتیت کے راستے کھول لئے۔ مگر ذہن میں اصل موضوع اور اس کی مقصدی ضروریات بہر حال غالب تھیں اور غالب ہیں

بیانیہ شاعری کے دائرے میں جب طویل نظمیں لکھی جاتی ہیں تو کوئی شک نہیں کہ غزل کی طرح حُسن میں شان یکتائی قائم نہیں رہ سکتی۔ آپ ابھی تک ایک غزل گو شاعر ہیں اور آپ کو خود تجربہ ہے کہ پانچ سات اشعار کی ایک غزل میں بھی زورِ بیان اور ندرتِ تخیل کی یکسانی کو نبھائے جانا آسان نہیں ہوتا، کجا کہ معاملہ نظم کا ہو اور خصوصاً طویل بیانیہ نظم کا۔ نظم بیانیہ ہو یا اظہاریہ، خارج کی ترجمان ہو یا داخلیت کی مظہر، کسی بھی طور غزل کے معیار پر نہیں پرکھی جا سکتی۔ اس میں آتار چڑھاؤ ضرور ہوگا۔ پھر جس نظم میں فکر و خیال کے کارواں کو ضمنی موضوعات کی مختلف وادیوں سے گزرنا ہو اس میں ہر مرحلے پر، ہر بند میں وہ سراسی رنگ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ منظر نگاری، حقیقت بیانی، واقعہ بندی، نعت گوئی اور پیغام سنانے کے کٹھن فرائض جب ایک ہی سلسلۂ نگارش میں سرانجام دینے ہوں تو ان بدلتی کیفیات میں یکسانی کی جستجو کا حاصل مایوسی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مثلاً خصوصیت سے آپ نے رسولِ مقبولؐ پر سختیوں کے تذکرے والے بند کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں حُسنِ بیان کمزور پڑ گیا ہے۔ آپ کی یہ رائے اپنی جگہ درست ہوگی، لیکن شاعر کی مشکل کو آپ نے زیرِ نظر نہیں رکھا۔ اسے اگر محض رسولِ مقبولؐ کی شانِ مظلومی کو دکھانے کے لئے ایک مستقل نظم لکھنی ہوتی تو وہ بہت مشکل تک جاتا، یہاں تو اسے تیئس برس کی واقعاتی تاریخ کو چند اشاروں کی شکل میں ضمناً توجہ طلب بنانا تھا اور

اس کا اصل موضوع اس کے رہوارِ فکر کی باگ تھامے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا اور وہ دُور تک جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ محض ایک بند ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ روم و ایران کی تہذیبوں کے زیرِ سایہ زندگی بُری طرح پامال تھی، وہ رحم کی بھیک مانگ رہی تھی، اسے کوئی اماں دینے والا نہ تھا، سرورِ عالم نے زندگی سے ایک میثاق لیا اور اسے پناہ دی، اس پناہ دہی کا حق ادا کرنے کے لئے بھاری قربانیاں دیں، قربانیاں دے کر زندگی کو محبت کے ایک لہلہاتے ہوئے باغِ جناں میں بدل دیا۔ اس سلسلۂ کلام میں قربانیاں دینے کا واقعہ محض ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے چند اشارات کے ذریعے اسے بیان کیا گیا ہے۔ گویا ایک پورا بند بھی اس ضمنی موضوع کو نہیں دیا جا سکا۔ پوستہ سلسلۂ بیان کی اس جزوی کڑی کو ایک جنوی کڑی کی حیثیت سے آپ لیتے اور پیشِ نظر بند کے پہلے چھ شعروں اور آخری چار شعروں کے درمیان آنے والے پانچ اشعار کو دیکھتے تو ایک لمبی تاریخِ ابتلاء کو اتنے اجمال سے سامنے لانے کی کٹھن ذمہ داری کی ادائی پہ آپ کچھ زیادہ غیر مطمئن نہ ہوتے۔ ان پانچ اشعار میں کم سے کم سادگیٔ بیان کا حُسن ضرور موجود ہے۔ رہا یہ امر کہ یہاں شخصی تجربات و احساسات کو سمو دینے کا بہترین موقع تھا جسے ضائع کیا گیا ہے، یہ بھی ایک ایسا اعتراض ہے جو شاعر کے پورے نقشہ کو بیک نظر سامنے نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت شاعر نے اپنے شخصی احساسات کے اظہار کے لئے اس نظم میں دوسرے مواقع پسند کئے ہیں۔ وہ پانچویں بند میں اپنے درد کے اظہار کا آغاز کرتا ہے مگر ابہام کے ساتھ۔ چھٹا بند اس کے درد و کرب کے اصل سرچشمے کو سامنے لے آتا ہے اور ساتویں بند میں وہ اپنی پوری ملی تاریخ کو ایک طویل شبِ فرقت کی سرگزشت کے طور بیان کرتے ہوئے سب کچھ کہہ لیتا ہے۔

میں نے صراحت اور کنائت دونوں کے تجربے کئے اور بالآخر کنائت کا راستہ منتخب کر لیا ہے۔ یہ نتیجہ ہے درحقیقت تغزل کی طرف متوجہ ہونے کا۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارا حلقہ صراحت کا طلب گار ہے اور اسی کا لحاظ کرتے ہوئے پہلے پہل میں اُس جانب بڑھا، لیکن ادب و شعر کے وسیع تقاضوں اور اس کی دوامی اور انسانیت گیر قدروں کا احساس ہونے پر میں نے اپنے حلقے کے ذوق کو اہمیت دینا چھوڑ دیا۔ اب اہم ترین ٹھوس حقیقتوں کو رمزیت و ایمائیت اور کنایت و استعارت کے پیرایئے میں اجاگر کرنے کا خاصا تجربہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں ایک نظم لکھی ہے جو تمام تر تحریکِ اسلامی کو موضوع بناتی ہے۔ مگر پیرایۂ بیان کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کا ایک بند ملاحظہ ہو :

منتظر تھے، کبھی قسمت کی گرہ ٹوٹے گی — ترے گیسو کبھی لہراتے، مہکتے ہوں گے
ترے ہونٹوں سے تبسّم کی کرن پھوٹے گی — پھر ترے نینوں سے پیمانے چھلکتے ہونگے

یہاں بھی وہی صورت، کہ تحریک ایک معشوق کے پیرائے میں پیشِ نظر ہے۔ تجدید میں زندگی کو محبوب بنا کر لیا گیا ہے تو اس طرح کہ خیال میں جذبے کی خاص گھلاوٹ موجود ہے۔ اس کا ماتھا افق پہ چمکتا دکھائی دیتے ہوئے "بوئے پیرہن" محسوس کرنے تک بات محدود نہیں رہی، بلکہ ذکرِ حسن کی "خوشبو" کا ہے۔ "آشنا سی یہ خوشبو ہے کس حُسن کی ؟" حسن کی یہ خوش بو، جو ممکن ہے آنکھوں سے سونگھی جاتی ہو، شعریت کے نقطۂ نظر سے احساس کی ایک اونچی نزاکت کو سامنے لاتی ہے اور پھر "آشنا سی یہ خوشبو"

نے تمہارا دلی قرب پیدا کر دیا ہے۔ دیکھئے، اب میں اپنی تعریف پر اتر آیا ہوں، کہنا صرف یہ تھا کہ آپ لُٹے پِٹے پن کہہ کر میرے مدعا کو اس کی اصل سطح سے نیچے لے آتے ہیں۔ بہرحال میں اب نظریہ و مقصد کو معشوق یا محبوب کی حیثیت میں لے رہا ہوں۔ اس معاملے میں شعلۂ خیال کا مقدمہ ——— "کوئی معشوق ہے" ——— اپنی جگہ بالکل واضح ہے۔

اب رہ گیا لسانی کمزوریوں کا سوال! ——— یہاں آکر میں فوراً اعترافِ قصور کر لوں گا، بلکہ پیشگی کر چکا۔ لیکن یہاں بھی میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ نئے تجربے کرنے کا رجحان میرے ہاں پایا جاتا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ لسانی اور فنی باریکیوں کا اہتمام اور نئے تجربوں کا رجحان بیک جا یکساں مرتبے پر شاذ ہی پائے جاتے ہیں۔ جو لوگ اُس طرف ڈھلک جاتے ہیں وہ نُدرت و جدت کے تقاضے پورے کرنے میں کوتاہ رہتے ہیں اور جو لوگ ایجادِ معانی کی طرف زیادہ کاوش کرتے ہیں وہ اُس پہلو میں کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ بلاشبہ دونوں پہلوؤں کا یکساں طور پر روشن ہونا بڑی چیز ہے، مگر ایسے نادر فنکار شاذ ہی پائے جاتے ہیں۔ کم از کم ایسا نادر فن کار بننا میرے بس میں نہیں ہے ——— اور میرا طریقہ یہ ہے کہ میں جو کچھ بن سکتا ہوں، وہ کچھ بننے کی حسرتِ ناکام میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی بساط کے مطابق کام کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ لسانی پہلو سے غیر معمولی حساس پن ہمارے ہاں لکھنویت کہلاتا ہے۔ مجھ پر لکھنویت کا کوئی پرتو نہیں پڑا بلکہ الٹا میرا جھکاؤ جدید شاعری کے باغیانہ انداز کی طرف ہے۔ مگر میری بغاوت روائت کو یکسر تباہ کر دینے والی نہیں، بس روائت پرستی میں مانع ہے۔ "لکھنویت" ایک آدھ لسانی کمزوری دیکھ پائے گی تو قیمتی سے قیمتی نگارش کو اٹھا کے پھینک دے گی، لیکن جدیدیت لسانی کمزوری کو نظر انداز کر دے گی، بشرطیکہ معنویت اور تخیل اور غائت کے لحاظ سے کوئی چیز من حیث المجموع اچھی ہو۔ چنانچہ اس نظم میں تو ایک تشبیہات اور کنائت و استعارہ کے بہت سارے اچھے نمونوں کے جمع ہونے کے باوجود وہ ایک مقام لسانی لحاظ سے آپ کو کھٹکے تو آپ نے ان کو بہ شدت محسوس کیا، لیکن بخلاف اس کے میں اگر ایسی کسی نظم کو پرکھنے بیٹھتا تو میں اس کی مثبت قدر پیدا کرنے والے مقاماتِ کثیر کو زیادہ اہمیت دیتا اور اس کے کمزور مواقع کو سرسری سی گرفت کرتا۔

اب ذرا جائزہ لیجئے ان مواقع کا جن کو آپ نے نشان زد کیا ہے۔ "کھدیڑنا" ایک ایسا لفظ ہے جس کے مفہوم کو کوئی دوسرا لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ آپ فرماتے ہیں "بھگانے کے لئے لفظ کھدیڑنا استعمال کیا ہے" ——— حالانکہ محض بھگانے اور کھدیڑنے میں بڑا فرق ہے۔ بہت سے دوسرے الفاظ بھی موجود ہیں، مثلاً "نکالنا" دور ہٹانا، ہانک دینا، دھکیلنا، دفع کرنا۔ لیکن یہ سب مفہوم میں باہم دگر مختلف ہیں۔ کھدیڑنا ان سب سے الگ ایک تصوّر دلاتا ہے۔ اس میں دھکے دے کر نکالنے کے ساتھ ساتھ تذلیل و توہین کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "کھ" اور "ڑ" کے استعمال کی وجہ سے اس لفظ میں جو صوتی بوجھل پن ہے اسے آپ نے اسی لکھنوی ذوق کے تحت غیر معمولی درجے میں محسوس کیا ہو مگر یہ نامانوس آوازیں ہی تو اس نامعلوم طرزِ عمل کو صوتی لحاظ سے واضح کرتی ہیں جو زندگی کے ساتھ روم و ایران کی تہذیبوں نے روا رکھا تھا۔ صوتیت اور معنویت جہاں ہم آہنگ ہو جائیں، وہاں تو فنی قدر بڑھ جاتا ہے۔ یا تو اگر وہ زبان اس لفظ کو اپنانے سے انکار کرتی ہو، یا بہ مطابقِ مفہوم

میں سے ایک یہ بھی ہے۔ مولینا عبداللہ العمادی جیسے صاحبِ علم و فکر نے علم حدیث کی حیثیت پر مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے مختصر مگر فاضلانہ بحث کی ہے۔ واضح کیا ہے کہ علمِ حدیث روائت و درائت کے کن محکم اصولوں پر قائم ہے۔ اور دوسری طرف ان شبہات و اعتراضات کا جواب دیا ہے جو بالعموم اٹھائے جا رہے ہیں۔

اسے مکتبہ نشأۃِ ثانیہ، حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔ قیمت عہ ؍

• فقہ الحدیث :

اس کتاب کے مؤلف جناب مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دار العلوم دیوبند ہیں۔ اس میں فقہی عنوانات کے تحت ان احادیث کے تراجم دیئے گئے ہیں جن سے فقہائے احناف نے مسائل کا استخراج کیا ہے۔ بیچ بیچ میں سوال و جواب کے طرز پر متعلقہ امور کی صراحت کی گئی ہے۔

نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، آرام باغ، کراچی اس کا ناشر ہے۔ قیمت عہ۔

• آسمانی فیصلے (بہ جواب قرآنی فیصلے) :

پرویز صاحب کے خاص نظریات و افکار کے توڑ میں یہ کتاب مولوی میاں محمد حافظ نوشہروی نے لکھی ہے۔ ذہن عالمانہ ہے مگر انداز کسی قدر مناظرانہ۔ مشکل یہ ہے کہ پرویز نے جس ذہنی دائرے میں تاخت و تاراج کی ہے وہ اس کتاب کے محترم مؤلف کی زد سے باہر ہے۔ تاہم اخلاص کے ساتھ ان کی یہ محنت قابلِ قدر ہے۔

اسے ادارۂ عروجِ اسلام، خوشاب، سرگودھا نے شائع کیا ہے، قیمت بلا جلد عہ ۱۲ ؍

• سیرتِ پاک :

جناب بشیر محمد شارق دہلوی نے اس کتاب میں سیرتِ نبویؐ کی ایک مختصر جھلک بچوں، بچیوں اور کم خواندہ حضرات کے لئے پیش فرمائی ہے۔

یہ نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب کراچی کی شائع کردہ ہے۔ قیمت عہ ۸ ؍

• ترجمانُ القرآن :

مولانا عبدالحق عباس، مدیر مدرستہ البنات لاہور کی عرق ریزی کا یہ حاصل قرآنِ مجید کے ایک ایسے ترجمہ پر مشتمل ہے جس کی مدد سے قرآن کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی دستگاہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ آیات کے اجزا ایک ایک سطر میں دے کر ہر ہر لفظ کا ترجمہ الگ الگ خانوں میں درج کیا گیا ہے اور پھر ایک الگ سطر میں بامحاورہ ترجمہ بھی ثبت ہے۔ طلبہ و طالبات کیلئے یہ خدمت علی الخصوص مفید ہے۔ چھٹے پارے کا ترجمہ اس وقت سامنے ہے۔

یہ المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔ لیک روڈ، لاہور کی پیش کش ہے۔

قیمت بلا جلد عہ ؍

● ہمارے دستوری مسائل کا نظریاتی پہلو :

جناب محمد ظفر احمد انصاری پاکستان کی ان گراں مایہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو اسلام کی حقیقت آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کے نظریات وعلوم سے بھی باخبر ہیں۔ اس علمی مرتبہ کے ساتھ موصوف نے ان مسائل کو لیا ہے جو تدوین دستور کے دوران میں جدید طبقے کی طرف سے اٹھائے گئے تھے۔ انصاری صاحب نے وسعتِ علم سے ان تمام چیزوں کے نظائر پیش کر دیئے ہیں جن کو دستور کا جزو بنانے سے ہمارے اکابر ہچکچاتے رہے تھے۔ یہ چھوٹا سا کتابچہ بڑی علمی وقعت کا حامل ہے۔

آفاق پبلیکیشنز، بندر روڈ کراچی اس کا ناشر ہے۔ قیمت عمر

● بچے کی تربیت :

ابنِ فرید، بی۔ اے نے ضرورت کے ایک اہم موضوع کو جو اب تک نظر انداز رہا ہے، محلِ کاوش بنا کر بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔ موصوف جدید علم النفس کا مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریۂ اخلاق سے آراستہ ذہن کے مالک ہیں۔ ان کا یہ سلسلۂ مضامین "الحسنات" رام پور میں شائع ہوتا رہا اور ہمارے زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ ابنِ فرید نے تربیتِ اطفال کے لئے رہنمائی بہم پہنچا کر نہ صرف والدین، بلکہ بچوں پر بھی بڑا احسان ہے۔

مکتبۂ الحسنات، رام پور (انڈیا) کی یہ پیشکش ۱۲/عہ فی جلد کے حساب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

● البعث الاسلامی :

ارضِ ہند و پاک کا یہ نوخیز جریدہ عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کی ادارت سعید الاعظمی کے ہاتھ میں ہے، لیکن اسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی حاصل ہے۔ اس جریدے کی اصل روح دعوتِ اسلامی ہے اور اس کا پیرایہ معیاری ادبیت ہے۔ عالمِ اسلام کے متعلق خاص خاص چیزیں بھی آتی رہتی ہیں۔

۳/۷ گوئن روڈ لکھنؤ (انڈیا) سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۸ ر۔ پاکستانی حضرات مستقل خریداری کے لئے دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی کو ذریعہ بنائیں۔

● مسلمہ :

عورتوں اور بچیوں کا یہ ماہنامہ مولینا عبدالحق عباس کی زیرِ نگرانی چار افراد پر مشتمل ایک ادارۂ تحریر کی کاوشوں سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی روح اسلامی اور رنگ مشرقی ہے۔ خواتین کو امورِ خانہ داری کے سلسلے میں بھی رہنمائی دی جاتی ہے۔ مدرسۃ البنات کا یہ خاص آرگن ہے۔ بہاولپور، پنجاب، آزاد کشمیر اور کراچی کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے۔

۱۵۔ لیک روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۸ آنے۔

● "تجلّی" کا خاص نمبر :

ماہنامہ تجلّی (دیوبند) سے ہمارا حلقہ واقف ہے۔ یہ ایک خادمِ دین جریدہ ہے اور دیوبندی مدرسۂ فکر کی اس شاخ کا ترجمان

ہے جو اپنے آپ کو اسلافِ دیوبند کے جذبۂ اقامتِ دین اور مسلکِ تعاون علی البرّ کی وارث سمجھتی ہے۔ اس کے بالمقابل دوسری شاخ وہ ہے جو اپنے نامور رجال سمیت شدید گروہی عصبیت اور اشخاص پرستی میں مبتلا ہو کر دین کی خدمت کے نام سے دین کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ قدرتی طور پر دونوں فریق جماعتِ اسلامی کے کام کے متعلق دو متصادم آراء رکھتے ہیں۔ ماہنامہ تجلی کا مکتبِ فکر اختلافات کی گنجائش چھوڑ کر یہ نقطۂ نظر رکھتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا کام بحیثیتِ مجموعی دین کے تقاضوں کے مطابق اور اس کے حق میں ایک ایسی خدمت ہے کہ اس میں اہلِ دین کو ہر ممکن تعاون بہم پہنچانا چاہیے۔ مقابل کا ذہن جماعتِ اسلامی کے خلاف ایسے شدید گروہی اشتعال میں مبتلا ہے کہ وہ اس کی ہر صحیح اور معقول بات میں بھی کیڑے ڈالتا رہتا ہے۔ نکتے چھانٹنا، گمراہی اور ضلالت کے لیبل چسپاں کرنا، فتوے لگانا، مناظرانہ اینچ پینچ سے مسلمہ صداقتوں تک کو مسخ کر دینا اور مدرسہ دیوبند کے اساتذہ اور اس علمی مرکز کے تمام متوسلین میں ہر تدبیر سے جماعتِ اسلامی کے خلاف اندھا تعصب پیدا کرنا ہمارے کچھ دیوبندی بزرگوں کا مصرفِ حیات بن چکا ہے۔ تجلی محض جذبۂ حق پژوہی کے تحت اس روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور ان کے سامنے پورے دلائل و شواہد کے ساتھ کلمۂ حق پکارتا ہے اور ان کے طرزِ عمل کا تجزیہ کر کے ان کی لغزشوں کو چھانٹ دیتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد طیب اور ان کے ارادت مندوں نے جو اُشقلے پے در پے چھوڑے ہیں ان میں سے ایک یہ الزام ہے کہ جماعتِ اسلامی ایمان کے ساتھ عمل کو لازمی سمجھتی ہے اور اسی بنا پر وہ بے عمل مسلمانوں کو مسلمان نہیں مانتی۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث ماہنامہ تجلی کے تازہ خاص نمبر (مارچ) میں کی گئی ہے۔ بحث میں مسئلہ کی اصولی حیثیت کو بھی ممیز کیا گیا ہے اور جماعتِ اسلامی کے موقف کو بھی مغالطہ کے اس دھند سے نکال کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو ان دیوبندی بزرگوں نے پھیلا دیا ہے۔ اس خاص نمبر میں تصوف کے بارے میں بھی مولانا مودودی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ اس شخص کا کام روحانیت کے جوہر سے محروم ہے۔ علاوہ بریں عرس و فاتحہ اور بعض دوسری مذہبی رسوم کے بارے میں بحثیں ہیں، فقہی سوالات و جوابات بھی ہیں، ایک فرضی مناظرہ کی دلچسپ مزاحیہ روداد ہے، اور کچھ نظمیں بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ اسی اشاعت میں ایک افسوسناک سانحہ کا ذکر بھی ہے کہ پچھلے دنوں دفترِ تجلی میں آگ لگانے کی کوشش کی گئی، مگر خدا نے بچاؤ کا سامان کر دیا۔

ماہنامہ تجلی کی اصل قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ مذہبی دائرے میں نوجوان طاقت کا ترجمان ہے۔

قیمت خاص نمبر ڈیڑھ روپیہ۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ مستقل خریدار بننے والوں کو یہ نمبر چندۂ سالانہ ہی میں مل سکتا ہے۔

اسلام ——— کوئی انفرادی مت اور دھرم نہیں!

یہ ایک اجتماعی تحریک ہے —— یہ ایک تاریخی قوت ہے!

اس تاریخی قوت نے بار بار اٹھ کر باطل کے اقتداروں سے ٹکر لی ہے!

دُور کیوں جائیے؟ خود پاکستان کی سرزمین اس قوت کا ایک ظہور دیکھ چکی ہے!

بھولئے نہیں! تحریکِ مجاہدین نے خون کے کچھ قطرے یہاں لنڈھائے تھے!

وہ رائیگاں نہیں گئے بلکہ تحریکِ نظامِ اسلامی کی شکل میں برگ و بار لائے ہیں

یہ داستانِ جذب و شوق

جسے انگریز کے سیاسی تدبّر نے برعظیم ہند کی تاریخ کے اوراق سے بظاہر محو کر کے چھوڑا تھا!

ہم

اس داستان کو سامنے لا رہے ہیں

•

آپ کی تاریخ کا وہ گم شدہ ورق جو

سیّد احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

نے اپنے خون کی روشنائی سے لکھا

•

ہندوستان کی

پہلی اسلامی تحریک

مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نورِ خامۂ قلم سے ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ "چراغِ راہ" ——— لاہور و کراچی

ماہنامہ فاران کراچی کا عظیم الشان

توحید نمبر

جون ۵۷ء میں آرہا ہے

شرک و بدعت کے بت کدوں میں نعرۂ توحید کی گونج، عجمی صنم کدوں میں دینِ خالص کا غلغلہ، ایک ایک مقالہ ایمان افروز، علم و تحقیق کی وہ راہیں جو صراطِ مستقیم سے جاکر ملتی ہیں۔ اُردو ادب میں اصلاح و انقلاب کا مثالی اقدام، کتاب و سنت کی طرف واپسی کی دعوت۔

اب تک جن علمائے کرام و اہلِ فکر حضرات کے مقالے آچکے ہیں

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب۔ مولانا محمد اسمٰعیل سلفی صاحب۔ مولانا محمد ناظم ندوی صاحب۔ مولانا عبد الحمید ارشد صاحب، مولانا عامر عثمانی صاحب (مدیر تجلی دیوبند) مولانا محمد اسحٰق صاحب۔ مولانا محمد ادریس ندوی صاحب۔ مولانا حافظ محمد مجیب اللہ ندوی صاحب، مولانا محمد امام الدین رام نگری صاحب۔ مولوی ابو منظور شیخ احمد صاحب۔ مولانا ابو البیان حماد صاحب۔ محترمہ عطیہ خلیل عرب

عربی زبان کے سب سے بڑے انشا پرداز علامہ محمد البشیر الابراہیمی (الجزائری) اپنی کبر سنی اور علالت کے باوجود "توحید نمبر" کے لئے مقالہ تحریر فرما رہے ہیں۔ شاعروں کے نادر و اعلےٰ منظومات کے علاوہ ماہر القادری مدیر "فاران" کا معرکۃ آرا نقش اوّل بھی ہوگا۔

ضخامت	سرورق	قیمت
کم سے کم تین سو صفحات	رنگین و دلکش	تین روپیہ، محصول ڈاک رجسٹری آٹھ آنے

اور

مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ چھ روپیہ آٹھ آنہ میں ہی "توحید نمبر" دیا جائے گا

ہندوستان میں

دفتر "الحسنات" رام پور (یوپی) کو توحید نمبر کی قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ یا سالانہ چندہ چھ روپیہ آٹھ آنہ بھیجا جائے۔

منیجر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱
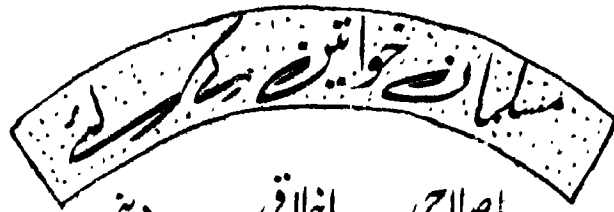
زیرادارت :- سید محمد ثانی حسنی — امۃ اللہ تسنیم (ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

آج کے مادی دور میں جبکہ فحش اور عریاں کتابیں اور رسالے گھر گھر پہونچ رہے ہیں۔ پردہ نشین خواتین کے ہاتھوں میں یہ ناقابل برداشت لٹریچر پہونچ رہا ہے اور خاندان کے خاندان بداخلاقی کے سیلاب میں بہے جارہے ہیں۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان شریف بہو بیٹیوں کو اس گندے اور گھناؤنے ماحول سے بچایا جائے اور ان کے ہاتھوں میں صالح اور اخلاقی لٹریچر پہونچایا جائے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ماہنامہ "**رضوان**" کا اجراء عمل میں لایا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ مسلمان خواتین میں صحیح دینی ذوق، اسلامی جذبہ، قوت عمل اور اخلاقی شعور پیدا کرے گا اور ان کے لئے دلچسپ و دل آویز بھی ہوگا۔ ہر مسلمان بہن اور بیٹی بلکہ ہر مرد و عورت کا اخلاقی و دینی فرض ہے کہ وہ اس رسالہ کو مسلمان گھرانوں میں پہونچانے اور اس کی اشاعت میں نمایاں حصہ لے۔

آسان زبان — موثر طرز بیان — مفید مضامین اور نظمیں

قیمت فی کاپی (تین آنے)

دفتر ماہنامہ **رضوان** لکھنؤ ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

SAFI
چمچہ بھر صافی
صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے
سے آپ نہ صرف خرابی خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہینگے
بلکہ صافی آپکے دورانِ خون میں توازن پیدا کرکے آپکے جسم میں تازہ
خون کی لہر دوڑا دے گی۔ صافی آپکے معدہ کے فعل کو درست بنائے گی۔
قبض سے محفوظ رکھے گی اور بھوک بڑھائے گی۔
موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے
کی عادت ڈالئے اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی
بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔
نوٹ:- بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے۔
ہمدرد دواخانہ، کراچی
PRODUCT

Printer & Publisher S. Kazim Ali
Printed at Nazar Printing Press Title Printed at Shan Electric Press KARACHI

روشنی گرمی حرکت

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

شمارہ نمبر ۵	جلد نمبر ۱۱

قیمت فی پرچہ: ۸ آنے

سالانہ چندہ: -/۵ روپے

مئی ۱۹۵۷ء

فہرست

دفتر ادارۂ تحریر:
نعیم صدیقی - مکتبہ چراغِ راہ - بیرون لوہاری دروازہ، لاہور

دفتر اشاعت و انتظام:
دفتر چراغِ راہ، فیض محمد فتح علی روڈ - کراچی نمبر ۱

سید کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ، فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

"ضبطِ تولید"

قاعدے کی بات ہے کہ جس بھی معاشرت کو آپ لیں گے وہ جب آئے گی تو پوری کی پوری آئے گی۔ اس کے چند اجزا لیں گے تو تدریجاً اس کے بقیہ اجزاء بھی آ کے رہیں گے۔ اصول لیں گے تو فروع بھی لینے پڑیں گے فروع لیں گے تو اصول بھی ساتھ آئیں گے۔ مقاصد جہاں سے لیں گے وہیں سے ذرائع بھی لئے جائیں گے اور ذرائع جہاں سے آئیں گے، مقاصد بھی وہیں سے مستعار لینے ہوں گے۔

جدید فرنگی معاشرت کا آغاز جب ہوا تھا تو اس وقت اتنے کھلے کھلے مفاسد سامنے نہیں آئے تھے، مگر ایک ایک قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا اور آج وہ معاشرت اپنی ساری گندگیوں کے ساتھ مکمل ہو کر انسانیت کے لئے تباہ کن بن گئی ہے۔ وہاں بھی پہلا قدم یہ تھا کہ صنفین کے درمیان سے معاشرتی روک ہٹا دی جائے۔ لیکن اس کے نتیجے میں بدنگاہی پیدا ہوئی، پھر بے قید شہوت رانی کا طوفان اٹھا۔ اور آخری حد یہ ہے کہ اب صنفی بدراہی (Sexual Perversion) کی انتہائی گھناؤنی صورتیں روز افزوں رفتار سے ترقی کر رہی ہیں۔ اسی طرح پہلا قدم یہ تھا کہ عورت کو خوئے حجاب سے آزاد کر کے سرگرم عمل کیا جائے مگر فطرتِ نسائیت کے ایک اہم تقاضے کو جب کمزور کیا گیا تو بے حجابی آخر کار بے لباسی تک پہنچی۔ پہلے چہرے اور سر کھلے، پھر گریبان کھلنے لگے، آستینیں کوتاہ ہونے لگیں، سائے اونچے اٹھنے لگے یہاں تک کہ لباس سکڑتے سکڑتے ایک سینہ بند اور ایک نیکر تک محدود ہو گیا۔ آج ایک عورت بند غسل خانے کے اس لباس میں بے تکلف بھری مجلسوں کے سامنے ناچ رہی ہے۔ لیکن قافلۂ ترقی اور آگے بڑھتا ہے اور ننگا کلب کی منزل آ جاتی ہے جو حیوانیت کی آخری معراج ہے۔

●

ہمارے بزرگانِ ملت اس فرنگی معاشرت کے فریفتہ ہیں اور ایک ایک جزو آہستہ آہستہ اٹھائے لئے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان اجزاء کو لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کل کی کل معاشرت اپنے تمام مفاسد سمیت مسلط ہو کے رہے گی۔ چہروں کی بے حجابی سے جو آغاز ہوا تھا اس کی اگلی منزل سامنے آ گئی ہے، یعنی لباس سکڑنے لگا ہے۔ آستینیں اور سائے اوپر کو چڑھ رہے ہیں اور گریبان کھلتے جا رہے ہیں اس ترقی کی آخری منزل وہی ننگا کلب ہو گی۔ اسی طرح صنفین کا معصوم سا اختلاط اب رنگ لا رہا ہے اور ناچ گانوں اور رنگ رلیوں کی مخلوط محفلیں اور ثقافتی تقاریب فروغ پا رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ بدکاری کا طوفان اٹھے گا اور نوبت اسی صنفی بدراہی پر پہنچے گی۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی "ضبطِ تولید" کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ خاندانی منصوبہ بندی کے غلاف میں لپیٹ کر لایا جا رہا ہے اور اسے

ہماری اسلامی ریاست کے صدر محترم کی اشیرباد حاصل ہو چکی ہے۔

اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے اور کیا نہیں کہتا ———— یہ سوال تو وہ لوگ چھیڑیں جن کو اسلام کے ہر فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہو لیکن وہ کہ جن کی پوری کی پوری زندگیاں اسلام سے بالکل آزاد اپنے رُخ پر چلی جا رہی ہوں، ان کو ایک ضبطِ تولید کے مسئلے میں یہ بتانا کہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے اور یہ نہیں ہے بالکل بیکار ہے۔ یہ لوگ عقلیت مآب ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی عقل و دانش ہی سے خطاب کیا جائے۔

●

ضبطِ تولید کو اگر ہم عقلیت کی کسوٹی پر لیں تو چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ خاندانی منصوبہ بندی کے پس منظر میں جو معاشی سوال ملک کو درپیش چلا جا رہا ہے اس سوال کے رُو سے ضبطِ تولید کی اصل ضرورت غریب طبقوں کو ہو گی، امراء کو یہ معاشی سوال درپیش ہی نہیں ہے۔ لیکن ہمارا غریب طبقہ مذہب پسند بھی ہے اور جدید تعلیم سے محروم بھی، ان وجوہ سے اس کے اندر ضبطِ تولید کی وبا اس وقت تک پھیل ہی نہیں سکتی جب تک کہ اسے تعلیم یافتہ نہ بنا دیا جائے اور ساتھ ہی اس کے اعتقادی مزاج کو بدل نہ ڈالا جائے۔ اس نوبت کے آنے میں ابھی سالہا سال کا وقفہ ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر ضبطِ تولید کے وظائف کا اثر امیر اور اونچے طبقے درمیانی طبقہ میں ہو گا۔ جب صورت یہ ہو کہ جس طبقے کو آپ کے نظریئے کے مطابق ضبطِ تولید کی ضرورت ہے وہ تو عملاً اس سے محروم رہے اور جس طبقے کو حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس پر عمل پیرا ہو تو معاشی پیچیدگی تو وہیں رہی جہاں تھی! تعداد کے لحاظ سے غریب طبقہ ہی پاکستان کی اصل آبادی ہے۔ اس کی رفتارِ تناسل تو علیٰ حالہا قائم رہے گی۔ چند بڑے گھرانوں نے اگر اپنی رفتارِ تناسل کم بھی کر دی تو اس سے ملک کے مجموعی احوال میں کیا فرق پڑے گا؟

سرمایہ دار طبقے میں تناسل کی کمی اور عوام میں تناسل کی زیادتی سیاسی لحاظ سے بھی سنگین نتائج پیدا کرے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام اکثریت کو محروم بنا کر چند افراد کی جھولیاں بھرنے کے جس طریق پر عمل کرتا ہے وہ اپنی رفتارِ نتیجہ خیزی کو بڑھا لے گا۔ اوپر کے طبقے کے افراد روز بروز کم ہوتے جائیں گے اور وہ کم افراد دولت اور ذرائع پیداوار کی سب سے بڑی مقدار کے مالک بنتے جائیں گے، دوسری طرف محروم ہونے والی اکثریت معاشی عمل کے تحت بھی بڑھے گی اور تناسل کی تیز رفتاری سے ان میں اضافہ کرے گی۔ لازم ہے کہ دونوں میں کشمکش بھی تیز تر ہوتی جائے اور آخر کار انقلابی تصادم واقع ہو کر رہے۔

دوسرے یہ کہ ضبطِ تولید بدکاری کے فروغ کا بہت بڑا اور موثر وسیلہ ہے۔ بدکاری میں ایک بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ فطرت کا نظام ہر تخم گناہ سے ایک شکلِ نتیجہ پیدا کر دیتا ہے۔ حرام اولاد ایک بدکار لڑکی کی قسمت کو تاریک اور اس کے خاندان کو رُسوا کر دینے کا موجب ہوتی ہے، نیز مزاسرار درون پردہ کو بے پردہ کر دیتی ہے۔ یہ سارے خدشات بدکاری کے فروغ میں موثر رکاوٹ بنتے ہیں۔ لیکن اگر ضبطِ تولید کے ذرائع و وسائل بھی عام ہو جائیں اور معاشرہ انہیں جائز بھی مان لے تو پھر ان سارے خدشات کا سدِّباب ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بدکاری کا طوفان اُمڈے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ یورپ میں بھی اسی وقت سے بدکاری کا زور ہوا ہے جب کہ

ضبطِ تولید کے طریقے عام ہو چکے تھے۔

ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہمارا یہ معاشرہ جو پہلے ہی عصمت و عفت کے لحاظ سے پستی کی طرف گرتا چلا جا رہا ہے، اس میں ضبطِ تولید کو رائج کر کے اسے تباہی سے کیسے بچایا جا سکے گا؟

تیسرے یہ کہ ضبطِ تولید کی تربیت کے ادارات کے قیام، اس کی تبلیغ کی مہم، اس کے متعلقہ آلات و ادویہ کی فراہمی وغیرہ پر جو مصارف قومی دولت میں سے اٹھیں گے، کئی برس تک وہ اتنے نتائج نہ دے سکیں گے کہ ان کی وجہ سے صارفین دولت کی تعداد کی رفتار افزائش معتد بہ حد تک کم ہو جائے اور مصارف سے زائد یا ان کے برابر بچت ہونے لگے۔ کیا یہ صرفِ کثیر ——— اور صرفِ بے جا ——— ایک غریب ملک کی معیشت کے حق میں ظلم نہ ہوگا۔

چوتھے یہ کہ فطرت کا ایک اٹل ضابطہ ہے جس کے تحت غریب اور پسماندہ اور بیماریوں کا شکار ہونے والے ملکوں اور طبقوں میں رفتارِ تناسل بڑھ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کا تحفظ نظامِ فطرت کے مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ غریبی و بیماری کے سبب جہاں زندگی کی تباہی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے وہاں صنفی حس اشتعال پذیر ہو جاتی ہے اور تناسلی اعضا زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اصل چارہ یہ ہے کہ عوام الناس کو افلاس اور بیماریوں کے چکر سے نکالنے کیلئے مثبت تعمیری کام کیا جائے۔ اس مثبت تعمیری کام کی کمی کو آخر ضبطِ تولید کی تدبیر سے کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔

پانچویں یہ کہ ضبطِ تولید کے جو طریقے اب تک معلوم ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں کہ جن پر پورا پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو خواتین کی صحتوں کے لئے بجائے خود تباہ کن ہیں۔ اس لئے سوچنا یہ بھی ہے کہ ضبطِ تولید کا طریقہ اختیار کرنے سے جو کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے بالمقابل کتنا نقصان قوم کے حصے میں آئے گا۔ اس کا صحیح صحیح فکری بجٹ بنا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ بجٹ خسارہ دار ہے۔

●

اس طرح جب ٹھنڈے دل و دماغ کیساتھ خالص عقلی جائزہ لیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس نے اس معاملے میں جو امتناعی اشارات دیئے ہیں وہ ہی برحق ہیں اور ایک مسلم قوم کو ان کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دینی چاہیئے۔

●

اصل صورتِ واقعہ صرف اتنی ہے کہ ہمارا اوپر کا طبقہ فرنگیت کی بعض انتہائی گندی لعنتوں میں خود گرفتار ہے اور پورے زور سے اس بات کے درپے ہے کہ ساری قوم کے سر ان لعنتوں کو چپک دے۔ معاملہ اس بلی کا سا ہے جس کی دم ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی تو پھر اس نے بڑی شاطرانہ چال سے کام لے کر ساری بلیوں کی دمیں کٹوا دی تھیں تاکہ اسے دم کٹی کہنے والا کوئی نہ رہے۔

کوثر اعظمی

بہادر شاہ ظفر

[بہادر شاہ ظفر کے مقبرے پر حاضری کا ایک تاثر]

•

شاعرِ حساس کیوں ہے دل کی دھڑکن تیز تر　　کون سا عالم ہے اب تخئیل میں پیشِ نظر
ہائے یہ خاک کا تودہ ہے کس کا مستقر　　آ رہی ہے ذرّہ ذرّہ سے صدائے الحذر

•

کون ہے یہ کون وہ شاہِ ظفر عالی دماغ　　خاندانِ مغلیہ کا آخری چشم و چراغ
وہ کہ اک بیمار بلبل زخم خوردہ داغ داغ　　جس کے اٹھتے ہی اجڑ کر رہ گیا دہلی کا باغ

•

وہ ظفر ہاں وہ بہادر شاہ ، شاہِ محترم　　کشورِ ہندوستاں کا تاجدارِ ذی حشم
آخری فرمانروائے مسلم و اہلِ صنم　　قلعۂ دہلی پہ لہراتا تھا وہ جس کا علم

•

وہ بہادر شاہ جو کہ فردِ تھا تو قید میں　　بخت کے ہاتھوں پڑا وہ حلقۂ تزویر میں
کھینچ کر لایا گیا جو سایۂ شمشیر میں　　قید کر رکھا گیا جو آہنی زنجیر میں

•

داستاں جس کی لکھی جاتی ہے اب بھی خون میں　　فرشِ خاکی پر پڑا ہے آج وہ رنگون میں
اب کہاں تابش کوئی باقی دُرِ مکنون میں　　یاس کی تحریر ابھری زیست کے مضمون میں

•

ہے فضا پر چار سُو چھایا ہوا غم کا سماں　　بن کے عبرت بے ثباتی ذرّہ ذرّہ سے عیاں
ہے لبِ ماحول پر بے مائگی کی داستاں　　گردشِ ایّام بھی ہے آکے یاں نوحہ کناں

•

شوکت و حشمت نہ کرّ و فر ہے نہ کوئی کرّ و فر
نے ہجومِ خواجگاں، نے حاجب و ایوان و در
نے صدائے با ادب، "ہشیار باش و با خبر"
کس قدر پُر درد ہے رُودادِ عمرِ مختصر!

•

یہ سرائے بے حقیقت بھی ہے کتنی پُر خلل،
کس قدر محکم ہے قانونِ مکافاتِ عمل،
آ گیا جو زد میں اس کی لے بہی اُس کو اجل
جھونپڑی مزدور کی ہو یا ہوں شاہوں کے محل

•

ذرۂ ناچیز؟ تا کے ہمسریٔ آفتاب
شمعِ محفل؟ تا بکے بے دُود رقصِ التہاب
تا بکے رُستہ شود از خارِ جلباں گلاب،
در میانِ موجِ خوب است ور نے تا کے حباب

مُسلمانانِ عالم اقدام کرتے ہیں

سا| ایک فیصلہ کن جہانی قوت بننے کے جو امکانات عالمِ اسلام کے لئے موجود ہیں وہ اس وقت تک بیکار ہیں جب تک کہ
حیاتِ تازہ کی صبح طلوع نہ ہو جائے۔ مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا دار و مدار اس پر ہے کہ ان کے اندر تمدنی و معاشرتی لحاظ
پیدا ہو اور وہ مدّوجزر پیدا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر فرناؔ ڈ اس بحرِ بیکراں کی لہروں اور رووں کا بغور جائزہ لیتا ہے وہ مستقبل کی تشکیل کرنے
طاقتوں اور ان کے رجحانات کی تشخیص کرتا ہے۔

ـنے ایک قوت زمینداروں، نوابوں اور رپا شاؤں کی ہے جو فی الحال بعض علاقوں پر بڑی بااثر ہے لیکن وہ اسے اہمیت نہیں دیتا،
ٹتا جارہا ہے۔ بہ مقابل اس کے وہ زراعت پیشہ دیہاتیوں ــــ فلاحین ــــ کو مستقبل کے بنانے میں ایک اہم عامل سمجھتا ہے
ـت کا یہ لاوا زیرِ زمیں دبا پڑا ہے اور کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا کہ عالمِ اسلام کے دیہات میں کیا کیا رجحانات کروٹیں لے
ـں ایک بار ملکیتِ زمین کے موجودہ نظام کے خلاف اضطراب پھیلے گا تو یہ لاوا بھڑک اُٹھے گا۔

د تمدنی نظام پر اثر انداز ہونے والی ایک قوت اس کی نگاہ میں شہروں کی روز افزوں آبادی ہے جو اپنے سابق ذرائع معاش سے
ـا چلی آرہی ہے اور ایک نئے معیارِ زندگی سے دوچار ہو کر معاشی مشکلات کی چکی میں پس رہی ہے چنانچہ عالمِ اسلام کی شہری آبادیوں
بڑھتی ہوئی بے چینی کی ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو ایک محرک طاقت بن کر تمدنی لحاظ سے بُرے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔
ـہ زیادہ اہمیت وہ ان نئے درمیانہ طبقوں کو دیتا ہے جو مغرب کی ذہنی ساخت اور اس کے صنعتی طریقوں کے فروغ کے نتیجے میں پیدا
میانہ طبقے زیادہ تر سرکاری افسروں، کاروباری لوگوں اور اہلِ دماغ پر مشتمل ہیں۔ وہ ان طبقوں میں مرکزی اہمیت سرکاری
ـیتا ہے۔ وہ اہلِ دماغ اور سرکاری عہدہ داروں کو ترکی انقلاب کے پیش رو قرار دیتا ہے اس کا مطالعہ یہ ہے کہ عرب ممالک
ـمیں یہی درمیانہ طبقہ قدامت پسندوں کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کے درپے ہے۔ مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں تبدیلی لانے
ـنِ "آفندی طبقہ" ــــ اہلِ دماغ اور سرکاری عہدہ دار ــــ مغربی افکار سے آراستہ ہو کر خمیر کا سا کام کر رہا ہے۔ اس
بے شمار افراد اپنے ذہنی اور عملی مرتبہ کے مطابق معاشی اور مجلسی معیار حاصل نہیں کر پا رہے۔ اس طرح مشرق کے موجودہ
ـلئے ایک اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یونیورسٹیاں جس طرح بھر پور ہیں، اس حالت کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے
ـرافزائش کتنی تیز ہوتی جارہی ہے۔
اور معاشی بدحالی کی اس کشمکش کے ماحول میں صنعتی دور شروع ہو رہا ہے۔ صنعتی مزدوروں کی تعداد اگرچہ سردست کم ہے لیکن

جدید صنعتی مراکز، تیل کے کنوؤں اور کارخانوں، ذرائع رسل و رسائل اور بندرگاہوں سے متعلقہ دائرہ ائے کار میں مزدور طبقہ نشوونما پا رہا ہے یہ مزدور طبقہ مابعد جنگ کے دور میں اپنے سیاسی اور معاشی مطالبے کر آگے بڑھ رہا ہے اور مغرب کی مزدور تحریک کے ہتھیاروں کا ابتدائی تجربہ کر رہا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر فرناؤ کی نگاہ ان مہاجر طبقوں پر بھی مرتکز ہوتی ہے جو فلسطین اور ہندیا کی تقسیم کی وجہ سے اپنے آبائی گھروں سے اکھڑ گئے ہیں اور ان کی پریشاں حالی تمدن و معاشرت کے لئے خطرناک امکانات اپنے ساتھ رکھتی ہے۔

مزید براں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ عورت آہستہ آہستہ اجتماعی زندگی کی عوامی سرگرمیوں میں داخل ہو رہی ہے، حالانکہ اسلام کے قدیم نظام نے اسے اس میدان سے پوری طرح روک رکھا تھا۔ عورت کے یوں میدان میں آجانے سے اسلام کے تمدنی نظام پر کیا کچھ اثرات مرتب ہوں گے، دوسرے پیچیدہ سوال کے ساتھ یہ بھی ایک قابلِ غور سوال ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر فرناؤ لکھتا ہے کہ اتنا تو واضح ہے کہ مسلمانوں کا معاشرتی و تمدنی نظام ایک کڑی تبدیلی سے گذر رہا ہے، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہ تبدیلی اصلاح پسندانہ طریقوں سے مکمل ہوگی یا انقلابی ذرائع سے۔ اس کے مطالعے کے مطابق اسلامی معاشرہ کا قدیم ڈھانچہ تو بوسیدہ ہو کر گر چکا ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا شکل اختیار کرنے والا ہے۔ مختلف علاقوں کی مختلف مسلم اقوام معاشرتی تبدیلیوں کے لحاظ سے بہت ہی کم وجوہ یکسانی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی توجیہہ یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ مختلف قافلے ہیں جو آگے پیچھے ایک ہی تمدنی راستے پر چلے جا رہے ہیں۔

نظریاتی طاقتیں عالمِ اسلام کے معاشرتی و تمدنی نظام میں جو طبقاتی قوتیں اس وقت کروٹ لے رہی ہیں اور جن کے ہاتھوں مستقبل کی کوئی معشیت بننے والی ہے ان کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرناؤ نے نظریاتی پہلو سے ناقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ غالباً یہ حصہ کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے۔ وہ اسلام کو ایک نظریہ و نظام کے طور پر متعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ اسلام اپنے معاشرے کی مذہبی اور دنیوی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں کرتا۔ وہ کلیسا اور ریاست کی علیحدگی کے تصور سے بالکل بیگانہ ہے۔ وہ صرف مسلم اور غیر مسلم دو بنیادی عناصر کو تسلیم کرتا ہے، قوموں نسلوں اور طبقوں کی تقسیم کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ وہ ان تمام لوگوں کے لئے مساویانہ مرتبہ کا اعلان کرتا ہے، جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور خدا اور اس پر ایمان لانے والوں کے درمیان یکسانی و سائط کی ضرورت نہیں مانتا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت بیک دم ایک مذہبی وحدت بھی ہے اور ایک نظامِ ریاست بھی: دونوں طرح کے عناصر ایک ہی ضابطۂ حیات میں یکجا ہیں جس کو عربی اصطلاح کے لحاظ سے "شریعت" کہا جاتا ہے ۔۔۔ چونکہ شریعت انسانی زندگی کے ہر شعبے پر کارفرمائی کا ادعا رکھتی ہے، لہٰذا یہ ایک بسیط قانونی نظام ہے ۔۔۔ بیک دم مذہبی بھی، شہری بھی، بلدیاتی بھی !!!

مسلم معاشرے کا ضابطہ و قانون کئی صدیوں کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ہمارا ضابطہ و قانون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا۔ اسی بنا پر وہ تمام ماخذِ قانون کو اسی ایک ذات میں جمع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ماخذ چار تھا ۔۔۔ بنیادی ماخذ قرآن ہے۔ لیکن چونکہ قرآن تمام تفصیلی ضروریات کو پورا نہیں کرتا، اس لئے اس کے خلا کو پیغمبرِ اسلام کے اقوال و افعال سے

پر کیا گیا۔ سو احادیث کے مجموعے "سنت" کے عنوان سے دوسرا ماخذ سامنے لاتے ہیں۔ قرآن و سنت دونوں کے استناد کا دار و مدار پیغمبرِ اسلام پر ہے۔ مسلمانوں کی جماعت خدا کے الہامی کلام کا مفہوم باہمی مشاورت سے طے کرنے کی گنجائش بھی رکھتی ہے۔ عملاً قانون سازی کے اس اختیار کو استعمال کرنے کا ذریعہ پوری جماعت نہیں بلکہ ایسے علماء کی مجلس ہے جو اصولیات کا ماہرانہ علم رکھتے ہوں۔ جن معاملات میں قرآن و سنت کوئی واضح راہنمائی نہ دیتے ہوں، ان میں مسائل کا فیصلہ جماعت کے متفقہ فیصلوں — اجماع — سے ہوتا ہے۔ یہ آخری دو ماخذِ قانون اسلامی نظامِ معاشرہ کو بدلتے ہوئے حالات میں پنپنے کے قابل بنانے کا ذریعہ ہیں۔

اسلامی معاشرہ اپنے لیے ریاست کے اصول نظامِ خلافت سے اخذ کرتا ہے۔ معاشرے کا سربراہ کار خلیفہ ہوتا ہے۔ دفاع اور دعوتِ اسلام کی ذمہ داریاں اس کو تفویض ہوتی ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ اس کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام کے حسبِ ارشاد دنیا دو حصوں میں منقسم ہے، ایک "دارالاسلام" دوسرا "دارالحرب"۔ نظریاتی طور پر یہ دونوں حصے دائماً باہم دگر برسرِ پیکار رہیں[1]۔ اس حقیقت کی بنیاد مبلغانہ نارواداری کے بجائے اسلام کے سیاسی مقاصد پر رکھی جا سکتی ہے — کیونکہ اسلامی قانون عیسائیوں اور یہودیوں کو (جنہیں اصطلاحاً اہلِ کتاب کہا جاتا ہے) پوری آزادی سے اپنے اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ وہ اسلامی حکومت کی اطاعت کریں اور سرکاری واجبات ادا کرتے رہیں۔ جہادِ مقدس کے ذریعہ اسلام کا فروغ تو محض ایک نظریاتی بات تھی، لیکن بیرونی حکومتوں کے تسلط کو اپنے سر سے ہٹانا بہرحال اس وقت مسلمانوں کے نزدیک بنیادی فریضہ تھا۔ گویا جہاد اب جارحانہ کے بجائے مدافعانہ معنوں میں باقی ہے۔

خلیفہ دنیوی حکمران ہے، لیکن وہ شریعت کی ترمیم و تعبیر کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ وہ روحانی طور پر "معصومیت" کے مرتبے پر فائز نہیں ہے۔ بنا بریں اسے کلیسائے روما کے پوپ کی مانند سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اربابِ کلیسا کا مرتبہ علماء، مفتیوں اور قاضیوں اور دوسرے ماہرینِ قانون کو حاصل ہے جو شریعت کی تعبیر کا اختیار رکھتے ہیں۔ اہم مسائل میں علماء کی کثرتِ رائے سے فیصلے ہو سکتے ہیں[2]۔

ڈاکٹر نے اسی سلسلے میں سنی اکثریت کے بالمقابل شیعہ اور خوارج کے ظہور کا تذکرہ کیا ہے لیکن ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ وہ درویشیت یا تصوف کو بڑی بھاری تمدنی اہمیت کے ساتھ کتاب میں لایا ہے۔ اسلام جب ایسے خطوں میں پہنچا جہاں عیسائی اور ایرانی مذہبیت نے تصوف اور رہبانیت کے بیج بکھیر رکھے تھے، تو بھکشو زاویہ نشینوں کا اولیں ظہور ہوا جو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی صحیح راہ انہیں کو معلوم ہے اور وہ ترکِ دنیا کر کے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ لوگ خرقہ پوش بنے گھومتے پھرتے تھے

---

[1] ڈاکٹر کو مغالطہ ہوا ہے۔ دنیا اسلامی فلسفہ کی رو سے "دارالاسلام" اور "دارالکفر" دو حصوں میں منقسم ہے۔ اصولاً یہ دو متضاد نظام ایک دوسرے سے متصادم ہونے ہی چاہئیں۔ مگر عملاً ان کے درمیان جب کبھی حالتِ جنگ پیدا ہو جاتی ہے تو زیرِ اثر علاقہ "دارالحرب" میں بدل جاتا ہے۔ عام حالات میں معاملات بھی ہو سکتے ہیں، تجارتی اور ثقافتی تعلقات بھی۔

[2] واضح رہے کہ ڈاکٹر فرناڈ کے سامنے خلفائے راشدین ہی نہیں ہیں وہ بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار مابعد کو بھی سامنے رکھ کر گفتگو کر رہے ہیں۔

اس نے طریقے کو پیمانہ عناصر میں سے خوب بھرتی لی۔ بعد میں تصوف کے کئی خانوادے پیدا ہوتے گئے اور انہوں نے قلعہ نما خانقاہیں تعمیر کیں، قرآن کی درسگاہیں کھولیں اور بسا اوقات اپنی ریاستیں چلائیں۔ ہر خانوادہ کا سربراہ کار پیر کہلایا اور اس کے متوسلین "پیر بھائی" یا "اخوان" کہلائے۔ یہ 'اخوانی' نظام مصنف کے مطالعہ کی رو سے آج تک اپنی ساری اصطلاحات اور امتیازات کے ساتھ مسلمانوں کے معاشرتی ہیئت میں گہرا دخل رکھتا ہے۔ پیری مریدی کے اس اخوانی نظام کو اگرچہ زوال سے سابقہ ہے مگر اب بھی کم سے کم ایسے پچاس بڑے بڑے نظام موجود ہیں جن کے متوسلین کی تعداد اسّی لاکھ سے لے کر ایک کروڑ تک پہنچتی ہے۔ سب سے بڑا نظام وہ ہے جس کا سلسلۂ ربط شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی ذات سے قائم ہے۔

ڈاکٹر فرناڈ عالمِ اسلام کی تاریخ سے ایسی مختلف تحریکات اور اصلاح و تغیر کی روؤں کو دریافت کرکے سامنے لاتا ہے جو اسی صوفیانہ اخوانی نظام کے زیرِ اثر تشکیل پاتی رہیں۔ رشید علی والئ عراق جب انگریزوں سے متصادم ہوا تو اس نے "نیشنل برادر ہڈ" قائم کی۔ ترکیہ کی عثمانی سلطنت میں اس طرز کے متعدد سلسلے رونما ہوتے رہے جن کا دائرہ اثر بعد میں البانیہ۔ المغرب۔ الجیریا اور علاقۂ بربر تک وسیع ہو گیا۔

ان صوفیانہ سلسلوں میں ایک قدر مشترک یہ رہی ہے کہ یہ اسلام کی غیر تغیر پذیر عربی ہیئت کے باغی رہے ہیں۔ ان کے دورِ عروج میں عرب سیاسی اقتدار کے اضمحلال کے سبب کمزور تھے۔ اس لئے ان کا ارتقار جاری رہا۔ آگے چل کر عربستان میں اسلامی معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کا رجحان فطری نتیجے کے طور پر زور پکڑتا گیا۔

اسی صوفیانہ افکار و نظریات کے اندر سے ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کا خواب نمودار ہوا۔ اس خواب کا کردار 'مہدی' نام کی ایک مثالی شخصیت قرار پائی۔ چنانچہ تاریخِ اسلامی کے اندر مہدیوں کا ظہور اسی خواب کا نتیجہ تھا۔ مختلف مہدی جب بھی 'اٹھے' زوال اور انتشار کے ردِ عمل کے طور پر اٹھے۔ ان میں سے ایک مہدیٔ سوڈان تھا جسے تھوڑی مدت کے لیے ایک افریقی سلطنت قائم کرنے کا موقع ملا۔ سوڈان کے تاریخی ماحول میں مہدیت کا رنگ رچ بس گیا ہے۔ آج اسی کے نتیجے میں افریقی آبادی کے اندر خود مختاری حاصل کرنے کا داعیہ کارفرما ہے۔

دو متقابل تحریکات

مصنف اسلام کے اس امتیاز کو ایک بار پھر سامنے لاتا ہے کہ اس کے قائم کردہ معاشرہ میں مذہبی اور سیاسی تحریکات کو الگ الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ عالمِ اسلام کے اندرونی اضطراب کے آثار و علائم — خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی — ان کی توجیہہ پیچھے ہٹ کر کسی سبب مشترک ہی سے کی جا سکتی ہے۔ مغربی قومیت کے تصور نے مسلمانوں کے اندر پوری طرح جڑ نہیں پکڑی۔ پس قوم پرستی اور تجدید و احیائے اسلام دو گونہ متجانس فکری عناصر کو باہم مربوط رکھ کر سوچنا مسائل کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔

تجدید و احیائے اسلام کی مساعی کا آغاز اٹھارویں صدی سے ہوتا ہے۔ ان مساعی کا آغاز بیک دم دو سمتوں میں ہوتا ہے۔ ایک طرف تجدید پسندوں کی تحریک ہے جو مسلم معاشرے کو اس کی اصل ہیئت پر لانا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف تجدد پسندوں کی تحریک ہے جو دنیا دارانہ یا سیکولر ذہن کے ساتھ مذہب و ریاست کو الگ کرنا چاہتے ہیں۔
گویا عالم اسلام میں قدیم رجحان کے تحت دو متخالف توام بھائی ہیں۔

تجدید پسندوں کا اولین گہوارہ عرب میں ٹھہرا جو گہوارۂ اسلام تھا۔ سلطنت عثمانی کی گراوٹ نے حرمین اسلام کے عربوں میں نفرت کی ایک لہر دوڑا دی۔ اسی لہر نے محمد ابن عبدالوہاب کو میدان میں لا کھڑا کیا۔ اس نے ایک غیر مصالحانہ مذہبی نظام کی تبلیغ کی۔ محمد بن عبدالوہاب کو شاہی خاندان میں اثر و نفوذ حاصل ہو گیا جس کے بل پر وہابی تحریک تلوار سے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ تحریک ابن سعود کو برسر اقتدار لائی اور وہابیت کا سارے عرب میں دور دورہ ہو گیا۔ اس تحریک نے مذہبی اصلاح کی مساعی میں بڑا بھاری حصہ ادا کیا ہے۔ اس کے زیر اثر بدوؤں کے اندر مختلف تنظیمی ہیئتیں اُسی مقبول عام صوفیانہ نقشے پر قائم ہو گئیں۔ لیکن وہ تصوف کے خاص مزاج سے خالی تھیں کیونکہ وہاں تحریک اس کی متحمل نہیں تھی۔ ابن سعود نے خاص اہتمام سے وہابی اخوت کا نظام قائم کیا جس کے ذریعے اس نے خانہ بدوش بدوؤں کو متمدن زندگی اختیار کرنے کے قابل بنایا۔

اسی طرز کی ایک تجدیدی تحریک محمد علی ابن السنوسی نے چلائی۔ الجیریا کے اس لیڈر کے نظریات کے مطابق لیبیا کی سلطنت ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی۔ یہی اخوانی نظام برطانوی مصر و سوڈان میں خود مختارانہ مرتبہ کے حصول کے لئے ایک مضبوط سیاسی طاقت بن کر کام کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربستانی بدوؤں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور ان کو ریاستی ہیئت کے مرتبے تک پہنچانے میں ان تحریکات نے بڑا اہم حصہ ادا کیا۔

ڈاکٹر فرناؤ محسوس کرتا ہے کہ مسلم معاشروں کا ایک قدیم تمدنی ہیئت کے تحت پیچ در پیچ ڈھانچوں کے ساتھ پایا جانا مختلف نظریات کی کشمکش کو بہت ہی سنگین اور ناقابل فہم بنا دیتا ہے۔ داعیان اصلاح کی طاقت کے اصل مراکز مصر اور انڈیا میں پائے جاتے ہیں۔ دونوں ممالک میں تجدید اسلام کی تحریکات جدید یورپ کے سیاسی، معاشی اور ذہنی نفوذ کے ساتھ مربوط ہیں۔ مسلمانوں کے ذہین عناصر نے بڑی تشویش کے ساتھ اپنی دنیا کی داخلی و خارجی کمزوریوں کو محسوس کیا اور مسلم معاشروں کو نئی قوت سے مالا مال کرنا چاہا۔ اس سلسلے کی پہلی آواز سید جمال الدین افغانی نے اُٹھائی۔ وہ سلطان ترکی اور شاہ ایران کا مشیر رہا۔ اس نے جامعہ ازہر قاہرہ میں درس دیا اور اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ یورپ میں گذارا۔ وہ ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے ایک طرف ہر ممکن ذریعے سے غیر ملکی اقتدار کے خلاف مسلمانوں کو جد و جہد کرنے کی تلقین کی اور دوسری طرف خود داخلی طور پر جبار فرمانرواؤں کی متزلزل سلطنتوں کے خلاف تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی۔

جمال الدین افغانی کے نظریات کو ان کے نامور شاگرد مفتی محمد عبدہٗ نے گہرائی اور وسعت دی۔ ان کے مصلحانہ عزائم نے علماء کو اس کے خلاف صف آرا کر دیا۔ چنانچہ مفتی محمد عبدہٗ کو مصر سے نکلنا پڑا لیکن آخر کار وہ مصر کا مفتیٔ اعظم بنا۔ وہ انقلاب کو مسلمانوں کے لیے کامیاب حل نہیں مانتا تھا بلکہ روحانی و سیاسی اصلاح کو دور جدید کا تقاضا سمجھتا تھا۔ مفتی محمد عبدہٗ کے خیالات نے تحریک سلفیہ کی شکل اختیار کی۔ لفظ "سلفی" خود بتاتا ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنے کے بجائے

نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے علمبرداروں کی نگاہ میں وہ خالص اسلامی نظام جسے خلفائے راشدین کے دور نے پیش کیا تھا، جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا اسی کے بل پر ممکن تھا۔ یہ لوگ یورپ کے جدید تصورِ قومیت کو مسلم معاشرے کے لئے قبول کرنے کے خلاف ہیں بلکہ سرے سے وہ علمبرداران مغربیت سے بر سرِ کشمکش ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سلفیہ قدامت پرستانہ اسلامی عناصر کے بھی مخالف ہیں اور معاشرتی اصلاح کے لئے اپنی خاص تجاویز سامنے لاتے ہیں۔ چنانچہ خود مفتی محمد عبدہ سیاسی نظامِ جبریت کے بالمقابل عوامی حقوق کے علمبردار رہے۔ نیز ان کے جانشینوں نے ترقیٔ نسواں کی وہ اجنبی آواز بلند کی جو اس سے پہلے عالمِ اسلام میں کبھی نہ گونجی تھی۔ پس، اگرچہ ان مصلحین نے معیاری اسلام کی طرف چلنے کی دعوت دی ہے، لیکن تحریکِ سلفیہ کو رجعت پسندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سلفیہ درحقیقت اسلامی معاشرے کو جدید رنگ دینا چاہتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ روحِ اسلام پر کوئی جراحت نہ آنے پائے۔

ہندوستانی مصلحین کا مقصود بھی یہی ہے کہ مسلم معاشرے کو اس کی اپنی سرگرمیوں کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔ یہ بجا ہے کہ ہندوستانی اسلام کا روحانی ماحول عربستان سے مختلف ہے اور انگریزی حکومت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یورپ کے بہت قریب کر دیا ہے۔ عین یہی سبب ہے کہ ہندوستانی مصلحین اہلِ تجدید کے بخلاف اسلام کی ایک ترقی پسندانہ تعبیر کے خواہاں ہیں۔ تحریکِ اسلام کا بانی سرسید تھا جو انڈین سول سروس سے منسلک تھا۔ سرسید یورپ کا طویل عرصہ گزار کر اپنے ساتھ یہ پیغام لایا کہ مسلمانوں کو یورپ کی سائنس اور یورپ کا طرزِ فکر اختیار کرنا چاہیئے۔ ورنہ وہ مایوس کن طریقے سے پس جائیں گے۔

سرسید احمد خاں اور ان کے ہم نواؤں نے یورپ کے متعلق جمال الدین افغانی کا مخالفانہ نقطۂ نظر مسترد کر دیا۔ یہ لوگ اپنے برطانوی حکام کے ساتھ تعلقات رکھنے سے متوحش نہ تھے۔ چنانچہ امیر علی برطانوی پرائیوی کونسل کا پہلا ہندوستانی ممبر ہوا۔ تحریکِ اسلام بعد میں اقبال کے ذہن میں گونجی ہے۔ اقبال مسلمانوں کی مغرب زدگی کا قائل نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کو زمانۂ جدید تک پہنچانے کے لئے راستہ نکالنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے مسلم معاشرہ کی ابتدائی جمہوری ہیئت کی طرف دعوت دی جسے وہ اس کی خالص شکل میں دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ میں کارفرما رکھتا تھا۔ اقبال کی یہ "اسلامی جمہوریت" مصری مصلحین کے نظریات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

ان ہندوستانی مصلحین کی مساعی کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر ایک الگ قوم ہونے کا احساس پروان چڑھا۔ ساتھ کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی نے مسلمان لیڈروں کا ایک طبقہ پیدا کیا۔ اس طرح پاکستان کے وجود میں آنے کے اسباب پیدا ہوئے۔ آج پاکستان کے اونچے مناصب پر زیادہ تر علیگ ذہن قابض ہے۔ (باقی)

جمیل صنعانی

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

"تیز دوڑو ورنہ تمہارا ڈبہ نکل جائے گا" جیسے ہی میں پلیٹ فارم پر پہنچا ظہیر نے میرے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
میں گاڑی میں سوار ہو گیا اور ہاتھ کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا

"چیریو، بائی بائی ——— وِش یو دی بیسٹ جرنی اینڈ ہیپی جرنی"

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ پلیٹ فارم، سارا ماحول، اور بمبئی مجھ سے دُور بھاگ رہے تھے۔ بمبئی کے چودہ دن جو چودہ گھنٹوں سے بھی زیادہ مختصر تھے، دور بھاگتی ہوئی چیزوں میں الجھ سے گئے۔ ظہیر کے لہراتے ہوئے ہاتھ کو خلقت کے اژدہام نے نگل لیا۔ حیدرآباد چھوٹا اب بمبئی چھوٹ رہا تھا۔ دکن کی سرحد پار ہو رہی تھی۔ بمبئی سنٹرل پر میرا پرانا ساتھی مجھ کو الوداع کہہ چکا تھا۔ گھٹی گھٹی اور غم کے ملے جلے احساس سے پیدا ہوا سا دروازہ میں کھڑا تھا کہ میرے شانے پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک تیز اور پاٹ دار آواز کانوں میں گونجی:

"تم فاروقی تم!" اور سعادت مجھ سے گلے ملتا رہا یہاں تک کہ میں درد سے کراہنے لگا۔
میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گاڑی احمد آباد جا رہی تھی اور سعادت اسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔
"میں نے ارادہ بدل دیا اسی لئے سمندری سفر ملتوی کر کے احمد آباد جانے والی گاڑی میں بیٹھا ہوں" میں خاموش رہا
کچھ سنتے ہوئے اس کا ہاتھ میری زانو پر پڑتے ہی پٹاخ سی آواز آئی
ہاں ہاں تم نے خشکی کے سفر کو پسند کیا" میں نے جلدی سے کہا اور اپنے سفری ساتھیوں کی طرف دیکھا تاکہ ان باتوں کا ردِ عمل معلوم کروں۔

جب میں نے اوپر کی برتھ پر پاشا کو نیم دراز ہاتھ میں ایک کتاب لئے ہم دونوں کی طرف متوجہ پایا تو وہ سب کچھ سن لیا جس کو سعادت نے مجھ سے اب تک نہیں کہا تھا۔

"آپ نے بھی سمندری سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ؟"
"میں نے ایسا ارادہ کبھی نہیں کیا" وہ بوکھلا گیا۔
سعادت کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور دوبارہ پٹاخ سی آواز پیدا ہوئی۔
میں نے اپنے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میرے سامنے والی برتھ پر بیٹھے ہوئے مولانا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے

تھے۔ میں نے کسی قدر اعصابی کھچاؤ محسوس کیا اور سعادت با قدسوم پھیلا گیا۔

بہ ہر پر جو لڈال کھول کر بستر پر دراز ہو گیا ——— میں نے سعادت کی خاطر اپنے سفر کو ایک مہینے کے لئے ملتوی کیا تھا۔ روانگی سے دو دن قبل اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"بھائی جان بھی میرے ساتھ چلیں گے اور وہ جہاز سے جانا چاہتے ہیں۔ مجھ کو بڑا افسوس ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں فارعتی.... خوباش برادر خورد مباش" اور سعادت رک گیا۔

بمبئی میں ظہیر نے مجھ کو ٹھہرالیا۔ باوجود میری تمام کوششوں کے دو ہفتہ ٹھہرنا ہی پڑا ——— بمبئی سنٹرل پر احمد آباد جاتے ہوئے مجھ کو سعادت مل گیا ——— اور سعادت کے ساتھ پاشا تھی۔

سعادت اور پاشا میرے کلاس فیلو تھے۔ سعادت کی بہن ہم سے ایک سال جونیئر تھی لیکن پاشا اور دلاری میں بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دن دلاری سے ملنے پاشا اس کے گھر پہنچی۔ سعادت کے سوا گھر کے تمام لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ نوکر بھی باہر تھا۔ گھنٹی کی آواز کو سن کر سعادت نے دروازہ کھولا۔ دو تین رسمی باتوں کے بعد پاشا تیزی سے اندر چلی گئی۔ سعادت بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال میں پہنچا۔

"تمام لوگ کہیں دعوت میں گئے ہوئے ہیں"۔

"اوہ" اس نے غور سے سعادت کو دیکھا۔

"چلئے اوپر بیٹھیں" پاشا نے تحریک کی اور وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پیچھے ہو لیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں

"Wut Lening Height کیسی کتاب ہے" پاشا نے دریافت کیا۔

اچھی ہے اس کی اہمیت کلاسیکی قسم کی ہے"

"ہیرو کے رومانی وحشیانہ پن کے بارے میں ...." اور اس نے جملہ کو نامکمل چھوڑ دیا۔

"کیا آپ پانی پلائیں گے؟"

پاشا نے پانی کا گلاس لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا "آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہوتا ہے۔"

اس نے اپنی بند آنکھ کی طرف اشارہ کیا اور سعادت کی کرسی کے دستے پر بیٹھتے ہوئے پلکوں کو چیر کر اس کے چہرہ کے بالکل قریب آنکھ کو جما دیا۔ اس کی سانسوں کی گرم گرم لپٹیں اور اس کی زلفوں کے پیچوں سے نکلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو سے سعادت کی کنپٹیاں جلنے لگیں۔ اور اس کا خون رگوں میں اچھل اچھل پڑا۔

سعادت نے اس زور سے پھونک ماری جیسے ہوا کا ایک جھکڑ گزر جائے اور اس نے پھر کئی بار اس طرح پھونکیں ماریں۔ وہ اٹھی اور کرسی پر نڈھال سی ہو کر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ سارا پانی پی گئی۔ وہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔ سعادت اپنی جگہ جما رہا۔ اس نے ذہن میں زلزلوں کے سے جھٹکے محسوس کئے ———

کمبخت کو اس کا بھی احساس نہیں کہ وہ میری بہن کی دوست ہے اور اگر یہ ساری بات دلاری کو معلوم ہو جائے تو۔ ۔۔۔۔۔ اس پر غم کی گھٹا سی چھا گئی۔ اس کے آنسو نہیں نکلے لیکن وہ روتا رہا ۔۔۔۔۔۔ اس نے جب یہ داستان مجھ کو دو ڈھائی برس پہلے سنائی تھی اس وقت بھی وہ رو رہا تھا۔

اور میں نے کہا تھا "تم چغد ہو، منٹو کے چغد"

اور اس نے بات دی تھی "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

"میں سونے تو نہیں دوں گا" وہ میری برتھ پر بیٹھ گیا

"گیا وقت کیسے ہاتھ آیا؟" میں نے دبی آواز میں دریافت کیا۔

اس نے چٹکی لی "چپ کہیں وہ سُن نہ لے"

"تو کیا ہوا اپنی آنکھ کا شہتیر بھی تنکا ہوتا ہے"

سعادت بکنے لگا "ڈائننگ کار میں چلو۔"

"کیا فاروقی صاحب نے ابھی نہیں کھایا" پاشا نے سوال کیا۔

"حلق سوکھ رہا ہے۔ لائم اسکواش سے کچھ تر کر لیں۔ آپ بھی چلیں گی؟"

"کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ آپ دونوں ہو آئیے۔ میرے لئے ایک گلاس بھیج دیجئے گا" وہ سمجھ گئی کہ ہم دونوں بے تکلف ہونا چاہتے ہیں۔

بیرا چلتے ہی میں نے کہا "یہ چینی کی گڑیا کہاں سے ملی ہے؟"

سکندر آباد اسٹیشن سے سوار ہوئی۔ مجھے بھی اسی قدر تعجب ہوا تھا جتنا کہ تم کو ۔۔۔۔۔۔"

"اور تم نے سمندری سفر ملتوی کر دیا"

"بھائی جا ا ا ن ۔۔۔۔۔۔"

"چُپ رہ" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تو اسکندر آباد اسٹیشن سے ساتھ ہے"

"چھ مہینے سے نہ ہی وہ ادبی حلقہ میں نظر آئی اور نہ ہی اس نے کالج کا رخ کیا" اس نے طیش چڑھانے کی کوشش کی۔

"اور اب وہ تمہارے ساتھ ادبی سفر کر رہی ہے"

ہم دونوں ہنس پڑے۔

"مگر دلاری کمپلیکس (Complex)؟" میں نے دریافت کیا۔

"صدہا برس کے وہ تمام Inhibitions جو مجھے ورثے میں سماج نے دیئے ان کو میں یکلخت تو دور نہیں کر سکتا"

"تو تم نے ذہنی طور پہ ارتقا کیا ہے"

"یوں ہی سمجھ لو"

"وہ مولانا کون ہیں؟"

"وہ حیدر آباد سے میرا ہم سفر ہے۔ گریجویٹ ہے اور خاصا پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ سیاہ حاشیہ سے گو اس کا رنگ دمک اُٹھتا ہے لیکن اس کی عمر دس پندرہ سال بڑھ جاتی ہے۔ ویسے وہ ہمارا ہم عمر ہے۔ اس کی بیوی زنانہ درجہ میں سفر کر رہی ہے۔ فاروقی میں کہتا ہوں Ann Blyth ہے Ann Blyth"

"تو یار پھر پہلے ہی اسٹیشن پر دکھاؤ"

"وہ تو ہوگا ہی ——— مگر یہ بہت اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ پاشا بھی ساتھ ہے"

"ہوں ——— وطن چھوٹتے تو کچھ ایسے چھوٹے"

"ویسے گرے ہوئے دودھ پر آنسو بہانا مجھے پسند بھی نہیں"

"پھر تم ایک بڑے شہر میں جا رہے ہو ——— سنا ہے کہ ۵۰ برس کی عورتیں بھی مکمل میک اپ میں رہتی ہیں"

"یار میں تو کچھ اس قدر سن چکا ہوں کہ الف لیلیٰ کی داستان کا شہر معلوم ہوتا ہے۔"

"اچھا چلیں"

پاشا سو چکی تھی اور مولانا کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔

"کون سی کتاب ہے مولانا" میں نے بغیر کسی تعارف کے دریافت کیا۔

"اخوان المسلمون کی تاریخ ہے"

"ناصر کی سوانح آپ نہیں پڑھیں گے۔ آپ کے نزدیک تو وہ گردن زدنی ہے نا؟" مولانا کی داڑھی نے مجھے چھیڑنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں نے ناصر کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا"

"مولانا لوگ عموماً کنویں کے مینڈک ہوتے ہیں"

"بھائی! آپ نے تو ابتدا ہی سے بات کو مقطع میں جا ڈالا! میں یہ بحث تو کرنے سے رہا کہ میں مولانا ہوں یا نہیں اور ...."

"دوسری کتابیں اگر پڑھ لی ہوں تب بھی کیا۔ وسعت نظر تو انہیں نصیب ہی نہیں"۔

"آپ تو معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ آپ بے اصولی کو سب سے زیادہ وسعت قلبی قرار دیں"

"مولانا آپ بات کرنے میں تو ہشیار معلوم ہوتے ہیں۔ گستاخی معاف میں ذرا بے تکلف ہو کر آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے چہرہ کے اطراف یہ باڑھ کیوں لگا رکھی ہے؟"

"دیکھئے آپ داڑھی مونڈتے ہیں۔ میں نہیں مونڈتا ——— اور پھر مارکس اور لینن کے داڑھی تھی۔ برنارڈ شا کے داڑھی

تھی۔ بیدی داڑھی سمیت ہم میں موجود ہے۔ آپ مجھ پر ہی اعتراض کیوں کرتے ہیں؟"
" مجھ کو کچھ عجیب سی گھن آتی ہے "
" آپ کو مجھ سے یا میری داڑھی سے کوئی گھن نہیں۔ آپ کو اس سمت سے نفرت ہے جس طرف میں جا رہا ہوں۔"
" بھئی فاروقی کس بحث میں الجھ پڑے۔ یہ مولانا لوگ ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اگر کسی بات کا اقرار کر لیں بھی تو ان کے وعدے ادھار ہوتے ہیں ———— ان کے خدا نے بھی تو جنت کا وعدہ ادھار پر اٹھا رکھا ہے۔"
مولانا کے چہرہ سے ناگواری کا احساس صاف ظاہر تھا۔ انہوں نے دوسری طرف رُخ کیا اور کتاب دیکھتے رہے۔
سعادت اوپر برتھ پر چلا گیا۔ مولانا نے اپنی برتھ پر جا نماز بچھائی اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ان کے انہماک اور یکسوئی سے میں بھی کسی قدر متاثر ہوا۔ نماز ختم کر کے مولانا نے تھرماس کی بوتل نکالی اور دو پیالیوں میں اوولٹین بنائی۔
"لیجئے" انہوں نے ایک پیالی میری طرف بڑھائی "مجھے سونے سے پہلے اوولٹین پینے کی عادت ہے"
"مگر آپ نے یہ تکلیف کیوں کی"
"آپ تو تکلف کرتے ہیں اس میں تکلیف کی آخر کون سی بات ہے میری زندگی کی ایک آئیڈیالوجی ہے ...."
مولانا نے میری فرمائش کے بغیر کہنا شروع کر دیا۔ "میں اسی کے مطابق اپنی زندگی کے ہر کام کو انجام دینا چاہتا ہوں۔ میں زندگی کے ہر سانس کے ساتھ اس مقصد کے تحت انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ دوسروں کو میرے مقصد سے میرے نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی سماج اور کوئی ملک بھی کسی نظریۂ حیات اور طریقہ فکر کے تمسخر کو اچھا نہیں سمجھتا۔"
"مجھے افسوس ہے" میں نے اوولٹین ختم کرتے ہوئے کہا۔
"میں نے ایک عام بات کہی ہے" اور وہ پیالیاں لے کر باتھ روم میں چلے گئے۔
مجھے مولانا کی شخصیت میں قدرے دلچسپی ہونے لگی اور میں ان کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔
میں جب صبح اٹھا تو گاڑی احمد آباد پہنچ رہی تھی۔
پاشا نے آج سفید سلک کی شلوار پر شفون کی ہلکی نیلی شرٹ پہن رکھی تھی اور گردن کے اطراف لپٹے ہوئے شیفان کے سفید دھواں دھواں سے دوپٹہ کے دونوں دامن ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ہم جب ریفریشمنٹ روم میں پہنچے تو ہر ایک کی نظر پاشا پر تھی میں اور سعادت سگریٹ کے دھوئیں سے حلقے بنا رہے تھے اور پاشا ویٹنگ روم جا چکی تھی۔
ہم اٹھے اور پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے۔ یہاں بڑا ہجوم تھا ———— عورتیں، مرد، بچے، سامان ———— پلیٹ فارم کا ہر حصہ ان چاروں چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ پکار پکار کر بات کرنی پڑتی تھی۔ میں اور سعادت نے مختلف پلیٹ فارموں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگائے۔ حسن اور جمالی کے نمونے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میں کسی قدر تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے ویٹنگ روم چلا گیا اور شیشوں کے اندر سے سعادت بینائی کو طاقت بخشنے والی ٹانک پیتا رہا۔

گاڑی آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ایک شخص میرے اور سعادت کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے خود ہی باتوں کا سلسلہ چھیڑا۔ دوران گفتگو میں پوچھ بیٹھا "آپ کہاں جا رہے ہیں" میں نے سعادت کی طرف دیکھا اور سعادت نے کہا "اجمیر کے ارادے ہیں"۔

"اوہ" ——— اس نے ایسے ادا کیا جیسے ٹھٹک گیا ہو۔ "آج کل بہت سے لوگ پاکستان جا رہے ہیں" اور وہ شخص اس جملہ کو ختم کرتے ہی چلا گیا۔ ہم دونوں کو قدرے بے چینی سی ہوئی۔

مولانا بڑے اطمینان سے ظہر کی تیاری کر رہے تھے۔

"سعادت اس داڑھی والے نے بھی کمال کر دیا" میں نے کہا "سب کو کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان جا رہا ہے اور پھر اطمینان دیکھو"

"ارے یار بنا پڑتا ہے" سعادت نے رائے دی۔

پلیٹ فارم پر ہلچل سی مچ گئی۔ سامان، آدمی، آدمی، بچے سب متحرک تھے۔ پاشا کے آتے ہی ہم دونوں اٹھے۔ قلیوں نے سامان اٹھایا اور سب چل پڑے۔ تھرڈ کے ڈبوں میں آدمی مرغی کے ڈربوں کی طرح ٹھس ٹھس کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے چیخ رہے تھے اور عورتیں کراہ رہی تھیں۔ ہمارے ڈبے میں تین نئے ہم سفر تھے۔ شام کی چائے پر مولانا نے ہم تینوں کو اپنے ڈبے میں مدعو کیا۔

"میرے ایک دوست نے احمد آباد سے ہم اپنے گھر کی اسپیشلٹی ——— یہ میٹھا میرے ساتھ کر دیا" انہوں نے پلیٹ ہماری طرف بڑھا دی۔

پاشا کچھ تکلف کر رہی تھی۔

"آپ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی لکھنوی روایات سے پیچھا نہ چھڑا سکیں"۔

"میں میٹھا کم کھاتی ہوں"۔

"ان کی زندگی رس اور مٹھاس سے اس قدر بھری ہے کہ یہ میٹھے کچھ جچتے ہی نہیں" میں نے کہا۔

"آج کل تو زندگی میں بیشتر تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کی زندگی سماج کے ان زہروں سے محفوظ رہی"

"کہاں سے ہے۔ تن کر حالات کے ناگ نہیں ڈستے۔ ویسے میں نالہ و بکا کرنا معیوب سمجھتی ہوں ——— اچھا مولانا مجھ کو آپ کی بیوی سے ملنے کی بڑی خواہش ہے۔ اگر وہ آج یہاں چائے پر ہوتیں تو کیا اچھا ہوتا"۔

"مس پاشا میں سماج کی بہتری اور انسانیت کی ترقی کے لئے پردے کو ضروری سمجھتا ہوں"۔

"میری موجودگی اس میں کیا رکاوٹ ہے"

"آپ کو سعادت چینی کی گڑیا کیوں کہتے ہیں۔ فاروقی آپ کو سعادت کے ساتھ دیکھ کر اس قدر چونکنے کیوں ہوئے تھے۔ سارا پلیٹ فارم آپ پر بھبھو کے گدھوں کی طرح نظریں ڈال رہا تھا۔ میں نے فاروقی اور سعادت کی نظروں میں بھی وہی حسرت دیکھی ہے معاف کرنا مس پاشا بعض وقت میں بہت ڈائرکٹ ہو جاتا ہوں ——— اور نہیں معلوم کتنی لڑکیوں کو ان عنابی ہونٹوں اور سرے گوں

رخساروں سے ہوتے ہوئے جب مردوں کی نگاہیں ان کے سڈول برہنہ شانوں پر پھسل جاتی ہیں تو کس قدر تسکین ہوتی ہے۔ اس طرح کس قدر پیسہ بالی ووڈ کی max factor کمپنی کو ہمارے غریب ملک سے ہر سال چلا جاتا ہے۔ میں جنسی انتشار کو بھی برا سمجھتا ہوں اور معاشی نقطہ نظر سے بھی یہ قومی خودکشی کی ایک قسم ہے۔"

ڈبہ میں ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔

"ہم دوسرے ڈبہ میں سفر کر رہے ہیں۔ آپ وہاں ہمارے ٹکٹ دیکھ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ تمام ٹکٹ چیک کرنے کے بعد اس نے ہماری طرف دیکھا۔

"اچھا چلو بھئی" اور ہم نے مولانا سے اجازت لے لی۔

جب ہم ماروار پر اترے میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ بار میر والی گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے مجھے ٹمپریچر ہو گیا۔ مولانا نے ایک دو گولیاں بھی کھلائیں لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اور سر شام جو میں سویا ہوں تو میری آنکھ بار میر پر کھلی۔ سعادت سے معلوم ہوا کہ لونی پر گاڑی کئی گھنٹے کھڑی رہی اور وہاں کی مٹھائی بھی بہت لذیذ تھی۔ وہ پانی پینے اسٹیشن پر اس جگہ گیا جہاں چند گھڑے اور ڈونگے رکھے تھے۔ چونکہ وہاں کوئی نہیں تھا اس لئے سعادت نے ایک ڈونگے کو گھڑے میں ڈبو کر پانی لیا اور پی گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگ جمع ہو گئے۔

"تم نے یہ پانی گندہ کر دیا" ایک نے کہا

"تم نے اس کو ہاتھ کیوں لگایا" دوسرے نے کہا

"کتا کہیں کا" ایک طرف سے آواز آئی

اچھا ہوا کہ اسٹیشن ماسٹر موقع پر پہنچ گیا اور سعادت کی جان بچی ورنہ وہ پٹ گیا تھا۔

"یار ابھی آدمی، آدمی کو کتا سمجھتا ہے" سعادت اس واقعہ سے بہت متاثر تھا۔

"اور بعض آدمی کتوں سے پیار کرتے ہیں" میں نے کہا۔

بار میر پر میری طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ ہم سب کو ایک شیڈ کے نیچے جمع کیا گیا۔ ہمارے ٹکٹوں کی بڑی تفصیلی جانچ پڑتال کی گئی اعلان کیا گیا کہ رات کے ۸ بجے سامان چیک کیا جائے گا اور ۱۲ یا ۱ بجے گاڑی آئے گی جس سے ہم لوگ مونا باؤ پہنچائے جائیں گے۔ وقتاً فوقتاً مختلف احکامات سنائے جاتے رہے۔

عورتیں مختلف گروپوں میں بٹ گئیں اور مختلف نمائندے ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں منتقل ہوتے رہے۔ پاشا بھی مولانا کی بیوی کے ساتھ عورتوں میں چلی گئی۔ تمام مرد شیڈ میں دوسری طرف بیٹھ گئے۔

دوپہر کے کھانے سے کچھ ہی قبل پاشا برا سا منہ بنائے ہوئے تیز تیز ہماری طرف آئی۔ اس کے پیچھے برقعہ میں لپٹی ہوئی مولانا کی بیوی آہستہ آہستہ آ رہی تھیں۔ وہ پاشا کو سمجھا بجھا کر دوبارہ اپنے ساتھ لے گئیں۔ دوپہر کا کھانا ان دونوں نے ہم سے علیحدہ

کھایا۔ کچھ دیر وہ دونوں باتیں کرتی رہیں اور پھر عورتوں کے جھنڈ میں مل گئیں۔ چہرے کے قریب پاشا لوٹی تو اس کی صورت سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو پیا ہے۔

مولانا کی بیوی ایک طرف مولانا سے باتیں کرنے لگیں۔

"پاشا آخر بات کیا ہے" سعادت نے دریافت کیا۔

"سعادت تم میرے کون ہو۔ شوہر ہو، بھائی ہو، باپ ہو، کوئی رشتہ دار ہو ———— کچھ بھی نہیں۔ تم صرف میرے ہم جماعت ہو" پاشا نے کہا اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔

"ان چار دیواری کے اندر بند رہنے والی چڑیلیں کو میرا اور تمہارا آزادانہ میل جول ڈستا ہے۔ یہ زہر ان کی رگوں میں گھل چکا وہ سب frustrated ہیں۔ وہ اپنی جوانی کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتے ہیں"۔

"وہ کیا ہیں تمہارے"

"شوہر، بھائی، رشتہ دار"

"کچھ بھی نہیں"

"ای اللہ"

"کتنا بڑا کلیجہ ہے، آنکھوں کا پانی مر گیا"

"چودھویں صدی ہے"

"چال کیسی چھنک مٹک ہے۔ ہزاروں میل غیر آدمی کے ساتھ"

"اللہ میاں سب کو پناہ میں رکھے"

"اُن سب کو ان باتوں میں مزا آتا ہے فاروقی۔ وہ سب ایک ایک بات کو بار بار پوچھتے رہے اور طرح طرح سے اس پر رائے زنی جاری رہی۔ آج کی ان کی گفتگو کا موضوع میں ہوں۔ وہ اس میں بہت منہمک اور مشغول ہیں۔ شائد یہ ان کیلئے دلچسپ ترین موضوع ہو۔ لیکن میرا تو خون خشک ہو گیا۔ وہ چڑیلیں ہیں چڑیلیں۔ موقع ملے تو مجھے چبا جائیں"۔

"پاشا تم ہمیشہ سے جذباتی رہی ہو۔" سعادت نے کہا "ان دقیانوسی عورتوں کے لئے یہ نئی زندگی بالکل انوکھی اور عجیب چیز ہے ان کو پرانی مٹرانہ مرغوب ہے نئی خوشبو گوارا نہیں۔ تم کو قطعاً اس قدر متأثر نہیں ہونا چاہیئے"۔

مولانا ہماری طرف آئے۔

"مجھ کو بڑا افسوس ہے پاشا"

"آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے یہ تو آپ کی پردہ دار خواتین، حیادار عورتیں اور نیک نفس بیبیاں ہیں"۔

"بات کو طول دینے سے حاصل؟"

"ورنہ آپ ان سب سے حملہ کروادیں گے"

"اچھا تو مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ آپ نے ہماری قومی روائت اور مذہبی جذبے کو مجروح کیا۔ یہ سادہ عورتیں آپ کی آزادی سے بری طرح زخمی ہوئی ہیں اور آپ کی گفتگو کے اس انداز سے جیسے کہ آپ آدمی نہیں جانوروں سے باتیں کر رہی ہیں وہ تلملا اٹھیں ——— اور ان کی حیرت، ان کا تعجب اور جو کچھ بھی انہوں نے کہا ٹھیک ہی تو ہے"

"شاید آپ رہی سہی کسر پوری کرنے آئے ہیں" سعادت بیچ میں بول پڑا۔

"کسر تو جب پوری ہوگی جب زمانہ کروٹ بدلے گا ———" اور مولانا چلے گئے۔

"کھوسٹ کہیں کا" پاشا نے دل کا غبار نکالا

ابھی ان باتوں کا اثر ہم سے زائل ہی نہیں ہوا تھا کہ کسٹم آفیسر کے پاس سے ایک آدمی آیا۔ سعادت کو بلایا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سعادت اور پاشا کچھ دور تک اس کے ساتھ پٹرولنگ ٹرین پر چلیں اچھی خاصی تفریح رہے گی۔

سعادت ہچکچا رہا تھا

"اس میں برائی کیا ہے" میں نے پوچھا۔

"یار ان حرامزادوں کی نیت کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی"

"پاشا سے پوچھو ان عورتوں میں رہنا پسند کرے گی یا آفیسر کے ساتھ تفریح کرے گی۔ مولانا ٹھیک کہتے تھے یا وہ صحیح راستہ پر ہے" میری طبیعت میں کسی قدر تلخی گھل گئی تھی۔

"یار تم بھی عجیب جھکی ہو"

غرض اس تفریح نہ کرنے کی پاداش میں ہم کو پانچ گھنٹے ڈی ٹین (Detain) کیا گیا اور ہم سب سے آخر میں کھوکھراپار پہنچے۔ جب کہ تمام لوگ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے، روندتے لیسوں میں سوار ہو رہے تھے۔ مولانا اور ان کی بیوی ہمارا انتظار کرتے رہے اور اس سے ہم کو بڑی تقویت پہنچی۔

ریگستان کا پانچ میل کا پیدل سفر، ہوا کے جھکڑ، اڑتی ہوئی ریت اور جھلسا دینے والی جون کی دھوپ ——— آخری میل طے کرنے سے قبل پاشا بے جان سی ہو گئی۔ میری اور سعادت کی حالت بھی غیر تھی۔ مولانا کی نہ تھکنے والی روح اور ان کی ہمت دلانے والی باتوں سے ہم توانائی حاصل کرتے رہے۔ مولانا کی بیوی پاشا کو سہارا دیئے گھسٹتی رہیں اور اس وقت جب کہ ایک قدم بھی آگے چلنا دشوار تھا کھوکھراپار کے کسٹم آفس کے سامنے شیڈ میں ہم سب بیٹھ گئے۔

کھوکھراپار کے کیمپ بری طرح آدمیوں کی کثرت سے بھرے پڑے تھے۔ اسپیشل ٹرین دس گیارہ دن سے نہیں آئی تھی۔ یہاں کیمپوں کی حالت جانوروں کے ڈربوں سے قطعاً مختلف نہ تھی اور ان میں رہنے والے بھی آدمیوں سے بہت کم مشابہ تھے مولانا نے وہاں کی مسجد کے امام سے مل کر ایک چھوٹے سے کمرے کا بندوبست کیا جہاں یہ دونوں عورتیں رات گزار سکیں اور ہم تینوں نے مسجد

میں رات گزاری۔ مولانا بڑی دیر تک نماز پڑھتے اور دعا کرتے رہے۔ مسجد کا سکون، فضا کی خنکی اور مولانا کا وہ سارا برتاؤ جو اب تک انہوں نے ہم سے روا رکھا تھا، مجھ کو اندر ہی اندر متاثر کئے جا رہا تھا۔

مولانا نے نماز سے فارغ ہو کر جب دیکھا کہ ہم صحنِ مسجد میں ہشیار ہیں تو بولے۔

"عورت کو حفاظت کی ضرورت ہے۔ شائد ہمارے سفر کا عملی مظاہرہ آپ کو Convince کرنے کیلئے کافی ہو۔ اسی طرح زندگی کا ایسا تصور جس میں دائمی اخلاقی اقدار نہ ہوں بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ فاروقی صاحب کے ذہن میں تخریب اور تعمیر کا عمل بڑی تندی سے ہو رہا ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی کافی ہلچل ہے۔ سعادت صاحب مگر آپ اس احساس کو زائل کرنے میں اپنی قوتِ ارادی کا بے جا استعمال کر رہے ہیں۔ پاشا کو شائد مصیبت سیدھا راستہ بنا دے" اور وہ لیٹ گئے۔

صبح جب مؤذن اذان دینے لگا تو میں برسوں کے بعد پہلی مرتبہ وضو کر کے خدائے دو عالم کے دربار میں حاضر ہوا۔ سعادت کہیں غائب تھا۔ دوسرے شام من کو ٹرین آئی اور رات کے ایک بجے کے قریب روانہ ہوئی۔ پاشا برقعہ میں اپنے جسم کو چھپائے مولانا کی بیوی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مولانا مسکرا رہے تھے اور میں مولانا کو دیکھ رہا تھا۔ سعادت دبکا سمٹا ایک کونے میں خاموش تھا اور ٹرین کی ہیڈ لائٹس تاریکی کے سینہ کو چیرتی کراچی کی سمت دوڑ رہی تھیں۔

(حلقۂ ادبِ اسلامی کراچی کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

بقیہ: "صلوٰۃ العیدین" از صفحہ ۳۴

بقیہ: "صلوٰۃ العیدین" از صفحہ ۳۴

اس بارے میں اختلاف ہے کہ عام خطبوں کی طرح عید کا خطبہ بھی "الحمد للہ" سے شروع کیا جائے یا مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں اس کا اللہ اکبر سے شروع کرنا مستحب ہے۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک اس کا اللہ اکبر سے شروع کرنا مستحب ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ - ص ۳۱۴) لیکن امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں "صحیح بات یہ ہے کہ عید اور استسقاء کا خطبہ بھی الحمد ہی سے شروع کیا جائے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ہر اہم کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہیں کیا جاتا، وہ ناقص ہے"، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہر خطبہ الحمد للہ ہی سے شروع فرماتے تھے۔ باقی رہا بہت سے فقہا کا یہ قول کہ استسقاء کا... خطبہ استغفار سے اور عید کا خطبہ تکبیر سے شروع کیا جائے، تو حقیقت میں ان کا یہ کہنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔ سنت یہ ہے کہ ہر خطبہ الحمد للہ ہی سے شروع کیا جائے" (زاد المعاد)

محمد عاصم نائیکر کوٹلوی

صلوٰۃ العیدین

(عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز)

[فقہ السنہ کے نام سے محترم رفیق محمد عاصم صاحب نے ایک کتاب مرتب کی ہے جسے مکتبہ چراغِ راہ شائع کر رہا ہے۔ پہلا حصہ (جو زیرِ اشاعت ہے) "کتاب الطہارت" اور "کتاب الصلوٰۃ" پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں روزہ، زکوٰۃ، حج، جنائز، دعا وغیرہ کے مسائل کا ذکر ہے۔ مرتب نے پوری کتاب کے خاکہ کی وضاحت پہلے حصے کے شروع میں کر دی ہے۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کی ترتیب اس انداز پر کی گئی ہے کہ اصل مسائل حدیث کی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ پھر ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن میں پوری امت کا اتفاق ہے۔ ہر مسئلہ کے ساتھ مرتب نے وہ حدیث یا احادیث بھی ان کے حوالے کے ساتھ درج کر دی ہیں جن سے یہ مسئلہ اخذ کیا گیا ہے۔ باقی رہے وہ مسائل جن میں سلف کا اختلاف ہے ان کے متعلق کتاب کے متن میں علمائے حدیث کا مسلک بیان کیا گیا ہے اور حاشیہ میں ان تمام حضرات کا مسلک (اس کی بنیاد اور دلیل کے ساتھ) درج کیا گیا ہے جن کا اس سے اختلاف ہے۔ یا وہ اس چیز میں کوئی مزید تشریح یا توضیح کرتے ہیں۔ باقی رہے وہ مسائل جن کا حدیث میں ذکر نہیں ہے لیکن فقہ کی کتابوں میں ان کا ذکر ہے تو ان کے متعلق کتاب کے متن میں یہ نوٹ دے کر کہ ان کا حدیث میں ذکر نہیں ہے نیچے حاشیہ میں ان کے متعلق ائمہ اربعہ کا مسلک درج کر دیا گیا ہے۔

اس طرح اس کتاب میں وہ تمام اصولی یا جزئی مسائل آگئے ہیں جن کی ایک آدمی کو اپنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے نزدیک اُردو زبان میں یہ پہلی کوشش ہے جس میں عام پڑھے لکھے لوگوں کے لئے فقہ کے اصول اس انداز سے مرتب کئے گئے ہیں کہ اب ایک مسلک رکھنے والا شخص اگر چاہے تو اپنے مخالف کا مسلک بھی وہاں تلاش کر سکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ ذہنوں کے لئے اس میں یہ آسانی ہے کہ وہ ایک مسئلہ میں تمام آراء سے اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں اور جس مسلک کو پسند کریں اختیار کر سکتے ہیں۔

"فقہ السنہ" کا ایک باب "صلوٰۃ العیدین" نیچے درج کیا جا رہا ہے۔ موقعہ کی مناسبت سے امید ہے قارئین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا۔ ادارہ]

عیدین کی نماز سنت ہے، جس کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱ھ یا سنہ ۲ھ میں فرمائی اور اس کے بعد ہر سال اس

کی پابندی کی۔ اور لوگوں کو اس کی تاکید فرمائی[1]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ پہنچے، تو آپ نے دیکھا کہ یہاں کے لوگوں نے سال میں دو دن کھیلنے اور تفریح کرنے کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا "یہ دونوں دن کیسے ہیں؟" لوگوں نے بتایا "جاہلیت میں ہم ان میں کھیلتے اور خوشیاں منایا کرتے تھے۔" فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان دو دنوں کو ان سے بہتر دو دنوں سے بدل دیا ہے ایک عید الفطر کا دن، اور دوسرا عید الاضحیٰ کا دن۔" (ابوداؤد)

عید کے روز جائز حدود کے اندر کھانا پینا، کھیلنا اور خوشی منانا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے "ایک عید کے روز حبشی لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھیل رہے تھے۔ میں حضورؐ کے مونڈھے کے اوپر سے جھانک کر دیکھنے لگی، آپؐ نے اپنے مونڈھے کو نیچا کر لیا تو آپ کے مونڈھے کے اوپر سے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ میرا جی بھر گیا اور میں پلٹ گئی" (بخاری، مسلم، احمد)

ذیل میں ہم اس نماز کے چند ضروری مسائل کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ عید کے روز غسل کرنا، خوشبو لگانا اور خوبصورت کپڑے پہننا مستحب ہے:

جعفر بن محمد اپنے والد کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر عید کے روز اپنی حبری چادر (یمن کی ایک عمدہ چادر) پہنا کرتے تھے" (شافعیؒ)

نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عید الفطر کے روز عید گاہ جانے سے پیشتر غسل کیا کرتے تھے" (موطا امام مالک)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ عید الفطر کے روز نماز کو جانے سے پہلے اور عید الاضحیٰ کے دن نماز سے واپسی کے بعد کھانا:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عید الفطر کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک نماز کے لئے نہیں نکلا کرتے تھے جب تک آپ چند کھجوریں نہ کھا لیتے اور آپ طاق (۱، ۳، ۵، ۷ ......) تعداد میں کھجوریں کھایا کرتے تھے" (احمد۔ بخاری)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ عید الفطر کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک نماز کے لئے نہ نکلا کرتے تھے جب تک کہ آپ کچھ کھا نہ لیں۔ اور عید الاضحیٰ کو آپ اس وقت تک کچھ نہ کھاتے تھے، جب تک آپ واپس آ جائیں (ترمذی، ابن ماجہ۔ احمد) مسند احمد میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "کہ آپ اپنی قربانی کے گوشت میں سے کھایا کرتے تھے۔"

---

[1] نماز عید حنفیہ کے نزدیک واجب، حنبلیہ کے نزدیک فرض اور مالکیہ و شافعیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۳۔ نمازِ عید کا شہر سے باہر جا کر میدان میں ادا کرنا :

مسنون یہ ہے کہ نمازِ عید شہر سے باہر نکل کر میدان میں ادا کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے باہر نکل کر مصلّی (عیدگاہ) میں نمازِ عید ادا فرمایا کرتے تھے۔ البتہ اگر بارش ہوتی تو مسجد ہی میں نماز پڑھ لیتے۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ عید کے روز بارش ہو رہی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مسجد ہی میں عید کی نماز پڑھائی۔[۱] (ابوداؤد۔ نسائی)

۴۔ عید گاہ کی طرف پیدل جانا :

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "سنت یہ ہے کہ عید گاہ کی طرف پیدل جایا جائے اور نکلنے سے پہلے کوئی چیز کھالی جائے۔" (ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف پیدل جایا کرتے تھے۔"[۲] (ابن ماجہ)

۵۔ عید گاہ کے اندر اور عید گاہ جاتے وقت بلند آواز سے تکبیر کہنا :

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ عید گاہ کی طرف نکلتے تو بلند آواز سے تکبیر کہتے۔ دوسری روایت میں ہے' عید الفطر کے روز جب سورج نکل آتا، تو آپ عید گاہ کی طرف نکلتے اور تکبیر کہتے' یہاں تک کہ آپ عید گاہ پہنچ جاتے۔ پھر آپ عید گاہ میں بھی تکبیر کہتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امام بیٹھ جاتا (یعنی نماز شروع ہوتی) تو آپ تکبیر کہنا ترک کر دیتے۔" (شافعی)

اس بارے میں بعض مرفوع احادیث بھی ہیں، جو اگرچہ کمزور ہیں، لیکن ان کی کثرتِ تعداد کی بنا پر عید گاہ جاتے وقت اور عید گاہ کے اندر تکبیر کہنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔[۳]

---

[۱] حنفیہ، حنبلیہ اور مالکیہ کے نزدیک نمازِ عید کا کسی عذر کے بغیر مسجد میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ شافعیہ کے نزدیک نمازِ عید کا مسجد میں ادا کرنا بہتر ہے الا یہ کہ مسجد تنگ ہو تو شہر سے باہر نکلنا مسنون ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ ج ۱۔ ص ۳۱۷)

[۲] یہ دونوں حدیثیں اگرچہ سند کے لحاظ سے کمزور ہیں، لیکن بہت سی دوسری احادیث سے مل کر قوی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عید گاہ کی طرف پیدل جانا سب کے نزدیک مستحب ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ ج ۱۔ ص ۳۱۷)

[۳] مالکیہ کے نزدیک اگر سورج نکلنے سے پہلے عید گاہ کی طرف نکلا جائے تو اس وقت تک تکبیر نہیں کہی جائے گی، جب تک کہ سورج نہ نکل آئے۔ حنفیہ کے نزدیک تکبیر کا پست آواز سے کہنا افضل ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۷)

۱۰۔ عید کی نماز سے پہلے یا بعد میں کوئی سنتیں نہیں ہیں :

نمازِ عید سے پہلے یا بعد میں کوئی سنت نماز نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ صحابہ کرام سے۔ حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ تشریف لے گئے۔ آپ نے دو رکعت نماز (نمازِ عید) پڑھی۔ آپ نے نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں" (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ احمد)

حضرت ابنِ عمر رضؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ عید کے روز عیدگاہ آئے، تو آپ نے عید کی نماز باجماعت سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا" (احمد۔ ترمذی)

اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں کوئی سنت نماز نہیں ہے۔ رہے عام نوافل، تو ان کی ممانعت میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کا پڑھنا جائز ہے، الّا یہ کہ انہیں ایسے وقت میں پڑھا جائے، جب کہ تمام باقی دنوں میں نوافل کا پڑھنا ناجائز ہے" جیسا کہ حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: "بہت سے صحابہ کرام سے نمازِ عید سے پہلے اور بعد میں عام نوافل کا پڑھنا ثابت ہے" (ترمذی)

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید سے پہلے کوئی نماز نہ پڑھا کرتے تھے، لیکن جب آپؐ گھر واپس تشریف لاتے، تو دو رکعت نماز پڑھتے" (ابنِ ماجہ۔ احمد)[1]

۱۱۔ نمازِ عید کی رکعتیں اور ان میں قراءت :

یہ چیز قطعی طور پر ثابت ہے کہ عید کی نماز کی دو رکعتیں ہیں، جن میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا ہر حصہ پڑھا جا سکتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ وہ سورتیں پڑھی جائیں، جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود پڑھا کرتے تھے۔

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں سورۂ " سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى " ـــــــ اور

---

[1] مالکیہ کے نزدیک اگر نمازِ عید میدان میں پڑھی جائے، تو اس سے پہلے اور بعد میں نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ اور اگر خلافِ سنت طریقہ پر مسجد میں پڑھی جائے، تو اس سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ حنبلیہ کے نزدیک عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز کہیں پڑھی جائے۔ شافعیہ کے نزدیک امام کے لئے عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، لیکن جو نمازی خطبہ نہ سن سکتا ہو، تو اس کے لئے نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید سے پہلے ہر جگہ نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے۔ البتہ نماز کے بعد عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، گھر میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۸)

وَهَلْ اَتَاكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ" پڑھا کرتے تھے۔" (احمد)

حضرت ابو واقد لیثیؓ سے حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا "آپ ان میں سورۂ قٓ اور "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ" پڑھا کرتے تھے"۔ [1] (مسلم۔ابو داؤد۔ترمذی۔ نسائی۔ابن ماجہ۔احمد)

عید کی نماز میں جہری قراءت سنت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

۱۲۔ نمازِ عید کی رکعتوں میں تکبیریں اور اُن کی تعداد:

نمازِ عید کی پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ قراءت سے پہلے سات تکبیریں (اللہ اکبر کہنا) اور دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے پانچ تکبیریں سنت ہیں:

عمرو بن شعیب اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ عید کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ تکبیریں کہیں، سات تکبیریں پہلی رکعت میں اور پانچ تکبیریں دوسری رکعت میں اور آپ نے اس سے پہلے یا بعد میں کوئی نماز نہیں پڑھی" (احمد۔ابن ماجہ)

حضرت عمرو بن عوف مزنیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی نماز کی پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں" (ترمذی)

امام ترمذی نے اس روایت کو حَسَن (اوسط درجہ کی) قرار دیا ہے اور اس کے متعلق امام بخاریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس باب میں اس سے صحیح کوئی دوسری روایت نہیں ہے [2] اور اسی پر میرا عمل ہے (العلل المفردہ للترمذی۔نیل الاوطار۔ج ۳۔ص ۲۵۲)

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" اور "ھَلْ اَتَاکَ" دوسری رکعت میں پڑھنا مستحب ہے۔

حنبلیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلیٰ" اور دوسری رکعت میں سورۂ غاشیہ کا پڑھنا مستحب ہے۔

مالکیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلیٰ" اور دوسری رکعت میں سورۂ الشمس کا پڑھنا مستحب ہے۔

شافعیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سورۂ قٓ یا سورہ سبح اسم ربک الاعلیٰ یا سورۂ الکافرون اور دوسری رکعت میں سورۂ القمر یا سورۂ غاشیہ یا سورۂ قل ھو اللہ کا پڑھنا مستحب ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ج ا۔ص ۳۱۱ تا ۳۱۲)

[2] تکبیروں کی تعداد کے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو قطعی طور پر صحیح اور قوی روایت کا درجہ رکھتی ہو، چنانچہ اس بارے میں سلف کے کل دس مسالک امام شوکانیؒ نے نقل کئے ہیں۔ان میں پہلا مسلک وہ ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔یہ اکثر صحابہ، تابعین اور ائمہ کا مسلک ہے۔امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ سمیت قراءت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قراءت سے

(باقی اگلے صفحہ)

ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین (ہاتھوں کا اٹھانا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے ایسا کرنا ثابت ہے [1] (نیل الاوطار)۔

تکبیروں کے درمیان کوئی ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ [2]

۱۳۔ عید کا خُطبہ :

نمازِ عید کے بعد امام کا لوگوں کو خطبہ دینا مسنون ہے۔

حضرت عبداللہ بن سائب سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیدگاہ میں رہا۔ جب آپؐ نے نماز ختم کی تو فرمایا "اب ہم خطبہ دیں گے، لہٰذا جو شخص بیٹھنا چاہے، وہ بیٹھ کر خطبہ سنے اور جو شخص جانا چاہے، وہ چلا جائے"۔ (ابو داؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ) [3]

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ تشریف لے جاتے۔ سب

بقیہ از سابق صفحہ : پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ یہ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں بھی سات تکبیریں اور دوسری میں بھی سات تکبیریں کہی جائیں۔ یہ حضرت انسؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، ابن عباسؓ، امام سعید بن مسیبؒ اور امام ابراہیم نخعیؒ کا مسلک ہے۔

چوتھا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد اور قراءت سے پہلے تین تکبیریں اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد اور رکوع سے پہلے تین تکبیریں کہی جائیں۔ یہ حضرت ابن مسعودؓ، ابو موسیٰؓ اور ابو مسعود انصاری کا مسلک ہے اور اسی کے قائل امام ثوریؒ اور امام ابو حنیفہؒ ہیں۔

بقیہ مسلکوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نیل الاوطار ج ۳۔ ص ۲۵۳ — الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱۔ ص ۳۱۰ تا ۳۱۲۔

[1] حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا سنت نہیں ہے۔ شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک سنت ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱۔ ص ۳۱۰ تا ۳۱۲)

[2] جمہور کا مسلک یہی ہے کہ تکبیریں پے درپے کہی جائیں اور ان کے درمیان کوئی دعا یا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ البتہ امام شافعیؒ، احمدؒ اور عطاءؒ کے نزدیک تکبیروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا مستحب ہے اور اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ہے (شرح مسلم للنووی ج ۱۔ ص ۲۹۰)۔

[3] خطبۂ عید کے سنت ہونے پر سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ ان کا بھی جو نمازِ عید کو فرض یا واجب کہتے ہیں۔ جیسے حنبلیہ اور حنفیہ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱۔ ص ۳۱۴) (نیل الاوطار ج ۳۔ ص ۲۵۹)۔

سے پہلی چیز جس سے آپ ابتدا فرماتے، وہ نماز ہوتی تھی۔ پھر آپ پلٹتے اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے۔ آپ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے اور احکام دیتے[1] اور اگر کبھی آپ کو کوئی لشکر روانہ کرنا ہوتا، یا لوگوں کو کسی اور چیز کا حکم دینا ہوتا، تو آپ اس کا حکم دیتے اور پھر گھر واپس تشریف لے آتے" (بخاری و مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیدگاہ میں رہا، خطبہ سے پہلے آپ نے بغیر کسی اذان یا اقامت کے نماز پڑھائی۔ پھر نماز کے بعد بلالؓ کا سہارا لے کر آپ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا، اس کی اطاعت پر ابھارا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی۔ پھر آپ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی" (مسلم نسائی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تمام صحیح روایات میں یہی ثابت ہے کہ عید کے روز آپ ایک ہی خطبہ دیا کرتے تھے، جمعہ کی طرح دو خطبے نہ دیتے تھے۔ البتہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ (جو ایک تابعی ہیں) فرماتے ہیں "سنت یہ ہے کہ امام عید کے روز دو خطبے دے اور دونوں کے درمیان بیٹھ کر فصل کرے"[2] (شافعیؒ)

مستحب یہ ہے کہ تمام دوسرے خطبوں کی طرح عید کا خطبہ بھی الحمد للہ کے لفظ سے شروع کیا جائے، اور خطبہ کے درمیان کثرت سے اللہ اکبر کہا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ خطبہ کے دوران اللہ اکبر فرمایا کرتے تھے اور عیدین کے خطبہ میں کثرت سے اللہ اکبر فرماتے تھے" (ابن ماجہ)[3]

نوٹ:- (۱) عید الفطر کے روز صدقۃ الفطر کا بیان کتاب الصیام میں آئے گا۔

(۲) ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں کی فضیلت اور عید الاضحیٰ کے بعد ایام تشریق کا بیان کتاب الحج میں آئے گا

---

[1] حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک سنت یہ ہے کہ امام عید الفطر کے خطبے میں لوگوں کو صدقۃ الفطر کے متعلق مسائل بتائے اور عید الاضحیٰ کے خطبے میں قربانی اور آئندہ تین دنوں میں تکبیر کہتے رہنے کے متعلق مسائل بتائے۔ اچھا یہ ہے کہ بعد عید سے پہلے جو جمعہ آئے، اس کے خطبہ میں یہ مسائل بیان کر دیئے جائیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱۔ ص ۳۱۴)

[2] حنفیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور مالکیہ کے نزدیک عید کے روز دو خطبے دینا اور انکے درمیان بیٹھنا سنت ہے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۳۱۴)

لیکن امام نوویؒ، امام شوکانیؒ، امام محمد بن اسماعیل الامیر اور دیگر اہل حدیث علماء کا کہنا ہے کہ عید کے روز سنت ایک ہی خطبہ ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں "شاید جمعہ کی طرح عید کے خطبہ کے درمیان امام کا بیٹھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت نہیں ہے بلکہ جمعہ کے خطبہ پر قیاس کرتے ہوئے لوگوں نے اسے ایجاد کر لیا ہے (سبل السلام ج ۲۔ ص ۷۹)

[3] ائمہ اربعہ کے نزدیک عید کے خطبہ میں جب امام "اللہ اکبر" کہے تو اس کے ساتھ خطبہ سننے والوں کیلئے بھی اللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔
[illegible]

حسین ملک

یہ بھی کرم ہیں گردشِ لیل و نہار کے
عنواں بدل گئے ہیں غمِ روزگار کے

اُبھرے ہیں داغ دل میں ترے انتظار کے
فصلِ خزاں میں دیکھئے جلوے بہار کے

دورِ نشاط، عہدِ مسرت، زمانِ عیش!
کتنے حسیں ہیں نام فریبِ بہار کے

جس کو وہ آزمائے وہی خوش نصیب ہے
یوں تو ہزار طور ہیں الطافِ یار کے

خورشید و ماہتاب سے بڑھ کر ہیں خوش نصیب
ذرّے جو بن گئے ہیں تری رہ گذار کے

عارف ہزار سلسلۂ گیر و دار ہو!
قائل ہیں ہم بھی جرأتِ دیوانہ وار کے

حفیظ الحسن - بی اے

اہلِ چمن پہ جور و جفا دیکھتے رہے
تعمیرِ گلستاں کا صلہ دیکھتے رہے

شائد یہ سب تھا عظمتِ محبوب کے طفیل
چاروں طرف ہجومِ بلا دیکھتے رہے

ہیں کتنی دل فریب جنوں کی حکائتیں
تعزیر پر یہ ذوقِ سوا دیکھتے رہے

انساں پہ کھل سکے نہ یہ اسرارِ کائنات
ہم مشکلاتِ ذہنِ رسا دیکھتے رہے

تصویرِ کائنات کے حسن و جمال میں
تنویرِ حسنِ ذاتِ خدا دیکھتے رہے

احسن اسی کے فیض سے یہ روشنی ملی
ہر شے کو ہم بہ نظرِ جدا دیکھتے رہے

غ

چاندنی رات میں ٹھنڈی پون — مجھ کو ڈر ہے نہ سو جائیں اہلِ چمن

زندگی کو بنائیں گے جب ہم دلہن، — موت کو بھی پہننا پڑے گا کفن،

خود سنبھالے ہوئے ہیں وہ دار و رسن — بڑھ نہ جائے کہیں میرا دیوانہ پن

آپ اور آپ کا حسن، توبہ شکن — جیسے شبنم کا منہ چومتی ہو کرن

اس میں کچھ سازشیں باغبانوں کی ہیں — ورنہ تاراج ہوتی بہارِ چمن ؟

میکدے کی روایت پہ حرف آئیگا — پڑ گئی گر کسی کی جبیں پر شکن !

چاہیئے اور کچھ اب جنوں کو مرے — امتحاں عشق کا اور دار و رسن !

پھر یقیناً بہاروں نے انگڑائی لی — چاک ہونے لگے خود بخود پیرہن،

قافلے والو ہشیار ہو کر چلو، — راہبر بن کے آئے ہیں کچھ راہزن

دل میں غم لے رہا ہے یوں انگڑائیاں — جیسے گھونگھٹ میں شرمائے کوئی دلہن

ننگِ فن ہیں وہ فن کار پرواز جو
چند سکوں میں ہی بیچ دیں اپنا فن

— نصیر پرواز صدیقی —

پروفیسر ابرار احمد سیوہاروی

ناول نویسی

داستان سرائی کا ذوق انسان میں ابتدائے آفرینش سے پایا جاتا ہے۔ انسان کو اس دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ لگاؤ جس چیز سے ہوتا ہے وہ اس کی اپنی ذات ہے۔ اس کو نفسیاتی اصطلاح میں آپ "نرگسیت" یا خود پسندی کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ کہنا اور سننا پسند کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ذاتی مناسبت اور جنسی تعلق کی بنا پر اپنے ہم جنس لوگوں کے افعال، ان کی معاشرت، ان کی پسند و ناپسند، ان کی زندگی کے حادثات، ان کی خوشی و غم، تکلیف و آرام کے متعلق بھی بڑی دل چسپی لیتا ہے اور ان کی داستانیں بڑے شغف سے سنتا ہے۔ اور یہ داستان جتنی اس کی اپنی زندگی کے زیادہ قریب اور اس سے زیادہ مماثلت رکھنے والی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ جاذب توجہ اور دل کش ثابت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے انسان کی زندگی میں ایک باقاعدہ معاشرے کا آغاز ہوا داستان سرا اور قصہ گو لوگ بھی تقریباً ساتھ ہی ساتھ پیدا ہو گئے اور آج تک سماج کا ایک اہم جزو بنے ہوئے ہیں۔ ان داستان گو حضرات کے اقوال جب ضبطِ تحریر میں آجاتے ہیں تو افسانہ یا ناول کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور ناول آج ہمارے ادب کا ایک اہم جزو ہے۔

ناول کے عناصر

ایک ناول کے اجزائے ترکیبی میں سب سے اہم جزو پلاٹ ہوتا ہے۔ ناول میں واقعات اور حرکات و سکنات کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی کو ناول کا پلاٹ کہتے ہیں۔ ناول کا دوسرا اہم جزو کردار ہوتے ہیں۔ ناول میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، جتنی حرکات و سکنات بروئے کار آتی ہیں وہ بہر حال کسی شخصیت سے متعلق ہوتی ہیں۔ کسی ذات سے ان کی وابستگی ہوتی ہے۔ کچھ اشخاص عمل کرتے ہیں اور کچھ ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی اثر انداز اور اثر پذیر لوگ ایک ناول کے کردار ہوتے ہیں۔ یہی کردار جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ایک تیسرا اہم عنصر معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ اس کو اصطلاحی زبان میں مکالمہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر عمل کے واقع ہونے کے لئے کسی مقام اور کسی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زمان و مکان کے امتزاج سے جو چیز ناول کے پردے پر ابھرتی ہے اس کو منظر کہتے ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہمیت والی چیز ناول کی عبارت اور طرزِ بیان ہے۔ ناول کی قدر و قیمت متعین کرنے میں اس کی عبارت اور طرزِ ادا کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ پلاٹ کتنا ہی اچھا ہو، کردار کتنے ہی جان دار کیوں نہ ہوں، مناظر کتنے ہی دلکش ہوں، لیکن اگر ان کو مناسب اور دل کش طریقے سے بیان نہ کیا جائے تو کہانی میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ مصنف کی انفرادیت کا اظہار سب سے زیادہ اس کے اسلوبِ بیان سے ہوتا ہے۔ ان عناصرِ ترکیبی کے بعد ایک اور چیز بھی رہ جاتی ہے جو ہر

ناول میں شروع سے آخر تک جاری و ساری رہتی ہے، یا رہنی چاہیئے، اور جس کے نہ ہونے سے ناول کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ وہ ہے ناول نگار کا فلسفۂ حیات جس کو وہ اپنے ناول میں پیش کرتا ہے۔ اس کو آپ "مقصدیت" کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ناول نگار دنیا کو، اس کی زندگی کو، زندگی کے اجزا، ان کے تناسب، اُن کی کارکردگی اور امتزاج کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسانی معاشرے کی ساخت کس قسم کی پسند کرتا ہے۔ اس کی پسند و ناپسند کا معیار کیا ہے۔ اس کی اخلاقی قدریں کیا ہیں اور وہ ان اقدار کا سرچشمہ کس چیز کو سمجھتا ہے۔ اس کے نیکی و بدی کے پیمانے کس قسم کے ہیں۔ اور وہ اپنے کردار کو کس حد تک اخلاقی ضوابط کا پابند بنانا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ناول نگاری کا وہ زمانہ عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے کہ محض وقت گزاری کے لئے بے مقصد قصے بیان کر دیئے جائیں جن کا زندگی سے کوئی خاص ربط نہ ہو اور نہ کسی طرح قاری کو دعوتِ فکر دے سکیں۔ اب تو وقت گزاری اور تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرنے کے علاوہ زندگی پر اثر انداز ہونے اور صلائے تفکر دینے کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دعوتِ فکر و عمل یا فلسفۂ حیات کا اظہار بالکل واضح طور پر ہو۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ مصنف ان چیزوں کو اپنی تحریر میں اس طرح سے ملائے کہ ان کے ذائقے کا علیحدہ کوئی احساس نہ ہو اور غیر محسوس طریقے پر ہی یہ چیزیں اثر انداز ہوں۔ اکثر ان چیزوں کا برملا سامنے آجانا منافرت کا باعث بن جاتا ہے، اور مقصد بڑی حد تک فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

ناول کا پلاٹ

ناول کے پلاٹ میں سب سے زیادہ اہم چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس کا خام مواد کس قسم کا ہے۔ زندگی کے پیش پا افتادہ اور بہت معمولی قسم کے واقعات اور غیر اہم معاملات اس قسم کے نہیں ہوتے کہ ان کو کسی ناول میں جگہ دی جائے۔ صرف وہی واقعات خاکے میں شامل ہونے چاہئیں جو زندگی پر اثر انداز ہوتے ہوں۔ جن کا زندگی کے بنانے اور بگاڑنے میں دخل ہو۔ معمولی معمولی واقعات کا ذکر اگر ناول میں کیا جائے تو کہانی ختم ہونے ہی میں نہ آئے گی اور ہر ناول طلسم ہوش ربا اور الف لیلہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور آج کل کی تیز رفتار زندگی میں اتنی گنجائش کہاں ہے کہ اس قسم کے دفتروں کو پڑھا جا سکے۔ جو بات کہی جائے جامع و مانع طور پر کہی جائے۔ تطویلِ بیجا سے تضیع اوقات کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ناول کے صفحات میں زندگی کے اہم مسائل کا ذکر ہونا چاہیئے۔ محبت و نفرت کے جذبات، ذہنی کشاکش اور اس کا کردار پر اثر، شعوری اور لاشعوری ذہنی تحریکیں، معاشرتی زندگی کے بنیادی تقاضے اور ان کا حل، سماجی بہبود کی تدابیر اور ان کے عمل میں آنے کی سبیل۔ یہ تمام چیزیں ہیں جن کو ہر ناول کے پلاٹ میں اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ تمام ایسے واقعات کا جلی الفاظ میں ذکر ہونا چاہیئے جو ہماری زندگی کو جدوجہد اور اخلاقی عظمت کا سبق دے سکیں۔ بقول ہڈسن[1] "ناول کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ وہ ہمیں درسِ عمل دے اور ان چیزوں کا ذکر کرے جو زندگی کو

---

[1] میں نے اس مضمون میں ہڈسن Hudson کی کتاب "Introduction to the Study of Literature" سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔

سخت کوشش، مجاہدانہ اور بلند اخلاقی صفات کا حامل بنا سکیں"۔ یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ ناول میں چھوٹے واقعات اور معمولی شخصیتوں کو بالکل نظرانداز کر دینا چاہیئے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ صرف ان واقعات کا ذکر کرنا چاہیئے اور ان کرداروں کو پیش کرنا چاہیئے جو ناول کے واقعات کی رفتار اور مجموعی تاثر پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ایسے افعال کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے یا ایسے کرداروں کو رخصت شمول نہیں ہونا چاہیئے جو پلاٹ پر کافی حد تک اثرانداز نہیں ہوتے ورنہ تو معمولی واقعات اور معمولی آدمیوں کا کردار بھی معاشرے کو اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح کہ ایک بڑے آدمی کا کردار یا ایک بڑے تاریخی اہمیت کے واقعے کا ذکر۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ناول نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر رخ کا مطالعہ کرے اور ہر مرتبے کے لوگوں کی زندگی کی صحیح عکاسی کرنے کی کوشش کرے۔ ورنہ تو اس کی ناول ایک مخصوص قسم کے طبقے کی ناول ہو کر رہ جائے گی اور دوسرے طبقات کے لوگ قدرتی طور پر اس میں زیادہ دلچسپی نہ لے سکیں گے۔ اس کے علاوہ کوئی ناول نگار یہ کہہ بھی کیسے سکتا ہے کہ اس کے ناول کے تمام کردار بڑے درجے کے ہی لوگ ہوں۔ وہ تو ایک پوری سوسائٹی کے حالات لکھنے پر مجبور رہے اور معاشرے میں ہر درجے اور حیثیت کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ان سب کی زندگی ایک دوسرے سے لازمی طور پر مربوط اور وابستہ ہوتی ہے۔ اور اس معاشرے میں ہر فرد کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک مرتبے کے افراد کو زیادہ اہمیت دے دی جائے اور دوسرے درجے کے لوگوں کو کم۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی مصنف پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں مصنف طبقۂ اعلیٰ کی زندگی کی اچھی عکاسی کرتا ہے اور فلاں طبقۂ ادنیٰ کی۔ لیکن اس تقسیم سے کسی ناول کی عظمت اور اس کی افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے انسانی زندگی کے بنیادی حقائق پر اخلاق عادات پر، بلند و پست کے معیار، نیکی و بدی کی کشمکش پر پوری روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اور پلاٹ میں بھی پوری دلچسپی اور کشش برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات اب یقینی طور پر واضح ہو گئی ہو گی کہ موضوع سخن اپنی ذات کے لحاظ سے کتنی ہی عظمت اور بزرگی کا حامل کیوں نہ ہو اگر اس کو خوبی کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا اور اگر اس میں مصنف کی کسبی اور وہبی قوتیں پوری طرح صرف نہیں کی گئیں۔ خداداد صلاحیت اور فنی مہارت کا پورا پورا استعمال عمل میں نہیں آیا تو ناول معیار کے لحاظ سے کوئی بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ کتنی ہی بڑی تاریخی شخصیتوں کا ذکر کیا جائے کتنے ہی اہم واقعات جمع کر دیئے جائیں لیکن اگر دوسری ضروریات پوری نہیں کی گئیں تو تصنیف ایک ادنیٰ درجے کی شمار ہو گی۔ در اصل سب سے بڑی چیز جو اس سلسلے میں آتی ہے اور کسی ناول کی عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے وہ زندگی کے ہر پہلو کی تفصیلی معلومات اور ہر مرتبے کی زندگی گزارنے والوں کے حالات سے پوری واقفیت ہے۔ زندگی کو ہر رخ اور ہر درجے میں سمجھنا اور اس سے مجموعی حیثیت سے بھی پوری طرح آگاہ ہونا اور اس آگاہی کو خوبصورت اور دلچسپ طریقے سے قاری کے سامنے... پیش کر دینا ایک اچھے ناول نویس کا کارنامہ ہے۔

بڑے واقعات کا یا بڑے مقام لوگوں کا ہی ذکر ہونا چاہیئے اور

حقیقت نگاری

بعض لوگوں کا ناول کے متعلق یہ خیال ہے کہ ناول میں حقیقت نگاری کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لئے کہ ایک ناول نگار کو یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ حقیقی واقعات کو بیان کر رہا ہے۔ واقعہ نگاری تاریخ کا موضوع ہے ناول کا نہیں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایک ناول نویس کی یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ناول نگار مورخ نہیں ہوتا کہ ہر واقعے کو جوں کا توں بیان کر دے اور ذرا ادھر ادھر انحراف نہ کرے۔ لیکن ایک ناول بے سروپا باتوں کا مجموعہ بھی نہیں ہونا چاہئیے۔ ناول میں حقیقت نگاری سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ کسی واقعے کی تاریخ بیان کر دی جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ واقعات اس قسم کے ہوں جو ہماری زندگی میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ناممکن الوقوع واقعات سے پلاٹ تیار نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک ناممکن قسم کا واقعہ بھی ناول کو خراب کر کے رکھ دے گا۔ اس کے علاوہ جن حالات زندگی کا ذکر کیا جائے ناول نگار ان کی تمام جزئی تفاصیل سے واقف ہو اور حسب ضرورت ان کو پوری قدرت کے ساتھ استعمال کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ بیان ہو رہا ہے ایک مزدور کی زندگی کا اور اس کی طرز رہائش، گفتگو کا معیار لباس کی تراش خراش وغیرہ سے اظہار ہو رہا ہے ایک آسودہ حال امیر قسم کے آدمی کی زندگی کا۔ اسی لئے مصنف کو ایسے موضوع پر ہاتھ نہ ڈالنا چاہیئے جس پر اس کو تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوں ورنہ وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھائے گا اور اس کا ناول مضحکات کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بڑے ناول نگار نے کسی ایسے موضوع پر طبع آزمائی نہیں کی جس کا حال پوری طرح اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ اسی قسم کی زندگی کے حالات لکھے گا جس پر اسے پوری قدرت حاصل ہو گی۔ لیکن مبتدی لوگ یا اوسط درجے کے ناول نویس اکثر اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ بہت سے ناول لکھ سکیں۔ یا قاری پر یہ اثر ڈال سکیں کہ انہیں ہر قسم کی زندگی کا تجربہ ہے۔ یا کتاب کی ضخامت کو بڑھانے کے لئے وہ زندگی کے ان گوشوں پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں جن کے متعلق انہیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص جو فوجی زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتا وہ فوجی جرنیل کو ناول کا ہیرو بنا ڈالے گا اور اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر خیالی باتیں لکھنا شروع کر دے گا۔ ایسی باتیں جن کو حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوگا نتیجہ کے طور پر افسانہ مضحکہ خیز بنے گا۔

زندگی کے متعلق وسیع معلومات کے مختلف ذرائع ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مصنف ہر قسم کی زندگی کے متعلق براہِ راست معلومات حاصل کرے۔ بلکہ یہ تو ہر شخص کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ذرا سی زندگی کی مدت میں ہر قسم کا تجربہ ذاتی طور پر کر سکے۔ لیکن وہ کتابوں سے مختلف قسم کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی زندگی کے حالات سن کر بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور ان بالواسطہ حاصل کی ہوئی معلومات کو بھی اپنی ذہانت اور تخیل کی مدد سے قاری کے سامنے اس انداز سے پیش کر سکتا ہے کہ بالکل ذاتی تجربات معلوم ہوں۔

کہانی

کسی کہانی کو لکھتے وقت یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ کہانی بذاتِ خود اس قدر دلچسپ، لطیف اور مفید ہے کہ اس کو بیان کیا جائے یا نہیں۔ اس کی تمام تفصیلات اور اجزا پر گہری نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لینا

چاہیئے کہ اس میں کوئی خلا تو باقی نہیں رہ جائے گا۔ کہیں تضاد تو پیدا نہیں ہو جائے گا۔ اس کے تمام اجزاء میں توازن و توافق پایا جاتا ہے یا نہیں۔ یہ بھی غور کر لینا چاہیئے کہ اس کے تمام واقعات مجموع کا قدرتی حصہ معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی واقعہ باہر سے ٹھونسا ہوا معلوم ہوتا ہو۔ واقعات کی رفتار فطری انداز پر چل سکے گی یا نہیں وہ رفتار ناول کے مجموعی تاثر سے موافقت رکھتی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ کوئی انفرادی واقعہ ناول کے سوچے سمجھے منصوبے کے یکسر خلاف جا رہا ہو اور مجموعی تاثر کو غارت کر ڈالے۔ یہ تمام سوالات ہیں جن کی روشنی میں ناول کے خاکے کو پہلے پرکھ لینا چاہیئے۔ اس کے بعد اس کو آخری صورت دینی چاہیئے۔ اگر پلاٹ میں ایک سے زیادہ کہانی شامل یعنی پلاٹ سادہ نہیں بلکہ مرکب ہے تو اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ تمام کہانیاں ہر جگہ سے اس طرح باہم پیوست کی جائیں کہ سب مل کر ایک ہی چیز نظر آئیں۔ پلاٹ کی مجموعی وحدت میں کسی طرح فرق نہ آنے پائے

طریقۂ بیان

کسی ناول کو بیان کرنے کے تین مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصنف براہ راست واقعات کو بیان کرتا چلا جائے۔ اس کی حیثیت صرف بیان کرنے والے کی ہو۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ناول کو خود نوشت سوانح عمری کی حیثیت سے بیان کیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کہانی کو دستاویزی صورت میں پیش کیا جائے جیسے خطوط کے ذریعے سے پورے واقعات کو بیان کر دیا جائے۔ ان تینوں طریقوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل ہے۔ تینوں ہی طریقے اپنی اپنی جگہ پر نہایت کامیاب اور موزوں ثابت ہو چکے ہیں۔ لکھنے والے کو خود اندازہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس طریقے کو زیادہ مناسب اور عمدہ طور سے نبھا سکے گا۔ لیکن زیادہ آسان طریقہ یہی ہے کہ آدمی سیدھے طریقے سے واقعات کو بیان کر دے۔ آخری دونوں طریقوں میں بیان میں کمزوری پیدا ہو جانے کا بہت امکان ہوتا ہے اور اتنا تو ضرور ہے کہ جب کوئی قاری دستاویزی ناول یا وہ ناول جس کو خود نوشت سوانح کے طور پر لکھا گیا ہو پڑھتا ہے تو یہ سوال اس کے ذہن میں ضرور قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کو پہلے طریقے پر کیوں نہیں لکھا گیا۔ اس سے ایک تنقیدی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور معمولی معمولی فروگذاشتوں کی گرفت ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اگر مابعد کے دونوں طریقوں پر پوری قدرت نہ ہو تو ان کو اختیار نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

کردار آفرینی

کردار آفرینی کے متعلق صرف ایک اہم سوال ہر قاری اور ناقد کے دل میں ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ناول کے کردار جان دار ہیں یا نہیں۔ یعنی ہمارے تخیل میں وہ حقیقی انسانوں کی صورت میں آتے ہیں یا نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ہم اپنے پورے معاشرے میں باوجود کوشش کے اس قسم کا کوئی کردار نہ پا سکیں۔ ناول کے تمام کردار ہمارے معاشرے کے زندہ اور چلتے پھرتے لوگ ہونے چاہئیں۔ مافوق شخصیات کا زمانہ اب نہیں رہا۔ اور نہ اب لوگوں کو مافوق انسانوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تو مافوق انسانوں سے ہی نہیں بلکہ جن و پری، بھوت پریت، جادوگر اور کاہن وغیرہ سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ خود گوشت پوست کے انسانوں سے۔ لیکن اب

اس معاملے میں مذاق ادب بالکل بدل گیا ہے۔ ذرا سی غیر معمولی بات پر قاری کے تیور بدل جاتے ہیں اور سننے والوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ کردار کی خوبی یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ اسی طرح محبت کریں جس طرح اپنے پسندیدہ دوست سے اسی طرح نفرت کریں جس طرح ایک دشمن سے کرتے ہیں۔ وہ ہماری سوسائٹی کے افراد معلوم ہوں اور ہمارے درمیان کوئی غیریت، کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اس کے ساتھ ان میں کچھ اس قسم کی خصوصیات ضرور ہوں جن کی وجہ سے ہم ان کو ہمیشہ یاد رکھ سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ آج ناول پڑھ کر ختم کیا اور کل اس کے تمام کردار ذہن سے محو ہو گئے جیسے کبھی ذہن میں آئے ہی نہ تھے۔ اور یہ چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ایک کردار کی زندگی کے تمام اہم پہلو ہماری نظر کے سامنے آ جائیں۔ بلکہ جو سب سے زیادہ اہم خصوصیت ہو وہ سب سے زیادہ نمایاں طریقے سے واضح کرنی چاہیئے تاکہ وہ زیادہ عرصے تک ذہن میں رہ سکے۔ اور اکثر ہر کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ہی قاری کے ذہن میں رہ جاتی ہے۔ تمام تفاصیل تو ذہن میں محفوظ رہ بھی نہیں سکتیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہی ناول معیاری اور وقیع سمجھی جائے گی جس میں کہانی اور واقعات سے زیادہ کردار نگاری پر توجہ صرف کی گئی ہو۔ بلکہ آج کل تو سارا زور کردار نگاری پر ہی صرف کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی چیز ناول کا افادی رُخ نمایاں کرتی ہے۔ اور اسی کا اثر طبیعت پر دیرپا ہوتا ہے۔

مکالمہ

کردار نگاری کے بعد قدرتی طور پر ناول کے مکالمات پر نظر جاتی ہے۔ مکالمے کی خوبی کی سب سے پہلی شرط ہے کہ زبان اقتضائے حال کے مطابق ہو۔ الفاظ کے انتخاب کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اچھے قسم کا مکالمہ ناول کا دلچسپ حصّہ ہوتا ہے۔ اگر مکالمے پھیکے ہوں تو قاری کی توقعات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ اگر مکالمے اچھے ہوں تو کہانی مجموعی طور پر چمک اٹھتی ہے۔ ناول کی تکنیک میں مکالمے کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ جو کردار بول رہا ہو الفاظ اور خیالات دونوں اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ ورنہ صرف مکالمے ہی میں اجنبیت پیدا نہیں ہوگی بلکہ سارا پلاٹ غیر فطری معلوم ہوگا اور کہانی کا مجموعی تاثر غارت ہو جائے گا۔ مکالمہ، جذبات، خواہشات اور احساسات کے صحیح اظہار میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر مکالمہ مناسب نہیں تو کسی جذبے اور احساس کا صحیح طریقے سے اظہار نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر کرداروں کے صحیح جذبات و احساسات کا ہی مناسب طور سے اظہار نہ ہو سکا تو ناول میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔ یہی تو ایک چیز ہے جو ناول کی قدر و قیمت، اہمیت اور افادیت کا تعین کرتی ہے۔

جذبات نگاری

جذبات نگاری ایک ایسی چیز ہے جس کا ہر قاری اندازہ لگا سکتا ہے۔ بغیر جذبات نگاری کے قصہ بڑا بیجان اور روکھا پھیکا سا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ مصنف کہیں بالکل ہی جذبات کی رو میں نہ بہہ جائے اور قاری کو بھی اپنے ساتھ بہالے جائے۔ بہرحال واقعہ نگاری کے ساتھ جذبات کا لطیف اور مناسب امتزاج نہائت ضروری ہے۔ یہی چیز پلاٹ میں رنگینی اور لطافت پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیز دو ناول نگاروں کے درمیان بڑی واضح وجہ امتیاز پیدا کر دیتی ہے اور تقابلی مطالعے میں ایک ناقد کو بڑی مدد ملتی ہے۔........

باقی صفحہ ۲۸ پر

نسیم بستوی

ساقی

بیدار نہیں ہوتا کیوں عزمِ جواں ساقی
جب صحنِ گلستاں سے اٹھتا ہے دھواں ساقی

کہتی ہے جنہیں دنیا رندانِ خراباتی
اک دن یہی بدلیں گے رفتارِ جہاں ساقی

چھاتا ہے نگاہوں پر جب عالمِ سرشاری
کانٹوں پہ بھی ہوتا ہے پھولوں کا گماں ساقی

کیا ایسی فضا میں ہو امیدِ حق آگاہی
خود شیخ کے دل میں ہے توقیرِ بتاں ساقی

مستوں نے بھی بدلا ہے اندازِ سخن اپنا
مٹ جائے نہ دنیا سے "اردو" کا نشاں ساقی

باقی ہے محبت کے نغموں میں اثر جب تک
تر ہے مئے رنگیں سے شاعر کی زباں ساقی

پردے ہی میں رہنے دے یہ راز کہ برسوں سے
میخانے میں رہ کر بھی ہوں تشنہ دہاں ساقی

چاہوں تو زمانے میں اک آگ لگا دوں میں
بخشا ہے مجھے تو نے وہ سوزِ نہاں ساقی

سنتے ہیں کہ محفل میں جب ذکرِ نسیمؔ آیا،
پیہم تری آنکھوں سے تھے اشک رواں ساقی

نسیم بستوی

قطعات

دیکھ لبریز خوں دیدۂ تر ہمارے دوست
آرزوؤں کا چمن خاک بسر ہمارے دوست
زندگی مائلِ تخریب نظر آتی ہے
پھیکی پھیکی سی مری شام و سحر ہمارے دوست

جب کسی کا خیال کرتا ہوں
شرحِ حسن و جمال کرتا ہوں
کھا کے اُن کی نوازشوں کے فریب
زندگی پائمال کرتا ہوں

عظمتِ غم کو پیار کرتا ہوں
زندگی خوش گزار کرتا ہوں
ہوں بظاہر خزاں کیساتھ مگر
اہتمامِ بہار کرتا ہوں

نگہِ معتبر نے لوٹ لیا
آرزوئے نظر نے لوٹ لیا
بے خطا تھے غریب پروانے
ہائے شمعِ سحر نے لوٹ لیا

ادارہ

بحث و نظر

سوال۔ السلام علیکم۔ میں اتنا نہیں پڑھتا کہ کتابی کیڑا کہا جاؤں۔ پھر بھی ضرورت سے کم نہیں پڑھتا۔ ہم نے ایک آپ کا مضمون پڑھا "تحریکِ اسلامی، چہ معنی دارد"؟ کچھ باتیں آپ کی ایسی معلوم ہوئیں کہ آپ زبردستی منوانا چاہتے ہیں۔ جیسے کہ قوموں کے فیصلے اب میدانِ کارزار میں نہیں ہوتے بلکہ پولنگ اسٹیشنوں پر ہوتے ہیں"۔ دوسری بات یہ کہ رسول کریمؐ کے زمانے میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی اور اب زمانہ کچھ اور ہے۔ ایک نظام اپنی پوری قوت سے قائم ہے یہ بات تو صحیح ہے لیکن راہیں نہ اُس سے زیادہ دشوار ہیں نہ کم۔ اُس زمانے میں لا الہ ...... سزا تھی تپتی ریت پر لٹایا جانا۔ گرم پتھر سینے پر رکھا جانا وغیرہ وغیرہ۔ اور اب لا الہ ... کی سزا یہ ہے کہ ذرا تنگی سے ہی سہی دفتر میں بیٹھ کر دماغ کی اسمبلی اور مفید افسانے لکھا کریں۔ لاہور میں یا کہیں پر چو این لائی یا کسی اور کی مذمت میں مسلمان نام کی دوشیزائیں اپنے ناچ کا فن دکھائیں تو تبصرہ لکھ دیا جائے اور آپ دیکھ بھی لیں۔ اگرچہ قرآنِ کریم اور اسوۂ رسول ہمارے ذہنوں میں رچا بسا بھی ہو تو کیا ہم وہ چیز اپنے میں پیدا کر سکتے ہیں جو ایک شہید اپنے خون سے پیدا کر دیتا ہے۔ یقین جانیئے آپ کے کام کو میں دنیا کے سب کاموں سے افضل سمجھتا ہوں لیکن دنیا جس غلط راہ پر چل رہی ہے اُس کا بھی اندازہ آپ کریں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ تحریک کا ایک راہرو پھانسی کے تختے سے لوٹ آتا ہے۔ اُس کا قصور یہ تو تھا کہ لا الہ ...... کا ذکر بہت جرأت و حکمت سے چھیڑ دیا لیکن اس کے رفقا یہ کہتے رہے کہ بے قصور پکڑا گیا ہے۔ اس کا قصور یا تو عدالت میں کھلے عام ثابت کر دیا چھوڑ دو کیونکہ قانون برطانیہ کی عدالتوں میں چلتا ہے اس لیے کھلی عدالت ہو یا بند عدالت لا الہ کا مرتکب وہاں قصوروار ٹھہرتا۔ میں زیادہ کیا لکھوں کچھ باتیں عرض کروں گا انصاف سے فیصلہ کیجئے گا۔ ایک طرف بیکسوں پہ ظلم بھی ہوتا رہے اور تحریک بھی چلتی رہے۔ آدمی مجبور ہو دبایا جائے مار کھاتا رہے اس کوشش میں کہ پورے کا پورا مسلمان ہو لیکن آپ کی تحریک زیادہ تر کاغذوں پہ چھپتی رہے مجھے اعتراف ہے کہ ہزاروں راہ سے بھٹکے ہوئے آپ کی تحریک سے راہ پر آ گئے لیکن بعض رفقا باتیں تو سب طرح کی کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض مرتبہ ایسی باتیں ہو جایا کرتی ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قول و عمل کے فرق کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ نہ ہی وہ اسلام و ایمان کی خاطر محبت کرنا جانتے ہیں نہ وہ حق و کفر سے بیزار و نالاں ہیں۔ میرا کوئی مخالفانہ خیال نہیں لیکن منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی"

جواب۔ کرم و محترم! آپ کا گرامی نامہ بار بار پڑھنے پر بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کا مدعا کیا ہے؟ آپ کس چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں، کس امر سے اختلاف کر رہے ہیں، کس معاملے میں آپ کو کوئی اعتراض ہے اور آپ ہمیں کیا رہنمائی دینا چاہتے

ہیں۔ کوئی بات اِدھر کی، کوئی اُدھر کی ـــــ اور کوئی نہ اِدھر کی، نہ اُدھر کی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ نے اطمینان سے بیٹھ کر یہ سوچا ہی نہیں کہ آپ کے اپنے دل میں ہے کیا ـــ آغازِ کلام آپ کرتے ہیں "تحریک اسلامی چہ معنی دارد" کے مقالے سے، اور پھر بالکل متفرق سی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں ـــ

اب آپ کے مختلف جملے سامنے رکھ کر اپنی گذارشات پیش کرتا ہوں۔

۱ ۔ میں نے اس مضمون میں موجودہ دورِ تمدن کی پیدا کردہ سیاسی فضا کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اب کسی قوم اور مملکت کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ آئینی راستے کھل گئے ہیں جو بادشاہی دور میں بالکل بند تھے۔ فرمائیے کیا اختلاف ہے آپ کو؟

۲ ۔ یہ عرض کیا تھا کہ نبی اکرمؐ کو ایک نیم مزاجی، نیم قبیلوی نظام سے سابقہ تھا اور آج ہمیں انتہائی تسلط وگیرائی رکھنے والے منظم اسٹیٹ سے سابقہ ہے۔ ظروفِ احوال کے اس فرق کو سامنے رکھے بغیر دورِ حاضر میں تحریکِ اسلامی صحیح اقدام نہیں کر سکتی۔ ارشاد ہو کہ اسمیں آپ کے لئے الجھن کا کیا باعث ہے؟

۳ ۔ اس میں کیا شک ہے کہ دور میں حق کو دبانے کے لئے مظالم کے اسالیب اور تحریک کو پیش آنے والے اندازہائے ابتلا بدلتے رہتے ہیں، لیکن مظالم و ابتلا کا سلسلہ پیش ضرور آتا ہے۔

۴ ۔ شہید کے خون کا تذکرہ کرنے سے آپ کا نہ جانے کیا مدعا ہے۔ اشارہ غالباً جہاد کی طرف ہے۔ جہاد بڑے اونچے مرتبے کا اجتماعی عمل ہے، مگر آپ کو شاید ادھر توجہ نہیں ہوئی کہ جہاد ایک اسلامی ریاست کا وظیفہ ہے، نہ کہ ایسے منتشر افراد اور متفرق جماعتوں کا جو کسی دوسرے آئینی نظام کے تحت پائے جائیں ـــ جہاد بالسیف سے پہلے اسلامی ریاست کا وجود ضروری ہے۔ پس یہ بحث پھر حل طلب رہ جاتی ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کا طریق کار کیا ہے۔ درحقیقت اس مقالے میں پیشِ نظر سوال یہی تھا۔ آپ نے بیچ میں ایک اور ہی مسئلہ لا ڈالا۔ اس طرح خلطِ مبحث کرنے سے آدمی دوسرے کو تو کیا متاثر کرے گا الٹا خود ہی الجھ کے رہ جاتا ہے۔

۵ ۔ ہماری تحریک کاغذوں پر چلتی ہے یا کہیں اور، آپ کو یہ واضح فرمانا چاہئے تھا کہ وہ کہاں چلے اور کس طرح چلے؟ خود آپ کیا کام کر رہے ہیں، کہاں کر رہے ہیں۔ اعتراض کس چیز پر ہے؟ اس کے بجائے کونسی چیز ہمارے سامنے رکھتے ہیں؟ تحریکِ اسلامی ایک دعوت رکھتی ہے، ایک پیغام اس کے ساتھ ہے۔ اس دعوت اور اس پیغام کو زبان، قلم، کاغذ، عمل تنظیم وغیرہ سارے ہی ذرائع سے ہم پیش کر رہے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا ایسا نہ کیا جائے۔ کیا قلم اور کاغذ سے کلمۂ حق بلند کرنے کی خدمت سر انجام دینا حرام ہے؟

۶ ۔ آپ کا یہ فقرہ عجیب ہے کہ "بیکسوں پر ظلم بھی ہوتا ہے اور تحریک بھی چلتی رہے" ـــ مطلب کیا؟ آیا مطلب یہ ہے کہ جہاں بیکسوں پر ظلم ہو رہا ہو وہاں تحریکِ اسلامی نہ چلائی جائے؟ یا پہلے کسی اور دعوت کے ذریعہ بیکسوں پر ظلم کو رکوایا جائے اور پھر

تحریکِ اسلامی کی بسم اللہ کی جائے؟

ظلم ـــ اور اجتماعی نظامِ ظلم ـــ کی روک تھام ہی کے لئے تو تحریکِ اسلامی برپا ہوئی ہے۔ مگر ایک نظامِ ظلم کو نظامِ رحمت میں بدلنے کی قوت حاصل کرنے تک بڑی مدت لگتی ہے، عمریں کھپ جایا کرتی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ کوئی ہتھیلی پر سرسوں جما دکھائے!

۷۔ مولانا مودودی کو سزا ملنے پر جو احتجاج ہوا تھا اس کی روح بالکل وہی تھی جو ان الفاظ میں ہے "أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ" یا یہ الفاظ سامنے رکھیے کہ "اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ" سے وہی بے گناہ ہونا اور بے قصور ہونا ہی مراد ہے "فَمَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِی ......" بھی سامنے ہے ـ یہ مطالبہ کہ مقدمہ چلا کر جرم ثابت کرو۔ اپنے اندر درحقیقت "فما بال ....." ہی کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس طرح کے احتجاج اور مطالبے سے غیر کی کشمکش کی حقیقت عوام الناس کے سامنے اور زیادہ کھل جاتی ہے، اور دعوت اور زیادہ نکھر جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلے میں آپ کیا نکتہ اٹھانا چاہتے تھے؟

۸۔ جی ہاں! کفر و فسق سے بیزاری کا انتہائی معراجِ کمال تو یہ ہے کہ آدمی کوٹھڑی میں بیٹھ کر تسبیح پھیرا کرے۔ جو لوگ دن رات گالیاں اور طعنے سنتے ہیں، معاشی ابتلا کی چکی میں پستے ہیں، سیفٹی ایکٹ کے وار سہتے ہیں، مخالفانہ پروپیگنڈے کی لہروں میں ڈبکیاں کھاتے ہیں، وہ تو کفر و فسق سے نیازمندی کا رشتہ رکھتے ہیں اور ان کے قول و فعل میں بڑے فاصلے ہیں جن کی پیمائش ہونی چاہیئے۔

اب ان گزارشات کو پڑھ کر پھر سوچیے کہ آپ کا مافی الضمیر ہے کیا؟

بقیہ: 'ناول نویسی' از صفحہ ۴۳

..... اس لئے کہ کوئی المیہ جذبات نگاری میں کمال رکھتا ہے تو کوئی طربیہ جذبات کی عکاسی استادانہ کرتا ہے۔ دونوں خوبیاں ذاتِ واحد میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دونوں قسم کے جذبات کو یکساں قدرت سے ادا کر سکیں لیکن صحیح معنی میں باکمال شخص وہی ہے کہ تمام قسم کے جذبات کے اظہار پر پوری قدرت رکھتا ہو اور ایک ہی پلاٹ میں اگر چاہے تو دونوں چیزوں کو شامل کر کے خوش گوار قسم کا مرکب پیش کر سکے۔ بہرحال یہ چیز ضروری ہے کہ ناول میں جگہ جگہ مزاح کا پہلو بھی پیدا کر دیا جائے تاکہ یکرنگی بارِ خاطر نہ ہو جائے۔ خصوصاً ایک المیہ ناول میں تو یہ چیز ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ناول نگار کو ہر وقت یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ناول کا ایک مقصد سامانِ تفریح مہیا کرنا بھی ہے گو کہ واحد مقصد سامانِ تفریح مہیا کرنا ... نہیں ہے۔

یارانِ حلقہ

● ـــــ پروفیسر اسرار احمد سہاوری

ہر مہینہ "اعزازی" اور "زرِ خرید" رسالے اتنی تعداد میں آجاتے ہیں کہ سب کو پڑھ لینا تو ممکن ہوتا ہے، لیکن پڑھ کر تاثر بیان کرنا یا مدیر کو لکھ بھیجنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر چراغِ راہ میں آپ کا افسانہ "جگنو ناچ" پڑھ کر تاثر کو پی جانا ممکن نظر نہیں آتا۔ میں نے آپ کی تصانیف میں پہلی مرتبہ "ذہنی زلزلے" پڑھی تھی۔ اُس وقت میں آپ سے متعارف نہیں تھا، لیکن اسی وقت یہ رائے قائم کر لی تھی کہ قلم میں اس شخص کے بہت زور ہے۔ جذبات کی شدّت توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح مؤثر اور ضروری تفاصیل بیان کر دینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ آج "جگنو ناچ" پڑھ کر پھر وہی رائے ذہن کی بالائی سطح پہ اُبھر آئی۔ طنز کی تلخی، مزاح کا چٹخارہ، اصلاح کی تڑپ، رومان کی چاشنی، بیان کی قدرت، غرض کہ کیا چیز ہے جو ایک افسانہ کو سنوار سکتی ہے اور اس میں موجود نہیں۔ مصنف کی ذات افسانے میں شیر و شکر ہو کر دلچسپی اور عظمت کا باعث بن گئی ہے۔ میں افسانے کو نثر کی غزل سمجھتا ہوں، اور یہ افسانہ تاثیر کی حیثیت سے درد آفریں غزل ہے۔

لکھتے وقت خیال تھا کہ چند الفاظ لکھنے ہیں، لیکن اب احساس ہوا کہ غلطی ہوئی، لفافہ لکھنا چاہیئے تھا، کارڈ ناکافی رہا۔ خیر آئندہ کبھی سہی۔

● ـــــ کمال سالارپوری

"جگنو ناچ" کے متعلق مشاہیرِ اہلِ قلم کے حلقہ میں میری رائے کوئی وزن رکھے نہ رکھے۔ مجھ جیسے گمنام اور کوتاہ قلم لوگوں میں تو ضرور وزنی سمجھی جاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی جو کثرت ہے اس سے آپ بھی ناواقف نہ ہوں گے۔ "جگنو ناچ" میں معاشرہ کے مختلف طبقوں پر جو بھرپور اور کامیاب طنز کیا ہے اور پھر ان کے کردار و سیرت کی جو حکاسی فرمائی ہے بالخصوص "جگنو خانم" کے رقص اور اس کے "نغماتی بول" کے اندر جو کچھ سمو دیا گیا ہے، اس نے افسانے کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ میرے نزدیک "شستہ" کے افسانوی ادب میں اس کا مقام سرِ فہرست ہونا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شدتِ تاثر، مقصدیت اور فنی لحاظ سے اس جیسا کامیاب ترین افسانہ میں نے عرصہ سے نہیں پڑھا۔

آپ کیا پڑھیں ....؟

• ”نقوش“ ـــــــ شخصیات نمبر (حصہ دوم)

”نقوش“ اُردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اور اپنے اچھوتے اور ضخیم خاص نمبروں کے لحاظ سے بالکل منفرد۔ حال ہی میں یکے بعد دیگرے اس کے دو شخصیات نمبر شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے دوسرا ہمارے سامنے ہے۔ اس نمبر کو مطالعہ کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ انسانی شخصیت دنیا کا سب سے دلچسپ میدان کاوش ہے اور ایک عجیب ہوشربا سیرگاہ ہے۔ ہر آدمی بجائے خود ایک افسانہ ہے، بلکہ افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ! ـــــــ اس سے بھی آگے بڑھ کے کہنا چاہیئے کہ اپنی جگہ ایک عالم کا عالم! شخصیات نمبر ایسے کئی عوالم کا مجموعہ ہے۔ انسانی شخصیتیں ایک حیران کن تنوّع کے ساتھ ایک بزم کاغذی کی زینت ہیں ـــــــ وہ بھی جو سراپردۂ عدم کے پیچھے جا چکی ہیں اور وہ بھی جو ابھی منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہیں۔ آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس خیالی مجلس میں ہم ان سے ملتے ہیں، ان کو چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور فریضۂ حیات ادا کرتے دیکھتے ہیں۔ اس مطالعہ کے دوران میں ایک طرف ہمارے سامنے وہ جوہر لازوال منکشف ہوتا ہے جو خاکی پتلوں کو رفعت و عظمت سے بہرہ مند کرتا ہے اور دوسری طرف وہ بے شمار کمزوریاں بھی علم میں آتی ہیں جو انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔

اس مجموعے میں ایک نسل پہلے کے جن بزرگوں کے سوانحی خاکے دیئے گئے ہیں اپنی اکثریت کے لحاظ سے وہ نئی نسل کے مقابلے میں بعض پہلوؤں سے بہت ہی ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں شرافت کا ایک مضبوط تصوّر ملتا ہے، کچھ روایات اور اقدار ملتی ہیں اور اخلاقی اور ثقافتی رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ ان کی سیرتیں کچھ ٹھوس معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بالمقابل بعد کی نسل کردار کے لحاظ سے پگھلے ہوئے موم کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کی اپنی کوئی مستقل اخلاقی و ذہنی ہیئت نہیں۔ وہاں ایک پختگی ملتی ہے اور یہاں ایک کچا پن پایا جاتا ہے۔ دو نسلوں کے اس قابل غور فرق و اختلاف کو سمجھنے میں یہ شخصیات نمبر ہمیں بڑی مدد دیتا ہے۔

جدید شعرا اور ادیبوں میں سے مستثنیات کو الگ رکھنے کے بعد بیشتر کی شخصیتیں بہ حیثیت انسان کے بہت مایوس کن ہیں۔ جس قوم کے ذہنی اور فکری پیشوا کردار کے لحاظ سے اس درجہ کنگال ہو جائیں اس کے لئے یہ بڑا موقع تشویش ہے۔

اس مجموعے میں بعض شخصیتیں دل ہلا دینے والی ٹریجڈی کے پیرائے میں سامنے آئی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک خاص مثال.... اختر اورینوی کی ہے جن کی شخصیت کی مصوری ان کی بیگم صاحبہ نے اپنے فطری جذبات کے زیر اثر بڑے دردبھرے طریق سے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اختر نام (یا تخلص) کی تقریباً ساری ہی شخصیتیں ایک نہ ایک طرح کا حزنیہ ہیں۔

"رشید جہاں" مرحومہ پر جو تعارفی مضمون لکھا گیا ہے اس کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی صاحب دعوت اور کسی ہوشیار کو مجلسی لحاظ سے کس اخلاق کا ہونا چاہیئے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی جنہوں نے مضمون لکھا ہے وہ رشید جہاں سے اپنے تاثر کی داستان سناتی ہیں۔ اس داستان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صدیقہ صاحبہ کمیونسٹ اور ترقی پسندانہ نظریہ کی قائل اس کے دلائل سے نہیں بلکہ رشید جہاں کے مجلسی طرزِ عمل سے ہوئیں۔ اس مضمون سے یہ معلومات بھی ملتی ہیں کہ بڑی بڑی خواتین ورکنز نوخیز لڑکیوں کی نفسیاتی کمزوریوں کو خوب اچھی طرح سمجھ کر کیسے نرم ہاتھ سے ان کے بند نقاب توڑ دیتی ہیں، بلکہ خود لڑکیوں کے ہاتھوں سے تڑواتی ہیں۔ پردے کی روک کو مٹا کر مغربی ثقافت کو مشرقی حرم میں داخل کرنے کے لئے کس ڈھب سے ایک خاموش جہاد جاری ہے۔ صدیقہ صاحبہ گویا رشید جہاں کے سامنے ایک بے اختیار سی "معمول" بن کر رہ جاتی ہیں اور آج اس مضمون کے اندر بھی ان کے ذہن کا طفلانہ سا انداز بالکل نمایاں ہے۔

اس نمبر کے شخصیاتی خاکوں میں ہمارے لئے بہت ہی جاذبِ توجہ خاکہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا ہے۔ قرآن کے خالص دین کا یہ داعی اپنے نظریات سے جیسی زندگی حاصل کر سکا ہے، وہ دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔ تاش، شطرنج، جوا، گالیاں، مذاق، مشغول، بحثا بحثی، خوشامد، غیبت، دو بیویوں میں سے ایک سے انقطاع، دن چڑھے بستر سے اٹھنا اور ایسے ہی دلچسپ عناصر سے "دو قرآن" اور "دو اسلام" کے مصنف کا کردار بنتا ہے۔ ڈاکٹر برق صاحب کا یہ کردار خود گواہ ہے کہ اخلاقی لحاظ سے کامل اباحیت حاصل کرنا وہ مقصود ہے جس کے لئے انکارِ حدیث کر کے قرآن کو نیزوں پر اٹھایا گیا ہے۔ یوں نفسیاتی لحاظ سے یہ سارا کھیل تماشا ایک ذہنی ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ ایک شخص جسے حالات نے "ملّا" کے سانچے میں ڈھالا تھا وہ جب حالات سے بگڑا تو اس نے ایسی زقند لگائی کہ سیدھا الحاد پر پہنچا۔ بعد میں جب ردِ عمل کا زور کم ہوا تو ذوقِ الحاد اور مذہبیت میں ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے سے پیدا ہونے والی شخصیت کا نام ہے ڈاکٹر غلام جیلانی برق!

مولانا مودودی کی شخصیت پر لکھا ہوا میرا ایک مقالہ بھی اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ نمبر بڑے معیاری پیرایۂ طباعت اور متعدد تصاویر کے ساتھ آیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔

قدم ملا کے چلو، باوقار بن کے بڑھو
اس انتشار میں تنظیم کی ضرورت ہے
باوقار تنظیم
باوقار تنظیم
(باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ اسکیم)
آجکل کے غیر اسلامی اقتصادی و معاشی نظام کو اسلام کے نظامِ معیشت میں ڈھالنے کیلئے ہماری پہلی پیش قدمی ہے
یہ اسکیم
دورِ حاضرہ کی چھوٹی بچت کی پرافٹ شیئرنگ اسکیموں کی ایک اسلامی شکل ہے
جو
ہر طرح کے سودی لین دین۔ طالع آزمائی یا لاٹری اور جوئے جیسی مذموم لعنتوں سے پاک ہے
آیئے
آپ بھی اس اسکیم میں شامل ہو کر ہمارے ساتھ شانہ بشانہ چلکر اس پاکیزہ جدوجہد اور نیک مقصد میں ہمارا ہاتھ بٹائیں
تفصیلات مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کریں
منیجر باوقار کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی ۱
فون: 7923
تار:- باوقار کراچی
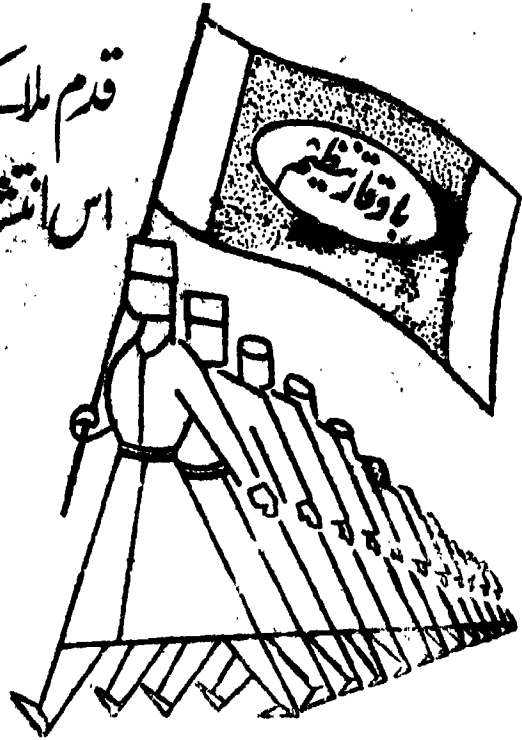
Printer & Publisher S. Kazim Ali

جون 1957

قیمت 0-8-0

"ایس-او-ایس"

جب بحری جہاز کو غرقابی کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اپنے ٹرانسمٹر کے ذریعے فضا میں "ایس-او-ایس" کے حروف منتشر کرتا ہے تاکہ قریب میں اگر کوئی اس پیغام کو وصول کرنے والا موجود ہو تو اس کی مدد کیلئے فی الفور پہنچ جائے۔ انگریزی کے یہ حروف اس جملے کی علامت ہیں "Save Our Souls" یعنی ہماری رُوحوں کو بچاؤ ——— انتخابی بل کی سازش کے بعد ہم یہ حروف نشر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جو بھی پاکستان' اس کے مقصد اور دستور کے لئے اپنے اندر دردمند دل رکھتا ہے وہ ان کی مدد کیلئے کمربستہ ہو کر پہنچ جائے۔

اگر پھلنا پھولنا غیر جمادی شے کا خاصہ ہے تو ہم یہ استخراج کرنے میں بے جا نہ ہوں گے کہ جس سازش نے ہمارے پچاس سالہ قومی فیصلے کو چشم زدن میں حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے اسکا اگلا نشانہ اب صدر ریاست کا مذہب ہو گا۔ مخلوط انتخاب کے نقطہ نگاہ سے یہ بات بالکل لغو معلوم ہوتی ہے کہ ریاست کے تمام دائروں میں مذہب وملت کا امتیاز اُڑا دینے کے بعد ملک کے صدر ریاست کے مذہب کا امتیاز باقی رکھا جائے۔ جب سب یکساں پاکستانی قومیت کے حامل ہیں تو یہ بالکل بے معنی ہے کہ صدر ریاست کے عہدے کے لئے پاکستانی ہونے کے علاوہ مسلم ہونے کی شرط باقی رہے اس لئے اسکے مزاج کے مطابق اس کے لائحہ عمل پر دوسرا نمبر دستور کی اسی شق کا ہو گا۔

پھر جس طرح ایک پودا اپنی نمو کیلئے اسی فضا کا طلبگار ہوتا ہے کہ جس کے اندر اسکی افزائش کے لئے مکمل سامان حیات موجود ہو' اسی طرح سازش کا یہ شجر خبیث بھی اپنی دوسری فصل کے لئے کراچی کی فضا کا نہیں ڈھاکہ کی فضا کا محتاج ہے۔

کاش کہ ہم وہاں کی فضا کو اس کے حق میں مسموم کر سکتے !

کاش ——— !

روشنی ——— گرمی ——— حرکت

ماہنامہ

چراغِ راہ کراچی

جون سنہ ۱۹۵۷ء

جلد نمبر ۱۱۔ شمارہ نمبر ۶

فہرست

سالانہ چندہ: ۵/- روپے۔ فی پرچہ: ۸ آنے

دفتر ادارۂ تحریر: ——— مکتبہ چراغِ راہ۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

دفتر اشاعت و انتظام: دفتر چراغِ راہ۔ فیض محمد فتح علی روڈ۔ کراچی

مینیجنگ ایڈیٹر ——— خالد احمد صدیقی

سید ناظر علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغ راہ، فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

سوچ بچار

جیلانی۔ بی۔ اے

جمہوریت یا آمریت؟

یوم جمہوریہ پر صدر ریاست نے اپنی نشری تقریر میں ملک کے سامنے چند تجاویز رکھیں ان میں سب سے اہم اور بنیادی تبدیلیوں کی حامل ملک کے موجودہ انتظامی ڈھانچے کو بدلنے کی تجویز تھی یہ کہ موجودہ صورت میں ملک کا انتظام اچھے طریقے پر نہیں ہو سکتا، اس لئے اسے امریکی طرز سے بدل لینا چاہیئے۔ یہ تجویز اس لئے بھی قابلِ غور ہے کہ یہ صدر ریاست کی طرف سے پیش کی گئی ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے دستور اور ہماری ملکی طرزِ روش میں گونا گوں تبدیلیوں کا امکان ہے۔ ہم فی الحال اس مسئلہ کو نہیں چھیڑنا چاہتے، کہ صدر کہاں تک پارلیمنٹ کی رضا کے بغیر از خود ایسی تجویز ملک کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ ہم صرف نفس مسئلہ کو لیں گے اور دیکھیں گے کہ موجودہ کابینہ نظام اور مجوزہ صدارتی نظام میں کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ کیا یہ ان دقتوں کا مداوا ہو سکتا ہے، جن کے پیش نظر صدر نے یہ تجویز رکھی ہے۔

ہمارا ملک جس نظام کے تحت چل رہا ہے وہ کابینہ نظام ہے اور یہی نظام برطانیہ میں رائج ہے۔ اس نظام کے اندر ملک کا انتظام اور نگرانی کرنے والی کابینہ (وزیر اعظم اور اس کے ساتھی وزیر) عوام کے نمائندوں لیعنی مقننہ سے منتخب کی جاتی ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت دوہری ہو جاتی ہے۔ وزیر اعظم اور اس کے ساتھی وزیر ایک طرف تو اس قانون ساز ادارے کے رکن ہوتے ہیں کہ جس میں وہ اپنے حلقہ ہائے نیابت سے منتخب ہو کر آتے ہیں دوسری طرف وہ ملک کی انتظامیہ کے سربراہ ہوتے ہیں اور عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے انتظامِ ملکی کی نگرانی کرتے ہیں۔ جب وہ سربراہِ انتظامیہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں تو انہیں دیکھنا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کے فیصلے ٹھیک طور پر نافذ ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور جب وہ پارلیمنٹ میں انتظامیہ کی کارگزاری کے متعلق جواب دہی کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں انتظامیہ کو پارلیمنٹ کی تنقید کی بوچھاڑ سے بچانا اور اس کارگزاری کی حمایت و وکالت کرنا ہوتی ہے کہ جو بحیثیت سربراہِ انتظامیہ ان کے تحت انجام پائی۔ چونکہ کابینہ کے اقتدار کی ڈور ارکان مقننہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے وہ ہر وقت ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں جونہی ارکان کی اکثریت ان کے خلاف ہوئی انہیں فوراً اپنی جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ کابینہ نظام کی یہی بنیادی پوزیشن درحقیقت اسے ٹک کر کام نہیں کرنے دیتی اور جو لوگ کابینہ نظام کی مخالفت کرتے ہیں ان کے پاس اس سے مخالفت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ لیکن صدارتی نظام میں جیسا کہ وہ امریکہ میں رائج ہے ایسا نہیں ہے۔ وہاں صدر اور اس کی کابینہ (امریکی صدر کے ساتھی وزراء سیکرٹری کہلاتے ہیں) مقننہ کے رکن ہوتے ہیں نہ ان کے ووٹوں سے برسرِ منصب آتے ہیں۔ وہ مقننہ کے سامنے اپنی کارگذاری کے جوابدہ ہوتے ہیں نہ ان کی مخالفت سے معزول۔ وہ الگ سے منتخب ہوتے ہیں اور براہ راست عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ مقننہ صدر ریاست کی

معزولی کی قرارداد پاس کر سکتی ہے لیکن یہ اتنا طویل اور پیچیدہ عمل ہے کہ اسے امریکی قوم کی تاریخ میں صرف ایک آدھ بار ہی استعمال کیا گیا۔ اس کے سوا مقننہ کے بس میں کچھ نہیں۔ مقننہ کا کام اس نظام میں صرف قانون سازی ہے بخلاف کابینہ نظام کے کہ جس میں اسے انتظامیہ کی نگرانی بھی کرنی ہوتی ہے۔ یہاں یعنی صدارتی نظام میں انتظامی امور کے تمام اختیارات صدر کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جو بلا خوفِ عزل اپنی مدتِ صدارت میں پوری دلجمعی کے ساتھ کام کا پروگرام بناتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ جبکہ کابینہ نظام میں ایک وزیر اعظم کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ اسے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔ گویا کابینہ نظام میں قانون سازی اور انتظام بالآخر ایک مقام پر آکر باہم مدغم ہو جاتے ہیں جبکہ صدارتی نظام میں ان کو علاحدہ علاحدہ رکھنے کا ہر ممکن اہتمام کیا گیا ہے۔

لیکن اس سے یہ تصور کرنا صحیح نہیں ہے کہ صدارتی نظام سرتاسر رحمت اور کابینہ نظام سرتاسر زحمت ہے۔ کابینہ نظام میں کچھ معائب ہیں تو اس میں محاسن بھی ہیں۔ اسی طرح صدارتی نظام میں جہاں متعدد خوبیاں ہیں وہاں واضح خامیاں بھی موجود ہیں۔ قانون سازی اور انتظامی اختیارات کی علاحدگی کا سب سے بڑا عیب اب خود وہاں کے علمائے قانون پر واضح ہو رہا ہے۔ یہ کہ یہ دونوں کے درمیان مسلسل رسہ کشی کو تقویت پہنچاتی ہے۔ قانون ساز اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں جبکہ صدر بحیثیت مختار انتظام اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ امریکی دستور کی رو سے نہ یہ اس کو گزند پہنچا سکتے ہیں نہ وہ مقننہ کو توڑ سکتا ہے۔ ایک امریکی قانون دان لکھتا ہے۔ "اس علاحدگی (یعنی مقننہ و انتظامیہ کی) کا نتیجہ یہ ہے کہ انتظامیہ اور کانگریس (امریکی مقننہ کانگریس کہلاتی ہے) کے درمیان کشمکش رہتی ہے جو کبھی تو کھلم کھلا عناد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی مسلح مصالحت کی۔"

چونکہ انتظامیہ اور مقننہ کے مفادات بعض مقامات پر باہم متصادم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کی صورتیں وضع کی گئی ہیں۔ برطانوی کابینہ نظام میں مقننہ ہی سے چند آدمی لیئے جاتے ہیں۔ جو انتظامیہ کی نگرانی و سربراہی کرتے ہیں جبکہ امریکی صدارتی نظام میں ان کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ ایک نظام میں ان کے درمیان تصادم دور کرنے کے لیئے انہیں متحد کیا گیا ہے۔ دوسرے میں ان کے دائرہ کار مقرر کر کے انہیں علاحدہ کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی بھی ایک دوسرے کے کام میں رکاوٹ کا باعث نہ بن سکے۔ پھر دونوں شعبوں کو اس طرح منضبط کیا گیا ہے کہ اگر مقننہ کو کچھ اختیارات دیئے ہیں تو انتظامیہ کو بھی غیر مسلح نہیں چھوڑا۔ ایک پر کچھ پابندیاں ہیں تو دوسرا بھی آزاد نہیں تاکہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے رہیں اور جب کوئی اپنی حد سے تجاوز کرنے لگے اس کو وہیں روک دیا جائے۔ اختیارات اور پابندیوں کی اس ترکیب کو دستوری زبان میں CHECKS AND BALANCES کا نام دیا گیا ہے۔

عملی پہلو سے اختلاف کے باوجود دونوں نظاموں میں ایک اصول کا بہر طور اہتمام و انتظام رکھا گیا ہے۔ یہ کہ ملک کے اندر جو بھی طاقت موجود ہو، جو بھی اختیار قائم ہو اُسے عوام کی رضا حاصل ہو اور یہی جمہوری نظام کا امتیازی نشان ہے۔

اگر امریکی صدر کے پاس وسیع اختیارات ہیں تو اس سے یہ ہرگز تصور نہ کیا جائے کہ وہ عوام سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے ہر معاملہ اور اقدام میں عوام کی تائید کا محتاج ہوتا ہے۔ سابق صدر امریکہ ٹرومین نے اپنی تازہ تصنیف MEMOIRS

بیں بڑے دلچسپ انداز سے بتایا ہے کہ صدر کو عوام کی تائید حاصل کرنے کے لئے کن کن ذرائع سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ جب کبھی کوئی قدم اٹھاتا ہے تو عوام کو اس پر مطمئن کرنے کی فکر کرتا ہے۔ اور جب کسی اقدام کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے عوام کی نبض ٹٹول لیتا ہے جب حالات سازگار پاتا ہے تو نشری تقریر کے ذریعہ عوامی تائید کی اپیل کرتا ہے۔ امریکہ کا صدر بالعموم وہی شخص ہوتا ہے جو امریکہ میں سب سے زیادہ مقبول اور عوام کی نگاہوں میں عزیز ہو۔ جس کی پشت پر ملک کی دو عظیم جماعتوں میں سے اس جماعت کی طاقت اور تائید موجود ہو کہ جس کی پالیسی اور پروگرام پر ملک کی عظیم اکثریت نے صاد کر دیا ہو۔ گویا اسے ہر لحاظ سے عوام کی تائید حاصل ہوتی ہے عوامی ہر دلعزیزی کے لحاظ سے بھی اور پروگرام اور پالیسی کے لحاظ سے بھی۔

اگر مقننہ کے ارکان عوامی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتے ہیں تو امریکہ کا صدر اس معاملہ میں ان سے کسی صورت بھی پیچھے نہیں۔ عوام کی نگاہ میں جتنی عزیز مقننہ ہے اتنا ہی انتظامیہ کا صدر۔ ایک امریکی ماہر دستور کے الفاظ میں امریکہ میں جھگڑا چل رہا ہے کہ صحیح معنوں میں عوامی نمائندگی کون کر رہا ہے۔ مقننہ یا انتظامیہ؟ دونوں کو اپنی عوامی نمائندگی کا بڑھ چڑھ کر دعویٰ ہے اور دونوں جانتے ہیں کہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔ جنگِ عظیم دوم میں صدر روز ویلٹ نے محسوس کیا کہ پرائس کنٹرول ایکٹ منسوخ ہونا چاہیئے۔ اس نے کانگریس سے دو چار مرتبہ اس کی منسوخی کے لئے کہا۔ لیکن کانگریس اسے قائم رکھنے پر مُصر تھی۔ یہ کشمکش کچھ عرصہ جاری رہی۔ بالآخر صدر نے کانگریس سے خود اعتمادی سے لبریز جس لب و لہجہ سے خطاب کیا وہ قابلِ ملاحظہ ہے:-

"میں چاہتا ہوں کہ کانگریس اس قانون کو یکم اکتوبر تک منسوخ کر دے۔ اگر وہ اس تاریخ تک ایسا کرنے پر تیار نہ ہو تو عوام کی جانب سے مجھ پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے اس کی بنا پر میں مجبور ہوں گا کہ خود ہی اقدام کروں اس لئے کہ مساعیٔ جنگ میں کسی قسم کی رخنہ اندازی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر کانگریس اس قانون کو ختم نہیں کرتی ہے یا کرتی ہے مگر غیر تسلی بخش انداز پر تو میں ہر ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار ہوں اور اس قانون کو ختم کر دونگا۔"

اس کے بعد کانگریس نے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ یہ صدر نہیں پورا ملک بول رہا ہے اور اگر میزان لگی تو پلڑا اسی کا بھاری ہو گا۔

ہمارے صدر محترم نے غالباً محسوس کیا ہو گا کہ یہاں کو دھ مغز اور بے ضمیر ارکانِ اسمبلی ان کے عزائم کی راہ میں سدِ گراں ہیں لہذا معاملات کو جلد از جلد نمٹانے کے لئے وہ تمام اختیارات صدر کو حاصل ہونے چاہئیں کہ جس سے وہ اپنا کام بے روک کر سکے۔ درحقیقت انتظامیہ کی نفسیات ہر جگہ یہی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ قوت اور زیادہ سے زیادہ اختیارات چاہتی ہے لیکن جمہوریت کے اندر جو جابجا مقننہ اور عدلیہ کی بریکیں لگا دی گئی ہیں تو اسی خدشہ کی بنا پر کہ مطلق العنانی زیادہ قوت اور زیادہ اختیارات کے ارتکاز سے آتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مطلق العنان جب کبھی آیا۔ اس نے سب سے اوّل انہی دو شعبہ ہائے حکومت کو کمزور کیا۔ جرمنی میں جب ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس نے سارے ملک کی انتظامی مشینری کو اس طرح ڈھال دیا کہ مقننہ اور عدلیہ نام کی رہ گئیں۔ اصل اختیار ہٹلر کے پاس تھا یا اس کی نازی پارٹی کے پاس۔

امریکہ اور انگلستان کی انتظامیہ بھی زیادہ سے زیادہ اختیارات کی خواہش رکھتی ہے لیکن ان کے سربراہ چونکہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ بہرصورت جمہوری نظام کے بنیادی تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ کم ازکم حال نصف صدی میں ان دونوں ممالک میں کہیں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جہاں بحالتِ جنگ یا بحالت امن کبھی ایسا معطل کیا گیا ہو۔ اگر حالت جنگ میں خود مقننہ ہی نے کوئی ایسا قانون بنا دیا کہ جس سے انتظامیہ کے ہاتھ مضبوط ہوتے تھے تو اس کو نہایت درجہ احتیاط کے ساتھ برتا گیا اور جونہی جنگ ختم ہوئی اسے فوراً واپس لے لیا گیا۔ اپنے ہاں کی پارلیمنٹ میں جس طرح قواعدِ ایوان کو بدلا اور پامال کیا جاتا ہے۔ وہ بھی معلوم ہے جبکہ انگلستان میں پارلیمنٹ کے قواعد اس حالت میں بھی معطل کئے گئے جبکہ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین سے پانی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اِن ممالک کی مقننہ اور انتظامیہ نے خوب خوب سمجھ رکھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود ایک دوسرے کے لئے اور انتظامِ ملک کے لئے بے حد اہم اور ضروری ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس زعمِ باطل میں مبتلا نہیں ہے کہ ملک کی تمام تر فلاح بس اسی کے شعبہ پر منحصر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ملکی مشین کی ہموار حرکت کے لئے جتنا ایک شعبہ ضروری ہے اتنا ہی دوسرا شعبہ ضروری ہے اور ان شعبوں پر اختیارات کے ساتھ جو پابندیاں لگا دی گئی ہیں وہ بھی اتنی ہی لازمی ہیں جتنے کہ اختیارات۔ یہ پابندیاں اعضائے ریاست کو اپنی حدود کے اندر رکھنے کیلئے لگائی گئی ہیں جس طرح صحت نام ہے تمام اعضائے جسد میں خون کی متوازن رسار کا، اسی طرح جمہوریت نام ہے تمام شعبہ ہائے حکومت کا توازن اختیارات اور پابندیوں کے ساتھ اپنے اپنے دائرے میں کام کرنے کا۔ اور جس طرح مرض کسی حصۂ جسد میں خون کی کمی بیشی سے واقع ہوتا ہے اسی طرح مطلق العنانی بھی کسی شعبۂ حکومت کا اتنے سارے اختیارات سمیٹ لینے کا نام ہے کہ دوسرے شعبے برائے نام رہ جائیں۔ ذمہ دارانِ ریاست جب حلف اُٹھاتے ہیں تو وہ اسی امر کا ہوتا ہے کہ وہ صحتِ ملکی کی نگہداشت کریں گے اور جہاں کہیں مرض کے آثار پائیں گے اس کے انسداد کی فوری تدبیر کریں گے۔

بالفرض یہاں پر امریکی نظام آ بھی جائے تب بھی صدرِ محترم کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جتنی بھی بامنصب شخصیتیں ہیں وہ براہِ راست عوام سے منتخب ہو کر نہیں آئی ہیں بلکہ آرڈی ننسوں اور چور دروازوں کے ذریعہ سے آئی ہیں۔ ان میں شاذ ہی ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے قومی کارکن کی حیثیت سے تربیت حاصل کی ہو۔ عظیم اکثریت ایسوں کی ہے کہ جو مستقل ملازمتوں سے لائے گئے ہیں۔ ان کے مزاج دفتر کی ٹھنڈی اور پُرسکون فضا کے لئے تو سازگار ہو سکتے ہیں لیکن عوامی سیاست کے جھکڑ کا ایک تھپیڑا نہیں سہہ سکتے جبکہ انگلستان اور امریکی نظاموں کی تمام تر خوبی، حسن اور کمال درحقیقت ان کے کارکنوں میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے اپنے نسخہ ہائے دساتیر تو عام کر دیئے ہیں لیکن اس کلید کا راز نہیں بتایا کہ جس سے یہ بروئے کار آتے ہیں۔ اور وہ سرّ ان کارکنوں کے اپنے سیاسی اخلاق میں مضمر ہے۔ وہ اپنے ملک سے باہر چاہے جس قسم کی بددیانتی کے مرتکب ہوں اپنے ملک کے اندر پوری دیانتداری سے کام کریں گے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ریاست

کا جو برطانوی ڈھانچہ انگلستان میں خیر و خوبی کا باعث ہے۔ وہ جب سرزمین مشرق میں آکر نافذ ہوتا ہے تو ہر طرف بدامنی اور انتشار پھیل جاتا ہے اور کوئی کل ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ عہدِ قریب میں جن مقبوضات کو پنجۂ مغرب سے رہائی ملی ہے۔ ان کی آزادی کے بعد تاریخ کا بغور مطالعہ صاف صاف بتا دیتا ہے کہ غیر ملکی حکمران جاتے ہوئے ان ممالک پر ایسے لوگ مسلط کر گئے کہ جو طبعاً غیر جمہوری اور اگر مجھے ایک اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا اقتدار خولیا کے مریض تھے۔ ان کا مقصدِ حیات کسی نظام کا قیام نہ تھا بلکہ اپنے لئے جاہ و شہرت کے خزانے لوٹنا تھا۔ وہ انتہائی پست سیاسی اخلاق کے حامل تھے۔ وہ جمہوری نظام میں غیر جمہوری راستوں سے آئے اور ایسے جھاڑ کے کانٹے بن کر مسلط ہوئے کہ کسی طرح اُتارے نہیں اترتے۔ اب دستور کیسا ہی عمدہ اور جمہوری کیوں نہ ہو وہ کبھی نہیں چلے گا۔ اس لئے کہ جو اس کے چلانے پر مامور ہیں وہ اسے چلانا نہیں چاہتے۔ ان کی زندگی کا مقصد اس نظام کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ انڈونیشیا سے ترکی تک نگاہ ڈال لیجئے ہر جگہ یہی کیفیت نظر آئے گی۔ حالانکہ ان تمام ممالک میں وہی دساتیر رائج ہیں کہ جو بہ کمال و عمدگی مغرب میں چل رہے ہیں جن ممالک نے اس راز کو پا لیا ہے وہ البتہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اہلِ مغرب بالخصوص انگلستان اور امریکہ نے اس ناموس فطرت کو خوب خوب سمجھ لیا ہے کہ دنیا میں کوئی کام دیانت داری اور خلوص کے بغیر نہ چل سکتا ہے نہ ترقی پا سکتا۔ انہوں نے میکیاولی کا فلسفہ بطور خارجہ پالیسی کے تو اپنا رکھا ہے لیکن داخلی سیاست میں اس کی ہوا تک نہیں آنے دیتے۔ نہ برطانوی نظام بے عیب ہے اور نہ امریکی نظام سراپا کمال اصل خوبی اس کے چلانے والوں میں ہے۔ برطانوی نظام اس لئے خوب ہے کہ اس کے چلانے والے ڈیزرائلی، گلیڈسٹون اور چرچل تھے اور امریکی نظام اس لئے قابلِ صد ستائش ہے کہ اس کو ابراہیم لنکن، جیفرسن ولسن اور روز ویلٹ سے آدمی میسر آ گئے۔ ان لوگوں کی عظمت اپنے نظامِ ملک سے کمال درجہ وفاداری اور دیانت داری میں مضمر ہے۔ وہ سیاسی اخلاق میں نہایت بلند مقام کے مالک تھے۔ وہ ملکی سیاست میں سیدھے راستے سے آئے اور ایوان کے باہر اور ایوان کے اندر انہوں نے جن مواعید پر قسمیں کھائی تھیں ان کے پابند رہے ورنہ از خود پیچھے ہٹ گئے۔ اس عہدِ تنزل میں بھی ان لوگوں کا اپنے داخلی معاملات میں سیاسی اخلاق ہم پاکستان کے رہنے والوں کے لئے باعثِ صد تعجب ہے۔ حالیہ نہر سویز کے تنازعہ میں کنزرویٹو پارٹی کے جن ارکان نے اپنی پارٹی سے اختلاف کیا انہوں نے پارلیمانی نشستوں سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس لئے کہ وہ عوام سے کنزرویٹو پارٹی کے پروگرام پر اور اس کے رکن و موئید کی حیثیت سے ووٹ لے کر آئے تھے۔ جب وہ اپنی پارٹی سے اختلاف کر رہے ہیں تو ان کے لئے کس طرح جائز ہے کہ وہ اس نشست پر قابض رہیں کہ جس کو انہوں نے پارٹی کے نام پر حاصل کیا تھا۔ سنہ ۴۷ء کا واقعہ ہے۔ ڈالٹن وزیر خزانہ انگلستان کو بجٹ سے ایک روز قبل چند چالاک نامہ نگاروں نے گھیر لیا اور باتوں باتوں میں اسے ایسا الجھایا کہ اس کی زبان سے بے اختیار چند اشارے بجٹ کے متعلق نکل گئے۔ دوسرے روز کے اخبارات میں وہی اشارے جلی عنوانات کے ساتھ چھپے ہوئے تھے۔ اس پر ڈالٹن نے پارلیمنٹ میں بجٹ پیش کرنے کی بجائے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ وہ فرانس جو

بیرونِ ملک اپنی کسی بھی غیر انسانی وحشت اور بربریت پر نادم نہیں ہے اپنے گھر میں سیاسی دیانت کا اس طرح پابند ہے کہ آئے دن وزارتوں کا ٹوٹنا اسے گوارا ہے لیکن اپنی روایات کو توڑنا منظور نہیں۔

ہماری ملکی سیاست میں اختلال کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہاں امریکی نظام نہیں ہے اور صدر کے اختیارات کم ہیں، بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان سیاست میں دیانتداری اور اخلاص سے کام نہیں لیتے۔ ان میں جذبۂ وفاداری کا فقدان ہے۔ ملّی مقصد اور ان کی زندگیوں کے مقصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملکی ترقی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس کے لئے جسم و جان تک دے دیں جبکہ یہ چاہتے ہیں کہ صرف ان کے جسم و جان بچ جائیں۔ خواہ ملک جہنّم میں جائے۔ جو لوگ سیاست و محبت میں ہر فعل روا کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ ذرا یہ تو بتائیں کہ پھر انگلستان اور امریکہ کے نظام ہائے حکومت کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے پست عقائد صرف پست طبائع ہی میں گھر کرتے ہیں۔ تلوار بنانے میں اگر خیانت کی جائے تو بوقتِ جنگ کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ظلم کے لئے استعمال ہوتی ہے یا عدل کے لئے۔ اس طرح اگر انتظامِ حکومت کے قیام میں دیانتداری سے کام نہ لیا جائیگا تو یہاں کبھی استحکام اور دشمن کے دل میں کبھی خوف پیدا نہ ہوگا۔ دنیا کی نگاہ میں ایک ملک کی توقیر و عزّت اس کے داخلی استحکام ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اس حقیقت کو ہم سے زیادہ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں اس وقت زمامِ ملک ہے۔

دستور میں جی بھر کر تبدیلیاں کر بھی لی جائیں تب بھی معاملہ راس نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ جو تبدیلی چاہتے ہیں وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنے۔ ہر دستور کی کامیابی کی چند شرائط ہیں۔ جب تک انہیں پورا نہ کیا جائے گا کامیابی قدم نہ چومے گی۔ امریکہ اور انگلستان میں جو کھیتی لہلہا رہی ہے وہ یہاں اس لئے مرجھا رہی ہے کہ جن شرائط کے تحت یہ مثمر ہوتی ہے وہ یہاں پوری نہیں ہو رہیں۔ یہ شرائط دستور کے الفاظ میں اس کی روح میں ملتی ہیں۔ دنیا میں جو لگ اپنے وطنوں کو دنیا کی نگاہ میں سربلند کرتے ہیں وہ اسی روح کی ہدایت پر چلے ہیں۔ وہ اسے اس طرح اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں کہ پھر وہ ملک کی زبان، اس کا دل اور اس کی آنکھیں بن جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں تو اسی کی آنکھوں سے۔ محسوس کرتے ہیں تو اسی کے دل سے، اور جب بولتے ہیں دنیا جانتی ہے کہ ان کی زبان ملک کی زبان ہے۔ یہ گویا سیاست کا درجۂ تصوف ہے اور اس کے بغیر وہ عزّت حاصل نہیں ہو سکتی کہ جس کے لئے ہمارے سیاست دانوں کے جی تو للچا رہے ہیں لیکن اس مقام بلند کو پانے کی اہلیت و ہمت نہیں رکھتے۔ اب وہ اس کو پانے کے لئے قریب قریب وہی طریقِ کار اختیار کر رہے ہیں کہ جس سے کسی تھانے میں کام لیا جاتا ہے یعنی جہاں رشوت سے کام چلتا ہو وہاں رشوت دی جائے، جہاں رعب سے کام نکلتا ہو وہاں رعب سے کام لیا جائے ورنہ چاپلوسی اور خوشامد سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ اس مقام بلند کو حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ اپنا تزکیہ ہے نہ کہ دستور کا۔ ایک چینی حکیم کے قول کے مطابق دانا نشانچی کا جب نشانہ چوک جاتا ہے تو وہ اس کوتاہی کی تلاش نشانے میں نہیں اپنی ذات میں کرتا ہے۔

فروغ احمد

اِحتساب

[یہ نظم ۲۳ مارچ ۵۷ء کو موزوں ہوئی۔ اُسی دن یومِ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی تقریب میں منعقد شدہ ایک بزمِ ہاؤس میں اسے سُنایا گیا۔ اور پھر حلقہ ادبِ اسلامی ڈھاکہ کے مشاعرہ میں اسے پڑھا گیا۔]

ہاں یہ میں نے بھی سُنا ہے کہ بہار آئی ہے
دیکھتا ہُوں کہ طرب ناک ہے محفل کا سماں
ٹوٹا ہے نغمۂ نوروز کے سیلاب کا بند
لیکن اے ہم سخنو! دل ہے مرا محوِ الم
ہاں یہ ساغر ہے مگر منہ کلمۂ تلخ ہے دوست

اِن دریچوں سے پرے، دُور افق تا بہ افق
جُرم و عصیاں، ستم و جور کی آبادی ہے
غیرت و شرم کے نکلے ہیں جنازے سرِ راہ
عدل و انصاف حسیں خواب، سُہانا سا فریب
اور اسلام فقط ایک حسیں بہلاوا!

آج تم نے بھی مجھے اِذنِ سخن دے ہی دیا
ساتھیو! آج مَیں خاموش نہیں رہ سکتا
یہ چمن کیسا چمن ہے، یہ خزاں ہے کہ بہار!
بلبلیں نالہ کُناں، زاغ و زغن گل بکنار
باغباں محوِ فغاں، دامنِ گلچیں شاداب

پھُول کمہلا گئے، پھر پھول نہیں آئے ہیں
غنچے مسلے ہی گئے، غنچے نئے کھل نہ سکے
مسندیں لٹتی رہیں، خلق پریشاں ہی رہی
قصر و ایواں میں شب و روز چراغاں ہی رہا
شاعرِ ملت نہ سر بگریباں ہی رہا

ساتھیو! جانتا ہوں میں کہ بہار آئی ہے
پھُول کمہلائے ہیں، جوبن پہ ہے کانٹوں کا نکھار
باغبانو! کبھی سوچا بھی ہے تم نے کہ آخر
چھایا ہے کیوں روشِ گل پہ اُداسی کا سماں؟
جوش اب کیوں نہیں لاتی ہے وہ نعروں کی شراب؟

شہر ویران ہے، یہ شہر خموشاں ہے ندیم !
سنگ اور خشت کو ہم شہر نہیں کہہ سکتے
آہ مایوسی کا انجام نہ جانے کیا ہو !
اس تصور سے مرا قلب لرز جاتا ہے
اس تصور سے مرا جی ہے کہ گھبراتا ہے

رائیگاں جائے گا کیا اپنے جوانوں کا لہو ؟
کیا [illegible] عصمت کے گہر ؟
یونہی مغرب کا یہ طوفان رہے گا برپا ؟
کیا یونہی چلتی رہے گی ابھی یہ بادِ شمال ؟
کیا نہ ہوگی کبھی اسلام کی کھیتی شاداب ؟

صحنِ مسجد میں تماشائے ہوس ہوتا ہے !
زیرِ محراب ابھی سویا ہے ملّائے حرم !
ہاں ابھی کیسے اُتر جائے دعاؤں کا خمار !
کیسے نکلے گا ابھی سر سے وظائف کا سرور !
ہوگا کب ذوقِ عمل بانگِ اذاں سے بیدار !

چارہ گر کاش جنوں اتنا تو ہوتا ہمدم
ان فلک بوس فصیلوں ہی کو ہم ڈھا سکتے
جیل ہے جیل ابھی اپنا وطن اے ساقی
سال بر سال یونہی رینگتے چلے جاتے ہیں
جانے گزریں گے ابھی اور بھی کتنے مہ و سال

ہاں یہ میں نے بھی سنا ہے کہ بہار آئی ہے

بقیہ [illegible] فروغ احمد کا [illegible] فروغ احمد کے نام۔ از صفحہ ۹۴

[illegible] گا۔ [illegible] فرشتے بن جائیں یا کوئی غیرارضی مخلوق۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اہلِ مریخ بھی اس سے بالاتر نہیں۔ [illegible] نہ تمہارے اعتراضات اور شبہات کا جواب بالکل صاف صاف اور پوری تفصیل و تشریح [illegible] کر دیتا۔ [illegible] کہا ہے کہ میں انتہائی خشک مزاج واقع ہوا ہوں اور سوچنے کا ایک ہی ڈگر ہے جس پر [illegible] اور تم نے مجھ پر Single track mind ہونے کی پھبتی بھی کسی ہے۔ افسوس کہ یک جان و یک قالب ہوتے ہوئے بھی آج تک تم مجھے نہ سمجھ سکے۔ یہ ہے وہ بُعد جس کا رونا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے "So near and so far" (اتنے قریب [illegible]) سو اس کے مصداق ہم ہی نکلے۔ کیا تم اپنی اوّلین فرصت میں اپنے الزام کی وضاحت کر دو گے ؟ تاکہ میں واقعی اس پر [illegible] دل سے غور کر سکوں۔

میں ہوں تمہارا

فروغ ۔ ڈھاکہ

نعیم صدیقی

"اٹھارہ سو ستاون"

آج جبکہ یہ مقالہ لکھا جا رہا ہے پاکستان بھر میں "یومِ ظفر" منا کر انقلاب ۱۸۵۷ء کی یاد تازہ کرنے کا ہفتہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ان سطور میں واقعات و احوال کا تاریخی ریکارڈ پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ پیشِ نظر ایک مختصر عمومی تجزیہ مقصود ہے۔

۱۸۵۷ء کی یاد

کوئی شک نہیں کہ تاریخ ایک بہترین مکتب ہے جس میں قدرت کا معلم واقعات و حوادث کی کتاب کھولے علی التکرار نسل ہائے انسانی کو تعلیم دے رہا ہے۔ اس کتاب میں ابنائے آدم کے انفرادی تجربات و کردار بھی رنگا رنگی کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور اجتماعی مد و جزر کی داستانیں بھی عبرت کے بے شمار اسباق کی شکل میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کی تصویروں اور کہانیوں سے محض تفریح کے طور پر دلچسپی لینا سرے سے مطالعۂ تاریخ کے مقصد کو خبط کر دیتا ہے۔ اس کتاب کو طالب علمانہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھیے تو اس سے انفرادی و اجتماعی ذہن و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

جو قومیں طالب علمانہ ذہن سے اپنی تاریخ سے استفادہ کرتی ہیں وہ ماضی کی اجتماعی حرکات کو بہرحال بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ اور ان کا سارا فلم اُلٹا گھما کر غور سے دیکھتی ہیں کہ پیچھے کے کام میں خوبیاں کیا تھیں اور غلطیاں کیا رہیں۔ خاص طور پر ایک ملتِ بیدار اپنی تاریخ کے کسی بھی روشن اور تاریک باب کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی اور اس کے کسی صفحے پر غیروں کی مغالطہ انگیزیوں کا غبار پڑا نہیں رہنے دیتی۔ اس لحاظ سے پاکستان میں تاریخ کے گذشتہ ادوار کو نمایاں کرنے کا رجحان اگر ترقی کرے تو یہ قابلِ تحسین ہے۔

۱۸۵۷ء ہی کیوں؟

بلاشبہ ۱۸۵۷ء کی طوفانی حرکت ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ اسے پردۂ ماضی میں اوجھل رہنے دیا جائے۔ مگر سوال یہ بھی تو ہے کہ غلامی کے اولین حملے کا جو عظیم الشان ردِ عمل ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا طوفانی ہنگامہ اس کا محض ایک جزء تھا اور نسبتہً ثانوی جزء۔ اس کا اولین اور اہم ترین جزء تحریکِ مجاہدین تھی۔ جو صحیح معنوں میں ایک نظریاتی، منظم، منصوبہ بند اور پابندِ حدود تحریکِ انقلاب تھی۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اپنی تاریخ کے اس روشن اور زریں، مکمل اور مرتب باب کو بالائے طاق رکھ کر محض ایک انقلاب ۱۸۵۷ء کو مجموعی ردِ عمل سے الگ کر کے کیوں لیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو عناصر معاشرے میں سیاسی و معاشی طور پر پیش پیش ہیں وہ چونکہ قوم کی دینی حس کو ملیامیٹ کرنے اور اس کو جغرافی قومیت پر استوار ہونے والے سیکولرازم کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں اس لئے وہ تاریخ کے اوراق میں سے اپنے مطلب کے مطابق انتخاب کرتے ہیں۔ اصل صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کو تحریکِ جہاد سے ہرگز منقطع نہیں کیا جا سکتا ـــ نہ فکری

جذباتی خاصے "نہ زمانی اتصال کے لحاظ سے۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی روح میں ذوقِ جہاد کا مدّ و جزر ۱۸۰۲ء میں روز افزوں رفتار سے ہوتا رہا۔ اور اس دوران میں تحریکِ جہاد کی قیادت کی صف منظم ہونا شروع ہوگئی تھی۔ ۱۸۲۱ء میں اس کے علمبرداروں کا ایک قافلہ سیّد شہیدؒ کی معیت میں حج کو گیا۔ ۱۸۲۲ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۸۳۱ء میں سیّد صاحب کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے بعد چالیس پچاس برس کے دورِ ابتلا میں مولینا ولایت علی صادق پوری اور دوسرے بزرگوں کی زیرِ قیادت اس تحریک کی لہریں کچھ سطح کے اوپر اور کچھ سطح کے نیچے مسلسل حرکت میں رہیں۔ مولینا ولایت علی اور ان کے جانشین رفقا نے سلسلۂ دعوت کے ساتھ ساتھ سکھوں کے خلاف معرکۂ جہاد جاری رکھا۔ مجاہدین کے لہو سے لکھا ہوا یہ باب عین ۱۸۵۸ء تک چلتا ہے۔ یہ وہ موقع ہے جبکہ پشاور سے انگریزی حکومت نے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں چھ ہزار کی فوج بھیجکر مجاہدین کا زور توڑ دیا — لیکن تحریک ختم نہ ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں پھر ایک فوجی مہم کے ذریعے جنگِ امبیلا لڑی گئی۔ بعد میں پھر انگریزی حکومت نے ایک فوج کشی ۱۸۶۸ء میں کی۔ ۱۸۹۰ء تک سرحد کے ماحول میں انگریز خطرے کی بُو سونگھتے رہے۔

یہ سارے کا سارا زریں باب آخر ۱۸۵۷ء کی اوٹ میں کیسے گم کیا جاسکتا ہے۔ چاہیئے یہ تھا کہ پوری اہمیت کے ساتھ تحریکِ جہاد کو نمایاں کیا جاتا۔ اس کے قائدین اور کارکنوں کے مثالی اور قابلِ ذکر کردار کو — جس کا اعتراف ہنٹر جیسے مسلم دشمن نے بھی کیا ہے — آئندہ نسلوں کے سامنے رکھا جاتا اور اس کے اسلامی نظریہ اور اس کی اخلاقی روح کے قیمتی ورثے کو آگے منتقل کیا جاتا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے ایک عمومی جذبۂ آزادی تو مل سکتا ہے لیکن ہمہ گیر نظریہ و نصب العین کا فکری مواد نہیں ملتا جسے ہم متاعِ گراں بہا سمجھ کر سینے سے لگالیں اور بہ حفاظت تمام آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کر دیں۔ پھر یہاں ہمیں سربراہ کاروانِ انقلاب میں ایسی مثالی شخصیتیں بھی نہیں ملتیں جن کے کردار ہمیشہ کے لئے روشن مشعلوں کا کام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہادر شاہ ظفر کی شخصیت پر اکتفا کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس کا کوئی انقلابی کردار نہیں ہے۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ وہ ایک اچھا آدمی، ایک دردمند حکمران سہی، لیکن وہ ایک مرثیہ تو تھا رجز نہ تھا۔ وہ تو اپنی جان، اپنے وظیفے اپنے ایک چھوٹے بیٹے کی ولی عہدی کے مسئلے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس مظلوم کو کامیابی کی زندگی تو کجا، مجاہدانہ موت بھی نصیب نہ ہوسکی۔ وہ سلطان ٹیپو کا سا مرتبہ بھی حاصل نہ کرسکا۔ وہ ایک نقشِ عبرت ہے دعوتِ اقدام نہیں۔ نہ معلوم ظفر ڈے منانے سے کونسا نتیجہ برآمد کرنا پیشِ نظر ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی نوعیت

۱۸۵۷ء کا انقلاب فی الواقع بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور ہم اپنے پیشروں کے کم سے کم اس کارنامے کے ممنون ہیں کہ انہوں نے غلامی کے تسلط کے خلاف ممکن حد تک ردِّ عمل دکھایا۔ لیکن تاریخ کی ہر اجتماعی حرکت ضروری نہیں کہ ایک "تحریک" قرار دی جائے۔ اگرچہ لوگ تحریک کا لفظ مختلف معنوں میں بولتے ہیں — لیکن سیاسی اصطلاح کی حیثیت سے تحریک وہ جدوجہد ہوتی ہے جس کے اندر کسی واضح نظریئے کا شعور کارفرما ہو، جس کی ایک معلوم و معین قیادت ہو، جس کا کام تنظیم اور منصوبہ بندی کے تحت چلتا ہو اور جو کچھ نہ کچھ طے شدہ حدود کی پابند ہو۔ اس تعریف کے مطابق انقلاب ۱۸۵۷ء کی نوعیت ایک تحریک کی نہیں بلکہ ایک طوفانی ردِّ عمل کی سی ہے۔ اسے محض علامتی "لوٹوں" کی ترسیل اور

"چپاتیوں" اور "کنول" کی تقسیم سے اور رقعوں پرچوں کی گشت کی بنا پر ایک تحریک کی سی تنظیم کا حامل ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تنظیم تو ہر بلوے اور ہنگامے میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ یہ ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی غیرت و حمیّت کا آخری وبال تھا — کہنا چاہیئے کہ فی الحقیقت بعد از وقت !! ہاں اگر اسے تحریکِ جہاد کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک کر دیجئے تو پھر صورت دوسری ہے۔ ہماری رائے میں امر واقعی یہی ہے۔

محرکات

انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب و محرکات کا کھوج لگانا بہت ضروری ہے۔ اس معاملے میں نہ انگریزی نقطۂ نظر صحیح ہے، نہ ہمارے جدید قوم پرست مورخین کا — ابھی ہمیں کسی عالی دماغ، انصفت شعار اور اسلامی فکر سے کام لینے والے مورّخ کا انتظار ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اس کے وجوہ و اسباب کچھ سیاسی بھی تھے، کچھ معاشی بھی، کچھ معاشرتی بھی، کچھ جذباتی بھی، اور کچھ مذہبی و اخلاقی بھی۔ لیکن غالباً مرکزی حرکت آفریں رجحان قطعی طور پہ دینی تھا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ غیروں کا عمل دخل خود نفرت آمیز اور توہین انگیز چیز تھا اور ایک حکمران طاقت کا مسندِ عزت سے فرشِ مذلت پر گرا دیا جانا، اور مسلمانوں کی علامتِ آزادی و اقتدار — یعنی بادشاہتِ وقت — کا ذلت آمیز سلوک سے دوچار ہونا، بزمِ شوکت و حشمت کا اُجڑ جانا اور اس کے نتیجہ میں آناً فاناً ایک ایک مسلمان فرد کے مرتبے میں آسمان و زمین کا فرق واقع ہو جانا ہیجان پیدا کرنے والی صورت حالات تھی۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سفید فام سوداگر مزاج نئے آقاؤں کے حیلہ ہائے پرویزی اور رفتہ ہائے چنگیزی کی لپیٹ میں آنے والے ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی کثیر تعداد جا بجا نقوشِ مظلومی پیش کر رہی تھی اور اس کی وجہ سے غم و غصہ بھڑک رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ انگریز حکمرانوں نے "تاجداروں اور خوشحال طبقے کے افراد پر باج و خراج کا غیر معمولی بوجھ ڈال کر، ڈھاکہ اور بنگال اور بہار کے صنعت کاروں کو تباہ و برباد کر کے بے شمار مسلمان عہدہ داروں کو مناصب سے ہٹا کر سفید فام ملازمین کو بھاری تنخواہیں دیتے ہوئے مقامی آبادی کی خدمات سستے داموں خرید کر اور بے شمار مواقع پر آبادیوں کے اندر کھلی کھلی لوٹ مچا کر سخت اقتصادی اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ سارے وجوہ زیرِ زمین نفرت و بیزاری کے جذبات کے بارود بھر رہے تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس بارود کو آگ کونسی چنگاری نے لگائی۔

ہندوستانی آبادی عموماً اور مسلمان علی الخصوص بالکل ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھے جیسے یکایک مسلح ڈاکو کسی گھر میں گھس آئیں اور وہ گھر کے مالکوں کو نوکروں اور بھٹیاروں میں بدل دیں اور ان کے املاک و اموال کی تباہی مچا دیں یہاں تک تو گھر کے لوگ صبر سے سہتے چلے گئے لیکن جب ان پہ آخری وار ہوا اور انہوں نے ایمان، اخلاق اور ثقافت کو خطرے میں پایا تو انہیں تابِ ضبط نہ رہی۔ تاریخ گواہ ہے کہ عیسائی پادریوں خصوصاً پادری ایڈمنڈ اور پادری فنڈر کا بظاہر سیکولر کہلانے والی حکومت کے زیرِ سایہ اسلام کے خلاف مناظرانہ یورش کرنا، سابق نظامِ تعلیم کو پیچھے دھکیل کر نئے طرز کا نظامِ تعلیم رائج کرنا اور اس کی سند کو ملازمت کی وجہ ترجیح قرار دینا، اسلام اور ہندوؤں کے مذہبی قاعدے کے خلاف تبدیلِ مذہب کرنے

والوں کو جدّی جائداد میں سے حصہ دلوانا اور بالآخر مشتبہ چربی والے کارتوسوں کے استعمال پر سپاہیوں کو نہایت سختی سے مجبور کرنا نفرت کے بارود کے بھک سے اُڑ جانے کا باعث ہوا۔ پہلا دھماکہ میرٹھ میں ہوا، پھر یہ آگ یکے بعد تمام چھاونیوں میں پھیل گئی۔

دوسرے تمام حاسّے بہت ہی کمزور ہو چکے تھے، صرف ایک مذہبی حاسّہ ایسا باقی تھا جس نے فضا میں ہلچل پیدا کی اور دوسرے حاسّے بھی کسی قدر کام کرنے لگ گئے

مزید شواہد

ہمارے اس نقطۂ نظر کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس انقلابی واقعہ کے پس منظر میں اس کی ہم عصر تحریکِ جہاد کام کر رہی تھی اور اس تحریک کی اساسی دعوت انگریزوں کے غیر اسلامی اقتدار کے خلاف مسلمانوں کو متحرک کرنے والی تھی۔ دوسری دلیل یہ ہے انگریزی طاقت نے اصل دھکا مسلمانوں ہی کو لگایا تھا اور نسبتہً محدود حد تک ہندوؤں اور سکھوں کی شمولیت کے باوجود[1] مسلمان ہی اس معرکے کے اصل کردار تھے اور انہی نے نتائج مالبد کو بھگتا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان جن کے مذہبی جذبات آج ایک سو سال بعد تک بھی مُردہ نہیں ہوئے اس وقت خاصے گرم خون تھے اور ان کے اندر شاہ ولی اللہ کے مکتبِ فکر کے علماء و مجاہدین بڑی انقلابی سرگرمی سے دعوت جہاد کا کام کر رہے تھے۔ ہندو مؤرخ ساورکر نے بھی بتایا ہے۔ کہ بڑے بڑے علماء سیاسی جہاد کے وعظ کہنے کے لئے مقرر ہو چکے تھے بلکہ وہ تو یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ ہزاروں روپے (غالباً اشارہ عوام کے ان چندوں کی طرف ہے جو مجاہدین کے لئے جمع ہوتے تھے) ان کے حوالے کئے گئے تھے۔ اس انقلاب میں رؤسا اور درمیانی طبقہ کے جن لیڈروں کا نمایاں حصہ ہے وہ خاص اشرافی روایاتِ ثقافت کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ مذہبی کردار رکھتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں میں بھی اس انقلاب کی رَو مذہبی جذبات ہی کے ساتھ دوڑی جبکہ جیلوں میں دھات کے برتنوں کے بجائے مٹی کے برتن تقسیم کئے گئے اور کھانا پکانے کے یکجائی انتظامات کئے گئے اور جبکہ بیواؤں کے نکاحِ ثانی کا قانون پاس کیا گیا۔ نیز مشتبہ چربی والے کارتوس ان کے لئے بھی آخری وجہ اشتعال ہوئے۔ ان کے بیشتر سربراہ کا بھی مذہبی مقام رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو ملانے والا اصل داعیہ ہی یہ تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے مذاہب کے لئے مشترک خطرہ سامنے دیکھ رہے تھے، ورنہ ان کے سیاسی مفاد میں یکسانی نہ تھی۔ ہمارے دعوے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے ردّعمل بجائے کے وارث مسلمانوں کے مذہبی ادارات اور مذہبی رہنما ہی ٹھہرے اور بعد کی ساری مسلم تحریکوں میں مذہبی جذبہ کار فرما رہا۔ اگر انقلاب ۱۸۵۷ء اس عنصر سے خالی ہوتا تو بعد کی تاریخ دوسرے ہی خطوط پر ارتقاء کرتی۔

لیکن ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ایک خالص اور مکمل اسلامی تحریک تھی ایسا بالکل نہیں تھا۔ خالص اور مکمل اسلامی تحریک کا اطلاق تو فقط تحریکِ جہاد پر ہو سکتا ہے۔

---

[1] یہ بالکل ثابت شدہ امر واقعہ ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کا پارٹ مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو مدد دینے کا تھا جس سے باہمی منافرت اور کھچاؤ اور لمبی سیاسی و معاشی کشمکش کی رَو چلی اور تقسیم ہند پر منتج ہوئی۔

دو متقابل کردار

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس کے پس منظر پر مشتمل دور ہمارے سامنے دو متقابل کردار لاتا ہے، ایک وہ کردار تھا جو اپنے مفاد کو بالائے طاق رکھ کر معرکہ آرا ہوا اور اس نے قربانیاں دیں۔ دوسرا کردار وہ تھا جس نے محدود مفاد حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کا آلۂ کار بن کر سلطنت کی تباہی، چمن آزادی کی ویرانی اور معرکہ آرا کردار کی شکست کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ بے شمار جعفر اور صادق دشمن کے ہاتھ بکے اور دین و وطن کو بیچ کھایا اور آگے چل کر بازی اسی غدارانہ کردار کے ہاتھ رہی۔ یہ ہماری تاریخ کا افسوسناک ترین سانحہ ہے۔

مد کے بعد جزر

اس قسم کے غیر منظم اور غیر منصوبہ بند جذباتی تصادم جن میں نہ اپنی اور دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نہ اپنی کمزوریوں کا شعور ہوتا ہے، نہ ترتیب سے منظم ہو سکتے ہیں اور نہ کوئی باضابطہ قیادت ہوتی ہے جو مضبوط ہاتھوں سے باگ ڈور کو تھامے، جب کبھی ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کا ردّ عمل بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے طوفانی مد کے بعد ایسا ہمت شکن جزر آتا ہے کہ برسوں تک کے لئے جمود چھا جاتا ہے۔ یہی ۱۸۵۷ء کے انقلابی ہنگامے کے خاتمے پر ہوا۔ اس انگریزی طاقت کے لئے جو کل تک دشمن تھی مسلمانوں کے اندر آہستہ آہستہ معافی مانگنے، غلطی پر ندامت کا اظہار کرنے اور فدویانہ خدمت خاکساری اختیار کرنے کے رجحانات اُبھرنے لگے۔ ان کے اندر انگریزی حکومت کے مداحوں، اس کی برکات کے گن گانے والوں، اس کے سامنے وفاداری کے قصیدے پڑھنے والے خوشامدیوں اور اس کی خوشنودی کے لئے قوم کو فنِ غلامی سکھانے والوں کا ایک بااثر طبقہ پیدا ہو کر پھلتا پھولتا چلا گیا۔ یہی طبقہ انگریزی حکومت کی کل کے پرزے فراہم کرتا رہا۔ اور اس کے صلے میں بلکہ آج دور آزادی کے خداوند بھی اسی کے افراد ہیں۔

ناکامی کے اسباب

انقلاب ۵۷ء کی ناکامی کے اصل اسباب کو تصادم کی چالوں اور جنگ کے مرکزوں میں تلاش کرنا تاریخی شعور رکھنے والے کسی مؤرخ کا کام نہیں ہو سکتا۔ اصل وجہ شکست انحطاط پذیر معاشرے کی وسیع الاثر کمزوریاں تھیں جن پر قابو پانا کسی کے بس میں نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سلطنت کی اساس کسی ٹھوس نظریہ و نصب العین پر نہ تھی۔ اسلامیت کے تھوڑے بہت آثار امیں تھے بھی وہ اکبری فتنے کے بعد ــــ اورنگ زیب کی مساعی اصلاح کے باوجود ــــ گھٹتے چلے گئے۔ شاہی محلوں میں سازشی سیاست کا دور دورہ تھا اور ساری سلطنت پھوٹ اور گروہ بندی کا شکار تھی۔ نظم و بندوبست میں خیانت کا روگ لگ چکا تھا۔ ثقافتی دائرے میں رقص و سرود اور مینا بازاروں اور تزک اور احتشام کے مظاہروں کا خوب زور تھا۔ رومان، معاشقے اور حسینی فتنے درباری اور اشرافی طبقوں میں وبا کی طرح پھیل رہے تھے۔ مفاد پرستی ہر طبقے کے افراد میں خوب رچ بس گئی تھی۔ ایسے عالم میں قدرت نے انگریزوں کو غلامی کے عذاب کا حامل بنا کر بھیجا۔

ان لوگوں نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھتے ہوئے سلطنت اور معاشرہ کے دیمک خوردہ ڈھانچے کے کمزور پہلوؤں کو پوری طرح سمجھ لیا۔ پھر انہوں نے بڑی آسانی سے مکارانہ چالیں چل چل کر اور ایک کو دوسرے کے خلاف اُکسا کر اور مدد دے کر لڑا لڑا مروایا۔ مثلاً سراج الدولہ کو میر جعفر کے ہاتھوں ختم کرایا اور پھر میر جعفر کو شکنجے میں کس لیا۔ میسور کو ختم کرنے کے لئے مرہٹوں اور نظام کو

استعمال کیا۔ پھر مرہٹوں اور نظام کو ٹکرا دیا۔ خود مرہٹوں کے اپنے ہی سرداروں کو باہم آویزش میں مبتلا کیا اور فائدہ اُٹھایا۔ سکھوں کو آپس کے اتحاد سے محروم کر کے پنجاب کے سکھ راج کا صفایا کرا دیا۔ سکھوں کے خطرے سے سندھ کے امراء کو ڈرا کر اور سندھ کے امراء سے سکھوں کو بدظن کر کے دو طرفہ خطرے پر قابو پایا اور سندھ کو انقلاب میں شریک ہونے سے روکے رکھا۔ پنجابیوں اور غیر پنجابیوں میں پھوٹ ڈلوائی تاکہ پنجاب بیکار رہے۔

لوگوں کو انگریزی سرکار کی نت نئے تلخ تجربات ہوتے چلے گئے، مگر وہ نہ تو ان چالوں سے بچ کر رہنے کے لئے بصیرت سے کام لے سکے، نہ باہمی پھوٹ کا کوئی انسداد کر سکے۔ بلکہ انگریزوں کو ایک طرف سربراہ کاروں میں آلۂ کار ملتے چلے گئے دوسری طرف عوام میں سے کرائے کے جانثار سپاہی اسی طرح بآسانی ہاتھ لگتے رہے جس طرح کسی منڈی مویشیاں سے گائے بیل خریدے جا سکتے ہیں۔ یہی غدار اور کرایہ دار عنصر ساری تباہی کا سبب بنا۔ یہ عنصر معاشرے کی انحطاط کی بدترین دلیل تھا اور انحطاط پذیر معاشرے کی بدقسمتی کی ایک واضح ترین علامت یہ تھی کہ اس کی باگ ڈور اصل قیادت کے ہاتھ میں تھی۔

ان اسباب و احوال کو سامنے رکھ کر آج سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ سبق حاصل نہ کیا جائے بلکہ محض ہاؤ ہو کر کے یادگاری ہفتہ گزار دیا جائے تو معاملہ اس کھلنڈرے اور "تعلیم چور" بچے کا سا ہے جو مدرسے جا کر اپنا وقت کھیل اور شرارت میں لٹا کر کورے کا کورا گھر واپس آ جائے۔

۱۸۵۷ء اور ۱۹۵۷ء

آج ایک صدی کے دو کناروں پر کھڑے ہوئے ہمارے دو تاریخی سال ایک دوسرے سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۷ء بڑے فخر سے ۱۸۵۷ء کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ تم نے جو حرکت پیدا کی تھی آج اس کا عظیم الشان نتیجہ میرے دامن میں ہے —— پاکستان!!

مگر ۱۸۵۷ء دھیمی آواز میں پکار رہا ہے کہ جن مقاصد کے لئے میرے ہزاروں جواں مردوں کا خون بہ گیا وہ توپ دم کئے گئے، وہ توپوں سے اُڑا دیئے گئے، وہ پھانسیوں پر لٹک گئے وہ جلاوطن کئے گئے، ان کے گھر اُجاڑ دیئے گئے۔ ان مقاصد میں سے تمہارے لالوں نے کیا کیا حاصل کر لیا؟

—— کیا آج اغیار کا اثر و نفوذ کام نہیں کر رہا؟

—— کیا آج تمہارے کسان سے [illegible] کو کھسوٹ نہیں پکار رہی اور عوام فاقہ مستی، بدحالی، بیماریوں اور جہالت کا شکار نہیں ہو رہے؟

—— کیا آج وہ ثقافت بحال ہو گئی جس کے روایات و شعائر کو بچانے کے لئے میرے مجاہدوں نے طوفان اُٹھایا تھا؟

—— کیا آج اس نظام مذہب و اخلاق کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں جس کا علمبردار میرا دورِ تاریخ تھا؟

۱۹۵۷ء نے یہ سوالات سن کر آنکھیں نیچی کر لی ہیں —— اور چپ چاپ کھڑا ہے۔

۱۸۵۷ء کہتا ہے کہ:

—— کیا آج پھوٹ موجود نہیں ہے؟ مفاد پرستوں نے دھڑے پیدا نہیں کر رکھے؟ محلاتی سازشیں نہیں ہو رہی ہیں؟ لسانی اور علاقائی عصبیتوں میں کھینچا تانی نہیں ہو رہی ہے؟ خیانت کا روگ عام نہیں ہو چکا؟ دشمن کے کام آنے والے اور ان کے مقاصد کو پورا کرنے والے عناصر موجود نہیں ہیں؟ اونچے طبقے میں تعیش پسندی زور نہیں پکڑ رہی؟ غیر اسلامی ثقافت کو فروغ نہیں ہو رہا؟ —— کیا آج بہادر شاہ کے دور سے زیادہ زیرک، فعاّل، باکردار، خدمت کیش قیادت میسر آگئی ہے؟

اگر نہیں تو رسماً میری یاد منانے اور نمائشی ہنگامے کھڑے کر دینے کا حاصل کیا ہے؟

تاریخی اثرات تاریخ کا کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اپنے آپ تک محدود رہے اور جس کا اثر آگے کو منتقل نہ ہو۔ خصوصاً بڑے بڑے انقلابی حوادث تو دور دور تک نہایت ہی واضح قسم کے اثرات ڈالتے ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کا تاریخی عمل بھی آج تک ہماری سیاسی و اجتماعی حرکات میں اثر انداز ہو رہا ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں شعوری حرکت کم اور جذباتی ردِّ عمل زیادہ تھا۔ چنانچہ ہماری بعد کی تحریکات کا مزاج بھی شعوری سے زیادہ جذباتی رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی کے جانباز اعلیٰ تنظیمی مظاہرہ نہیں کر سکے۔ آج بھی دیکھیے تو پوری قوم میں یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ کڑی تنظیم میں رہ کر کوئی کام نہیں کر سکتی بلکہ فوراً ہلڑ بازی پر آتی ہے۔ معرکۂ آزادی کے جانباز اپنے لئے کچھ بھی اٹل اخلاقی حدود طے نہ کر سکے۔ اس وجہ سے عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھا کر انہوں نے اپنا مقدمہ خود کمزور کر دیا۔ یہ کمزوری بھی بعد میں ہمیشہ اہم مواقع پر ہمارے اندر نمودار ہوتی رہی۔ خصوصاً ہنگامۂ تقسیم کے موقع پر ہمارے بعض نام نہاد "مجاہدینِ کرام" کے ہاتھوں بھی گھٹیا قسم کی ظالمانہ حرکات واقع ہوئیں۔ اسی طرح اضطراباتِ پنجاب (۱۹۵۳ء) کے دوران میں بھی ایسے واقعات ہوئے جن کو ایجی ٹیشن کے لیڈروں نے بھی غلط قرار دیا۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ کی ناکامی کا اصل ذمہ دار جو غدار طبقہ تھا اس کی مفاد پرستی کی خصلت نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی اور آج وہ پہلے سے زیادہ ترقی پذیر ہے۔ اس وقت بھی اغیار کے کام آکر اپنا مفاد حاصل کرنے والے ہی دینوی و سیاسی لحاظ سے بازی مار لے گئے اور انہوں نے مخلص، ایثار پیشہ اور جانباز خادمانِ ملّت کو میدان سے نکال باہر کیا۔ ٹھیک اسی طرح آج بھی دوسروں کے اشارۂ ابرو پر ملک و ملّت کی ہر قیمتی متاع کو لٹا دینے والے اور اپنی قوم کی آئیڈیالوجی آزادی اور تہذیب کو دشمنوں کے قدموں پر نچھاور کر دینے والے پیش پیش رہ کر ذاتی فوائد کے خزانے جلدی جلدی سمیٹ رہے ہیں اور مخلص، بااصول اور صاحب کردار عنصر کو پیچھے دھکیل دھکیل کر ختم کر دینے کے درپے ہیں۔
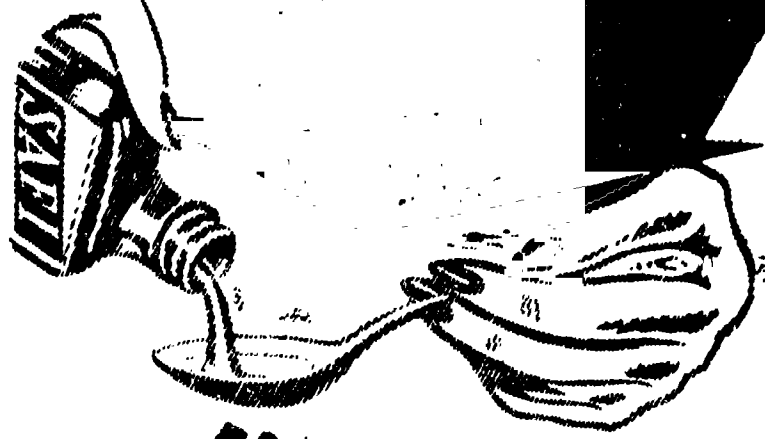
افتخار اعظمی

تعمیری تنقید کی چند بنیادیں

تعمیری تنقید کے مبادیات پر بعض تعمیر پسند ناقدین کے مقالات میں واضح اشارات تو ضرور ملتے ہیں لیکن ابھی تک بھرپور علمی انداز میں ان مبادیات کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ تعمیری تنقید کی اساس رسول پاکؐ اور حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ کے وہ ارشادات ہیں جو انہوں نے مختلف مواقع پر مختلف شعراء اور ادبی مسائل کے بارے میں دئے۔ اصل ماخذ قرآن ہے۔ اور پھر احادیث رسولؐ اور اور آثارِ صحابہؓ۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ دنیائے ادب کے عظیم ناقدین کی رایوں سے صرفِ نظر کیا جائے، بلکہ میرا مدّعا یہ ہے کہ چونکہ تعمیری تحریک ایک مخصوص نظریے سے وابستہ ہے، اس لئے ناقدین کو تنقید و تجزیہ کے وقت اپنے اصل ماخذ سے نہیں ہٹنا چاہیئے آنحضرتؐ کے اقوال میں نہایت لطیف تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ آپؐ شعر و ادب کے صحیح رمز شناس تھے۔ اُس کی خوبیوں سے بھی واقف تھے اور اُس کی خرابیوں سے بھی۔ آپؐ جانتے تھے کہ فن میں انسانی طبائع کیلئے بے پناہ کشش ہے۔ اعلیٰ فنکار اگر بے راہ روی کا شکار ہو جائے تو وہ انسانی سیرتیں بگاڑ بھی سکتا ہے اور اگر راہِ صداقت پر گامزن ہو تو وہ کاروانِ ملت کو عظمتِ انسانی کی منزل تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ آپؐ نے امرؤالقیس کے بارے میں جو رائے دی اُسے تعمیری تنقید کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ امرؤ القیس دورِ جاہلیت کا ایک بڑا فنکار تھا۔ اُس کے ہاں شاعری کے تمام محاسن بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں۔ شاعرانہ تخیل کے اعتبار سے اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ عربی شاعری میں اس نے تشبیہ و استعارہ کے اعتبار سے اضافے کئے۔ اُس کے افکار و تاثرات اگرچہ محدود ہیں، لیکن اُس نے انہیں نئے نئے اسالیب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اُس کی فنکارانہ عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اُس کے اشعار میں وفورِ جذبات بھی ہے اور حُسنِ خیال اور حُسنِ ادا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی نظمیں قلب میں ایک جذباتی ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ اُس کے کلام میں مُہلہل کی رندانہ سرمستی بھی ہے اور ابو داؤد کی شہسوارانہ جرأت و شہامت بھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود من حیث المجموع اُس کی شاعری رندی و ہوسناکی اور آوارگی و بے راہ روی کا مُرقّع ہے۔ یہ مُرقّع ظاہری طور سے لاکھ دلکش سہی لیکن اس کے اندرون میں تہذیبی اخلاقی انحطاط کی بھیانک تصویر چھپی ہوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سرورِ کائنات نے فرمایا:-

"وہ اگرچہ شاعروں کا سرتاج ہے لیکن جہنّم کے راستہ میں اُن کا رہنما بھی ہے۔"

علّامہ اقبالؒ نے اس بلند ترین ارشاد کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امرؤ القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں، جنہوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ رائے ظاہر کرائی۔ امرؤ القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دَور، حُسن و عشق

کی ہوش ربا داستانوں اور جانگداز جنگوں، آندھیوں سے اُڑتی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کُل تخیلی کائنات ہے۔ امرؤ القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور اُن میں بجائے ہوشیاری کے بیخودی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اِس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن، یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو "اعلیٰ علیّین" کی سیر کرانے کی بجائے "اسفل السافلین" کا تماشہ دکھائے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اُس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھائے۔ اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔"

اقبال کی تشریح سے رسولِ پاکؐ کی حکیمانہ تنقید کے بہت سے گوشے واضح ہو گئے۔ اِس تنقید کے دو گوشے ہیں۔ پہلے جزو میں رسول اللہؐ نے امرؤ القیس کے شاعرانہ کمال اور فنی عظمت کا بے کھٹکے اعتراف کیا ہے کہ "وہ شاعروں کا سرتاج ہے"۔ دوسرے جزو میں یہ کہہ کر تنقید کی ہے کہ "وہ راہِ ہلاکت میں اُن کا رہنما بھی ہے"۔ دوسرا جزو اس لئے بہت اہم ہے کہ آنحضورؐ کے نزدیک شاعر کا منصب قوم کو تہذیبی عظمت کے مینارۂ بلند پر لے جانا ہے نہ کہ انحطاطِ قومی کی راہ پر۔ آپؐ کی اس بلیغ تنقید کے اجزائے ترکیبی کی بنیاد پر تعمیر پسند ناقدین کو بھی یہ چاہیئے کہ وہ جب کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق کا تجزیہ کریں تو لفظ و معنی، اُسلوب و خیال، مواد و ہیئت کا نہایت انصاف سے تجزیہ کریں۔ نظریاتی اختلاف کی بنا پر کسی شاعر کے کمالِ فن سے صرفِ نظر نہ کریں۔ بلند آثارِ فن پر تنقید کا یہی مناسب طریقہ ہے۔ اِس روش کو عربی ادب کے نکتہ رس ناقد حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ نے اختیار کیا۔ امرؤ القیس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف انہوں نے نہایت فیّاضی سے کیا۔ حضرت عمرؓ البتہ امرؤ القیس کو سب سے بڑا شاعر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ وہ زہیر کو امرؤ القیس سے بلند تر مانتے تھے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ زہیر اپنے کلام میں واقعیت اور حقیقت کا خاص طور سے خیال رکھتا ہے۔ وہ جب کسی کی مدح کرتا ہے تو صدقِ بیان کے ساتھ ساتھ صداقتِ خیال یا صداقتِ واقعہ سے منہ نہیں موڑتا۔ نامانوس الفاظ نہیں استعمال کرتا، مطالب ادا کرتا ہے تو سادہ اور لطیف انداز سے۔ زہیر کے کلام کی معنوی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ رکاکت، ابتذال اور پستیٔ خیال سے بڑی حد تک پاک ہے۔ حضرت عمرؓ کی تنقید کے بعض پہلو قابلِ ذکر ہیں اور لائقِ توجہ بھی۔ مثلاً انہوں نے شاعری میں واقعیت پر زور دیا، دوسرے سادگیٔ خیال کے ساتھ ساتھ سادگیٔ ادا کی تعریف کی۔ تعمیر پسند ناقدین کو بھی یہی معتدل روش اختیار کرنی چاہیئے۔ وہ بھی جب کسی تخلیق کے محاسن و عیوب کا جائزہ لیں تو اس کا خیال رکھیں کہ شاعر کے ہاتھ سے کہیں واقعیت کا دامن تو نہیں چھوٹا۔ کذب آمیز مبالغہ قطعاً لائقِ تعریف نہیں۔ اچھے شعر کی تعریف ایک عرب شاعر نے اس طرح کی ہے:۔

"شعر تو وہی اچھا ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ بول اُٹھیں کہ "شاعر نے سچ کہا"۔"

ایک روز رسولِ پاکؐ کی جناب میں خاصانِ رسالت بیٹھے ہوئے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ ـــ

"جنہوں نے میری مدد تلوار سے کی ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شعر و ادب کے ذریعہ بھی میری مدد کریں۔" حضرت حسّانؓ جو سرشارِ فیضانِ نبوت تھے، اُٹھے اور کہا کہ "میں یہ فرض بجا لانے کے لئے تیار ہوں"۔ آپؐ نے فرمایا: "میں بھی تو قریش کا ایک فرد ہوں پھر کیونکر تم اُن کی ہجو کروگے؟ ابوسفیان میرا چچا زاد بھائی ہے۔ اُس کی ہجو کے لئے آخر کونسا اُسلوب اختیار کروگے؟" حضرت حسّان نے کہا: "میں ہجو کے وقت آپ کو اُن کے درمیان سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔" اس کے باوجود آپؐ نے احتیاط کے خیال سے فرمایا: "حسّان ابوبکرؓ کے پاس جاؤ وہ علمِ انساب کے ماہر ہیں۔" رسولِ پاکؐ کا حضرت حسّانؓ سے یہ کہنا کہ حضرت ابوبکرؓ سے ملو وہ نسب ناموں کو صحیح طور سے جانتے ہیں۔" اس بات کی دلیل ہے کہ احتیاط و اعتدال اور توازن تعمیری شاعری کا اہم تر عنصر ہے۔ رسولِ پاکؐ اور حسّانؓ بن ثابت کی باہمی گفتگو سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو بات کہی جائے وہ جانچ پرکھ کر کہی جائے اور اُس کا کوئی جزُ حقیقت و واقعہ کے خلاف نہ ہو۔ تعمیری شاعری کو جھوٹے اور مصنوعی موتیوں کی ضرورت نہیں جو چند ہی دنوں کے بعد اپنی چمک کھودیں۔ ہمارے ناقدوں کو ان بلیغ ارشادات کو سامنے رکھ کر جھوٹے اور سچے موتیوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ہے۔ حقیقتِ واقعہ وہ نور ہے جو صحیح معنوں میں فن کو زندگی کی آب و تاب بخش سکتا ہے۔

نظریاتی تنقید کے وقت بھی ہمیں ذہنی تعصب یا تنگ نظری کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ "کس نے کہا" بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ "کہنے والے نے کیا کہا"۔ رسول اللہؐ کا قول اور آپؐ کا عمل دونوں اس کے مطابق رہا۔ آپؐ نے ایسے شعراء کی تعریف کی جو اگرچہ غیر مسلم تھے لیکن اُن کا کلام بلند قدروں کا آئینہ دار تھا۔ آپؐ نے صحت بخش اور حیات آفریں اشعار کو ہمیشہ سراہا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ مسلم کی زبان سے نکلے ہیں یا غیر مسلم کی زبان سے۔ دورِ جاہلیت کے ایک بلند فکر شاعر عنترہ کے ایک شعر سے آپؐ اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپؐ کے دل میں اُس سے ملنے کی تمنّا پیدا ہوئی۔ عنترہ کی شاعری اُس کی شخصیت کا پرتو ہے وہ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کی وجہ سے مشہور ہے۔ خودی کو اس نے ہمیشہ عزیز ترمتاعِ زندگی سمجھا۔ اُس کا یہ شعر عزتِ نفس کا آئینہ ہے:-

ولقد ابیتُ علی الطوی واَظلّهُ   حتی انال بہ کریمَ المأکلِ

میں بہت سی راتیں محنت و مشقت کے عالم میں بسر کرتا ہوں تاکہ باعزت روزی حاصل کرسکوں

آنحضرتؐ نے جب یہ شعر سنا تو بہت متاثر ہوئے اور بہت تعریف کی۔ اِس شعر کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت سادہ الفاظ میں ایک بلند انسانی قدر کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر بھوکا رہنا تو گوارا کرلیتا ہے لیکن اُسے یہ پسند نہیں کہ وہ غلط ذرائع سے روزی حاصل کرے۔ اُسے حصولِ مقصد کے لئے ہر تکلیف گوارا ہے لیکن وہ آرام کی خاطر اپنی خودی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بقول اقبالؒ:-

"رسول اللہؐ نے جو عزت عنترہ کو بخشی، اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی

تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں اِنسان کو جو سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، اُن کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دو جہاں صلعم (بابی انت و اُمی) نے جو اس قدر شعر کی تشریح فرمائی اُس سے صنعت کے ایک دوسرے اصول کی تشریح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ اِنسانی کے تابع ہے، اُس پر فوقیت نہیں رکھتی۔"

اُمیہؔ بن ابی الصلت اگرچہ اِسلام نہیں لایا لیکن پاکیزگیٔ خیالات اور بلندیٔ مضامین کی وجہ سے آنحضورؐ اُس کا کلام پسند فرماتے تھے۔ انبیاء کے صحیفے اُس نے پڑھے تھے۔ دورِ جاہلیت کی برائیوں سے وہ دور تھا۔ مشرکانہ توہمات سے اُسے نفرت تھی۔ اخلاقی قدروں کا احترام اُس کے دِل میں تھا۔ وہ اس پر ایمان رکھتا تھا کہ یہ زندگی ایک خواب جنوں نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ دنیا ایک ایسا آغاز ہے جس کا ایک انجام بھی ہے۔ تخلیقِ کائنات بے مقصد نہیں۔ صرف یہ چند روزہ زندگی ہی نہیں ہے بلکہ عمرِ ابد بھی ہے فنا کے ساتھ بقا کا تصوّر بھی وابستہ ہے۔ اِنسان ایک ذمّہ دار مخلوق ہے، اُسے ایک دن اپنے خالق کے سامنے جوابدہ بھی ہونا ہے۔ یہ احساسات و خیالات اُمیہؔ بن ابی الصلت کی شاعری میں کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس کے اشعار کی ہمیشہ تحسین کی۔ آپؐ اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ابن سوَیدؔ ثقفی کی روایت ہے کہ "ایک بار میں حضورؐ کے ساتھ تھا، آپؐ نے فرمایا۔ 'اُمیہؔ بن ابی الصلت کے اشعار سناؤ'۔ میں نے بعض شعر سنائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "خوب! ممکن تھا کہ وہ اِسلام لاتا"

اِن مثالوں سے میرا مدّعا یہ تھا کہ تعمیر پسند ناقدین نظریاتی اختلاف کے باوجود تمام بلند فکر شعراء کے کلام سے اُن بلند قدروں کو نِکالیں جو حیاتِ اِنسانی کے لئے وجہِ شرف ہیں۔ جماعتی عصبیت کی بناء پر کبھی عِناد و مخالفت پر آمادہ نہ ہوں۔ تعمیری تنقید کی یہی وہ اخلاقی اساس ہے جس پر احادیث رسولؐ شاہد ہیں۔ مندرجہ بالا توضیحات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعمیر پسند ناقد کو چاہیئے کہ وہ ادیب و شاعر کی تخلیقات میں یہ دیکھے کہ وہ کہاں تک صداقت سے قریب ہیں اور اُن میں کہاں تک صحت بخش زندگی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ وہ قوم کو راہِ ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں یا راہِ عظمت کی طرف۔ اِن معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ لفظ و بیان اور تخیّل و محاکات کے اعتبار سے تخلیقات بلند ہیں یا نہیں۔ اگر کسی کے کلام میں صحت مند تصوّر نہیں ہے مگر اُس میں فنّی عظمت کے آثار ہیں تو ہمیں اِن خوبیوں کا ناقدانہ انداز سے تجزیہ کرنا چاہیئے۔ البتہ اس طرزِ فکر کی ہمیں مخالفت کرنی چاہیئے جو اخوت اِنسانی کی راہ میں روک بنے۔ حضرت عمرؓ نے ہجو گوئی کو ممنوع قرار دیا۔ اِسلام سے پہلے عرب قبائلی تعصب کی بناء پر جنگاہ بنا ہوا تھا۔ ہجو کی جاتی تو نسلی امتیاز کی بناء پر۔ چونکہ اس طرزِ شاعری سے اُخوّتِ اِنسانی کا چشمہ گدلا ہوتا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اِسے ایک جُرم قرار دے دیا۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ ہجو، طنز یا مزاح کی جگہ اسلامی ادب میں نہیں بلکہ اس صنفِ سخن کا صحیح اِستعمال اگر نہ کیا جائے تو بہت سے معاشرتی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں۔ نسلی غرور، خاندانی وجاہت، یا انفرادی جاہ و ثروت کی بنیاد پر ہجو کرنا صحت مند اِنسانی تصوّر کے خلاف ہے۔ نظریاتی اختلاف کی بناء پر کسی گروہ یا جماعت پر طنز کیا جا سکتا ہے لیکن شخصی عِناد یا جماعتی نفرت پر طنز، ہجو اور مزاح کی اساس رکھنا تعمیری تصوّر کے خلاف ہے۔ مخالف تحریکوں کے جو علمبردار ہیں اُن کی

تنقیص و توہین صحیح نہیں۔ لیکن اُن کے کردار اور اُن کے تصور پر تنقید بجا ہے۔ اقبالؔ جو اخلاقِ اسلامی کے صحیح اداشناس تھے، اُنہوں نے اپنے مخالفین کی تنقیص نہیں کی بلکہ اُن کے کمزور پہلوؤں پر نہایت لطیف طنزیہ انداز سے تنقید کی۔ اُنہوں نے اپنے طنز میں اُن کے غلط افکار و تصورات پر نشتر لگائے۔ خصوصیت کے ساتھ اقبالؔ کی نظم "لینن خدا کے حضور میں" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اُس میں طنز و تعریض کے نہایت لطیف پہلو ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بالغ نظر اور وسیع النظرؔ شاعر کی حیثیت سے اقبالؔ نے لینن کی شخصیت کے بعض اچھے گوشوں کو بھی روشن کیا ہے۔

رسولؐ اکرم اور صحابہؓ کے ناقدانہ افکار کو سامنے رکھے بغیر متوازن تعمیری تنقید کا ظہور ممکن نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ نقد و نظر کو جلا دینے اور صحیح راہ پر لگانے کے لئے مشرقی اور مغربی تنقید سے استفادہ کرنا یقیناً ضروری ہے لیکن چونکہ تعمیری تحریک اپنا ایک بسیط نظریۂ حیات رکھتی ہے، اس لئے اُس کے ہر ناقد کو اصل سرچشموں سے بیگانہ نہیں ہونا چاہیئے۔ تعمیر پسند نقاد کا صرف یہ کام نہیں کہ وہ اُن احساسات و خیالات اور افکار و تاثرات کو ایک بار پھر اپنے مضمون میں پیش کرے جنہیں شاعر پیش کر چکا ہے۔ تنقید کسی شاعر کی کیفیات کی باز آفرینی کا نام نہیں ہے بلکہ اُس کا مقام اس سے بلند ہے خصوصیت کے ساتھ تعمیری تنقید زندگی اور ادب کے تعلق کو ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ ادب کے اُن بیش بہا اور معیاری حصّوں کا پتہ لگاتی ہے جو اِنسانی تہذیب کو ایک پاکیزہ جمال عطا کرتے ہیں۔ وہ نور و ظلمت، خیر و شر، پستی و بلندی اور حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ وہ زندگی کو ایک سنجیدہ شئے تصوّر کرتی ہے۔ اِس لئے ادب میں اُن اعلیٰ اِنسانی قدروں کی ترجمانی ضروری سمجھتی ہے جو اِنسانی معاشرہ کو متوازن اور مطمئن رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ چونکہ ہر دور میں حق و باطل، نیکی و بدی اور ظلم و اِنصاف کی کشاکش جاری رہی ہے، اس لئے ہر دور کے ادب میں اُجالے اور اندھیرے ساتھ ساتھ نظر آئیں گے۔ اِس بنا پر ہمیں چاہیئے کہ ہم جب ادب کا جائزہ لیں تو باطل کے سایۂ ظلمت کے ساتھ ساتھ حق و اِنصاف کی تجلیاں بھی دِکھائیں۔ البتہ اس کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ خیر کا تصوّر کسی دور میں محدود رہا ہے اور کسی دور میں بسیط۔ زمانہ کی رفتارِ ترقی کے ساتھ نیکی کا تصوّر بھی پھیلا اور بڑھا ہے۔ قبائلی دور میں اُخوّت کا تصوّر قبیلے تک محدود تھا۔ پھر جب قوم بنی تو اُخوّتِ قومی ظہور میں آئی۔ اور ایک دور وہ آیا جب آنحضرتؐ نے نسلی اور وطنی تفریق و امتیاز کی حدیں توڑ کر بسیط نظریۂ اِنسانی پیش کیا۔ اعلیٰ اِنسانی قدروں کے مختلف مظاہر ہیں جو ترقی ہوئی اُس کا تاریخی تجزیہ بھی تعمیری ناقد کے لئے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف ادوار میں، مختلف انبیاء کی تعلیمات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اِس مطالعہ سے وہ ذوقِ نظر پیدا ہوگا جس کے ذریعہ انبیاء کی تعلیمات کے اُن اثرات کا پتہ لگایا جاسکے گا جو مختلف ادوار کے ادب میں ہمیں ملتے ہیں۔ خود دورِ جاہلیت کے ادب میں بہت سے پاکیزہ فنی نمونے ملتے ہیں۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں جو صحت بخش تصورِ اخلاق رکھتے ہوں۔ یہ فیض تھا درحقیقت حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ اسماعیلؑ کی تعلیمات کا۔ قومیں اپنے مُصلحین کے درسِ اخلاق کو بھولتی نہیں ہیں۔ بلکہ بلند افکار ذہن کے کسی گوشے میں چھپ جاتے ہیں۔ اِن احساسات کو کبھی حالات کی رَو اور کبھی کسی عظیم شخصیت کی آمد پردۂ خفا سے باہر لاتی ہے اور پھر یہ جذبات لطیف یا

احساساتِ پاک شعر ونغمہ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اُمیہ بن ابی الصلت کا کلام اس بات پر شاہد ہے کہ عرب میں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ اور ہودؑ وصالحؑ نے جو شمعِ یقین جلائی تھی، اُس کی لَو مدّھم تو ضرور ہو گئی تھی لیکن وہ بجھی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی اُس کی کرنوں نے کبھی کبھی ایوانِ سخن کو جگمگایا۔ حق کی لہریں کبھی ختم نہیں ہوتیں بلکہ وہ بعض مرتبہ سطحِ دریا سے قعرِ دریا میں چلی جاتی ہیں۔ اگر یہ لہریں فنا ہو جائیں، تو پھر شاید حق، انصاف، عدل، مساوات اور اخوت و یگانگت کے چمن زاروں کی آبیاری نہ ہو سکے۔ تعمیر پسند ناقدین کا کام انہیں لہروں کا پتہ لگانا ہے۔ اُنہیں ادب کے اندر سے صالح قدروں کو ڈھونڈ کر نکالنا ہے اور اس طرح اعلیٰ ادبی تخلیق کے لئے ملک میں ایک ساز گار فضا پیدا کرنی ہے۔ چونکہ تنقید بھی تخلیق کے دائرے میں آتی ہے، اس لئے تعمیری ناقد کو جرح و تعدیل اور تحلیل و تجزیہ کے ساتھ ساتھ اپنے اُسلوبِ بیان کو بھی دلکش اور موثر بنانا ہے۔ طرزِ ادا کی دلکشی کے بغیر تنقید صحیح معنوں میں حسنِ تخلیق کا نمونہ نہ بن سکے گی۔

آرٹ حسن کا ایک لطیف مظہر ہے اور حسن نام ہے نظم و تناسب اور ترتیب و توازن کا۔ ایک نمونۂ فن کی یہ خوبی ہے کہ اُس کے ہر نقش میں ایک تناسب ہو۔ تصویر کے تمام نقشہائے رنگارنگ جب ایک دوسرے کی رعنائی و زیبائی بڑھانے کا ذریعہ نہ بنیں گے تصویر مجموعی طور سے کمالِ حسن سے محروم رہے گی۔ مختلف اکائیوں سے جو کل تیار ہو، اُسمیں وحدت ہونی چاہیئے۔ گویا وحدت و کثرت میں ایسا ربط و اتصال ہو کہ دونوں کا الگ الگ تجزیہ کرنا دشوار ہو جائے۔ تاج محل کی یہی خوبی ہے کہ اُس کا کوئی نقش بیکار نہیں، اُس کا ہر جزو دوسرے جزو کی دلکشی کو بڑھاتا ہے۔ اسی تناسب کیوجہ سے اُس کی سادگی میں بھی حیرت انگیز رعنائی ہے۔ کائنات خود ایک اعلیٰ نمونۂ فن ہے۔ اسمیں جو نظم و توافق اور ربط و ہم آہنگی ہے اُس سے آرٹ کے لئے یہ نکتۂ لطیف ذہن میں آتا ہے کہ فن چونکہ خارجی کائنات کا مظہر ہے۔ اس لئے جس طرح خارجی اشیاء میں باہمدگر ربط نہاں ہے، اُسی طرح آرٹ میں بھی تناسب اور توازن ہونا چاہیئے۔ انفس و آفاق پر غور کرنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ عروسِ حیات پر جو حجاباتِ رنگیں پڑے ہیں، انہیں انسان اُٹھائے اور اُس حسنِ تناسب کے جلوے دیکھے جس سے وجدان و ذوقِ نظر پر حقائق افشا ہوتے ہیں۔ یہی نشاطِ مشاہدہ آرٹ کا سرچشمہ ہے اور اسی کے ذریعے حقیقت تک رسائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار مطالعۂ کائنات کی تلقین کرتا ہے۔ تعمیر پسند آرٹسٹ کو خصوصیت کے ساتھ قرآن کے ان اشارات کی طرف توجہ دینی چاہیئے اور پیکرِ فطرت میں جو ہم آہنگی یا توازن ہے اس کے پیشِ نظر اسلامی آرٹ کو بھی تنظیم و ترتیب اور اعتدال کا مرقع بنانا چاہیئے، کیونکہ شاعری ایک طرز ساحری ہے اگر اسمیں عدمِ توازن ہو گا تو قوم کا ذہن بھی بے راہ روی اور انتشار کا شکار ہو گا۔ چونکہ اسلام کا مقصد زندگی، انسان، کائنات اور ماورائے کائنات کے مابین مناسب، متوازن اور خوشگوار ربط و علاقہ پیدا کرنا ہے اس لیے اسلامی فنکار کو چاہیئے کہ وہ اپنے فن کو فکر و اسلوب کے اعتبار سے ہر طرح کے انتشار اور بے ربطی سے بچائے اور تعمیر پسند ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادب کے اندر سے متوازن اور متناسب اجزا کو ڈھونڈ کر نکالے اور فنی اور فکری بے راہ رویوں اور بے ربطیوں کی طرف اشارہ کرے۔ اس مقصد کیلئے اُسے موجودہ زندگی کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات و اسباب کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اُنکی تہ میں جو اصل وجہ خرابی ہے اُس کا پتہ لگانا چاہیئے اور اس طرح ایک منضبط لائحۂ عمل کے تحت اُسے دور کرنے کا تصوّر ادیب و شاعر کو دینا چاہیئے۔

رشید کوثر فاروقی

غزل

رنگ محل کی برجیاں کہتی ہیں یہ اذاں کہاں
گنگ و جمن کے دیس میں نجد کی آندھیاں کہاں

کس سے کہوں کہ لے چلا کون کشاں کشاں کہاں
اہلِ نمود کے لئے دل کی زباں زباں کہاں!

پہلے قدم کی پختگی سارے سفر کی جان ہے
صید کو زیر کر سکا ناوکِ بے کماں کہاں

پلکوں پہ موجِ نور سی ہونٹوں میں لرزشِ لطیف
اُن کا سکوت لے گیا جانے مجھے کہاں کہاں

اب تو اُفق کے پار بھی ایک شعاع زار ہے
مطلعِ اعتبار پر وہم کی بدلیاں کہاں

اور بھی نکہتیں ہیں کچھ لالہ و گل سے ماوراء
تول رہا ہوں پر ابھی فرصتِ آشیاں کہاں

اہلِ جہاں ہی کم نہ تھے، پھر یہ ضمیر کی چبھن،
خلوتِ بے صدا میں بھی میرے لئے اماں کہاں

رقتِ قلب کے بغیر گرمیٔ زندگی محال!
اپنی قبا سمیٹ لے ابر تو بجلیاں کہاں!

تیشہ بدوش آ گیا کوثرِ میکدہ شکن،
پوچھ رہے ہیں مغبچے خیر تو ہے یہاں کہاں؟

میں آپ کیوں حصہ لیں؟

[illegible] اس لئے کہ:

یہ سکیم "شرکت [illegible] نفع و نقصان" کے معروف کاروباری اصولوں پر مبنی ہے جو "عام لمٹیوں" کے برعکس "طالع آزمائی" "لاٹری" یا "جوے" [illegible] سے قطعاً پاک ہے اور اس میں کوئی عنصر خلاف [illegible] نہیں ہے۔

اس سکیم میں آپ پانچ روپیہ ماہانہ جمع کرتے ہوئے مقررہ مدت میں پانچ سو روپے کی کثیر امدادی رقم ایک دفعہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبروں کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔

اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضبط نہیں ہوتا خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

اشد مجبوری [illegible] اگر [illegible] آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ پورے کا پورا یک مشت واپس بھی کیا جا سکتا ہے۔

بوقت ضرورت آپ [illegible] روپے پر قرض حسنہ بھی لے سکتے ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو اپنے [illegible] کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کرا کر اس سے اپنا ادا کیا ہوا روپیہ وصول کر سکتے ہیں۔

اور اس [illegible] آپ [illegible] باوقار تنظیم کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو اقتصادی اور معاشی میدان میں اسلامی اصولوں کو [illegible] کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں ہم تمدنی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کو اسلام کے تصور [illegible] اپنے تجارتی، صنعتی اور معاشی نظام کو بھی سودی لین دین، لاٹری، جوئے اور طالع آزمائی کی [illegible] پاک رکھنے کی کوشش کریں ——— "باوقار تنظیم" ——— اس سلسلے میں ہمارا پہلا قدم ہے، آیئے آپ بھی اس سکیم میں شامل ہو کر اور ہمارے ساتھ شانہ بشانہ چل کر اس پاکیزہ جدوجہد اور اس نیک مقصد میں ہمارا ہاتھ بٹایئے۔

[illegible] مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیجئے۔

باوقار کمپنی لمٹیڈ، بندر روڈ، کراچی ۱

فون نمبر ۷۰۹۲۳

خلیل حامدی

عالمِ اسلام کی اسلامی تحریکیں

(ایک جائزہ)

سیاسی طور پر دنیا بڑی تیزی کے ساتھ دو کیمپوں میں بٹتی جا رہی ہے۔ ایک مغربی کیمپ، جو اپنے آپ کو "جمہوریت" اور "آزاد دنیا" کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اور دوسرا "سرخ کیمپ" جس کے علمبردار "مساوات"، "زرداری" اور "ہیومنزم" کے دلفریب نعروں کی رٹ لگا رہے ہیں۔ یہ دونوں دھڑے اپنی اغراض و مصالح کی بنا پر اگرچہ باہم دست و گریبان ہیں۔ مگر ایک بات پر ان دونوں کا اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی تحریک جس گوشے سے اُٹھے اُسے وہیں سختی سے دبا دیا جائے۔ اسلام کے لیے ان دونوں میں سے کسی کے دل میں رواداری کی کوئی گنجائش نہیں۔ کسی اسلامی ملک کی طرف اگر ان میں سے کسی کا جھکاؤ ہے تو وہ "مسلمان دوستی" کے جذبے سے نہیں ہے بلکہ "حریف دشمنی" کی بنا پر ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا سوال ہے۔ وہ دونوں کے پروگرام میں شامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک اُسے بلا تاخیر قتل کر کے دریا برد کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور دوسرا نشہ آور گولیاں کھلا کر سلیقے سے ذبح کرنے کا قائل ہے۔ اور پھر لاش پر ایک "آرام دہ" اور خوشنما مقبرہ بھی تعمیر کرنا چاہتا ہے ــــــــــــــ

مگر اسلام علی رغم انف اعداء ہر لمحہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ہر وہ طاقت جو اُسے دبانے کے لئے ضرب لگاتی ہے وہ اسے مزید اُبھارتی ہے اور ضرب جس قدر کاری ہوتی ہے اُس کا اُبھار اُسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ اگر طاغوت کے اندر اسلام کو معدوم کرنے کی سکت ہوتی، تو بلاشبہ اسلام اس وقت دنیا سے مٹ چکا ہوتا اور اس کے ڈھانچے آثارِ قدیمہ کے عجائب خانے میں ہوتے۔ مگر اسلام کائناتی دین ہے اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں ثبت اور اس کی شاخیں فلک کی پہنائیوں میں پیوست ہیں۔ کائنات کا خالق ہر دور میں ایسے مخلص بندے پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو اس شجر کی آبیاری کا فریضہ ادا کرتے رہتے ہیں، یہ دور بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے اس کی دعوت اُٹھ رہی ہے۔ کہیں مکمل اور واضح شکل میں اور کہیں مبہم اور جزوی صورت میں! حتیٰ کہ افریقہ کے گمنام مقامات (مجاہیل)، جو مہذب دنیا سے منقطع ہیں اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی دعوت کے احیاء کی طرف لپک رہے ہیں دعوتِ اسلامی کا مزاج ہمیں ہر جگہ یکساں نظر آتا ہے۔ اس کے نام لیواؤں میں وہی صبر و ثبات، وہی سوز و گداز، سخت کوشی و فداکاری، حق گوئی و بے باکی، وسیع القلبی اور انسان دوستی کی چمک دمک ہے اور اس کے معاندین میں ہر جگہ وہی سنگدلی کی بہیمیت، مغلوب الغضبی، وہی چھچھوراپن اور جھنجھلاہٹ دکھائی دیتی ہے اور پھر معاندین کی اقسام بھی قریب قریب ایک جیسی ہیں۔ استعمار چاہے برطانوی ہو یا فرانسیسی، اسپینی ہو یا اطالوی، ولندیزی ہو یا روسی، معاندین کی صفِ اول میں ہے۔ کبھی اقتدار کا سہارا لے کر، کبھی کلچر و آرٹ کے لشکر لے کر دعوت کی راہ مارنا چاہتا ہے۔ کبھی خود "اسلام" کا علمبردار بن جاتا ہے۔ کبھی مذہب کی تقدیس کو اُچھال کر سیاست

کی ہنگامہ آرائیوں سے اُسے ملوث نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دعوتِ اسلامی کا دوسرا گروہ خود مسلمانوں کا مفاد پرست اور اہل ہوا طبقہ ہے، جس میں دنیا پرست علماء اور الحاد پسند امراء کی ملی بھگت کام کرتی ہے۔ عوام کی جہالت بھی دعوتِ حق کے پھلنے پھولنے میں سدِّراہ بنتی رہی ہے۔ ذیل میں ممالکِ اسلامی میں دعوت و تبلیغ کا ایک طائرانہ جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

فرانسیسی مراکش

مراکش میں اسلامی نظام کے احیاء کی جد و جہد مراکش کی اسلامی جماعت حزب الوحدۃ والاستقلال کر رہی ہے۔ اس نے مراکش کی برسرِ اقتدار پارٹیوں سے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ مگر برسرِ اقتدار پارٹیاں (حزب الاستقلال اور حزب الشوریٰ) دین و سیاست کی تفریق کی قائل ہیں۔ مراکش کی دو ڈھائی لاکھ یہودیوں کی خاطر تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ مسلم آبادی پر سیکولر نظامِ حکومت قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ فرانس اور امریکہ کی خوشنودی کی خاطر انہوں نے ایک یہودی کو بھی وزارت میں لے رکھا ہے۔ تقریباً ۱½ لاکھ فرانسیسی اور ایک کثیر تعداد یہودیوں کی اہم عہدوں پر قابض ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ علماء کی جماعت — جمعیت علمائے مغرب — کی میلان بھی سرکاری پارٹیوں کی طرف ہے۔ فرانسیسی اس جماعت (الحزب) کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے رہے ہیں۔ فرانسیسی حکومت جب فرنچ رقاصاؤں کے ننگے ناچوں میں قاضی القضاۃ سے لے کر ائمہ مساجد تک دعوتِ شرکت دیتے تھے تو یہ جماعت اس کی شدید مذمت کرتی تھی اور شرکت کرنے والے علماء پر کھلم کھلا تنقید کرتی تھی۔ اب اس جماعت کے رہنما نے فیصلہ کیا ہے کہ طنجہ سے جماعتِ اسلامی (پاکستان) کا لٹریچر شائع کرکے مغرب عربی (مراکش، الجزائر اور تونس) میں پھیلائیں گے۔ طنجہ میں ان کا اپنا پریس ہے اور "الشعب" نامی اخبار نکالتے ہیں۔

ہسپانوی مراکش

ہسپانوی مراکش میں عبداللہ گنون نہایت سلجھے ہوئے عالم ہیں۔ تطوان (دارالحکومت) سے ماہوار عربی رسالہ "لسان الدین" نکالتے ہیں۔ تطوان کے المعہد الدینی (مذہبی ثقافتی ادارہ) کے انچارج ہیں۔ یہ ادارہ ملک الحسن سلطانِ مراکش (ریف) کی طرف سے قائم کیا گیا ہے اچھا لکھنے والوں کو ادارے کی طرف سے جوائز (پرائز) بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کے لیے ماضی قریب میں عربی زبان کی تعلیم ممنوع رہی ہو اور عربی مکاتب کا قیام جرم سمجھا جاتا ہو۔

الجزائر

مراکش کے بعد الجزائر کا نمبر آتا ہے۔ اس ملک پر فرانسیسی استبداد کی تلوار ابھی لٹک رہی ہے۔ سوا سو سال سے الجزائری قوم آزادی کے لیے لڑ رہی ہے۔ مال و جان کی کونسی ایسی قربانی ہے جو اس نے نہ دی ہو۔ کشت و خون، تاخت و تاراج اور دار و گیر کے ہنگامے

رستاخیز میں اس قوم نے بے نظیر ثبات وصبر کی مثال پیش کی ہے۔ الجزائر کی دینی جماعت جمعیت العلماء الجزائرین نے عربی زبان کی احیاء کے لئے ملک بھر میں مدارس کا جال پھیلا رکھا ہے۔ بچوں اور بچیوں کے ۱۹۰ مدارس جن میں چار سو اساتذہ کام کرتے ہیں اس کے زیر انتظام ہیں جا بجا جمعیت کی شاخیں قائم ہیں۔ اس وقت الجزائر کی تمام دینی وسیاسی جماعتوں نے مل کر محاذ آزادی کی تشکیل کی ہوئی ہے۔ دعوتِ اسلامی کے لحاظ سے الجزائر کے بارے میں قطعی فیصلہ اُس وقت ہی ہو سکے گا جب یہ ملک آزادی سے ہمکنار ہوگا۔ پچھلے دنوں جمعیت العلماء کے صدر علامہ بشیر ابراہیمی جب لاہور تشریف لائے تو میں نے جمعیت کے نصب العین کے بارے میں ان سے سوال کیا تو فرمانے لگے: جمعیت العلماء الجزائر کی جماعتِ اسلامی ہے اس کا مقصد مسلمانوں کو متحد کرنا اور ان کی زندگیوں کو کتاب وسنت کے رنگ میں رنگنا ہے۔ اس جماعت کی دعوت مراکش اور تونس تک وسیع ہو چکی ہے۔ حکومت کی تمام سختیوں کے علی الرغم مغربی عربستان کی یہ عظیم الشان مذہبی تعلیمی وتہذیبی تحریک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ استوائی افریقہ اور نائیجیریا میں بھی اس کے طرز پر لوگ کام کر رہے ہیں۔ ہنگامی حالات کی وجہ سے جماعت کا ہفتہ وار آرگن "البصائر" بند ہو چکا ہے۔ جماعت کی سرگرمیوں سے مطلع رہنے کے لئے ہمارے لئے یہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔!

تونس اور لیبیا میں اسلامی دعوت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ تونس میں بورقیبہ حکومت نے پچھلے سال آزادی کے برسرِ اقتدار آتے ہی مخالفین کو کچل دیا ہے۔ حزبِ دستور کے جنرل سیکرٹری صالح بن یوسف نے فرار ہو کر لیبیا میں جا پناہ لی ہے۔ تونس کی تحریکِ آزادی کی داغ بیل ڈالنے والے علامہ عبدالعزیز الثعالبی اور اس کو پروان چڑھانے والے مشہور مجاہد محی الدین القلیبی تھے مگر مستعمرین کی ریشہ دوانیوں نے یہ تحریک ساحلِ مراد تک نہ پہنچنے دی۔ بورقیبہ وزارت امریکہ اور فرانس کی جی حضور ہے۔ یہی حال لیبیا کا ہے۔ لیبیا کا صوبہ طرابلس الغرب کسی زمانے میں عرب کی مشہور سنوسی تحریک کا گہوارہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تونس کی طرح یہاں تبرّج و اختلاط اور فرنگیت کے مفاسد نظر نہیں آتے۔ شہری آزادیاں دونوں خطوں میں عنقا ہیں۔ لیبیا کے بشیر اسعدادی جنہیں ملک بدر کیا جا چکا ہے، حزب المؤتمر کے لیڈر تھے۔ پچھلے انتخابات میں اُن کی پارٹی کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ اُن کے اخراج کا باعث بن گئی۔

تونس کی جامع الزیتونہ ازہر کے مقابلے کی یونیورسٹی ہے۔ اس میں ابتدائی دینی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تک کا انتظام ہے۔ دس ہزار کے لگ بھگ طلباء ہر وقت جمع رہتے ہیں۔ جامعہ کے جو طالب علم جدید علوم کی تکمیل کرنا چاہیں وہ ابن خلدون انسٹیٹیوٹ میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ دیہاتی آبادی میں حفظِ قرآن اور ابتدائی نوشت و خواند کے مدارس اگرچہ کافی تعداد میں ہیں لیکن ملک کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے ——— تونس کو راہِ راست پر لانے کے لئے اس جامع سے ہی توقع کی جا سکتی ہے۔

مشرقی، مغربی اور وسطی افریقہ

شمالی افریقہ میں مراکش، الجزائر اور تونس مسلمان ملک ہے۔ مشرقی افریقہ میں ایریٹریا، صومال اور حبشہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مغربی افریقہ میں سنغال، سوڈان اور نائیجیریا مسلم آبادیاں ہیں۔ وسط افریقہ میں تشاد خالص مسلمان ملک ہے اس وقت یہ پورا غلام آباد

آزادی کے لئے پھر پھڑا رہا ہے۔

استوائی افریقہ

استوائی افریقہ کی ایک تشاد (Tathad) حصولِ آزادی کے لئے آخری بازی لگا رہی ہے۔ تحریکِ آزادی کی کمان شروع سے علماء کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تحریک ابتدا کے جن مراحل سے گزر رہی ہے اُس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں حکومتِ فرانس نے مجبور ہو کر علماء کو آزادی کی گفت و شنید کی دعوت دی۔ چار سو کی تعداد میں علماء الشبہ میں جمع ہوئے مگر ظالم فرانسیسیوں نے مذاکرات کے لئے نمائندے بھیجنے کے بجائے فوج کا ایک دستہ بھیج دیا جو ناگاہ اس مجمع پر ٹوٹ پڑا اور ساطوروں (چھروں) سے ایک ایک کو ذبح کر ڈالا۔

۱۹۴۶ء سے تحریک کی قیادت شیخ محمد علیش عروضہ کے ہاتھ میں ہے جو ازہر کے باضابطہ عالم ہیں۔ شیخ علیش نے چھ سال قبل ازہر سے فارغ ہو کر اپنے وطن الشبہ میں جدید طرز کا ایک مدرسہ قائم کر دیا ہے۔ جس میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہی مدرسہ اس وقت دعوت کا مرکز ہے۔ شیخ خود اگرچہ ملک بدر ہیں اور سوڈان میں پناہ گزین ہیں مگر تحریک انہیں کے پروگرام کے مطابق چل رہی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت نے مدرسہ کو بند کر دیا تھا مگر پورے ملک کے احتجاج پر حکومت کو کھولنا پڑا۔ یہ مدرسہ اب شیخ کے نائبین چلا رہے ہیں۔ اس کے تحت ملک میں شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ حکومت کی سختیوں کے علی الرغم یہ تحریک پورے ملک میں اپنے وسیع اثرات پھیلا چکی ہے۔

نائیجیریا

نائیجیریا مغربی افریقہ میں برٹش کالونی ہے۔ مسلمان غالب اکثریت کے باوجود اقلیت بنے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اپنے پورے عروج پر ہے۔ عیسائی مشنریوں کے غول کے غول ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ جمعیۃ انصار الدین اور جمعیۃ انوار الدین وہاں کی دینی جماعتیں ہیں جو الجزائر کی جمعیۃ العلماء کے طرز پر کام کر رہی ہیں۔ اول الذکر کے زیرِ اہتمام ۶۳ مدرسے ہیں جن میں ۱۲ ہزار طلباء پڑھتے ہیں۔ موخر الذکر نے بھی کافی تعداد میں مدارس کھول رکھے ہیں۔ ۶ ہزار کے قریب ان میں طلباء زیرِ تعلیم رہتے ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں اسلامی تہذیب و ثقافت کی علمبردار ہیں۔ ان کے مدارس میں مروجہ نصاب کے ساتھ دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں ان جماعتوں کے اثرات روز بروز وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ حکومت انہیں کمزور کرنے کے لئے باہم افتراق پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور قادیانیوں کو اس سلسلہ میں آلۂ کار بنا رہی ہے۔

سنغال

سنغال بھی مغربی افریقہ کی ایک ریاست ہے۔ مگر اس پر فرانس کا قبضہ ہے۔ شمالی افریقہ کی دوسری آبادیوں میں فرانس مسلمانوں

کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے وہ یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ بھی کر رہا ہے۔ حکومت نے ملک میں فرانسیسی طرز کے مدارس جاری کر کے ان میں تعلیم کو لازم کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی دینی واقفیت پہلے ہی کم تھی مگر یہ مدارس انہیں مزید دین سے بیگانہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دس سال سے الحاج محمود بن عمر العوتی کے زیرِ قیادت احیائے سنت کی تحریک کام کر رہی ہے۔ اُنہوں نے سنغال میں ایک مرکزی درسگاہ قائم کر کے ملک میں جا بجا اُس کی شاخیں قائم کر دی ہیں۔ اب تک ان شاخوں کی کل تعداد ۱۴۰ تک پہنچی ہے۔ ۳۰ ہزار طالب علم ان میں پڑھتے ہیں۔ ان مدارس میں کتاب و سنّت کی تعلیم کے ساتھ جہاد کی اسپرٹ بھی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ازہر، جامعہ زیتونہ، اور جامعہ القرویین کا رُخ کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہر صوبے میں ۲۵ ملین فرنک سالانہ خرچ کرنے کے بعد بھی مسیحی مشنریوں کو چند مجوسیوں کو حلقہ مسیحیت میں لانے کے سوا کوئی کامیابی نہیں ہو رہی۔

سوڈان

سوڈان کو آزاد ہوئے ایک سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہاں کی تمام دینی جماعتوں نے مِل کر سوڈان کو اسلامی ریاست بنانے کے لئے اسلامی دستور کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ اس مطالبے کو سوڈان کے دونوں مذہبی زعما سیّد علی میرغنی اور عبدالرحمان المہدی کی تائید حاصل ہو چکی ہے۔ یہ دونوں زعماء دو وسیع الاثر تحریکوں کے قائد ہیں۔ سیّد میرغنی الطریقۃ الختمیہ کے رہنما ہیں اور ربانی تحریک احمد بن ادریس کے خلیفۂ خاص محمد عثمان میرغنی کے پوتے ہیں۔ عبدالرحمان المہدی مہدی تحریک کے مؤسس سید مہدی کے صاحبزادے ہیں مشرقی اور شمالی سوڈان میں اول الذکر کا اثر و نفوذ ہے اور وسطی اور مغربی سوڈان میں مہدی تحریک کے انصار مؤیدین کا! اخوان المسلمون کی جماعت بھی سوڈان میں روز بروز پھیلتی جا رہی ہے۔ اخوان رہنماؤں کی سزائے موت پر پورا سوڈان سراپا احتجاج بن گیا تھا۔ علی طالب اللہ وہاں کے مراقب عام ہیں۔ "الاخوان المسلمون" کے نام سے جماعت نے ایک اخبار بھی جاری کر دیا ہے۔ مطالبۂ دستور اسلامی کی مہم کو اُٹھانے کا سہرا اخوان کے سر ہے۔ انہوں نے تمام دینی جماعتوں کو متحد کر کے "دستورِ اسلامی محاذ" قائم کر دیا ہے۔ محاذ کی طرف سے باقاعدہ اسلامی دستور کا خاکہ حکومت کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اسماعیل ازہری کی حکومت نے دستور پر خاص توجہ نہیں دی۔ موجودہ حکومت کی بقاء کا انحصار اب بھی اسلامی دستور کے نفاذ پر ہے۔ سوڈان میں جماعتِ اسلامی کے نام سے بھی ایک تنظیم ہے جس کا مقصد اسلامی تہذیب کو زندہ کرنا ہے۔

مصر

مصر میں تحریکِ اخوان کی بساط بظاہر لپیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب وہاں کوئی شخص اخوان کا نام نہیں لے سکتا۔ مگر اس تحریک نے ذہنوں پر جو اثر ڈالا ہے اُسے محو کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ حسن البناؒ کی آواز خدا کی آواز تھی نہ اُسے عبدالہادی پاشا دبا سکا اور نہ اب کرنل ناصر دبا سکتا ہے —— یہ سورج ڈوبا تو ہے لیکن طلوع ہونے کے لئے۔ جوں جوں رات بڑھتی جا رہی ہے

آمرِ مصر کو قربِ سحر کا خدشہ کھائے جاتا ہے۔ اخوان کے جو لوگ ہنگامہ ہائے دارو گیر میں مصر سے نکل کر دوسرے ملکوں میں جا پناہ گزین ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک فرد تحریک بنا ہوا ہے۔ شام، قطر، جرمنی اور سوئٹزر لینڈ میں یہ لوگ اُسی شان وارفتگی کے ساتھ دعوت کا کام کر رہے ہیں۔ جو اخوان کی خصوصیت ہے۔ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے بھی خاصا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مصر کی شبان المسلمین پہلے بھی سیاست سے کنارہ کش ہو کر رہتی تھی۔ اب بھی اُسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ غلبۂ اسلام کی تمنا تک محدود ہے۔

لبنان

لبنان میں عباد الرحمان کی جماعت سب سے مضبوط اسلامی جماعت ہے۔ یہ جماعت مکمل اور صحیح اسلام کی داعی ہے۔ لبنان میں مغربی تہذیب کی یلغار سے عام مسلمانوں بالخصوص نوجوان طبقے کو بچانے کے لئے یہ جماعت قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس نے اسکاؤٹ کا نظام جاری کر رکھا ہے۔ یہ اسکاؤٹ جب تربیتی کیمپ لگاتے ہیں تو روزے رکھتے ہیں۔ الاخوان المسلمون سے اس جماعت کو کامل اتفاق ہے۔ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر بھی اس کے نوجوانوں میں پھیل رہا ہے۔ چند روز ہوئے طرابلس سے "کلمۂ طیبہ کے معنی" پمفلٹ چھپوا کر جماعت نے مفت تقسیم کیا ہے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بالعموم اس کی طرف سے مفت تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ جماعت کے بانی عمر الداعوق کی شخصیت لبنان کے نوجوان طبقے کو بڑی تیزی سے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ الاخوان المسلمون ۱۹۴۷ء سے لبنان میں خلافِ قانون ہے۔

شام

سعید رمضان اور دوسرے اخوان رہنماؤں کے شام میں آجانے سے اخوان کی دعوت یہاں قوت پکڑتی جارہی ہے۔ شام کا جو عنصر دین کا غلبہ چاہتا ہے وہ اس جماعت میں سمٹ کر آرہا ہے۔ قوم پرست اور کمیونسٹ اس جماعت کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ ہر جگہ اس کی شدّ و مدّ سے مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کے اجتماعات میں ہنگامہ آرائی تک کرنے سے نہیں دریغ کرتے۔ حمص میں ایک بار کمیونسٹوں کی ایک ٹولی نے اخوان کے ہفتہ وار اجتماع پر ہلہ بول دیا۔ اور ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس وقت اجتماع میں درسِ قرآن ہو رہا تھا۔ جماعت کے لوگوں نے اس وقت بڑے صبر سے کام لیا اور معاملہ کو عدالت کے حوالے کرنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ دمشق یونیورسٹی سے خدا کا جنازہ نکالا گیا تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ اسی یونیورسٹی کے تحت شریعت کالج قائم ہو چکا ہے۔ اور اس میں فقہ اسلامی پر ایک انسائیکلوپیڈیا تیار ہو رہا ہے۔ شام کے دستور میں جو کچھ اسلامی اجزاء پائے جاتے ہیں وہ کافی حد تک اخوان ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کی اس جماعت میں جس قدر مانگ ہے بڑی مشکل سے پورا کیا جارہا ہے۔ اُمید

[illegible]

اسلامی انجمنیں بھی محدود پیمانے پر کام کر رہی ہیں مگر ان کے پیش نظر اس وقت صرف اسلامی تعلیم و تربیت کی اشاعت ہے۔

اردن

اردن میں بھی اخوان کی جماعت خاصی مضبوط ہے۔ اردن کی موجودہ پارلیمنٹ میں اخوان کے بھی چار نمائندے منتخب [illegible] انہوں نے جس الیشوع پر انتخاب لڑا ہے وہ یہ ہے — "اردن میں اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کرنا۔ فلسطین کو [illegible] سے آزاد کرانا۔ مغرب و مشرق کے استعماری بلاکوں کی گاڑیوں میں جُتنے کی بجائے مضبوط آزادانہ پالیسی اختیار کرنا ......"

چند ایک ابتدائی اسکول اخوان کے زیر انتظام چل رہے ہیں اور مزید سکول کھولنے کی اسکیم پیش نظر ہے۔ یہ جماعت موتمر اسلامی [illegible] مل کر القدس میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کر رہی ہے۔ فلسطین کی جنگ میں اور یہودی سرحدات کی حفاظت میں [illegible] جانفشانیوں کے جو جوہر دکھائے ہیں دشمن بھی اُن کا اعتراف کرتا ہے۔

اردن کے دارالحکومت عمان میں جمعیۃ البر والاحسان نے بھی ایک اسلامی کالج قائم کر رکھا ہے۔ رسالہ "دینیات" اسی کے [illegible] میں شامل ہے۔ اس کی دلچسپیاں صرف تعلیم محدود ہیں۔

عراق

عراق کی "الاخوة الاسلامیة" تنظیم و قیادت کی حیثیت سے مستقل ہے مگر اس کی دعوت اور طریق کار اخوان کی دعوت [illegible] ہی کے مطابق ہے۔ نوری السعید کی حکومت نے عراق میں جو تشدد آمیز رویہ اختیار کر رکھا ہے اور شہری آزادیوں کا جس بے دردی [illegible] کا گھونٹ رکھا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی آزاد تنظیم کا چلنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دعوتی سرگرمیاں ماند پڑی [illegible] ہفتہ وار آرگن "الاخوة الاسلامیة" بند ہو چکا ہے۔ عراق کا دوسرا اسلامی جریدہ "السجل" بھی بند ہو چکا ہے۔ الاخوة الاسلامیة کے [illegible] محمد محمود الصواف بڑی بیباک روش اور بے تاب شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی خطابت کی شعلہ بیانی پتھروں کو موم کر دینے والی ہے۔ [illegible] آزادی فلسطین کے لیے "جمعیت انقاذ فلسطین" کے نام سے جو تنظیم قائم ہے اس کے قیام میں صواف صاحب کی کوششوں ہی کا [illegible] ہے۔ اس کی لیڈرشپ بھی انہی کے ہاتھ میں ہے ———— بلکہ آج کل ان کی تمام سرگرمیاں فلسطین کی آزادی [illegible] مرکوز ہیں۔

ان کے علاوہ [illegible] - امجد الزہاوی بھی احیائے اسلام کے لئے ان تھک کوشش کر رہے ہیں۔ شرکت [illegible] کے نام سے [illegible] ایک کمیٹی قائم کی ہوئی ہے جو دینی موضوعات پر مشتمل پمفلٹ شائع کر کے مفت تقسیم کرتی رہتی ہے [illegible] شائع کر چکا ہے۔

ایران

ایران کی فدائیانِ اسلام تحریک کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ البتہ مرحوم نواب صفوی کا جذبۂ دینی قابلِ تعریف تھا۔ ایران میں جماعتہ التبلیغ کے نام سے ایک اور تنظیم سامنے آئی تھی اُس کے لٹریچر سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے اسلام کا تصور کسی حد تک صاف ہے۔ مگر اس کی سرگرمیوں سے زیادہ واقفیت تا حال ہم نہیں پہنچ سکی ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ بادشاہت کے مستبد نظام اور مذہبی تعصب کی افراط کے ہوتے ہوئے ایران میں دین کی سربلندی کی جد و جہد کرنا جان جوکھم کا معاملہ ہے یہی وجہ ہے کہ "جماعتہ التبلیغ" کے اغراض و مقاصد میں مذہبی گروہ بندی سے احتراز کی وضاحت کی گئی ہے۔

کویت وغیرہ

جزیرۃ العرب کی ریاستوں اور شیخیتوں میں کویت کے سوا کسی جگہ تنظیم کے ساتھ دعوتی کام نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر انفرادی طور پر حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض لوگ کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے۔ کویت میں جمعیتہ الارشاد الاسلامیہ کے نام سے ایک جماعت موجود ہے۔ اس نے ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ کویت کے سرکاری تعلیمی ادارے جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں وہ مصر اور لبنان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں اور اپنے اندر الحاد و دہریت کے وہ تمام جراثیم رکھتے ہیں جو ان یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ کویت کے لوگ بڑے سادہ تھے مگر اب تعلیم اور ارباب تعلیم کے ذریعے اُن کے اندر مغربیت کے تباہ کن جراثیم سرایت کر رہے ہیں۔ جمعیتہ الارشاد نے اس زہر کو ختم کرنے کے لئے مدرسہ قائم کیا ہے۔ مدرسے کے نام ہی سے ایک ماہوار رسالہ بھی نکلتا ہے۔ جزیرۃ العرب میں عرب نیشنلزم اور بھارت دوستی کی وبا جس طرح پھوٹ نکلی ہے، جمعیتہ الارشاد نہ صرف قعرِ دریا میں خود تر دامن نہیں ہوئی بلکہ عام عربوں کو بھی اس غلطی سے ٹوک رہی ہے۔

ملایا

ملایا کی ۵۰ لاکھ کی آبادی میں ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں اور باقی قدیم چینی۔ اسلام وہاں عرب اور ہندوستانی تاجروں کی وساطت سے پہنچا ہے۔ ملایا کے لوگوں نے اسلام کو جس جوش و خروش سے خوش آمدید کہا تھا وہ اس حد تک تھا کہ ملائی کے معنی مسلمان کے ہو گئے تھے اور جو چینی بھی مسلمان ہو جاتے تھے انہیں بھی ملائی کہا جاتا تھا۔ مگر اب مسلمانوں کے اندر اسلام سے جذباتی محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اوہام و خرافات کا دورہ دورہ ہے قدیم ہندی اور چینی تصورات نے عجیب و غریب عقائد کا مجموعہ تیار کر دیا ہے۔ عربی اور دینی تعلیم تقریباً ناپید ہے۔ اگر کہیں کوئی ایسا مدرسہ ہے بھی تو وہ جاہل مسلمانوں کی عدم توجہ سے دم توڑ رہا ہے۔ عربی زبان اُن کے نزدیک محض مقدس زبان کی حد تک ہے حتیٰ کہ عربی میں گانا اور گانا سننا ان کے نزدیک نہ صرف حلال ہے بلکہ کارِ ثواب! جو دعا عربی

میں نہ مانگی جائے وہ مستجاب نہیں ہے۔ تعلیم پر انگریزی حکومت کا قبضہ ہے۔ ملائی زبان میں [illegible] کے لئے انگریزی مدارس اور سنگاپور یونیورسٹی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اقتصادیات پر چینیوں کا قبضہ ہے جو مشرقِ بعید کے یہودی کہلاتے ہیں۔ جمعیت دعوتِ اسلامی، شبانِ مسلمین، رابطۂ عرب کے نام سے معمولی انجمنیں قائم ہیں مگر فکری طور پر مفلس ہیں۔

سیام

سیام کی دو کروڑ دس لاکھ کی آبادی میں سے تیس لاکھ مسلمان ہیں۔ نظامِ تعلیم دین کے ہر عنصر سے خالی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ روز بروز دین سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ اصلاحِ حال کے لئے انصار السنۃ کے نام سے ایک جمعیت قائم ہے جس کے لیڈر اسماعیل احمد ہیں۔ تقریباً دو ہزار اس کے رکن ہیں۔ ان لوگوں نے دینی مدارس قائم کرنے کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ایک مرکزی مدرسہ دارالحکومت بنکاک میں ہے اور چار مدرسے دوسرے حصوں میں۔ سیامی زبان میں اب تک قرآن کا کوئی ترجمہ نہیں۔ جمعیت انصار السنۃ ایک ترجمہ مختصر تفسیر کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ ایک ماہوار رسالہ سیامی زبان میں الھدیٰ کے نام سے اس نے جاری کر رکھا ہے۔ تین چار ہزار تک اس کی اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ جمعیت اصلاح، جمعیت سلفیہ، انجمن اسلام، مسلم برادری کے نام سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں لیکن وہ صرف مقامی ضروریات تک محدود ہیں۔ دین کے احیاء کا تصور ان میں نہیں ہے۔ بنکاک میں جمعیت سلفیہ کا ایک مدرسہ اور مسجد بھی ہے۔

برما

مشرقِ بعید کے ممالک میں انڈونیشیا کے بعد برما میں دینی بیداری زیادہ ہے۔ تمام ملک میں دینی مدارس پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگوں میں دین حاصل کرنے کا شوق بھی کافی پایا جاتا ہے۔ برما کی اکثریت چونکہ بدھ مت کی پیرو ہے اس لئے [illegible] تہذیب و ثقافت پر اس مذہب کا اثر ہے۔ برمی زبان میں اسلام کے موضوع پر لٹریچر بہت کم ملتا ہے۔ دینی مدارس [illegible] زبان بھی عربی اور اردو ہے۔ کچھ عرصے سے ایک برمی نوجوان سید منگ کو غفاری (Maung Ko Gaffar) نے تبلیغ [illegible] کے نام سے برمی زبان میں ایک ماہوار رسالہ رنگون سے نکالا ہے یہ پہلا اسلامی رسالہ ہے جو اس ملک میں خود اہلِ ملک کی ز[illegible] نکلا ہے۔ سید منگ کو غفاری کے والد مولانا عبدالغفار سالق داعی بڑے پابندِ سنت، مخلص اور اہلِ علم انسان تھے۔ برما میں [illegible] سے زیادہ تر انہوں نے ہی [illegible] جاری کئے ہیں۔ سید منگ کو غفاری بڑے صالح نوجوان ہیں ان میں کام کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے [illegible] میں پایا جاتا ہے۔ یہ رنگون میں [illegible] مسلم جرنلسٹ اینڈ رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں۔

سیلون

سیلون میں مستقل وجود کے طور پر جماعتِ اسلامی کی تشکیل ہو چکی ہے۔ اس کے قائم کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں

دیوبند اور ندوۃ کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور وہیں سے جماعت اسلامی سے متاثر ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کا تقریباً تمام لٹریچر ان لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔ نوجوانوں میں کام کا ولولہ کافی ہے۔ احمد بخاری اور عثمان بن طاسین جیسے فاضل نوجوان اگر اسی انداز پر دعوت پھیلاتے رہے تو بہت جلد یہ خطہ اسلام کے نظام زندگی کی طرف راغب ہو جائے گا۔

پاک وہند کی اسلامی تحریکیں آپ کے سامنے ہیں ؎

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

انڈونیشیا

انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی اپنی خامیوں کے باوجود اس وقت انڈونیشیا میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبردار ہے۔ کمیونسٹ اور نیشنلسٹ اُس کے ساتھ جو عداوت رکھتے ہیں اُس کی وجہ صرف اس کی اسلام پسندی ہے۔ نہضتہ العلماء کے عبدالواحد ہاشم اگر زندہ ہوتے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس نازک موقع پر نہضتہ العلماء کو ماشومی سے علیحدہ رکھتے۔ عبدالواحد ہاشم بڑے معتدل اور صحیح الفہم لیڈر رہتے۔ موجودہ لوگوں میں بے اعتدالی اور خوردہ گیری زیادہ پائی جاتی ہے۔ بہرحال انڈونیشیا میں اسلام کا مستقبل انہی دونوں تحریکوں سے وابستہ ہے۔ ان کے مغلوب یا ناکام ہو جانے کا مقصد وہاں کمیونزم کے نفوذ و استیلاء کے علاوہ کچھ نہیں۔

مؤتمر عالم اسلامی سے ایک اپیل

آخر میں میں مؤتمر اسلامی کے معزز رہنماؤں سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا میں احیائے اسلام کی کوشش جس قدر ہو رہی ہیں۔ ان کی ناکامی میں بہت بڑا دخل مسلمانوں کا ایک دوسرے سے غیر متعلق رہنا ہے۔ مؤتمر اسلامی ایک عالمی ادارہ ہے اگر یہ صحیح اسلام کا کام کرنے والی تمام جماعتوں کو متحد کر دے تو اس سے نہ صرف اسلامی عناصر کی قوت میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ علمی و فکری غذا سے ایک دوسرے کی پشت پناہی ہو سکے گی۔ بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جن میں دین کا جذبہ بہت پایا جاتا ہے۔ مگر اُن کے سامنے دین کا فکر واضح نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد مٹ جاتی ہیں۔ مؤتمر اسلامی اپنے اجتماع دمشق کے پروگرام کو اپنا عملی جامہ پہنانا شروع کر دے تو اس سے یہ ضرورت کافی حد تک پوری ہو سکتی ہے۔

بقیہ: یاران حلقہ از صفحہ ۵۱

"جگنو تاریخ اول آیا" عزت مآب کے ہاتھوں سے جگنو خانم نے سنہرا تمغہ مسکراتے ہوئے لیا، آداب بجا لائی اور پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔" [1]

سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے جناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔

والسلام ضیاء الدین ڈھاکہ

[1] (ادارہ: محترم مکتوب نگار کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ جملہ افسانے کا آخری جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے آگے بقیہ چلتا ہے۔ جو اسی شمارہ کے صفحہ ۵۱ پر دیا گیا ہے۔ بقیہ پڑھنے کے بعد پھر غور فرمائیے کہ آپ کا اعتراض کہاں تک بجا ہے؟ فقط)

احمد پرویز

"چراغِ راہ" شمارۂ دسمبر ۵۶ء پر ایک نظر

"چراغِ راہ" کی نومبر، دسمبر ۵۶ء کی مشترکہ اشاعت میں "کھمبے" کی تصویر نہیں آئی، اس لئے اس کے کچھ کہنے اور اپنے کچھ سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کی تصویر اب آنکھوں میں کھُبنے لگی ہے اور کان اس کی تلخ نوائی سے لذت اندوز ہونے لگے ہیں۔ کیونکہ وہ کچھ نہ کہنے کے باوجود بھی بہت کچھ کہہ ڈالتا ہے اور "رازہائے درونِ پردہ" سے ہر بار کچھ نہ کچھ لے کر منظرِ عام پر لا ڈالتا ہے اور تماشائیوں میں سے اہلِ ہوش و گوش کو دعوتِ فکر و نظر دے جاتا ہے، اور کچھ دیر ٹھہر کر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے "کھمبے نے کہا" کی بجائے "سوچ بچار" کے تحت "گرد و غبار" پر نظر پڑتی ہے۔ دراصل معنوی اعتبار سے "سوچ بچار" "چراغِ راہ" کا مخصوص حصہ ہے۔

اس کے بعد زکی زاکانی کی ایک انتہائی اثر آفریں نظم "کمی" سامنے آتی ہے۔ زکی زاکانی کے ہاں فن بھی ہے اور مقصد بھی، حسنِ کلام بھی ہے اور تاثیرِ کلام بھی، نشتر بھی ہے اور مرہم بھی۔ اس نظم میں ان سب خصوصیات کو بآسانی یکجا دیکھا جا سکتا ہے، جی چاہتا ہے بار بار پڑھیے اور داد دیجیے، "اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ"۔ دراصل "کمی" زکی زاکانی کی نظموں میں شاہکار کی حیثیت سے سامنے آئی ہے۔ مستقبل میں "کمی" کے مصنف سے اُردو ادب --- خصوصاً اسلامی ادب کو زیادہ "کچھ" ملنے کے امکانات ہیں۔

اگلے صفحہ پر محترمہ سلمیٰ یاسمین نجمی کا ایک مختصر مگر عمدہ سا تنقیدی مقالہ "منٹو ——عظیم افسانہ نگار" آگے بڑھنے سے نگاہوں کو ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کو اپنی زبان و قلم پر پورا پورا قابو حاصل ہے اور یہی خصوصیت اسلامی تنقید نگاری کو جاہل "تنقید نگاری" سے ممیز کرتی ہے۔ مقالہ جس قدر مختصر ہے اُسی قدر دلچسپ، وقیع اور وقتِ نظر کا متحمل۔ منٹو کی سماجی زندگی جو پستیٔ اخلاق و انسانیت کا مظہر تھی اُس سے تنفر کے باوجود مقالہ نگار نے توازن، احتیاط اور ناقدانہ ذمہ داری کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

صلا پر رضوان بریلوی کی ایک پُر جوش نظم "چراغاں" سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ رضوان بریلوی خاصا لکھ لیتے ہیں اور زود گو بھی ہیں اور پھر اُن کے کلام میں فنی حیثیت سے پختگی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے دروبست کا اہتمام بھی ہے، جیسا کہ چراغاں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر تاثیرِ کلام کی بُری طرح کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کی روشنی شعور کی تہوں تک جذب نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے جسے مقصد سے عشق کہتے ہیں وہ کیفیت ان کی نظموں میں دور دور تک محسوس نہیں ہوتی۔

[illegible] ہے اور مستقبل کی ایک اہم ضرورت بھی۔

محترم اسرار احمد سہاوری کے پُراثر افادیت مقالہ کے بعد سے بزمِ غزل شروع ہوتا ہے۔ جو کافی بلند اور معیاری غزلوں پر [illegible] اس وقفہ "چراغِ راہ" نے غزلوں کے تاثر کو منتشر نہیں کیا، بلکہ اس صنفِ ادب کو اس کے شایانِ شان جگہ عنایت فرمائی [illegible] کی محفلِ تغزل میں نعیم صدیقی، کوثر نیازی، حبیب کیفوی، بنتِ مجتبیٰ مینا، راسخ عرفانی اور افتخار اعظمی نے حصہ لیا ہے۔ چند منتخب [illegible] ذیل ہیں، آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

اُٹھو! کہ ولولوں کی گھٹائیں اُمڈ پڑیں — آؤ! کہ آرزوؤں کے ساغر کھنک گئے
جس نے بھی کھایا زخم ہمارا جگر کٹا — جس پر بھی تیرا تیر چلا، ہم پھڑک گئے
اس دور میں تو حُسن بھی دیوانہ ہو گیا — گھونگھٹ اُلٹ دیئے گئے! آنچل ڈھلک گئے
(نعیم صدیقی)

بے خوفی، بے لوث، پاکیزہ رفاقت چاہیئے — اے ہجومِ دوستاں! مجھ کو محبت چاہیئے
کون جانے، کب وہ ٹھہرائیں ہمیں شایانِ لطف — ہر گھڑی اُجڑے ہوئے دل کی یہ حالت چاہیئے
چند لمحوں کا نہیں ہے، عمر بھر کا کام ہے — ہر قدم پر راہِ الفت میں عزیمت چاہیئے
(کوثر نیازی)

جنوں ہی میرے لیے ہوش ہے جنوں ہی خرد — متاعِ زیست یہی ہے لٹا نہیں سکتے
کسی کا حسنِ دلآویز ہی کچھ ایسا ہے — ہزار چاہیں بھی دل سے بھلا نہیں سکتے
(حبیب کیفوی)

لبِ ہر خار پہ ٹپکاتا ہوا خونِ جگر — اک مسافر ہے، کہ منزل کو چلا جاتا ہے
جب بچھڑ جائے رہِ شوق کا ساتھی کوئی — یہ وہ صدمہ ہے جو مشکل سے سہا جاتا ہے
(بنتِ مجتبیٰ مینا)

خزاں دیدہ چمن کو گُلِ بداماں کون دیکھے گا — خدا جانے کہ پھر فصلِ بہاراں کون دیکھے گا
ابھی تو نوکِ مژگاں اشکِ پیہم سے مزیّن ہے — مسرت کو لبِ حسرت پہ خنداں کون دیکھے گا
(راسخ عرفانی)

مذہبِ عشق میں عصیاں ہے تمنائے سکوں — موت ہے عشرتِ ساحل کوئی انعام نہیں
زلف و کاکل میں نہ اُلجھ، نہ رخ و ابرو میں — نگہِ شوق کی پرواز سرِ بام — نہیں
چہرۂ صبحِ حقیقت سے اُٹھا دی جو نقاب — نور ہی نور ہے، اب ظلمتِ اوہام نہیں
(افتخار اعظمی)

بقیہ: فیصلہ از صفحہ ۴۴

[illegible] وہ اپنی ہر بات منوالیا کرتا تھا اور اس کی بیوی کا وجود ایک ایسے تورانی حقیقت میں آگیا ہے جو نگے قریب جانے کی [illegible]
[illegible] فرح بہت پیدا نہیں ہو سکی۔ وہ بے حس سا ہو کر سامنے کی طرف دیکھنے لگا [illegible]
[illegible] بچے کی طرف بڑھ رہی تھی [illegible]
[illegible]

نظر نمایندی

فیصلہ

آج شاہد نہایت اچھے موڈ میں تھا، جونیئر کلرکوں کے طبقہ میں ایسی ساز گار اور خوش گوار ذہنی فضا کسی خوش قسمت کو بھی شاذ و نادر ہی میسر آتی ہے، سروس کے ابتدائی دنوں کے بعد جب بابو بن جانے کا خیال اور تمام باتوں پر غالب رہتا ہے ان لوگوں کی زندگی میں حقیقی تفریح اور دردسروں سے، اچھے موڈ میں گفتگو کرنے کے مواقع روز روز نہیں آتے۔ بہت ہوا تو افسر کی غیر موجودگی میں ساتھیوں سے نوک جھونک ہوگئی، یا کبھی کسی تقریب پر ذہنی فراغت کے چند لمحے میسر آ گئے۔ ورنہ طبیعت کا عام اسلوب ع

نہ چھیڑ و ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں

کے مترادف رہتا ہے، خاص طور سے گھر کی چہار دیواری میں داخل ہونے کے بعد تو ان کے چہروں پر شگفتگی کا محسوس ہونا تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے جیسے مہاوٹوں کے دنوں میں دھوپ کا نکل آنا۔

تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوئے، ایک لمبا سا سانس لے کر چارپائی یا کرسی پر گر پڑے۔ ناشتہ دان اور کاغذوں کا پلندہ ایک طرف پٹخ کر دوسرا طویل سانس لیا اور نہایت دردناک انداز میں سر جھکا کر بوٹوں کے تسمے ڈھیلے کرنے لگے۔

یہ تو اپنے دولت کدے میں نزول اجلال کا منظر ہوا۔ اس کے بعد جو زندگی کے ڈرامے میں کامیڈی نما ٹریجڈی یا ٹریجڈی نما کامیڈی شروع ہوتی ہے تو دوسرے دن دفتر سدھارنے تک برابر جاری رہتی ہے۔ اسی دوران میں کبھی بیوی غریب کی شامت آتی ہے کبھی بچوں کی اور کبھی ان دونوں کے ہاتھوں خود اپنی۔

ایسے ناگزیر اور بندھے ٹکے حالات میں شاہد کا یوں مسکراہٹ کے پھول بکھیرتے ہوئے گھر میں داخل ہونا خلافِ معمول ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ اس کی بیوی نے تقریباً حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر پھر برتن مانجھنے لگی۔ اس کے دل میں یہ خواہش نہایت شدّت سے اُبھری کہ اس حادثے کا سبب دریافت کروں لیکن اس اندیشے سے خاموش رہی کہیں میری مداخلت مسرت کے اس نُور کو مدھم نہ کر دے جو نہ جانے کتنے دن کے بعد اس نے اپنے شوہر کے چہرے پر دیکھا تھا۔

روزمرہ کے معمول کے مطابق سیدھا اپنے کمرے میں جانے کی جگہ شاہد آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اپنی بیوی کے پاس ہی آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ راکھ میں لتھڑی ہوئی پتیلی ایک طرف رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتی نہایت شگفتہ لہجہ میں بولا۔

"بیگم آج تو تمہارا خواب حیرت انگیز طور پر سچ ثابت ہوا۔ تم نے خواب یہی دیکھا تھا نا کہ میں رومال میں ڈھیر ساری مچھلیاں لئے ہوئے اور بالکل نیا لباس پہنے گھر میں داخل ہوا ہوں ؟"

"ہاں خواب تو یہی دیکھا تھا لیکن ـــــ !" لیکن تک پہنچکر شاہد کی بیوی اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو لیکن میرا یہ خواب پورا کہاں ہوا ہے۔ آپ کا لباس تو ابھی تک وہی مچھیروں کا سا ہے اور آپ کے ہاتھوں میں مچھلیوں کی جگہ وہی پیتل کا ناشتہ دان ہے جس کی بد ہیئتی کو چھپانے کے لئے آپ نے اسے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ رکھا ہے۔

شاہد اپنی بیوی کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر خاصی بلند آواز میں ہنسا۔

"شاید تم یہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہو کہ میں آیا تو اسی ہیئت میں ہوں پھر خواب کی تعبیر کس طرح پوری ہوئی۔ لیکن تمہارا یوں حیران ہونا درست نہیں۔ ادھر دیکھو ـــ !"

یہ کہہ کر شاہد نے اپنے پرانے کوٹ کی اندرونی جیب سے بٹوا نکالا اور دس دس روپے کے نئے کرنسی نوٹ گننے لگا۔

"کہو اب تو تمہارے خواب کی تعبیر سولہ آنہ ٹھیک ہوئی۔ یہ تو ایک جاہل کو بھی معلوم ہے کہ اگر خواب میں مچھلیاں دیکھیں تو روزی ملتی ہے "

"واقعی یہ تو حیران کن بات ہے۔ خواب کی ایسی صحیح تعبیر اور اتنی جلدی !" شاہد کی بیوی راکھ میں سنے ہوئے ہاتھ جھٹکتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور عقیدت بھری نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ بالکل اسی انداز سے جیسے وہ کوئی بہت بڑا سورما ہے اور کوئی اہم جنگی قلعہ فتح کر کے آیا ہے اور یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کھاری پانی کے کنوئیں میں اچانک میٹھے پانی کے سوتے پھوٹ پڑیں۔ یہ عورت جو دن رات ایک بے جان مشین کی طرح اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگی رہتی تھی اور اقتصادی دباؤ کے باعث جس کے خیالات اور تصورات بھی بڑی حد تک مشین ہی ہو گئے تھے اس وقت ایک مثالی عورت نظر آ رہی تھی۔ وہ عورت جس کے جلو میں زندگی کی تمام برکتیں جلوہ فرما ہوتی ہیں اور جو ایک نگاہِ غلط انداز سے مرد کے قلب و زار کو گل و گلزار بنا دیتی ہے۔

"اور میرے خواب کا دوسرا حصہ ؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شاہد کی بیوی نے سوال کیا۔

تمہارے خواب کے دوسرے حصے کی تعبیر یہ ہے کہ سپرنٹنڈنٹ نے نہایت زوردار لفظوں میں میری سفارش کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انشاء اللہ بہت جلد اے گریڈ مل جائے گا۔"

سچ ـــــ ؟" شاہد کی بیوی کی نظروں میں عقیدت و مسرت کی پرچھائیاں اور گہری ہو گئیں۔ اس نے تقریباً کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہمارے بچوں کے حال پر نظر کرم کی۔ میں کئی دن سے اسی فکر میں غلطاں تھی کہ حامد کی تعلیم کس طرح جاری رہ سکے گی۔ موجودہ حالات میں اس کا قطعاً امکان نہ تھا۔"

"ہاں اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جائے تو وہ کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی دیتا ہے "

"اچھا اب آپ یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔ اندر جا کر کپڑے تبدیل کیجیے اور یہ ناشتہ دان مجھے دے دیجیے۔ برتنوں کے ساتھ ہی مانجھ دوں، بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اسے قلعی کرنے کے لئے ہی دے دیجیے بہت بری حالت ہو گئی ہے۔"

"ہاں یہ سب کچھ بھی ہو جائے گا۔ تم ہاتھ دھو کر روپے تو سنبھال لو!" یہ کہہ کر شاہد نے ایک بار پھر نوٹ گنے اور کچھ ایسے انداز سے اپنی بیوی کی طرف بڑھا دیئے جیسے اس کی خدمت میں کوئی نایاب تحفہ پیش کر رہا تھا۔

جس وقت وہ نوٹ گن رہا تھا اس کی بیوی نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کے ساتھ گنتی جا رہی تھی۔ پھر بھی نوٹ لے کر اس نے ایک بار گنے اور خوشی سے بیخود سی ہو کر بولی: "تین سو ہیں!"

"ہاں تین سو ہی ہیں۔ میری دو مہینے کی تنخواہ کے برابر اور خدا نے چاہا تو اتنے ہی اور مل جائیں گے۔" شاہد اب یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا تاجر اپنے فالتو مال کی گنتی کر رہا ہو لیکن اس کی بیوی کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ مسرت کے شدید جذبات کی وجہ سے اس کا پورا وجود رعشے کی سی حالت میں تھا آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور ذہن میں طوفان سا مچا ہوا تھا۔ تین سو روپے کے ان نئے کرنسی نوٹوں نے اس کے سامنے ضرورتوں کے کئی دفتر کھول دیئے تھے۔ تصور کی دنیا میں وہ اپنی ننھی منی حسین بچیوں کے لئے سونے اور چاندی کے زیور بنوا رہی تھی۔ ریشم کے بڑھیا بڑھیا کپڑے خرید رہی تھی۔ مکان کے کمروں کو نئے انداز سے سجا رہی تھی۔

اسے یوں بیخود اور محویت کے عالم میں دیکھ کر شاہد معنی خیز انداز میں مسکرایا جیسے کسی معصوم بچے کی سادگی پر ہنسی آ گئی ہو۔ آہستگی سے اس کا بازو پکڑ کر کمرے کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "یہ حقیر سی رقم دیکھ کر ہی تم تو یوں حیران ہو گئیں جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔"

"میرے نزدیک تو یہ تین سو روپے قارون کے خزانے سے بھی بڑھ کر ہیں۔ پیسہ وہی جو وقت پر کام آ جائے۔ آپ کو معلوم ہے گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ بچوں کے پاس ڈھنگ کا ایک کپڑا بھی نہیں اور ——!"

اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں کمرے میں پہنچ گئے۔ شاہد تھکے تھکے انداز میں ایک طویل سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی بیوی قریب رک کر غیر ارادی طور پر پھر نوٹ گننے لگی۔ دس دس روپے کے تیس نوٹ گن کر اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ اتنے روپے پا کر اس کے کرنے کے بہت سے کام نکل آئے تھے اور فطری طور پر شاہد کی ذات سے اس کی دلچسپی کم ہو رہی تھی لیکن یوں ایکا ایکی چلے جانا بھی مناسب نہ تھا۔ اس لئے محض بات جاری رکھنے کے خیال سے بولی۔ "کیا ترقی دینے کے سلسلے میں سرکار کا یہ قاعدہ ہے کہ جس کی تنخواہ بڑھائی جائے اسے ترقی کے روپے پیشگی دے دیئے جاتے ہیں؟"

اپنی بیوی کا یہ سوال سن کر شاہد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر ہنستے ہنستے بولا۔ "تمہاری تجویز تو شاندار ہے، حکومت منظور کر کے تو ملازمت پیشہ لوگوں کی طرف سے تمہیں معقول انعام ملنا چاہیے۔ لیکن افسوس حکومت نے ابھی ایسی کوئی تجویز منظور نہیں کی ہے"

"تو پھر یہ روپے آپ کو کہاں سے ملے ؟" شاہد کی بیوی اس سوال سے دانستہ گریز کر رہی تھی۔ لیکن اس موقع پر اس کی زبان پر بیساختہ یہی سوال آگیا اور اس کی توقع کے عین مطابق شاہد نے یہ بات نہایت ناگواری کے انداز میں سنی، پھر اپنی طبیعت کی یہ کیفیت چھپانے کے خیال سے ہنستے ہوئے بولا۔ "ان روپوں کے بارے میں کیا پوچھتی ہو۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لو کہ میرے ساتھیوں نے مشترکہ طور پر ایک منفعت بخش کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ اب تک میں نے اپنا حصہ وصول نہ کیا تھا۔ آج اس کی پہلی قسط لایا ہوں۔"

یہ خاصی گہری اشاریت تھی اور شاہد کی بیوی کو اس قسم کے معاملات کا کوئی خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے طور پر مطمئن ہو گئی اور بلند آواز میں ایک بار پھر اللہ کا شکر ادا کر کے مستقبل کے متعلق اچھے اچھے منصوبے بنانے لگی۔

انسانی مشاغل میں یہ مشغلہ سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ہے۔ تخیل کی وادی وہ وادی ہے جہاں ایک فقیر کو بھی اس بات کی پوری پوری آزادی ہے کہ وہ بادشاہ کے تخت پُر جلال پر تشریف فرما ہو، پھر شاہد کی بیوی کے سامنے تو تین سو روپے کے کرنسی نوٹوں کی گڈی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ یقین کہ اب ہماری آمدنی مستقل طور پر بڑھ جائے گی۔ اس لئے وہ اس رنگین وادی میں کافی آگے نکل گئی تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کے بارے میں نہایت ہی شاندار پروگرام بنائے تھے، اور ان پروگراموں کی مناسبت ہی سے اس کے چہرے کی کیفیات بدل رہی تھیں لیکن اب شاہد کی حالت پہلے سے بہت مختلف تھی، اپنی بیوی کے اس سوال کے بعد وہ اس شرابی کی مانند رہ گیا تھا جسے کوئی ترش چیز کھلا کر کیف سے محروم کر دیا گیا ہو۔ وہ کرسی کے بازؤں پر کہنیاں جمائے خالی خالی نظروں سے اپنی بیوی کے چہرے کو تک رہا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں میاں بیوی کی یہ حالتیں دائمی ہیں۔ شاہد یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا خلا میں گھورتا رہے گا اور اس کی بیوی یونہی، رنگیں، دلفریب تصورات کی دنیا میں بھٹکتی رہے گی۔ کہ اس کا چھوٹا لڑکا ریاض ایک برقعہ پوش خاتون کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوا۔ اپنے گھر میں ایک اجنبی عورت کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں اپنے اپنے خیالات سے چونکے اور استفسار طلب نظروں سے نووارد خاتون کی طرف دیکھنے لگے۔ برقعہ پوش عورت رنج کی شدت سے ہچکتا ہوا ایک طویل سانس لے کر شاہد کے پیروں کے بالکل پاس زمین پر بیٹھ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "کیا شاہد بابو آپ ہی کا نام ہے ؟"

"ہاں بہن میرے شوہر کا یہی نام ہے۔ کہو تمہیں ان سے کیا کام ہے ؟"

"کام تو کچھ نہیں، اگر یہ سن لیں تو ایک فریاد لے کر آئی ہوں ان کے پاس۔"

"ہاں کہو بہن! اگر ہمیں کسی کے کام آئیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے۔" شاہد کی بیوی فخریہ لہجے میں بولی۔

"لیکن تم ہو کون اور مجھ سے تمہیں کیا کام ہو سکتا ہے ؟" شاہد نے متوحش سا ہو کر سوال کیا اور کرسی پر یوں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ اُٹھ کر بھاگنے کی ضرورت پڑے تو کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو۔

نووارد خاتون مطمئن آواز میں بولی۔ "بابو جی۔ میں وہی بدنصیب ہوں جسے قتل کرنے کے لئے آپ کے ہاتھ میں تلوار دے دی گئی ہے۔ میرے وکیل نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے میرے دشمنوں سے رشوت لے کر سرکاری کاغذوں میں میرے بچے کی عمر کم لکھدی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ عدالت کو مجبوراً ان ظالموں کے حق میں فیصلہ کرنا پڑے گا اور وہ اسی سال ڈیڑھ سال کی مدت سے فائدہ اُٹھا کر میری جائیداد خرد برُد کر دیں گے۔ میں آپ کو خدا رسول کا واسطہ دیتی ہوں میرے ساتھ یہ پاپ نہ کمانا۔ روپے کسی کے پاس رکھے نہیں رہ جاتے۔ آج آئے کل خرچ ہو گئے لیکن گناہ کا داغ بعض اوقات شہیدوں کے خون سے بھی نہیں دھویا جا سکتا۔"

"لیکن بہن ہمارے بارے میں تجھے قطعی طور پر غلط فہمی ہوئی ہے، نہ ہمیں کسی نے رشوت دی، نہ ہم ایسے غلط کام کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔"

"بابو جی میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں ان ننھے منے بچوں کا واسطہ دیتی ہوں جن سے آپ کا گھر سجا ہوا ہے۔ میرے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔ میں نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہے عمروں کا رجسٹر آپ ہی کے پاس ہوتا ہے اور اس کے اندر آپ ہی تبدیلی کر سکتے ہیں۔ میری موجودہ حالت اچھی نہیں ہے لیکن پھر بھی میں وعدہ کرتی ہوں کہ انہوں نے جتنے روپے دئے ہیں اتنے ہی ادا کر دوں گی۔ یہ لیجئے میری چوڑیاں تو آپ اسی وقت اپنے پاس رکھ لیجئے۔" عورت نے برقعے سے ہاتھ نکال کر اپنی سونے کی دو چوڑیاں شاہد کے قدموں میں ڈال دیں۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی صاف طور سے محسوس ہو رہی تھی۔

عورت کی درد بھری باتیں سن کر شاہد کی بیوی کا دل بھر آیا لیکن اپنی فطرت کے خلاف وہ خود اور زیادہ بپھر گیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا تیز تیز نظروں سے برقعہ پوش خاتون کو گھورتا رہا اور جب اس نے بار دگر اپنی داستان شروع کرنی چاہی، تو ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ "مائی تجھ سے کہا تو ہے تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم ایسا ذلیل کام کسی طور نہیں کر سکتے، جا اپنے گھر جا، کسی کو بدنام کرنا اچھی بات نہیں۔" اور جب عورت نے پھر بھی اپنی وہی درخواست دہرائی اور چوڑیوں کے ساتھ اپنے کانوں کے بندے بھی شاہد کے پیروں میں رکھ دیئے تو وہ جلال میں آ گیا اور اپنے گلے کی پوری قوت سے چلّا کر بولا۔ "تو سیدھی طرح یہاں سے جاتی ہے یا دھکے دے کر باہر نکالوں۔ شرم نہیں آتی لوگوں کو بدنام کرتے ہوئے۔ سوچ تو سہی اگر یہ بات ہمارے افسروں کے کانوں تک پہنچے تو وہ ہمارے بارے میں کیا خیال کریں۔"

شاہد کی بیوی کے لئے یہ تماشے کا سا منظر تھا۔ ابھی ابھی وہ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی، ایک انتہائی حسین اور مسرور دنیا میں محو گلگشت تھی اور صرف چند ساعتوں کے بعد ہی یوں محسوس کر رہی تھی کہ کسی نے آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ بے شک اس کا شوہر نہایت زوردار لفظوں میں عورت کے الزام کی تردید کر رہا تھا

اور مظلوم عورت اس کے لہجے کے کرارے پن سے مرعوب بھی نظر آ رہی تھی لیکن خود وہ تو اپنے آپ کو دھوکہ نہ دے سکتی تھی۔ تین سو روپے کے کرنسی نوٹ ابھی تک اس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں تھے اور یہ نوٹ جو ذرا دیر پہلے بہشتِ بریں کا پروانہ معلوم ہو رہے تھے اب انگاروں کی طرح جلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے عورت کو تسلی دینے کی کوشش کی، اپنے شوہر کو سمجھانا چاہا، لیکن معاملہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ خواب کی سی حالت میں ان دونوں کی گفتگو سنتی رہی، شاہد کے الفاظ تیز سے تیز تر ہوتے گئے اور عورت کی بھرائی ہوئی آواز آہستہ آہستہ ہچکیوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ اس وقت ہوش میں آئی جب عورت اپنی چوڑیاں اور بندے اٹھا کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب وہ اس کے الفاظ کا مفہوم بھی پا سکتی تھی، اور قلب و جگر کو ڈسنے والے رنج و غم کا اندازہ بھی کر سکتی تھی۔ بیخودی کے عالم میں آگے بڑھ کر اس نے نووارد خاتون کا راستہ روک لیا اور رنج سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بہن ذرا دیر ٹھہریں تیری تسلی کرنے کی کوشش کروں گی۔ یقین کر میرے شوہر ایسا کام ہرگز نہیں کر سکتے" لیکن نووارد خاتون نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بلند آواز میں روتی ہوئی اور کوستی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

"اللہ کرے رشوت میں لئے ہوئے یہ حرام کے روپے تیرے کسی کام نہ آئیں۔ تجھے ان سے اپنے بچوں کا کفن خریدنا پڑے اور تیری بیوہ تیرے بعد یونہی روتی اور فریاد کرتی در در پھرے جس طرح آج میں پھر رہی ہوں اور تو ـــ!"

یہ الفاظ نہیں زہر میں بجھے ہوئے نشتر تھے جو کانوں کے رستے اس کے دل میں اترتے جا رہے تھے۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جائے گا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زمین پہ بیٹھ گئی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔ "خدا کے لئے اس مظلوم عورت کو مطمئن کیجئے۔ کہیں اس کی منحوس بد دعا رنگ نہ لائے۔ اس لئے خدا کے لئے جلد اٹھئے اسے روکئے۔ ہم اپنی زندگی یونہی گذار دیں گے ہمیں ایسے روپوں کی ضرورت نہیں۔"

"خاموش رہو جی! یہ کیا بکواس شروع کر دی تم نے۔ خبردار اس سلسلے میں ایک لفظ بھی کہا ہو!"

یہ ڈانٹ سن کر شاہد کی بیوی پتھر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت ہو گئی۔ اسے اپنے شوہر سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ وہ اس قدر سخت دل اور ڈھیٹ ثابت ہو گا۔ اجنبی عورت کو بیشک دھوکہ دیا جا سکتا تھا لیکن خود وہ تو اب کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ سکتی تھی۔ اب مشترکہ کاروبار کا مفہوم اس کی سمجھ میں بخوبی آ رہا تھا اور مٹھی میں دبے ہوئے کرنسی نوٹوں کی تپش برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

کئی منٹ یونہی خاموش بیٹھی رہنے کے بعد وہ ایک خاص عزم کے ساتھ اٹھی اور شاہد کے قریب آ کر تین سو روپے کے نوٹ اس کے قدموں میں ڈال دیئے۔

نحیف و نزار ہونے کے باوجود شاہد اپنے گھر میں نہایت باوقار زندگی گذارتا تھا، گھر کے معاملات میں عام طور پر اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا لیکن اس وقت اسے یوں محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی قوت نے اس کے دل کی وہ ساری حرارت زائل کر دی ہے جس کے

(باقی صفحہ ۴۰۰ پر)

راسخ عرفانی

غزل

بہار و مے سے پھر تجدیدِ پیماں ہم بھی کرتے ہیں
سبو کو اشکِ خوں سے گُل بداماں ہم بھی کرتے ہیں

خزاں دیدہ گلوں کی دید سے تسکین کیا ہو گی؟
بہ مجبوری مگر سیرِ گلستاں ہم بھی کرتے ہیں،

خدا جانے کہ کل جوشِ جنوں سے حشر کیا ہو گا!
مگر اب تو رفو چاکِ گریباں ہم بھی کرتے ہیں

اسی میں ہے اگر کچھ مصلحت، پھر کیا تامّل ہے
نشیمن کو حریفِ برق و باراں ہم بھی کرتے ہیں

تمہیں پر تو نہیں موقوف اے گلشن کے رکھوالو،
یقین جانو کہ تعظیمِ بہاراں ہم بھی کرتے ہیں

شبِ فرقت فسردہ آرزوؤں کے کھلونوں سے
دلِ مضطر کو بہلانے کا ساماں ہم بھی کرتے ہیں

جہاں میں آندھیاں غم کی جو چلتی ہیں تو چلنے دو،
چراغِ آرزو دل میں فروزاں ہم بھی کرتے ہیں

یہی مرضی ہے جب راسخ ہمارے ناخداؤں کی
تو پھر اپنا سفینہ نذرِ طوفاں ہم بھی کرتے ہیں

ننھے بچوں کو بیماری سے بچائیے!
بہار اطفال
شربت
ننھے بچوں کا قدرتی محافظ ہے
بچوں کی عام جسمانی کمزوری۔ لاغری۔ دانت نکلنے کی تکالیف۔ اسہال۔ نزلہ
زکام اور پھیپھڑوں کی تکالیف میں بیش بہا فوائد کا حامل ہے
ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔
فی شیشی ۔/۴/۱
اپنے شہر کے سٹاکسٹوں یا ادارہ کی ایجنسیوں سے حاصل کریں
اشرف میڈیکل لیباریٹری
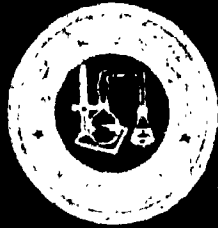
سخن اے ہمنشیں از من چہ پرسی
کہ من از خویش دارم گفتگوئے

فروغ احمد کا خط فروغ احمد کے نام

فروغِ من! سلام و رحمت!

بھائی تم نے جو رسالہ Reader's Digest سے A Tale of Two Letters کا تراشہ نکال کر مجھے دکھایا ہے اس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ اس سے پہلے James Mackintosh سے میں واقف ہی نہ تھا۔ رفقا جانتے ہیں کہ میں تمہیں اور تم مجھے عرصے سے لکھتے رہے ہو۔ وہ رات مجھے یاد ہے جب کمرے میں مَیں نہایت بے قراری کا ایک ایک لمحہ گزار رہا تھا۔ بنگال میں خزاں کہاں یہاں تو طوفانِ بہاراں سے جی اکتا یا رہتا ہے اور آدمی "فصلِ خزاں" کے لئے ترس جاتا ہے۔ وہ رات بھی عجیب رات تھی۔ بارش کے شرابے دار چھینٹے کھڑکیوں سے کمرے کے اندر آرہے تھے اور ٹھنڈی مرطوب ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی میز کے کاغذات کو اِدھر اُدھر منتشر کر رہی تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے بند کرکے میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولا تو "کوئی" اندر آیا۔ سلام اور مصافحہ کرکے میرے نزدیک بیٹھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر نظر ڈالنے کے بعد خیر و عافیت پوچھی۔ میری زبان پر بے ساختہ اقبالؒ کا یہ شعر جاری ہو گیا ؎

سخن اے ہمنشیں از من چہ پرسی   کہ من از خویش دارم گفتگوئے

"وہ" چلا گیا لیکن ایک وجدانی کیفیت جو اس شعر سے پیدا ہو چکی تھی کیفِ دوام بن کر رہ گئی۔ اس طرح طبیعت نے ایک صنفِ ادب کی راہ سجھائی۔ اور میں نے تمہارے نام اپنا پہلا خط لکھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ خط اتنا نجی بھی نہ تھا بلکہ اس میں ابنائے روزگار کی باتیں زیادہ تھیں اور اسی لئے میں نے حلقہ ادب کی ایک نشست میں سنایا بھی تھا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس پر میرے ایک محترم دوست نے کن الفاظ میں تبصرہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ "یہ ادب پارہ نرگسیت کا پتہ دیتا ہے"۔ فرائڈ کی اصطلاح میں "نرگسیت" (Narcissusism) "خود عشقی یا خود پسندی کو کہتے ہیں۔ فروغ تم جانتے ہو اور تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ تم اور میں یک جان و دو قالب نہیں، یک جان و یک قالب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے احوال سے کتنے بے خبر رہے۔ مبادا میرے محترم دوست اس صورتِ حال پر منقسم شخصیت (split personality) کا حکم لگا دیں۔ لیکن یہ بھی نہ مجھے گوارا ہوگا نہ تمہیں۔ کبھی کبھی اگرچہ میں بھی پریشان ہوتا ہوں یہ سوچ کر کہ آخر حقیقت کیا ہے۔ لیکن پھر وہی بات دل کو لگتی ہے جو تم نے سجھائی تھی۔ یعنی "خود عشقی" بھی نہیں۔ "منقسم شخصیت" بھی نہیں البتہ توام شخصیت یعنی Twin personality کا الزام زیادہ سے زیادہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ بس صرف ایک خلش باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ توام شخصیت اور اتنا بُعد کہ خط لکھنا پڑے! ہاں یہ ایک انتہائی مشکل قسم کا Paradox ہے اور جب تک ہم اعصاب باہم سے بالاتر نہ ہو جائیں توام شخصیت اور باہمی بُعد کا PARADOX

(باقی صفحہ ۱ پر)

یارانِ حلقہ

محترم نعیم صاحب۔ السلام علیکم!

اپریل کے "چراغِ راہ" میں "احسان دانش کے ساتھ چند لمحے" نہبت مختصر ہے۔ اگر اختصار سے آگے بڑھ کر ان کے فکر و فن کی مقصدیت کا بھی احاطہ کر لیا جاتا تو یہ گفتگو ایک مضمون کی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ احسان صاحب اس دور کے ایک گراں مایہ شاعر ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کے فن میں . . . . ایک خاص تعلق ہے وہ ایک مزدور شاعر ہیں اور انہوں نے اس طبقہ کے خدوخال کی پوری طرح عکاسی کی ہے لیکن ان کے کلام میں فکر نہیں صرف فن ہی فن ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ تعجب ہے کہ احسان نے جوش ملیح آبادی سے استفادہ کیا اور ان کی نظر میں جوش ہی اس دور کا وہ شاعر نکلا جس سے وہ متاثر ہو سکتے تھے۔ لاہور میں رہتے ہوئے ان کو شاعرِ مشرق سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہوگا۔ اقبالؒ اس صدی کی سب سے زیادہ پُروقار آواز ہے اس کے لہجے کی تمکنت اور دلکشی اس دور کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ اگر احسان شاعرِ مشرق سے استفادہ کرتے تو یقینی طور پر ان کا کلام اتنا بے جان نہیں ہوتا، جس قدر جوش سے متاثر ہو کر ہوا ہے۔

احقر خیال مینائی۔ جلال پور جٹاں

محترم نعیم صاحب: السلام علیکم،

۱۳ مارچ ۶۸ء کی سہ پہر میں، میں اور فروغ احمد صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ نے ہمیں جو تفصیلی گفتگو کا موقع عطا فرمایا اس کے لئے میں ذاتی طور پر بیحد مشکور ہوں۔ ساتھ ہی آپ کے دئے ہوئے "ہدیۂ اخلاص" کے لئے بھی خلوصِ دل سے شکریہ پیش کرتا ہوں۔

ہماری اس دن کی گفتگو بیشتر اسلامی ادب کے افسانہ نگاروں، ان کے فن، ٹکنیک، ان کی افادیت وغیرہ کے گرد گھومتی رہی تھی اور یقیناً مجھ جیسا کم علم شخص آپ کے گرانقدر خیالات سے بڑا مستفیض ہوا تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے دورانِ گفتگو میں اپنے ایک تازہ افسانہ "جگنو تارے" کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ نے دراصل اس افسانہ کی شکل میں ایک تجربہ کیا ہے۔ اب جب یہ افسانہ چراغِ راہ کے سابقہ شمارے میں سامنے آگیا ہے اور میں نے دو تین بار اسے پڑھکر ایک رائے قائم کی ہے تو بہتر سمجھا کہ اسے آپ کے سامنے بھی رکھ دوں۔

میں ادب سے بہت ہی معمولی تعلق رکھتا ہوں، تاہم ایک طالب علم کی حیثیت سے مختلف اصنافِ ادب پر غور و فکر کے بعد ایک رائے

قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کی اس تخلیق پر کچھ لکھنے کی جسارت فی الحقیقت اُسی دن کی بے تکلفانہ گفتگو سے ہوئی ورنہ بار بار مجھے خیال آتا ہے کہ مبادا میری طرف سے کوئی گستاخی ہو جائے۔

اِس افسانہ میں جو سب سے بڑی خوبی مجھے نظر آتی ہے وہ یہ کہ آپ شروع سے آخر تک ایک سماں باندھنے میں نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوئے ہیں جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ پلاٹ آپ کے ذہن میں اچھی طرح پلنے کے بعد صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوا ہے اور پھر اس میں آپ کے مشاہدہ کی گہرائی اور آپ کی منظر نگاری کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس حیثیت سے میں اس افسانے کو آپ کے تمام افسانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔

اب اس میں جو سب سے بڑی کمزوری مجھے نظر آئی وہ ہے "وحدتِ تاثر" کی کمی۔ آپ نے کوشش تو بہت کی ہے، لیکن پورا افسانہ پڑھ چکنے کے باوجود قاری کے ذہن پر کوئی ایک خاص اثر پیدا نہیں ہو پاتا اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے، کہ افادیت کے نقطۂ نظر سے اس افسانہ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ ایک دستاویزی فلم معلوم ہوتا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ افسانہ پڑھ کر قاری کے اندر اُس تہذیب، اُس معاشرت اور اُس سوسائٹی کے خلاف نفرت کے شدید جذبات اُبھرتے جو ایک بے بس عورت کو رقاصہ بنا ڈالتا ہے لیکن وہ آپ کے محاکاتی انداز سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ رقص میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ الحمرا کے پورے ماحول کی عکاسی آپ نے جس طرح کی ہے اُس میں افادی پہلو کم ہے اور لذتیت زیادہ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ذوق، ذوق کی بات ہو مگر میرے ذوق کے مطابق تو یہ اندازِ بیان اُس رقص سے زیادہ اپنے اندر ہی ایک فتنہ رکھتا ہے۔

آپ نے "مولوی" کا رول اتنا خراب پیش کیا ہے کہ اُس سے آپ مولویوں کے پورے گروہ کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھار دیتے ہیں۔ حالانکہ اِس میں ہمارا سراسر نقصان ہے۔ آخر عام لوگ تو ہم کو بھی مولوی ہی کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مسافر خانہ میں مولوی کا جو رول آپ نے دیا ہے آخر وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ جس معاشرہ میں دین کی بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ الامان والحفیظ اُس ماحول میں ایک عام مولوی کر بھی کیا سکتا ہے۔ آپ مولوی کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عام شریف آدمی بھی کیا کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ میں یہ بھی کہوں گا کہ جماعتِ اسلامی کا ایک رکن بھی وہاں پر کیا کر سکتا ہے؟ اب اگر جواب دینے کے انداز میں کوئی مولوی کی جگہ جماعت کے ایک رکن کو کھڑا کر دے اور یہ بتائے کہ وہ پوسٹر لگا تا رہا یا کتاب بیچتا رہا تو آخر اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہوگا۔ یہ اندازِ بیان ہمیں دین سے قریب کرنے کے بجائے دور کرتا چلا جائے گا۔

پھر آپ نے عین رقص کے دوران جو اذان کو "داخل" کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں وہ بالکل ہی بے جوڑ معلوم ہوتی ہے اور پھر اس پر آپ کی تشریح اذان مستزاد۔

آخری بات جو کہنی ہے وہ یہ کہ اختتامیہ جملہ اتنا سپاٹ اور سادہ ہے کہ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس افسانہ میں جذبات کا بھی دخل رہا ہوگا۔ کسی بھی افسانہ کا جملہ اختتامیہ تاثر پیدا کرنے میں بڑا ممد ہوتا ہے۔ اب آپ اِس لحاظ سے غور کریں تو آخر یہ جملہ کیا تاثر پیدا کرتا ہے۔

(باقی صفحہ پر)

Printer & Publisher S. Kazim Ali
Printed at Nazar Printing Press Title Printed at Shan Electric Press KARACHI.

جولائی 1957 قیمت 0-8-0

ماہنامہ کراچی

روشنی ـــــ گرمی ـــــ حرکت

چراغِ راہ

جولائی ۱۹۵۷ء

جلد نمبر ۱۱ - شمارہ نمبر ۷

فہرست

ایڈیٹر:- جیلانی۔ بی۔ اے۔

فی پرچہ: ۸ آنے

سالانہ چندہ: ۵ روپے

مینیجنگ ایڈیٹر:-

خالد احمد صدیقی۔ بی۔ کام

دفتر ادارۂ تحریر:-

مکتبہ چراغ راہ۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

دفتر اشاعت و انتظام:-

دفتر چراغ راہ: فیض محمد فتح علی روڈ۔ کراچی نمبر ۱۔

ستین کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغ راہ، فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

جیلانی بی اے ۔

سوچ بچار

مشرقی پاکستان اس وقت دو بحرانوں سے دوچار ہے ، غذائی اور سیاسی ، اور یہ بحران اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ ان کا نوٹس نہ لینا مجرمانہ غفلت سے کم نہیں ہے ۔

کراچی کی غذائی کانفرنس ، وزیراعظم کی ملتان کی تقریر ، اور وزیراعلیٰ مشرقی پاکستان کے بیان نیز ذاتی معلومات کی بنا پر یہ ..... امر ثوثق تصدیق حاصل کر چکا ہے کہ مشرقی پاکستان کی غذائی صورت نہایت تشویش ناک ہو چکی ہے ۔ اس میں اور قحط میں صرف اتنا فرق ہے کہ قحط میں غذائی کمیابی کے ساتھ خوف پھیل جاتا ہے جو اس کی کیفیت کو شدید تر کر دیتا ہے ۔ جب کہ اس حالت میں ابھی خوف کی فضا پیدا نہیں ہوئی ہے اور امید کی کرن ہنوز باقی ہے ۔ ہم اس پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ گزشتہ سالوں کی غلہ اور اگاؤ مہم کے باوجود ، تجربہ کار محکمۂ راشن بندی کے باوصف قحط کی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی ہے ؟ کامن ویلتھ اکنامک کمیٹی کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اس سال پاکستان میں بائیس لاکھ ایکڑ دھان کی زائد کاشت کی گئی ہے ۔ اور تمام کاشت سے جو دھان حاصل ہو گا وہ سوا بارہ کروڑ ٹن ہے ۔ یہ اعداد اتنے مایوس کن نہیں ہیں کہ ہم کسی قحط کے لئے تیار ہو جائیں ۔ ایک اندازے کے مطابق ہمیں پانچ لاکھ ٹن چاول کی مزید ضرورت پڑے گی ۔ دوسرے اندازے کے مطابق احتیاج اس سے دوگنی ہو گی ۔ اگر ان اعداد و شمار کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اس کمی کو بھی بدل دیا جائے تب بھی تشویش اس نسبت سے نہیں پیدا ہونی چاہیئے کہ جس نسبت سے یہ ذمہ داران انتظام کے الفاظ سے مترشح ہوتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ایک شخص کا پیٹ اعداد و شمار سے نہیں روٹی ہی بھرا جا سکتا ہے ۔ صورت حال کچھ ہی کیوں نہ ثابت کی جا سکتی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان میں چاول کا نرخ چھیالیس روپے من تک جا پہنچا ہے ۔ اب سوال یہ نہیں کہ یہ کیا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟

کراچی میں اعلیٰ سطح کی غذائی کانفرنس اسی تحقیق کے لئے منعقد کی گئی ۔ اس کے نزدیک اس غذائی بحران کے تین بڑے سبب ہیں :

۱۔ افراط زر
۲۔ ذخیرہ اندوزی اور
۳۔ سمگلنگ

لیکن وزیراعلیٰ مشرقی پاکستان کے نزدیک اس بحران میں اضافے کا موجب ذخیرہ اندوزی نہیں ہے اس لئے انہوں نے

غذائی کانفرنس کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا کہ ذخیروں کے منہ جبر و قوت سے کھولے جائیں۔ انہوں نے مزید فرمایا۔ ہمارا سابقہ تجربہ شاہد ہے کہ تشدد سے نتیجہ لازماً حسب منشاء نہیں نکلتا۔ وزیراعلیٰ کے نزدیک نرخوں کے بڑھنے کا اصلی سبب اجناس کی کمی نہیں بلکہ افراطِ زر ہے۔

وزیراعلیٰ کے ارشاد کا مدعا پانے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ افراطِ زر کیا ہے؟ آسان زبان میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب ملک کے اندر چیزیں کم اور پیسے زیادہ ہو جائیں تو چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔ معاشیات کی زبان میں اس صورتِ حال کو "افراطِ زر" کی اصطلاح سے واضح کیا جاتا ہے۔ وزیراعلیٰ کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں روپے کی اس لئے ریل پیل ہو گئی ہے کہ بارہ کروڑ روپیہ صوبہ میں ریلیف کے کاموں پر مختلف صورتوں میں خرچ کیا گیا ہے، جو گویا زائد آمدن کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ خارجی تجارتی کاروبار سے مشرقی پاکستان کو اچھا خاصا نفع ہوا ہے، اور یہی وجہ ہے اصل میں افراطِ زر کی، یا بالفاظِ دیگر اجناس کے نرخ میں اضافے کی۔

ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ اس رائے کی کما حقہٗ تنقیح کر سکیں۔ یہ بات اپنے اندر اس لئے بھی وزن رکھتی ہے کہ یہ اس زبان سے نکلی ہے کہ جس کے اختیار میں اس وقت صوبے کا کل انتظام ہے۔ تاہم اس سے یہ تو ہرگز ثابت نہیں ہو جاتا کہ صوبے کی اکثر آبادی کی قوتِ خرید بڑھ گئی ہے۔ صوبے کے ایک طبقہ کی حالت بے شک بہتر سے بہترین ہو گئی ہو گی لیکن کیا اس سے یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ صوبے کے اس سرے سے اس سرے تک جھونپڑیوں کے اندر پھیلی ہوئی آبادی کی حالت بھی بہتر ہو گئی ہے۔ اور وہ اس قابل ہیں کہ چھیالیس روپے من چاول خرید سکیں۔ اگر وہ واقعی اس قابل ہیں تو پھر قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ قحط جہاں جنس کو نایاب بنا دیتا ہے وہاں قوتِ خرید بھی ختم کر دیتا ہے۔ اور اگر جنس کی کمیابی قوتِ خرید میں اضافے سے مطابقت رکھتی ہو تو گرانی کی شکایت ہی عبث ہے۔

وزیراعلیٰ کے نزدیک ذخیرہ اندوزی بحران میں اضافے کا سبب ہو یا نہ ہو، ہم معقول وجوہ کی بنا پر اسے ایک سبب سمجھتے ہیں، اور جہاں پہلے محض نفع خوری کی لذت کے لئے کی جاتی تھی وہاں اب سیاسی وجوہ کی بنا پر بھی کی جا رہی ہے، اور جو لوگ ذخیرہ کرتے ہیں وہ اس کے نتائج و عواقب سے شعوری آگہی رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔

انہی کے ساتھی وہ غدارانِ ملت ہیں کہ جن کی ناپاک معیشت کا تمام تر مدار اپنے ملک کی قوتِ حیات چوری چھپے اغیار کے ہاتھ نہایت سستے داموں فروخت کرنے پر ہے۔ مشرقی پاکستان کی طویل اور جنگلات سے اٹی ہوئی سرحدوں کی نگرانی کسی بڑی سے بڑی فوج سے بھی ممکن نہیں جب تک کہ خود اہلِ ملک اپنے ملک کا درد اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں۔ حالیہ سرکاری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے سالوں کی نسبت سمگلنگ کی شرح میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر پہلے پانچ لاکھ گانٹھیں جوٹ کی سمگل ہوتی تھیں تو اب دس لاکھ ہوتی ہیں گویا اپنے ملک سے محبت میں دوگنی کمی ہو گئی ہے۔ یہ اندازہ صرف دیدہ واقعات کی بنا پر مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نادیدہ طور پر ملک کی جو دولت باہر جاتی ہو گی وہ کتنی ہو گی۔

جن اسباب کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے ان کے علاوہ اتنا ہی اہم سبب وہ سرکاری و سیاسی طبقہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں سارے انتظام کی عنان و نگرانی ہے، اور جس نے محض اپنے مفاد کی خاطر ملکی معیشت کو اس درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم اور لائق اعتناء ملک اور اس کا مفاد نہیں بلکہ اس کا اپنا وجود اور اس کا اپنا مفاد ہے۔ درحقیقت تمام اسباب کی جان یہی سبب ہے اس لئے کہ صرف اسی کی غفلت اور بدنیتی دوسرے اسباب کی موجب بنی ہوئی ہے۔ جب پاسبان ہی آمادۂ خیانت ہو جائے تو گلہ کس سے!

اس کے بعد سیاسی حالت کو لیجئے، اس کا بحران غذائی بحران سے کسی صورت بھی کم نہیں۔ کرشک سرامک پارٹی کو شکست دے کر عوامی لیگ جس طرح برسر اقتدار آئی تھی اس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا یہ تنظیم نہایت مضبوط و متحد ہے، اور اس کی آمد سے صوبے کی سیاسی فضا میں انتشار کی کمی اور انتظامیہ کو استحکام نصیب ہوگا۔ لیکن قلیل ہی عرصہ میں یہ واضح ہونے لگا کہ اس کی صفوں میں متحدہ محاذ سے بھی بڑھ کر انتشار ہے۔ وہاں تو مختلف پارٹیاں اپنے اپنے لیڈر کے تحت اپنی اپنی بڑائی کیلئے کوشاں تھیں۔ یہاں ایک پارٹی میں مختلف لیڈر تھے، اور ہر لیڈر جماعت کو اپنے رُخ پر موڑنا چاہتا تھا۔ پھر ان چھوٹے چھوٹے لیڈروں کے دو دھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی قیادت سہروردی کر رہے تھے اور دوسرے کی مولانا بھاشانی۔ اصل اصل تو یہ تأثر ملتا تھا کہ یہ دونوں قائد ایک دوسرے کے ممدو معاون اور ایک جان دو قالب تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ دکھائی دینے لگا کہ ان کے دائرۂ کار الگ الگ ہیں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ صوبائی حد تک تو مولانا بھاشانی کی چلے گی لیکن ملکی معاملات میں عوامی لیگ کی نمائندگی مسٹر سہروردی کریں گے۔ اس کے بعد اچانک خارجہ پالیسی کے معاملہ پر انکشاف ہوا کہ مولانا بھاشانی صرف صوبائی حد تک ہی قائد نہیں بلکہ ملکی معاملات اور اس کی خارجہ پالیسی کے بارے میں بھی اپنا ایک نقطہ نظر رکھتے ہیں، اور جتنا حق مسٹر سہروردی کو عوامی لیگ کی ترجمانی کا ہے اتنا ہی مولانا بھاشانی کو ہے۔ اگر مسٹر سہروردی مغربی بلاک سے وابستگی کو ناگزیر قرار دے سکتے ہیں تو مولانا بھاشانی اسی حق کے ساتھ اس کے خلاف رائے دے سکتے ہیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان کے کسی حصہ سے بائیں بازو[1] کی نمائندگی اس شدت سے کی گئی ہو۔ لیکن ایک فائدہ اس سے ضرور پہنچا وہ یہ کہ مشرقی پاکستان سے دور رہنے والے مغربی پاکستانیوں کو علم ہوگیا کہ عوامی لیگ کے پیرائے میں کون کون سے عنصر طالع آزمائی کر رہے ہیں۔ مسٹر سہروردی نے اس معاملہ کو جس طرح سمیٹا اس میں ان کے تدبر سے۔ ان کے منصب کو زیادہ دخل تھا، اور جماعتی اختلاف کی یہ خلیج ابھی پوری طرح پٹی نہ تھی کہ علاقائی خود مختاری کی قرارداد سامنے آگئی۔ اس قرارداد کی منظوری میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا بھاشانی تھا۔ انہوں نے یہ سوچے بغیر کہ ان کی جماعت کا ایک قائد پاکستان گیر حیثیت رکھتا ہے اور اس کو ان تمام جماعتی افعال کی جواب دہی مغربی پاکستان میں بھی کرنی پڑے گی جو مشرقی پاکستان میں سرزد ہوئے ہوں، ایک تائیدی مہم چلا دی، اور

---

[1] اس سیاسی اصطلاح سے مراد وہ عنصر ہے جو حکومت کی مستقل پالیسی سے اختلاف رکھتا ہو۔ یہ اصطلاح بالعموم کمیونسٹوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

علاقائی خود مختاری کی تائید میں اس حد تک غلو کیا کہ کسی کے معاملے سے اپنے صوبے کی لاتعلقی کا اعلان کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مغربی پاکستان نے اس کی مخالفت کی تو وہ اس کو ازخود "السلام علیکم" کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس قرارداد نے مسٹر سہروردی کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ یہ موقع ان کے جماعتی تدبر و جرأت کی آزمائش کا تھا۔ اگر وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت کے قائد ہوتے تو وہ سب سے پہلے اپنی جماعتی صفوں کے انتشار کو دور کرتے، بحیثیت وزیراعظم اُن کی پالیسی اور جماعت کی پالیسی کے درمیان جو بُعد و اختلاف پیدا ہو چکا تھا اس کو ختم کرتے، اور اگر وہ اس قرارداد کو اپنے یا پاکستان کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے تو پبلک کی نگاہوں میں اپنی جماعت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے یا تو جماعتی طریقے سے اس قرارداد کو واپس کرواتے یا پھر اپنی پالیسی بدل دیتے اور اس کی کھُل کر حمایت کرتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس قرارداد کی حمایت گویا مغربی پاکستان کے اندر دبے ہوئے صوبائی فتنوں کو آگ دکھا دینے کے مترادف تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ مولانا بھاشانی اور اس کے رفقاء کی موجودگی میں اُن کا جادو نہیں چل سکتا۔ اور اگر ان کو کچھ وقت عوامی لیگ کے نام پر وزارتِ عظمیٰ کے مزے لوٹنے ہیں تو اس معاملے کو خوبصورتی (یعنی منافقت) سے ٹال دیں۔ چنانچہ اس قرارداد کے متعلق جب مغربی پاکستان میں سوالات کئے گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر بات اُڑا دی کہ یہ تو محض سیاسی سٹنٹ یعنی سیاسی چالبازی ہے۔ اور جب مشرقی پاکستان میں پہنچے تو وہاں اس کی پُرزور تائید کر دی۔

لیکن ایسی چالبازیوں سے کبھی سیاسی معاملات سلجھتے ہیں؟ وہ جن ہتھیاروں سے کام لے رہے تھے ان کے جماعتی رفیق اُن کے خود ماہر تھے۔ پھر ان ہتھیاروں سے پبلک کو چکمہ تو دیا جا سکتا تھا لیکن اس میدان کے شہسواروں کی آنکھوں میں کیسے دھول جھونکی جاتی؟ چنانچہ راز کھلتے گئے، پردے اٹھتے گئے، اور دل کی باتیں زبانوں پر آنے لگیں۔ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں جس اختلاف کو زبردستی دبا دیا گیا تھا وہ علاقائی خود مختاری کے مسئلہ پر اُبھر کر پھر سامنے آ گیا۔ اور اب کے جس جارحانہ صورت میں آیا تھا اس کو دبا دینا سہروردی صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ اس پر مسٹر سہروردی نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے جماعت کے اندر سے اپنے حمائتی گانٹھنے شروع کر دیئے۔ ان کو گمان تھا کہ ری پبلکن عوامی لیگ کولیشن سے مرکزی پارلیمنٹ میں ان کو جو اکثریت حاصل ہو گئی تھی مشرقی پاکستان والے اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ لیکن کاگماری کانفرنس نے اس حقیقت کو عریاں کر دیا کہ عوامی لیگ سہروردی صاحب کی آلۂ کار نہیں تھی بلکہ خود سہروردی اس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

کاگماری کانفرنس کے بعد مغربی پاکستان ہمہ تن علامتِ استفہامیہ بن گیا۔ اگر سہروردی اس جماعت کے واقعی رہبر ہیں تو کیا یہ حرکت انہی کے ایما پر ہوئی تھی؟ بعض نے یہاں تک الزام لگایا کہ کاگماری کانفرنس میں سہروردی بہ نفس نفیس شریک تھے۔ لیکن سہروردی کی معنی خیز خاموشی چغلی کھا رہی تھی کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ جن سانپوں کی انہوں نے اپنی مطلب برآری کے لئے ہمت افزائی کی تھی وہ اب ان کے سامنے اپنے پھن کیوں جھکا لیتے؟ سہروردی صاحب آگ اور پانی میں گھر گئے۔ اگر وہ جرأت سے کام لیتے تو سیاسی بنیاد پاؤں تلے سے نکل جانے کا اندیشہ تھا اور اگر چپ رہتے ہیں تو ہدفِ ملامت بنتے ہیں۔ اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ خوبصورتی (یعنی منافقت) سے معاملے کو ٹال دیں۔ اور اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی جلد سے

جلد فکر کریں۔

سہروردی صاحب خوب جانتے ہیں کہ وہ ایوان کے کھلاڑی ہیں میدان کے کھلاڑی نہیں۔ ان کے لئے ایوان کے جوڑ توڑ کرنا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت میدان کے۔ اور یہیں ان کے اصل جوہر کھلتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشرقی پاکستان اسمبلی کی دوسری پارٹیوں سے ساز باز شروع کر دی۔ ایک ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشک سرامک پارٹی اور ان کے درمیان ایک معاہدہ تک طے پا گیا تھا لیکن ایک غیبی ہاتھ نے عین وقت پر ساری بیٹھک کو الٹ دیا اور معاملہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ مولانا بھاشانی سہروردی کی ذاتی کمزوریوں اور منصبی مجبوریوں سے خوب آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر سہروردی صاحب نے اپنا رسوخ اسمبلی میں بڑھانے کا اقدام کیا تو بھاشانی صاحب نے صرف اسمبلی ہی میں نہیں، جماعت اور پبلک میں بھی ان کے متوازی مساعی شروع کر دیں۔ سہروردی صاحب نے مخلوط انتخاب سے ہندوؤں کے دل جیتے تھے تو اپنی خارجہ پالیسی سے ان کو بھی اور کمیونسٹوں کو بھی دل برداشتہ کر دیا۔ اب ان دونوں کی تائید مولانا بھاشانی ایک نیا محاذ[1] قائم کر کے حاصل کریں گے۔ گویا وہ دھڑے بندی جو پہلے صرف سیاسی بصیرت ہی سے معلوم کی جا سکتی تھی اب ظاہر کشمکش کی صورت میں سامنے آ گئی ہے۔ دونوں دھڑوں کی نگاہ میں اصل مقصد ملکی فلاح نہیں بلکہ ان کی اپنی جیت ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے انہیں اگر ملک دشمن عنصر کی خوشامد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس تک سے گریز نہیں کرتے۔ اور فتح و اقتدار کا یہی جنون ہے جس نے مشرقی پاکستان کو ہلاکت کے اس گھاٹ لا اتارا ہے۔

ہم نے مشرقی پاکستان کی سیاسی حالت کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے اسباب بحران کی ٹوہ سے قصداً اعراض کیا ہے اس لئے کہ ان اسباب کا سراغ خارج میں نہیں ارباب بست و کشاد کے داخل میں ملے گا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر کا محور آدمی ہے۔ واقعات اپنے کسی داخلی قانون کے تحت نہیں بدلتے بلکہ آدمیوں کی سیرت ان کا رُخ موڑتی ہے۔ یہ واقعات نہ تھے جنہوں نے جعفر و جناح کو پیدا کیا تھا، بلکہ جعفر و جناح نے واقعات کو تخلیق کیا۔ ایک نے قوم کی تقدیر بگاڑی تو دوسرے نے بنا دی۔ سیاسی ابتری کے جو بھی اسباب ہوں ایک چیز بہر حال نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں علاحدگی کا احساس روز بروز قوی ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس جذبہ کو تقویت پہنچانے والے دو نمایاں عنصر ہیں۔ ہندو اور کمیونسٹ۔ ایک سیاسی ابتری کا اس لئے متمنی ہے کہ پاکستان کا وجود اس کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور دوسرا اس لئے خواہش مند ہے کہ جس فلسفۂ حیات پر وہ ایمان رکھتا ہے اس ابتری کے آئینے میں اسے اپنے عقیدہ کی سچائی ثابت کرنے کا موقع مل جائے گا۔ دونوں کے منتہا میں فرق ہے لیکن مشرقی پاکستان کی مرکز بیزاری

---

[1] تازہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کرشک سمتی نام سے ایک نیا سیاسی محاذ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کرشک سمتی یعنی کسان پارٹی، اس محاذ سے گویا..... مولانا بھاشانی پاکستان کی سیاست میں صوبائی عصبیت کے ساتھ ساتھ طبقاتی کشمکش بھی داخل کرنا چاہتے ہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد بھی مولانا بھاشانی نہایت معصومانہ انداز استعجاب سے پوچھتے ہیں "کون کہتا ہے کہ میں کمیونسٹ یا ان کا ہم صفیر ہوں؟"

میں مسلسل اضافہ دونوں کے نزدیک حصولِ مقصد کا ضروری ابتدائی مرحلہ ہے۔ چنانچہ یہ کیفیت مختلف ذرائع سے ابھاری اور پیدا کی گئی اور کی جارہی ہے۔ کبھی زبان کے مسئلہ پر، کبھی بنگالی قومیت کے رُوپ میں، کبھی مخلوط انتخاب منوا کر، کبھی علاقائی خود مختاری کی قرارداد کے پیرہن میں، اور کبھی مصنوعی قحط پیدا کر کے !

ہم کو اس سے بحث نہیں کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور اب وقت بھی نہیں ہے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کر کے معاملے کو درست کر لیا جائے۔ اب تو یہ تسلیم کر لینا ہے کہ ہلاکت آفریں جراثیم ہمارے جسدِ ملّی میں سرائت کر چکے ہیں۔ اس وقت اس بحث سے کیا حاصل کہ وہ کیوں اور کیسے گھُسے ؟ اس وقت تو اس امر کی فکر کرنی ہے کہ مشرقی پاکستان موت و حیات کی جس کشمکش سے دوچار ہے اس سے اسے کیوں کر نکالا جائے۔

ہمارے سامنے اس کا اصل علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ پاکستان کے دونوں حصّوں کے درمیان احساسِ بُعد ختم ہو جائے۔ بُعد بجائے خود ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں، البتہ اس کا احساس ختم کرنے کے سلسلہ میں عملی اقدامات ہمارے بس میں ضرور ہیں۔ اور یہ احساسِ بُعد دونوں بازوؤں کے درمیان راست ربط و تعلق ہی سے ختم ہوگا۔ مشرقی پاکستان کی کیفیّت اس وقت ایک ایسے نفسیاتی مریض کی سی ہو چکی ہے کہ جو اپنی سوسائٹی سے منقطع ہو کر صرف اپنے خیالات ہی کی دنیا میں بستا ہو۔ اس کی فکر یک رُخی ہو اور وہ نہ جانتا ہو کہ کسی مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی اس خلوت و جمود کو جب تک جلوت و حرکت سے نہ توڑا جائیگا اس کے غیر صحتمند خیالات میں تازگی اور وسعت نہیں آئے گی۔ جب دونوں خطّہ ہائے ملک کے درمیان ایسے واسطے قائم ہو گئے کہ جن کے ذریعہ خیالات و افکار اور جذبات و احساسات کی موجیں آزادانہ آجا سکیں گی تو ایسے مرض آور جراثیم خود بخود ختم ہو جائیں گے کہ جن کی پرورش اور نمو کا تمام تر انحصار علاحدگی، جمود اور خود پسندی پر ہے۔ دونوں حصّوں کا بے روک اور سہل ربط روشندانوں کا کام دے گا۔ اس سے شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کی وہ تمام فضا دور ہو جائے گی کہ جو محض دُوری کی بنا پر ممکن ہے۔ یہ نہ صرف دلوں کے سارے غبار دھو دے گا بلکہ اس فطری محبّت کو بھی اجاگر کر دے گا کہ جس نے درحقیقت ہزار میل کی دُوری کے باوجود ہم سب کو ایک بنایا تھا۔

ملاپ کے یہ واسطے تین ہو سکتے ہیں: حکومت، صوبائی عصبیتوں سے بالاتر پاکستان گیر جماعتیں اور ادارے (سیاسی اور غیر سیاسی)، اور اسلام۔

حکومت دونوں حصّوں کا درمیانی فصل تو کم نہیں کر سکتی البتہ ذرائع مواصلات میں آسانی اور سہولت بہم پہنچا سکتی ہے۔ یہاں سے مشرقی پاکستان پہنچنے کے تین ذرائع ہیں: ریل، ہوائی جہاز اور بحری جہاز۔ ریل کا راستہ بھارت میں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس ذریعہ سے سفر کرنے کے لئے بھارتی ہائی کمیشن سے ٹرانزٹ ویزا لینا پڑتا ہے۔ ہوائی جہاز کا کرایہ فی کس اتنا ہے کہ ایک اوسط درجے کا آدمی اس کا متحمل نہیں ہے، اور بحری ذریعہ علاوہ کرائے کے اتنا طویل ہے کہ وقت کا معتدبہ حصّہ سفر ہی میں کٹ جاتا ہے۔ صرف ریل کا ذریعہ ایسا ہے کہ اس میں کرایہ بھی کم اور وقت بھی کم لگتا ہے۔ لیکن یہی ذریعہ اپنے اختیار میں نہیں غیر کے

اختیار میں ہے۔ اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے وہ یہ کہ فضائی کرایہ اتنا کم ہو کہ ایک آدمی کو مشرقی پاکستان جانے کے لئے سو بار سوچنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ فضائی سروسیں اتنی زیادہ اور کرایہ اتنا کم ہو کہ ڈھاکے اور کراچی کا فرق صرف میلوں ہی سے معلوم ہو سکے۔ سروسوں کی زیادتی اور کرائے میں کمی سے حکومت کو جو خسارہ ہو وہ بجٹ کی دفاعی مد میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ربط وہ کام کرے گا جو پاکستان کی پوری فوجی قوت سے ممکن نہیں۔ اور ربط کے اس قیام کو دفاعی تدبیر قرار دینا شاعری نہیں حقیقت ہے

آمدورفت کی یہ سہولت پاکستان گیر سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں اور اداروں کے لئے کام کے نئے میدان فراہم کرے گی۔ غیر سیاسی ادارے جہاں ثقافتی اور امدادی کاموں میں معاون ثابت ہوں گے، غرب و شرق کے احساسات میں ہم آہنگی کا ذریعہ بنیں گے.... وہاں سیاسی جماعتیں عوام کے شعور کو صوبائی سطح سے اٹھا کر ملکی سطح پر لے آئیں گی۔ وہ عوام کی توجہ ایسے مسائل کی طرف مبذول کر دیں گی جو دونوں حصہ ہائے ملک سے یکساں تعلق رکھتے ہوں۔ یہ جماعتیں مغرب والوں کو بتائیں گی کہ تمہارے مشرقی بھائی کس درد سے بے چین ہو رہے ہیں، اور مشرق والوں کو بتائیں گی کہ ان کے مغرب کے رہنے والے بھائی کن الجھنوں میں گرفتار ہیں...... ایک دوسرے کے دکھ درد میں باہمی شرکت مشرقی پاکستان والوں پر یہ بات واضح کر دے گی کہ مظلوم صرف مشرقی پاکستان ہی میں نہیں بستے، مغربی پاکستان بھی ان سے آباد ہے۔ اور پاکستان کے سامنے اہم مسئلہ کسی صوبے کی خود مختاری ہی کا نہیں بلکہ اپنی سالمیت کے تحفظ اور مظلوم کشمیر کی آزادی کا بھی ہے۔ اس سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان کی زندگی کمیونزم یا سیکولرزم میں نہیں اسلام میں مضمر ہے، اور اس کے دشمن امریکہ اور برطانیہ ہی نہیں بھارت اور روس بھی ہیں۔ یہ سارے غیر سیاسی ادارے اور سیاسی جماعتیں دونوں حصوں کے درمیان اس روحانی تعلق کو استوار کریں گی جس پر فی الحقیقت پاکستان کی عمارت قائم ہے۔ یہ ادارے اور جماعتیں چمن کی حسین تتلیوں کی مانند امید کے پیغام ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصۂ ملک تک پہنچاتی رہیں گی حتیٰ کہ کسی حصہ کے اندر غلط فہمی یا شک سے یہ شکایت باقی نہ رہے گی کہ اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب یہ احساس ختم ہو گیا تو جانئے کہ ہم خطرے کی زد سے باہر ہیں۔ کیونکہ قومیں ایٹم بم کا زخم سہہ سکتی ہیں لیکن احساسِ بے چارگی کا ہلکا سا چرکہ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

اب یہ سوال رہ گیا ہے کہ اگر ہم کو ایک بن کر رہنا ہے تو ہماری بنائے وحدت کیا ہو؟ وہ کون سا جذبہ ہو کہ جس کو تھام کر ہم تشتت سے بچ سکتے ہیں۔ یہ جذبہ کہ ہم سب ایک ملک کے باشندے ہیں؟ یا یہ جذبہ کہ ہم ایک مسلکِ زندگی کے سالک ہیں؟ اگر ہم اپنی وحدت کی بنیاد جغرافیائی بنیادوں پر رکھتے ہیں تو گویا ہم زندگی کے اس بنیادی سوال کو بے جواب چھوڑ دیتے ہیں کہ آدمی اپنی زندگی کیسے بسر کرے؟ حالانکہ اسی سوال کا جواب حقیقتاً آدمی کے قبلۂ وفاداری کی تعیین کرتا ہے۔ صدیوں کے تجربے کے بعد آدمی نے یہ حقیقت دریافت کر لی ہے کہ بنائے وحدت جغرافیائی حدود نہیں ایک مسلکِ زندگی ہی ہو سکتا ہے۔ جغرافیائی حدود باہمی نزاع ہی کے مواقع فراہم نہیں کرتیں بلکہ وابستگی کے دائرے کو اس طرح تنگ سے تنگ تر کرتی چلی جاتی ہیں کہ وہی تریاق بالآخر سمِ قاتل بن جاتا ہے۔ جبکہ ایک وسیع مسلکِ زندگی اور اپنے مشرب کی محبت مصائب و آلام کی اندھیریوں اور ہر گونہ متغیر حالات کے اندر بھی آدمیوں کو ہر نزاع اور خطرے سے بچا دیتی ہے۔ یہ فلسفہ نہیں واقعیت ہے۔ عہدِ جدید میں سب سے اول کمیونزم نے یہ ثابت کر دکھایا ہے

کہ جغرافیائی حد بندی ایک قوم کے لئے سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ اسی کے بعد ہر ریاست یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا صرف جنگی ہتھیار ہی اس کو خارجی خطرے سے بچا سکتے ہیں یا اس کے ساتھ اسے کوئی مشرب بطور تدبیرِ دفاع بھی اختیار کرنا ہوگا؟ اس کا جواب کمیونزم نے تو دے ہی دیا تھا، امریکہ اور برطانیہ نے بھی واشگاف الفاظ میں اپنے موقف کا اعلان کر دیا۔ ایک کے نزدیک زندگی کا مسلک اشتمالیت تھی تو دوسرا آزاد جمہوری مسلکِ حیات کی دعوت دینے لگا، اور یہی دو نظریاتی دوائر پوری دنیا کو محیط ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دنیا کی اس جدید سیاست میں جغرافیائی حد بندی کہاں گئی؟

ہم مدت ہوئی قدیم جغرافیائی حد بندیوں کے دور سے نکل چکے ہیں۔ اب ہم نظریاتی اور علمی دور میں داخل ہو چکے ہیں اب سیاست کا مدار اس پر نہیں کہ کس کی حد کہاں پر ختم ہوتی ہے۔ اب سیاست کا رُخ اس سے متعین ہوتا ہے کہ کون سا نظریہ غالب و مقتدر ہو رہا ہے۔ اس عہد میں ملکی قومیت کو بنائے وحدت بنانا گویا زمانے سے ایک صدی پیچھے لوٹنا ہے۔ جس عہد میں نظریاتی عقیدوں کے مطابق جتھہ بندی ہو رہی ہو، اور ہر ملک کسی نظریے کا علم بردار بن رہا ہو تب جغرافیائی حدود میں گھٹی ہوئی قومیت کا تصور پیش کرنا کوئی باعثِ فخر نہیں قابلِ ملامت بات ہے۔ اگر چند ملک اپنی ملکی حد بندیوں کے باوجود بغداد پیکٹ کے سے منفی مشرب کے تحت جمع ہو سکتے ہیں تو کیا ہمارے لئے اسلام کے تحت متحد ہونا ممکن نہیں؟

دستور بننے کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ ہم اسلام کے حق میں دلائل پیش کرتے۔ لیکن مخلوط انتخاب نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم کو ابھی اپنے مسلکِ زندگی کے متعلق اطمینان کرنا باقی ہے۔ ہم اس قومی بے یقینی اور تذبذب کے عواقب سے خوفزدہ ہیں۔ اگر ہم نے ایجابی طور پر اسلام کو قبول نہ کیا تو ہم عنقریب اپنے ایک حصہ کو کمیونزم اور دوسرے کو امریکی لادینی جمہوریت کی نذر کر دیں گے۔ مشرقی پاکستان کی صورتِ حال دیکھ کر ہمارا یقین پھر تازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کو افتراق و تشتت سے صرف اسلام ہی بچا سکتا ہے۔

اگر حکومت کی مصلحت اس معاملے میں ہاتھ بٹانے کی متقاضی نہ ہو تو ہم تمام سیاسی و غیر سیاسی اداروں سے اپیل کرتے ہیں کہ باہمی تعاون سے ایک ایسے ادارے کے قیام کی سعی کریں کہ جس کا کام بنگلہ زبان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی وسیع اشاعت ہو، وہ قرآنِ مجید کے ترجمہ[1] کے علاوہ حدیث اور دوسرے دینی لٹریچر کے نشر کا اہتمام بھی کرے۔ اس کا شائع شدہ لٹریچر سستا، بطرزِ جدید اور اس کثیر تعداد میں ہو کہ مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں دین کا نورانی فکر پھیل جائے۔

ہم اس اپیل کو دینی زاویہ نگاہ سے نہیں بلکہ پاکستان کے دفاعی نقطہ نگاہ سے پیش کر رہے ہیں۔ اگر روس اشاعتِ کمیونزم کے لئے اور امریکہ اسکے ابطال کیلئے کروڑوں روپے پانی کی طرح بہا دیتا ہے تو کیا ہم اسلام کے لئے اتنی قربانی نہیں کر سکتے۔ یہ ملک اپنی نظریاتی نشر و اشاعت پر اتنی گرانقدر رقوم خرچ کر کے اسراف نہیں کر رہے ہیں یہ کام درحقیقت انکی دفاعی تدابیر کا ایک حصہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انکا نظریہ جتنا پھیلے گا وہ اتنے ہی مضبوط اور خطرہ اتنا ہی کم ہوتا چلا جائیگا۔ اسی طرح اگر ہم اسلام کی اشاعت کیلئے کچھ خرچ کریں گے تو دنیا میں اس کا جو صلہ پائیں گے وہ تو ظاہر ہے۔ اللہ کے ہاں اس سے بھی بڑا انعام ہمارے لئے موجود ہوگا۔

---

[1] افسوسناک بات یہ ہے کہ قرآن پاک کا بنگلہ میں کوئی مستند ترجمہ موجود نہیں۔

جعفر رضا

امیر تیمور اور ابنِ خلدون

ایک تاریخی ملاقات

چنگیز و ہلاکو کے لائے ہوئے ہلاکت خیز طوفان کے بعد ابھی مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ منگولیا کے صحراؤں کا سرش آسمان ایک بار پھر ایک سخت اور ہولناک طوفان کی آمد آمد کا پتہ دینے لگا۔ تاتاریوں کی فطرت میں قبولِ اسلام کے بعد بھی کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ سن ۷۹۰ھ میں سمرقند کے تخت پر چغتائی خاں کا بیٹا محمود خاں فروکش ہوا۔ منتظمِ امورِ سلطنت کی حیثیت سے اُس وقت ایک ذہین اور مدبر تاتاری امیر اپنی مطلق العنانی کے موقع کا متلاشی تھا۔ تیمور لنگ جو بعد میں امیر تیمور کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنی سیاسی فراست اور حکمرانِ وقت کی نااہلیت کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں سمرقند کا مطلق العنان حکمران بن بیٹھا۔

سلطنت کے داخلی معاملات پر قابو پا لینے کے بعد امیر تیمور نے تاتاریوں کی ایک زبردست جمعیت تیار کی اور اپنے روایتی حزم کے ساتھ دنیا کی فتح کے لئے اٹھا۔ اس وقت عالمِ اسلام کی سیاسی حالت بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی ہر طرف طوائف الملوکی، قحط، فرقہ بندی اور دوسرے داخلی خلفشار کا دور دورہ تھا۔ تیمور کی فتوحات کے لئے راستہ ہموار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سمرقند سے بغداد تک تیمور کو کسی بھی سخت جانی یا مالی نقصان کا سامنا نہ ہوا۔ سن ۷۹۵ھ میں تیمور بغداد میں فاتحانہ داخل ہوا۔ چونکہ شام کا علاقہ مصر کے غلام النسل ترک فرمانروا برقوق کے ماتحت تھا اس لئے تیمور کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سلطان برقوق کی طاقت تیمور سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اور عقل مند تیمور کوئی بھی خطرہ جان بوجھ کر مول لینے پر تیار نہ تھا۔ حتیٰ کہ جب تیمور کے صلح کے ایلچی کو قتل کر کے سلطان برقوق اپنی جرار ترک فوج کے ساتھ مصر چھوڑ کر دمشق کی طرف روانہ ہوا تو تیمور نے پیچھے لوٹ آنا ہی مصلحت سمجھا اور ایران و افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی تک جا پہنچا۔ تیمور کے ہاتھوں دہلی کے تاراج ہونے کا واقعہ اسی دوران میں وقوع پذیر ہوا۔ دہلی ہی میں امیر تیمور کو سلطان برقوق کی موت کی روح افزا خبر ملی۔ وہ نہایت تیزی سے اپنے دارالخلافہ سمرقند کو واپس لوٹا اور مختصر لیکن زبردست تیاری کر کے خراسان، عراق، ارمینیا، آذربائیجان اور ایشیائے کوچک کے علاقوں کو روندتا ہوا سیواس تک جا پہنچا جو مملکت مصر کے صوبہ شام کا ایک اہم مرکز تھا۔ سیواس فتح کر لینے کے بعد ماہ اکتوبر سن ۱۴۰۰ء میں امیر تیمور نے ایک عظیم الشان شامی فوج کو Aleppo کے مقام پر شکست دی۔ اس کے بعد وہ حمص اور بعلبک کے شہروں کو فتح کرتا ہوا شام کے دارالسلطنت دمشق کی طرف بڑھا۔ اُدھر مصر میں برقوق کی وفات کے بعد اس کا لڑکا فاراج (Faraj) تخت نشین ہو چکا تھا۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سلطان برقوق ہی

کے عہد میں اسلام کے مشہور فلسفی مؤرخ ابنِ خلدون کا فرقۂ مالکیہ کے قاضی کی حیثیت سے تقرر ہو چکا تھا۔

جب تیمور کے حملے کی خبر مصر پہنچی تو سلطان فاراج نے فوراً اپنی فوج کو شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ اخیر میں سلطان خود اپنے امیر الامراء اور مقتدر علماء کے ساتھ دمشق کے لئے روانہ ہوا۔ عبد الرحمٰن ابن خلدون بھی سلطان کے ہمرکاب[1] تھا۔ سلطانی فوج کے دمشق پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن امیر تیمور بھی اپنے لشکر جرار کے ساتھ آ پہنچا اور دمشق سے کچھ دور قبات یا البغا کی پہاڑی پر خیمہ زن ہوا۔ سلطانی فوج پہاڑی کے نشیبی میدان میں پڑاؤ ڈالے حملے کی منتظر تھی۔ تقریباً ایک مہینہ تک دونوں فوجیں خاموش آمنے سامنے ایک دوسرے کے حملے کی منتظر رہیں۔ کبھی کبھی حلایہ کے دستوں کے مابین ایک آدھ جھڑپ ہو جاتی جس میں دونوں فریق کا کچھ نہ کچھ نقصان ہوتا۔ اچانک ایک واقعہ نے پورے میدان جنگ کا نقشہ بدل دیا۔

سلطان فاراج کو اچانک یہ خبر ملی کہ دار السلطنت قاہرہ میں اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چند امیر اور شہزادے سلطنت کے خلاف سازش کا جال پھیلا رہے ہیں۔ فاراج کو اپنی مرکزی حکومت صوبائی سلطنت سے زیادہ عزیز تھی۔ چنانچہ ایک فوری مشاورتی مجلس کے بعد رات ہی رات سلطان مع اپنے مخصوص امیروں کے مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی پوری سلطانی فوج میدان خالی کر کے قاہرہ واپس لوٹ چکی تھی۔ دمشق کے باشندوں کو جب یہ وحشتناک خبر ملی تو وہ اپنے انجام کے خیال سے تھرا اٹھے۔ شہر کے اسلام اور علماء نے ابن خلدون کی طرف رجوع کیا جو عادلیہ کالج میں مقیم تھا اور شومیٔ تقدیر کی وجہ سے مصر واپس جانے سے رہ گیا تھا۔ لمبی بحثوں اور طویل مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ امیر تیمور کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ لیکن دمشق کے قلعہ کے والسرائے نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس کے باوجود بھی قاضی برہان الدین ابن مفلح الحنبلی اور چند دوسرے مشائخ امیر تیمور کے پاس گئے اور پر امن طریقے پر شہر حوالے کر دینے کے بدلے امن اور جان بخشی کا وعدہ لے آئے۔ دوسری مرتبہ بڑے پیمانہ پر گفت و شنید کیلئے ایک وفد بھیجا گیا جو اس خوشخبری کیساتھ واپس آیا کہ امیر نے حلفیہ طور پر دمشق کے باشندوں کو امن و امان کا وعدہ دیا ہے بشرطیکہ وہ دوسرے دن غیر مشروط طور پر شہر حوالہ کر دیں ——— قاضی برہان الدین جو اس وفد کا بھی قائد تھا، ابن خلدون سے ملا اور اُسے بتایا کہ اسکی غیر معمولی شہرت امیر تیمور کے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہے اور وہ اسکی دمشق میں موجودگی کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسی رات ابن خلدون کی موجودگی میں جب دمشق کی جامع مسجد میں صلح کے سوال پر ایک عام جلسہ منعقد ہوا تو ایک بڑی جمعیت نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور مرنے مارنے پر تل گئے۔ صبح ہوتے ہوئے پورا دمشق جنگ کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ ابن خلدون نے جب شہری امن و امان کے علاوہ اپنی زندگی بھی خطرے میں دیکھی تو اس نے بذاتِ خود تیمور سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ بڑی دقتوں کے بعد اُسے فصیل شہر سے باہر جانے کی اجازت ملی....

---

[1] ابن خلدون نے اپنی مشہور زمانہ تاریخی تصانیف کے ساتھ ایک خود نوشتہ سوانح حیات بھی ترتیب دی تھی۔ جو اس کی وفات سے چند سال قبل تک کے حالات پر مشتمل ہے ۱۸۶۷ء میں ابن خلدون کی مشہور تاریخی تصنیف جو خصوصاً عرب اندلس اور عموماً اس وقت کے عالم اسلام کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات پر مشتمل ہے۔ بلاق (BULAQ) سے سات جلدوں میں شائع ہوئی۔ ساتویں جلد میں چند ابواب مصنف کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں جو ۱۳۹۵ء تک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ابن خلدون کی اس نامکمل خود نوشتہ سوانح حیات کا بقیہ حصہ دو مختلف نسخوں پر مشتمل استنبول کی ایا صوفیہ لائبریری اور احمد افندی کے کتب خانہ میں ۱۹۵۲ء تک گمنامی کی تاریکی میں پڑا رہا۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر فیشل (W. J. FISCHEL) نے بڑی کاوشوں سے دونوں نسخوں کا مقابلہ کر کے، اس کا ایک حصہ عربی سے انگریزی میں منتقل کر دیا۔

... نے ... ابن خلدون کی ملاقات ... دمشق کا ... شاہ ملک سے ہوئی ... عزت و توقیر
کے ساتھ فلسفی مؤرخ کو امیر کے خیمہ تک لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد امیر کے اذنِ باریابی کے ساتھ ساتھ ابن خلدون کا نام "مغربی مالکی قاضی" کے لقب کے ساتھ نقیب نے پکارا اور ابن خلدون مع شاہ ملک کے شاہی خیمہ میں داخل ہو گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد امیر تیمور نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا جسے ابن خلدون نے بڑے احترام سے بوسہ دیا اور امیر کے اشارے پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ خیمہ منگول سرداروں سے بھرا پڑا تھا۔ امیر تیمور نے ابن خلدون سے بات چیت کرنے کے لئے مترجم کی حیثیت سے حنفی فقیہ خوارزم عبدالجبار ابنِ نعمان کو طلب کیا۔ ابن خلدون سے اس کے عہدے اور مصر کے ترکی النسل سلطان سے تعلقات پر سوالات کر لینے کے بعد امیر نے اس کی جائے پیدائش پوچھی۔ ابن خلدون کے جواب "اندرون مغرب" پر اس خاص لفظ کی تشریح چاہی۔ جواباً ابن خلدون نے بتایا کہ افریقہ اور برقہ کا علاقہ اندرون مغرب کہلاتا ہے جب کہ زناتہ اور تلمسان، مغربِ وسطی اور فیض اور مراقش کا علاقہ "انتہائے مغرب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تیمور نے مزید سبتہ اور سجل ماسہ کے متعلق سوال کیا اور جواب سے مطمئن ہونے کے بعد ابن خلدون سے مغربی ممالک پر ایک مبسوط تاریخ مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ ابن خلدون نے سر جھکا کر تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا۔ امیر کے اشارے پر ایک تاتاری خادم نے ابن خلدون کو ایک عجیب غذا پیش کی جسے تاتاری رستا کہتے تھے۔[1] ابن خلدون نے اس نعمت کو بہت پسند کیا اور مترجم کے ذریعہ امیر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

ابھی تک ابن خلدون کا اپنی عزت و جان کے متعلق خوف زائل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دن پہلے شافعی قاضی صدرالدین المناوی کو امیر نے صرف اس لئے گرفتار کر لیا تھا کہ وہ مصریوں سے زر فدیہ وصول کرنے کا باعث ہو سکے۔ چنانچہ اس واقعہ کے پیش نظر ابن خلدون اپنی گفتگو میں تمام تر احتیاط اور ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس نے امیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ امیر سے ملاقات کرنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ تیمور نے جب وجہ پوچھی تو ابن خلدون نے چاپلوسانہ انداز میں بتایا کہ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کا سب سے بڑا حکمران ہے اور اپنی عظمت میں اسکندر یونانی اور سیزر رومی سے کسی طرح کم نہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ "اندرون مغرب" میں نجومیوں اور رمالوں کے ذریعہ سن چکا تھا کہ بہت جلد مشرق سے ایک عظیم حکمران اٹھے گا جو آندھی کی طرح تمام دنیا پر چھا جائے گا۔ تیمور ابن خلدون کی اس تعریف پر مسکرا پڑا۔ اور ایران کی قدیم تاریخی شخصیتوں پر اس فلسفی مؤرخ سے کافی دیر بحث کی۔ بحث کے دوران ابن خلدون پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ امیر کا مطالعہ تاریخ کافی وسیع اور مستند ہے۔ ابن خلدون نے بھی الطبری کے حوالوں اور اپنے فلسفیانہ نکتوں سے امیر پر کافی گہرا اثر ڈالا۔ اس بحث کے بعد دونوں کی گفتگو ختم ہوئی اور ابن خلدون کو مہمان کی حیثیت سے ایک پر تکلف خیمہ میں پہنچا دیا گیا۔

دوسری صبح جب ابن خلدون بیدار ہوا تو اسے شہر کے پُر امن فتح ہونے کی خبر ملی۔ امیر تیمور نے فتح کے بعد جابیہ دروازے

بقیہ از سابق صفحہ: ابن خلدون اور تیمور لنگ" کے عنوان سے کیلی فورنیا یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ یہ ترجمہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ امیر تیمور کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا اس سے ازالہ ہوتا ہے۔ ابن خلدون کی غیر متعصبانہ اور حقیقت پسند نظر جہاں تیمور کی بربریت کا اظہار کرتی ہے وہاں یہ اس کی قابل ستائش خوبیوں کا بھی اعتراف کرتی ہے۔

[1] ابن خلدون اور امیر تیمور مرتبہ و مترجمہ فسچل

کے قریب، مقبرۂ منجق کے پاس زعماء و علماء شہر کو خلعت تقسیم کیا۔ ادھر ابنِ خلدون نے اپنے شہری گھر میں بند ہو کر شب و روز کی محنت کے بعد تاریخِ مغرب مرتب کی اور امیر کی خدمت میں پیش کیا۔ امیر نے فوراً اپنے معتمد کو تاریخ کے منگولیا زبان میں ترجمہ کے لئے حکم دیا۔ اسی دوران میں قلعہ دمشق سخت محاصرہ کے بعد فتح کر کے امیر کے حکم سے مسمار کیا جا چکا تھا۔ قلعہ کے باشندوں سے امیر نے زرِ فدیہ کا مطالبہ کیا جو اُن کے جائداد مال و اسباب کی ضبطی کے حکم کی صورت میں پورا ہوا۔ انہی باشندوں میں ایک عباسی شہزادہ الحکم کے خاندان سے تھا جس کے نام پر مصر کے ترکی الاصل سلطان حکومت کرتے تھے۔ اس شہزادے نے امیر تیمور سے اپنے اسلاف کی روائتی خلافت کا مطالبہ کیا۔ امیر تیمور نے وعدہ کیا کہ اگر علماء و فقہا نے اس کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ اپنی تمام طاقت سے شہزادے کے خلافتی حقوق دلوائے گا۔

دوسرے دن امیر کے خیمہ میں علماء و فقہا کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں ابنِ خلدون بھی شامل تھا۔ سب سے پہلے عباسی شہزادے نے اپنی خاندانی خلافت کے حق میں دلیل و برہان کے انبار لگا دیئے۔ اور اخیر میں ایک حدیث کا حوالہ دیا جس کی رُو سے قیامت تک خلافت کا عہدہ عباسیوں کے ہاتھوں میں رہنا ثابت ہوتا تھا۔ اس کے جواب میں پہلے قاضی برہان الدین نے ثابت کیا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ ابنِ خلدون نے فوراً اس خیال کی تائید کی۔

امیر تیمور نے پھر عباسیوں کی خلافت کی جدوجہد کے متعلق چند سوالات براہِ راست ابنِ خلدون سے کئے۔ ابنِ خلدون نے نہائت عالمانہ انداز میں عباسیوں کے مسندِ خلافت پر قابض ہونے کی تاریخ سے ہلاکو کی تباہیٔ بغداد کے عہد تک تبصرہ کیا۔ خلافت کے نسلی امتیاز پر ابنِ خلدون نے شدید نکتہ چینی کی۔ اور اجتہاد کو مسئلہ خلافت کا اوّلین اصول بتلایا ساتھ ہی ساتھ اس نے امیر کے سامنے ان تفصیلات کو بھی بیان کیا جس کا تعلق عباسیوں کا علویوں کی آڑ لے کر مسندِ خلافت تک پہنچنے کا تھا۔ تمام علماء و حکماء شہر نے اپنے بیانات خلافت کے جمہوری اصولوں کے حق میں دیئے۔ مذاکرہ کے خاتمہ کے بعد امیر تیمور نے عباسی شہزادہ کو ان الفاظ کے ساتھ رخصت کیا: "تم نے ابھی ابھی اپنے دعویٔ خلافت کے متعلق عالمِ اسلام کے چیدہ علماء و حکماء کا مشترکہ فیصلہ سُنا۔ اب تم خود سوچو کہ تمہارا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ خدا تمہاری ہدایت کرے۔" [1]

اس مذاکرہ کے بعد ابنِ خلدون کا قیام کچھ اور دنوں تک بڑھ گیا۔ اس نے اپنی علمی شخصیت سے امیر تیمور کو اس حد تک متاثر کیا کہ امیر ابنِ خلدون کے مصر واپس جانے پر کسی طرح رضامند دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاتاریوں کی رسم کے مطابق فتح کی خوشی میں ابنِ خلدون نے قرآنِ کریم کا ایک قیمتی نسخہ مع "قصیدۃ البردہ" کے امیر کو نذر کیا۔ جواباً رسم کے مطابق امیر نے ابنِ خلدون سے کسی ایسی خواہش کا مطالبہ کیا جو اس کی قوت سے باہر نہ ہو۔ ابنِ خلدون نے فوراً مصر واپس جانے کے ارادہ کا اظہار کیا۔ بڑے پس و پیش کے بعد امیر تیمور نے وعدہ کر لیا کہ وہ دمشق سے کوچ کرنے کے وقت اس تجویز پر غور کرے گا۔ امیر کی اس غیر متوقع

---

[1] "ابنِ خلدون اور تیمور لنگ" مرتبہ والٹر جے فسچل۔

مہربانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابنِ خلدون نے ان حفاظ، عالموں اور معزز شہریوں کا امن نامہ بھی تحریر کرا لیا جو سلطان مصر کی فوج سے الگ ہو کر دمشق میں رہ گئے تھے۔ دو تین دن بعد جب امیر تیمور نے اپنی فوجوں کو دمشق سے واپسی کا حکم دیا تو ابنِ خلدون نے امیر کو اپنی واپسی کے متعلق وعدہ کی یاددہانی کرائی۔ طوعاً و کرہاً امیر نے اجازت دے دی۔ رخصتی مصافحہ کے وقت امیر تیمور نے بطور نشانی ابنِ خلدون کی تیز رفتار گھوڑی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن ابنِ خلدون نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ اور گھوڑی امیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دی۔ لیکن جب ہفتوں کے کٹھن سفر کے بعد ابنِ خلدون قاہرہ پہنچا تو اس کے دوسرے دن سلطان مصر کے ایلچی براستے امیر تیمور نے ایک گراں رقم ابنِ خلدون کو یہ کہہ کر حوالہ کی کہ یہ امیر نے گھوڑی کی قیمت کے طور پر بھیجی ہے۔

ابنِ خلدون نے امیر تیمور کی یہ تاریخی ملاقات (جس کا ایک اجمالی خاکہ اوپر کی سطور میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے) اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ پہلا عرب مؤرخ تھا جس نے تاتاریوں کا ان کے درمیان رہ کر مشاہدہ کیا اور نسلی تعصب اور سنی سنائی باتوں سے ہٹ کر حقیقت حال کا انکشاف کیا۔ ابنِ خلدون کے مطالعہ کے بعد اس غلط فہمی کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے کہ امیر تیمور مطلقاً جابر و قاہر تھا۔ آج تک تمام مؤرخوں نے اپنا سارا زور تیمور کی وحشیت اور بربریت کو اجاگر کرنے میں صرف کیا ہے۔ مؤرخوں کی یہ انتہا پسندی ان کی اپنی شخصی کج روی اور نسلی تعصب کی بنا پر تھی۔ ابنِ خلدون ان علتوں سے پاک تھا گو کہ اس نے تاتاریوں یا امیر تیمور سے متعلق کوئی تاریخی کتاب ترتیب نہیں دی۔ لیکن اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں امیر تیمور سے ملاقات کے تفصیلی خاکہ کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت اور کردار کا بڑے مہذب اور شستہ الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اس کے خیال میں تاتاری اپنی خصلت و جبلت، عادت اور فطری شجاعت میں عربی بدوؤں سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ ابنِ خلدون نے اپنے اُن ہم عصر مؤرخوں پر عدم واقفیت اور جاہلیت کا الزام لگایا جو سحر اور کہانت کو امیر تیمور اور اس کے ساتھیوں کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ اُس نے اُن لوگوں کو تنگ نظر اور متعصب بتایا جو صرف اس لئے امیر تیمور کو برا بھلا کہتے تھے کہ وہ سُنی ہونے کے باوجود شیعوں کے متعلق اچھی رائے اور نیک عمل کا اظہار کرتا تھا۔ ابنِ خلدون کے خیال میں امیر ایک ذہین، مدبر، علم دوست اور علم پرور فرمانروا تھا۔ اس میں علم و ادب کے سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ اس کی فطرت قاہرانہ تھی لیکن وہ ہمیشہ ...... انصاف پسندی کے جوہر سے اپنی اس فطرت کو کچلنے کی کوشش کرتا۔ وہ رحم دل بھی تھا اور سخت دل بھی۔ اس کا کردار تاریخ کے ان اہم کرداروں میں سے ایک ہے جو مختلف اور متضاد اوصاف و عیوب کے حامل ہیں اور اپنی رنگا رنگی شخصیت کی دلکشی کے باعث تاریخ و نفسیات کے طالب علموں کے مبحث کا مرکز ہیں۔

حافظ نذر احمد صاحب
لیکچرار علوم اسلامی، اسلامیہ کالج لاہور
آنریری سیکرٹری پاکستان اورینٹل
کانفرنس لاہور

پاکستان کے مدارسِ دینیہ

(ایک ابتدائی جائزہ)

یہ ایک نہایت ہی دلچسپ اور معلومات افزا مضمون ہے جو ایک ایسے صاحبِ علم کا نتیجۂ تحقیق و کاوش ہے جس کی عمر تعلیم کے معزز مشغلے میں کھپ رہی ہے اور جس کے دل و دماغ میں دینی رجحانات ہمیشہ کارفرما رہے ہیں۔ یہ معلوماتی مضمون پہلی پاکستان اورینٹل کانفرنس (لاہور) میں پیش کیا گیا تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے بالکل ایک نیا موضوع لیا ہے۔ مدارسِ دینیہ جو پاکستان کے تعلیمی محاذ کا ایک بڑا ہی اہم جزو ہیں، ان کا پہلی بار اعداد و شمار جمع کر کے سائنٹفک طریق سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ مقالہ نگار کو جملہ مدارس سے پوری پوری معلومات بر وقت بہم نہیں پہنچ سکیں، لیکن جتنا کچھ کام ہو گیا ہے، بہت ہی مفید ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس خدمت کو سرانجام دیتے ہوئے چند مقاصد پیشِ نظر رکھے ہیں۔ ان کا جوہرِ مدعا یہ ہے کہ مدارسِ دینیہ اپنے آپ کو ایک ہمہ گیر تنظیمی ہیئت کے اندر لائیں اور اجتماعی غور و فکر کے تحت کچھ ناگزیر تبدیلیاں اپنے نظامِ تعلیم میں پیدا کریں جن میں سب سے اہم نصاب کی تبدیلی ہے۔

اس مقالے کو پڑھ کر خیالات میں بے اختیارانہ ایک تحریک سی ہوئی جس کے تحت چند خیر خواہانہ کلمات عرض ہیں،

سب سے پہلے تو میں اس سخت جان دینی نظامِ تعلیم کے حق میں اپنے جذبۂ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال سے برقرار رکھا ہے۔ وہ اشخاص اور ادارے بڑے ہی قابلِ قدر ہیں جنہوں نے اسلام کے بالکل خلاف پڑنے والے نظامِ اجتماعی کے دائرے میں بہت ہی کم آمدنیوں پر دینی تعلیم گاہوں کو چلایا اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کر کے ایک ملی خدمت کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر قابلِ داد ہیں وہ فرزندانِ ملت بھی جنہوں نے دنیوی ترقیوں سے قطعِ نظر کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے زندگیاں کھپا دیں۔ انہی قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔

یہ اعتراف میرے دل میں ہمیشہ رہا اور ہمیشہ رہے گا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے اس دینی نظامِ تعلیم کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور بڑی بے چینی سے یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تعمیری تبدیلیاں جلد از جلد واقع ہونی چاہئیں ورنہ جو کچھ جس ڈھب سے چل رہا ہے، زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ میرے اندر ان سرگرمیوں کے لئے کبھی تنقیص و تحقیر کا جذبہ نہیں رہا، لیکن میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجود ہیں اور اگر ان کو زیرِ بحث نہ لایا جائے تو وہ ہمیشہ موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی اصل مقصد سے اس عظیم الشان کام کو نقصان پہنچا رہی ہے اور مزید نقصان....

پہنچائے گی - میرا جذبۂ خیر خواہی دامن گیر ہو کر تقاضا کرتا ہے کہ میں بزرگانِ ملت کو اُن کمزوریوں کے ازالہ کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کروں کہ وہ اپنے سے ایک ادنیٰ آدمی کی بات سننے کے لئے اونچا ظرف رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تو تعلیم کی تمدنی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسان سازی کے پروگرام میں سب سے پہلے خاندان، پھر مکتب اور پھر معاشرہ کا مجموعی ماحول حصہ لیتا ہے۔ مکتب کے اثرات تربیتِ فکر و عمل میں اس بنا پر بہت زیادہ دخیل ہوتے ہیں کہ یہ ادارہ ہمہ تن اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے۔ اور اس کے اندر طلبہ دن کا ایک بڑا حصہ اخذ و اکتساب میں گزارتے ہیں۔ تعلیم ایک نسل کے نظریاتی و تجرباتی سرمائے کو بعد کی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ متفرق تجربات چونکہ کسی نظریے ہی کے گرد مجتمع اور مترتب ہوتے ہیں اس لئے کسی نظامِ تعلیم میں سب سے بڑی اہمیت نظریے کی ہوتی ہے۔ ہر نظریہ ایک خاص طرز کا کردار پیدا کرتا ہے۔ اس وجہ سے ہر نظامِ تعلیم انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے ایک سانچے کے طور پر کام کرتا ہے۔ پس تعلیم دراصل زندگی کے فلسفے اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اسلوب و فن پر مشتمل ہوتی ہے۔ تعلیم کی تمدنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ درس گاہ بڑے بڑے انقلابوں کی پرورش گاہ ثابت ہوتی ہے، اور معلم ایک چلتے ہوئے نظام کو زیر و زبر کر دینے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

تعلیم کی یہی اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر ہماری تاریخ میں تعمیر و اصلاح کے داعی جب کبھی بھی سیاست کے دائرے میں خوفناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوتے ہیں تو انہوں نے بلا تامل تعلیم کے مورچے سنبھال لئے ہیں۔ بنو امیہ کے دورِ استبداد میں اصلاح پسند عناصر فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈیمیوں کو قائم کیا اور ان کے ذریعے نوجوان طاقت کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریۂ حق اور نظامِ خیر و فلاح کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایسا علمی تحقیقی لٹریچر تخلیق کیا جو معاشرہ کے مجموعی ماحول پر تادیر اثر انداز ہوتا رہے۔ اسی طرح تاتاریوں کی تاخت کے بعد جب دوسرا بڑا دھکا تعمیری رجحانات کو پہنچا تو اسکے ردِ عمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظامِ تعلیم و تربیت تھا جس کا اصل منشا یہ تھا کہ ناساز گار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دیئے جائیں جن میں سچی خدا پرستی، دنیا سے بے نیازی، ایثار و قربانی، حسنِ خلق اور دعوت الی اللہ کا ولولہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایۂ محفوظ جمع کرنے کا ایک عبوری وقفہ گزارا جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں تو اس سرمائے کو اجتماعی دائرے میں کھپایا جائے۔ مگر بدقسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصود سے تغافل کا موجب بن گیا اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے انہدام کے بعد جب نظامِ حیات کی باگ ڈور پوری الحاد اور سیکولرزم کے قبضہ میں چلی گئی تو دعوتِ اسلامی کے علمبردار مسجدوں اور حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے اپنے طرزِ خیال کے کارکن تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین و احساس کے

وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور ہماری دینی درس گاہیں فقط خطیب، مناظر، مفتی اور محدث پیدا کرنے میں لگ گئیں۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اوّلاً ہمیشہ ایک انقلابی و تعمیری رجحان کے تحت رُونما ہوتی رہیں اور ان کا منشا نظامِ حق کے ایسے علمبردار پیدا کرنا تھا جو نظریۂ اسلامی کے امانت دار ہوں اور دنیوی مفاد کو تج کر رضائے الٰہی کے لئے انقلابی تحریک بپا کرنے میں موزوں وقت پر حصہ ادا کر سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جب کہ حق و باطل کی کش مکش زوروں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، ہمارے دینی مراکزِ تعلیم اس معرکے کی پشت پناہی کرنے اور اس میں بہترین افراد سے کمک پہنچانے کے بجائے اُلٹا اس میں مزاحم ہو رہے ہیں ——— الا ماشاء اللہ!

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دینی مدارس کی تدریج میں جمود آگیا ہے اور یہ زندگی کے اسلامی نظریہ و اسلوب کی تعلیم سے طلبہ کو کما حقہٗ مالا مال کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔ پیش آئند دور اور اجتماعی ماحول کی ضروریات کے مطابق ذہن و کردار کی تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ بس اب کسی تامل کے بغیر اس تعلیمی نظام کار پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس پر اگر اس نظام کے کار پردازوں میں سے کچھ بھی تعداد غور و فکر کے لئے تیار ہو تو چار نکات ایسے ہیں کہ جن کو پیشِ نظر رکھ کر دینی مدارس کی موجودہ ہیئت میں تغیر پیدا کرنا چاہیئے۔

ہماری دینی درس گاہوں کے کار پرداز پہلا نکتہ یہ سامنے رکھیں کہ انہیں زندگی کے سیاسی و معاشی مسائل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہیں دینی ہے بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظامِ زندگی کی تعلیم دینی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے سے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقائد اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، انفرادی اخلاق و آداب کا ایک ضابطہ اور اس کے متعلق واعظانہ تلقینات، فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ و مجادلہ طریقِ فکر اور مسلمانوں کے پرسنل لاء کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی ذہن سے قانونی تیاری، بس ان چیزوں پر ہمارے دینی مدارس کا نظامِ تعلیم مشتمل ہے۔ یہ دینی نظامِ تعلیم برسوں کی کاوش کر کے بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالمگیر پیمانے پر زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکے، جس کے پاس اعلیٰ درجہ کے عقلی معیارات موجود ہوں اور جو ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکے اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لے۔

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ عرض ہے کہ کسی بھی نظریہ و فکر کے لئے صرف ایسے افراد کارآمد ہوتے ہیں جو فعال اور متحرک ہوں اور اپنے نظریات کی برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں۔ مگر ہمارے نقشۂ کار میں کوئی ایسی کوتاہی موجود ہے کہ ہم اسلام کی علمبرداری کے لئے برسوں سے ایک ہی ڈھب کا جو کردار پیدا کر رہے ہیں وہ فعال اور متحرک اور ذہنی و فکری برتری کا شعور رکھنے والا

ہیں، ، ، عدم توجہ، غیر سیاست پسند، جامد، منفعل، عمل، یاس زدہ، پسپائی پسند اور منفیت کیش ہے۔ یہ اتنے سارے سخت الفاظ خدا شاہد ہے کہ کسی جذبۂ نفرت و تنقیص سے نہیں کہے جا رہے، بلکہ امرِ واقعہ کو چونکہ ان کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا اس لئے بڑی دردمندی سے عرض کئے جا رہے ہیں۔ آپ خود جائزہ لے کر دیکھیں تو قلیل سی ایک تعداد کو چھوڑ کر دینی مدارس کے پیدا کردہ انسان کو ہم زندگی کے اجتماعی ہنگاموں سے بالکل منقطع پاتے ہیں۔ وہ موجوں کی کشاکش سے ہٹ کر دور ساحل پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ مخالفِ اسلام رجحانات اور انہیں لے کے چلنے والے با اثر طبقات سے مرعوب اور ان کے مقابلے میں کسی قدر کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔ وہ باطل اور بدی سے دور رہنا چاہتا ہے مگر اس سے پنجہ آزمائی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مشاغل کے ایک محدود سے دائرے میں پناہ گزیں ہے۔ کاش کہ ہماری دینی درسگاہیں اس حقیقت کو محسوس کر کے اپنے نظامِ کار کو بدل ڈالیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لئے جدوجہد کرنا اگر مطلوب ہو تو ہمیں ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو دورِ حاضر کے ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے۔ دورِ حاضر کے ذہن کو اپنی قوم کے دائرے کے اندر بھی اور وسیع تر بین الاقوامی دائرے میں بھی مخاطب اور متاثر کرنے کے لئے شرطِ اول یہ ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اس کے علمی و معاشرتی پس منظر کا احاطہ کیا جائے، وہ جس طرح کی کشمکش سے دوچار ہے اس کا پورا پورا اندازہ ہو اور اس کے سامنے آج جو مسائل جس شکل میں آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ استدلال موجود ہے اس سے داعی باخبر ہو۔ یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلبہ میں نہیں پیدا کر سکتیں جب تک کہ وہ جدید فلسفہ و نفسیات اور سیاست و معیشت کے علوم سے انہیں مالا مال نہ کریں اور مغربی نظامِ حیات کا اسلامی نظامِ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرا دیں۔ اس مقصد کو مروجہ نصاب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔

عجیب بات ہے کہ بار بار ملت کے اصحابِ نظر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ایک بڑی تبدیلی ہونی چاہیئے مگر ہم درسِ نظامی کے چکر سے نہیں نکل سکتے اور نہ اس کے تنگ سے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں..... "درسِ نظامی بڑی ذہنی کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ بڑی شے ہے مگر حالات و ضروریات نے ایسی نئی مانگیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کو پورا کریں تو جمود چھایا رہے گا۔ زمانہ آگے آگے دوڑتا جائیگا اور ہم پیچھے ہی پیچھے گھسٹتے رہینگے۔ ہم پیچھے گھسٹنے والوں کی آواز آگے دوڑنے والی منحرف طاقتیں کبھی نہیں سنیں گی۔ ان کو متاثر کرنے کے لئے ان کے ہمدوش ہو کر مسابقت کرنا ضروری ہے۔

آج اگر ایک داعیِ حق نظریۂ ارتقاء کو نہیں جانتا، اگر وہ ضبطِ ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے، اگر وہ تجزیۂ نفس کے مختلف مدارسِ فکر سے بیگانہ ہے، اگر اسے مارکسزم سے آگاہی نہیں ہے، اگر وہ جدید فلسفۂ تاریخ سے تعارف نہیں رکھتا، اگر اسے بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں اور عبادتوں اور

اخلاقی ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے۔ حال یہ ہے کہ عمرانیات اور دنیا کے طبعی جغرافیے سے بھی ہمارا دینی نظامِ تعلیم طلبہ کو بقدرِ ضرورت واقف نہیں کرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہماری کمزوری کی حد یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ افراد اس زبان اور ان اصطلاحات اور اسالیب سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو اس دور کے ذہن کے لئے مؤثر ہیں۔ انگریزی تو انگریزی ہم ادبی معیار کی اچھی اُردو سے بھی طلبہ کو آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔

چوتھا نکتہ یہ قابلِ غور ہے کہ کوئی نظامِ تعلیم اسی صورت میں کامیابی سے چل سکتا ہے جب کہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے انسان ڈھال سکے دیتا ہو جو عملاً ایک دورِ تمدن میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہر نظریاتی نظامِ تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر تیار کرنے ہوتے ہیں۔ درس گاہوں سے طلبہ نکلیں تو زندگی زارِ تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے۔ ان میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ تمدن کے کسی نہ کسی شعبے یا ادارے کو چلانے کے اہل ہوں۔ وہ میدان میں آئیں تو نظامِ رائج سے کشمکش کرتے ہوئے بھی معاش کے راستے نکال سکیں۔ زندگی ان کی ضرورت محسوس کرے۔ تمدن میں ان کی مانگ ہو۔ وہ اول تو کسی شعبے میں اچھے لیڈر اور کارپرداز ثابت ہوں، ورنہ کم سے کم اچھے کارکن ضرور ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارا مروجہ دینی... نظامِ تعلیم ایسے افراد تیار کرکے نہیں دے رہا کہ جو صحافت و ادب اور تصنیف و تالیف سے لے کر تجارت و صنعت اور ڈاکٹری، انجینئری اور حساب کاری تک گوناگوں مشاغل کو اپنا سکیں۔ اس وقت کی یہ حالت ہے کہ بارہ بارہ سال تک کی دینی تعلیم پایا ہوا نوجوان ٹائپسٹ تک نہیں بن سکتا کہ وہ حلال کی روزی کما کر اپنے حلقۂ ربط میں زبان و عمل سے دین و عمل کی دعوت دیتا رہے۔ کل اگر یہاں نظامِ اسلامی کو چلانے کے لئے کارکنوں کی مانگ پیدا ہو تو دینی نظامِ تعلیم اس مانگ کو پُورا نہیں کر سکتا۔

ان نکاتِ چہارگانہ کو پیشِ خدمت کر کے مَیں بہت ہی عاجزانہ انداز سے دینی مدارس کے کارپردازوں کی خدمت میں یہ مشورہ رکھتا ہوں کہ وہ کسی ایسے نقشے پر کام کریں کہ طلبہ ان کے ہاں دس بارہ برس میں فارغ ہوں تو وہ ایک طرف اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں اور دُوسری طرف میٹرک یا ایف اے کے درجات کے مساوی انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلیں۔ تاکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان پر پورا میدان کھلا رہے۔ جدید علوم کے نصاب کو جُوں کا تُوں لے لینے کے بجائے اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں ناقدانہ طریق پر مطالعہ کرایا جائے تاکہ مغربی تصورات کی کمزوریاں نمایاں ہوں اور اسلامی تصورات کی برتری کا سکہ ذہنوں پر بیٹھ جائے۔ ایسے کورس تیار کرائے جا سکتے ہیں جو اسلامی اور مغربی تصورات کا ہر دائرہ میں تقابلی مطالعہ اس طرح کرائیں کہ اسلامی تصورات کا اثبات ہو اور مغربی تصورات کی تردید!

اس کے ساتھ ساتھ دینی مدرسگاہوں کے ماحول کو بھی اس جمود سے نکالا جائے جس میں وہ برسوں سے پڑا ہے۔ طلبہ کو سادگی کے ساتھ صاف ستھرے رہن سہن کی تربیت دی جائے تاکہ اُن میں عزتِ نفس کا احساس زندہ ہو اور وہ

کسی نفسیاتی الجھن میں نہ پڑیں۔ اس سلسلے میں مالیاتی نظام کو بھی نئے سرے سے استوار کرنا چاہیئے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ فاضل مقالہ نگار کی تحریک کے بموجب دینی مدارس کے کارپرداز جمع ہوں، کانفرنسیں منعقد کریں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور اجتہادی فراخ دلی سے کام لے کر یکساں خطوط پر نیا نظم استوار کریں اور اپنے مدارس کو باہم دگر مربوط کر دیں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے نظام تعلیم کو ایسی ہیئت پر کھڑا کریں کہ آگے چل کر یہی پاکستان میں سرکاری نظام تعلیم کے لئے نمونہ ثابت ہو۔

(نعیم صدیقی)

مدت سے خواہش تھی کہ ان مساعی کا جائزہ لیا جائے، اور ان کے نتائج ارباب بصیرت کے سامنے پیش کئے جائیں جو مساعی تعلیمی اور تدریسی دنیا میں قیام پاکستان کی اصل غائت اشاعت اسلام اور اسلام کے اصل منشا اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے پاکستان میں جاری ہیں۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں پشاور "موتمر عربی وعلوم اسلامیہ" منعقد ہوئی تھی، اس موقع پر نیاز مند نے ایک مقالہ متعدد ضمیموں کے ساتھ پیش کیا۔ جس میں وہ کوائف، اعداد و شمار اور نصاب جمع کئے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے محکمہ ہائے تعلیم ثانوی تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹیوں میں دینیات، اسلامیات، علوم اسلامی، اسلامک ریلجن نالج اور اسلامک تھیالوجی کے مختلف ناموں سے رائج ہیں۔

پاکستان اورینٹل کانفرنس لاہور کے انعقاد کے وقت خیال پیدا ہوا کہ اس موقع پر ان غیر سرکاری اسلامی مدارس عربیہ کا جائزہ پیش کروں جو انفرادی اور دینی جماعتوں کی کوششوں سے قائم ہیں۔

سوال نامہ اس مقصد کے لئے ۳۰ رنومبر کو سوالنامہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے (۱۱۱) علماء اور اسلامی مدارس کو ارسال کیا گیا، ابتدا میں خیال تھا کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں یہی سو ڈیڑھ سو دینی مدارس ہوں گے، لیکن چند ہی دنوں میں تین صد کے قریب دینی مدارس کے نام اور پتے جمع ہوگئے، اتنے نام اور پتے کیسے حاصل ہوئے؟ یہ ایک طویل داستان ہے، اس سلسلہ میں مختلف کرمفرمائوں نے تعاون فرمایا۔ جن میں اکثر سے کوئی سابقہ تعارف بھی نہ تھا۔

تین صد سے زیادہ سوال نامے (ٹکٹ لگے ہوئے جوابی خطوط کے ساتھ) جاری کئے گئے، پانچ صد کے قریب خطوط لکھے گئے۔ اس وقت تک اُن کے جواب میں ۹۰ مکمل و نامکمل جواب آئے ہیں، اور (۱۲۷۶) صفحات پر مشتمل مطبوعہ روئدادیں وصول ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں یہ "ابتدائی جائزہ" پیش کیا جا رہا ہے۔

بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ پانچ صد سے زائد خطوط کے نتیجے میں اس قدر تھوڑے جواب کیوں وصول ہوئے؟ اس کی بڑی وجہ وقت کی قلت اور کچھ غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں۔ نیز ایک سبب سہل انگاری اور عدم توجہی بھی ہے، جواب آخر وقت تک وصول ہوتے رہے ہیں۔ یقین ہے باقی اصحاب بھی جوابات ارسال فرما دیں گے اور وہ مکمل رپورٹ مرتب کرتے وقت شامل کئے جا سکیں گے۔

جائزہ کے محرکات دینی مدارس کی کس مپرسی اور گوشۂ گمنامی میں ان کا نامعلوم ہونا اس جائزہ کا بڑا محرک ہوا، ———

اہالیانِ مشرقی پاکستان کا اس خطہ کے دینی مدارس سے روشناس نہ ہونا اور مغربی پاکستان کے عوام کا وہاں کے کوائف سے بے خبر ہونا نہ بڑی بات ہے، ہمارے پڑھے لکھے اور بظاہر باخبر افراد خود اپنے ضلع اور شہر کے دینی مدارس سے بھی کلی طور پر بے خبر اور غافل ہیں۔

یہ امر بھی کچھ کم افسوسناک نہیں کہ دینی مدارس میں خود بھی باہمی ربط و ضبط نہیں، اور ان کے نگران و بانیان کے درمیان تعارف و تنظیم کا فقدان ہے ——— اس جائزہ کی ایک اہم غائت یہ بھی ہے کہ اربابِ بصیرت اور اصحابِ خیر کے سامنے ملک کے تمام معلوم مدارس کے نام اور پتے اور ان کے ضروری کوائف پیش کر دیں، تاکہ وہ ان اداروں کی طرف توجہ دیں اور کوئی جماعت یا نیک دل افرادِ ملت ان کی ضروریات اور مشکلات سے باخبر ہو کر اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ ہو جائیں

دینی مدارس کی تنظیم

ملک میں ہر قسم کے اداروں، شعبوں، مدرسوں، کارکنوں اور طلبہ کی تنظیمیں موجود ہیں۔ اگر نہیں تو صرف دینی مدارس کے معلم، متعلم اور منتظمین کی نہیں۔ اگر ایسی فعال جماعتوں کی تشکیل ہو جائے تو ان سے نہ صرف رابطہ و اتحاد کا کام لیا جا سکے گا، بلکہ اصلاحِ احوال اور مقصد میں تقویت بھی حاصل ہو سکے گی۔

دینی مدارس کی کوئی ایسی تنظیمی جماعت، مرکزی دفتر، معلوماتی کتاب، گائیڈ یا ڈائرکٹری نہیں جس سے دینی مدارس اور اساتذہ کے نام اور پتے، اداروں کے حالات و کوائف اور اعداد و شمار حاصل ہو سکیں، اس ترقی یافتہ زمانہ میں ان ضروری اور ابتدائی معلوماتی ذرائع کا فقدان نہایت قابلِ غور مسئلہ ہے۔

دینی تعلیم کی مختلف صورتیں

مشرقی اور مغربی پاکستان میں دینی تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

۱۔ سرکاری نظامِ تعلیم کے تحت دینی تعلیم کا انتظام۔ مثلاً

ا۔ پرائمری اور مڈل کی جماعتوں میں دینیات و اسلامیات کی تعلیم۔

ب۔ محکمۂ تعلیم پنجاب کے سوا تمام محکمہ ہائے تعلیم کے تحت میٹرک میں اسلامیات۔

ج۔ ثانوی تعلیمی بورڈوں کے تحت ایف اے میں اسلامیات، اسلامک ریلیجن نالج اور اسلامک تھیالوجی کے نام سے ایک مضمون۔

د۔ تمام پاکستانی یونیورسٹیوں کی بی اے اور ایم اے کلاسز میں علومِ اسلامی کا مضمون۔

۲ ——— نیم سرکاری انداز کی دو صورتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ مشرقی پاکستان کے جونیئر اور سینئر مدارسِ اسلامیہ

ب۔ ریاست بہاول پور کے مکاتبِ مسجد اور مدارسِ مُکتب، عالم، فاضل اور جامعہ عباسیہ کا ایک مستقل ادارہ۔

۳ ——— درسِ نظامی کے طرز پر غیر سرکاری دینی مدارس اور دار العلوم عربیہ جو انفرادی یا دینی جماعتوں کے تحت قائم ہیں۔

اس جائزہ میں ہمارے پیشِ نظر صرف مؤخر الذکر نیم سرکاری اور غیر سرکاری مدارس ہیں۔

مشرقی پاکستان کے نیم سرکاری مدارس

دینی تعلیم کے اہتمام و انتظام میں مشرقی پاکستان کو اوّلیت اور فوقیت کا درجہ حاصل ہے۔ مشرقی پاکستان کے ہر قصبے اور قریے میں

دینی مدارس قائم ہیں۔ افسوس کہ وقت کی قلت، بُعدِ مسافت اور وسائل کی کمی کے باعث اس ابتدائی جائزہ کے وقت مفصل کوائف جمع نہیں کیا جا سکے۔

درس نظامی کے طرز پر چلنے والے مدارس عربیہ کے علاوہ اس خطہ میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ مشرقی بنگال کے تحت جونیئر اور سینئر اسلامی مدارس قائم ہیں۔ بورڈ کی سابقہ رپورٹ کے مطابق ان کی تعداد حسب ذیل تھی:

جونیئر اسلامی مدارس ۲۶۳
سینئر اسلامی مدارس ۲۹۳

جونیئر مدارس کے دو شعبے ہیں۔ ابتدائی اور داخلی ——— ابتدائی درجہ کا نصاب چار سالہ ہے، ان کے نصاب میں بنگالی، اردو، عربی، حساب، جغرافیہ اور دینیات شامل ہیں ——— داخلی درجہ کا نصاب بھی چار سالہ ہے، ان کے نصاب میں بنگالی، اردو، عربی (صرف و نحو)، فارسی، تجوید و قرأت، حساب اور تاریخ و جغرافیہ شامل ہیں ——— سینئر مدارس کے تین درجے ہیں۔ عالم، فاضل اور کامل ——— عالم کا نصاب چار سالہ ہے۔ فاضل کا ایک سال اور درجہ کامل کا نصاب چار سالہ ہے۔ درجہ کامل کے امتحانات کے نام محدث، فقیہ، ادیب اور مفسر ہیں۔ اس سترہ سالہ نظام تعلیم میں چھبیس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین اور کتب کی تفصیل ضمیمہ نمبر ۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ریاست بہاول پور کے دینی مدارس

ریاست بہاول پور میں طرز نظامی کے قدیم دینی مدارس کے علاوہ متعدد نیم سرکاری دینی مدارس گزشتہ ربع صدی سے جاری ہیں۔ ان مدارس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

۱۔ مکاتب مساجد ۲۔ مدارس تعلیم القرآن ۳۔ مدارس مہذب ۴۔ مدارس رفیق الطلباء ۵۔ مدارس فضلا

ان مدارس میں عربی صرف و نحو، ادب، منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، تفسیر شامل نصاب ہیں۔ ان دینی علوم کے علاوہ درجہ بدرجہ پرائمری، مڈل، میٹرک تک کا نصاب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔

بہاول پور کا سب سے بڑا دینی تعلیمی ادارہ جامعہ عباسیہ بہاول پور ہے۔ اس جامعہ کو علوم دینی اور عربی زبان کے اعلیٰ درجہ کے کالج کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعہ کا بجٹ تخمیناً اسی ہزار روپیہ سالانہ ہے، جو ریاست کے سرکاری خزانہ سے ادا ہوتا ہے۔ جامعہ عباسیہ میں عالم فاضل کے علاوہ علامہ کی کلاسز بھی جاری ہیں۔

جامعہ عباسیہ کے علاوہ ریاست میں مدرسہ خیر العلوم خیر پور، دار العلوم بہاول نگر، مدارس رحیم یار خان، احمد پور شرقیہ، منچن آباد اور منڈی چشتیاں قابل ذکر ہیں۔ ان مدارس کی تعداد، اخراجات، معلمین اور متعلمین کی تعداد ضمیمہ نمبر ۱۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۹۵۷ء کی پہلی ششماہی میں عالم فاضل مدارس میں ۴۳۷۵ اور مکاتب مساجد میں ۲۵۲۱۰ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ مساجد کے یہ مکتب تعلیم بالغاں اور عوامی تعلیم کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان پر سالانہ گرانٹ ۲۵۹۰۰۰ روپے صرف ہوتی ہے۔

ریاست بہاول پور کے اس کامیاب اور ارزاں تعلیمی تجربہ پر کہ پاکستان کے ... [illegible] ... مفید اور احسن

نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس نظامِ تعلیم کو اپنانے سے ملک کے میزانیہ پر بھی کچھ زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا۔

کاش ہمارے اس خطہ کے ارباب اختیار تعلیم پر ناروا قیود و حدود عائد کرنے کے بجائے اس پسماندہ ریاست جیسے ہی وسائل اختیار کر کے عوامی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور ملک کو جہالت کے تاریک گڑھے سے باہر نکال سکیں۔

مدارسِ عربیہ اسلامیہ —— درسِ نظامی کے قدیم انداز پر دینی مدارس مختلف مکاتبِ خیال کے افراد اور جماعتیں چلا رہی ہیں۔ بیشتر دینی مدارس احناف، اہلِ سنت والجماعت، اہلِ حدیث اور حضرت تشیع کے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ مکتب خیال کے اختلافات کے باوجود ہر جگہ نصاب اور علوم و فنون میں کافی حد تک یکسانیت ہے۔ صرف احادیث و تفسیر اور فقہ و عقائد کی چند کتابیں مختلف ہیں۔

دینی مدارس کے نصاب میں عام طور پر مندرجہ ذیل علوم و فنون شامل ہیں:۔

۱۔ قرآنِ مجید حفظ و ناظرہ ۲۔ تجوید و قراءت ۳۔ فارسی ۴۔ عربی (ادب، صرف و نحو، معانی، بیان، عروض) ۵۔ منطق۔ ۶۔ فلسفہ ۷۔ علم کلام ۸۔ عقائد ۹۔ فقہ اور اصولِ فقہ ۱۰۔ مناظرہ ۱۱۔ طب ۱۲۔ ہیئت و ہندسہ ۱۳۔ حدیث اور اصولِ حدیث ۱۴۔ تفسیر اور اصولِ تفسیر۔

لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیرِ اہتمام دار العلوم قاسمیہ میں تفسیر قرآنِ مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کی جماعتیں منتہی طلبہ کے لئے جاری ہیں۔ لاہور کے دوسرے مدارسِ اسلامیہ میں حزب الاحناف، جامعہ اشرفیہ، تقویۃ الاسلام، جامعہ سلفیہ اور جامعہ داتا گنج بخشؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں —— پشاور میں دار العلوم حقانیہ اور جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک اور دار العلوم سرحد، جامعہ اشرفیہ پشاور اہم دینی ادارے ہیں —— لاہور اور پشاور کے بعد مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ دینی مدارس ملتان، سرگودھا اور کراچی میں ہیں۔

قدیم دینی مدارس میں جامعہ محمدیہ (جھنگ) نے اپنے نصاب میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کر کے اصلاح کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ تا دمِ تحریر وصول شدہ اطلاعات کی روشنی میں اسلامی مدارسِ عربیہ کی تعداد مشرقی پاکستان میں ۴۴۳ اور مغربی پاکستان میں ۵۰۰ ہے۔ تین صد مدارس کو سوالنامے ارسال کئے گئے، ۹۰ جواب وصول ہوئے، ان جوابات کی روشنی میں ۵۵ دینی مدارس میں طلبہ کی تعداد ۱۰۹۴۰، اور معلموں کی تعداد ۶۲۵ ہے، اور ان پر ۱۱۴۰۵۳۳ روپیہ خرچ آ رہا ہے۔ ضلع وار تفصیلات آخری ضمیموں میں ملاحظہ فرمائیں۔

نصاب میں اصلاح —— ان مدارس کے نصاب میں داخل شدہ علوم و فنون کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن سات آٹھ سو سال پیشتر جن حالات میں یہ نصاب مرتب ہوا تھا وہ حالات اب بدل چکے ہیں۔ تقاضے مختلف ہو گئے ہیں اور انسانی معلومات و تحقیقات کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہیں۔

اصحابِ فکر و نظر نصاب میں اصلاح اور کتابوں میں تبدیلیوں کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ کچھ اصحاب سبقت فرمانے کی جسارت کریں۔ مروجہ نصاب میں چند امور خاص طور پر توجہ طلب ہیں، اور ان کی اصلاح ضروری ہے۔

بعض فنون اپنی افادیت کھو چکے ہیں، اب ان کی تعلیم چنداں مفید نہیں رہی۔ مروجہ نصاب کی بیشتر کتب ساتویں اور آٹھویں

سا برہان ... یف ہیں۔ مناسب ہوگا کہ اہی علوم وفنون پر فضلا کی جدید تصانیف شامل نصاب کی جائیں تاکہ جدید ترین معلومات سے استفادہ کیا جا سکے۔ نیز جدید مسائل اور عصرِ حاضر کے پیدا شدہ تقاضوں کے مطابق کتب کا نصاب میں شامل ہونا از بس ضروری ہے۔

حرفِ آخر بحالاتِ موجودہ میری تجویز یہ ہے کہ مستقبل قریب میں کسی موزوں وقت پر دینی مدارس کی ایک کنونشن طلب کی جائے۔ اس اجتماع میں حضرات علماء و فضلاء کی خدمت میں ان مدارس سے متعلقہ جملہ امور غور و فکر کے لئے پیش کئے جائیں خصوصاً

۱۔ نصاب میں مناسب اصلاح کا مسئلہ

۲۔ مروجہ نصاب کی قدیم کتب میں مناسب تبدیلیاں۔

۳۔ دینی مدارس کی تنظیم کے وسائل

۴۔ اسلامی مدارس کی ضروریات کا جائزہ اور مشکلات کے حل۔

۵۔ جدید مسائل اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے وسائل۔

۶۔ اسلام اور علومِ اسلامی کی تدریس و تبلیغ کے وسائل۔

۷۔ محکمہائے تعلیم اور یونیورسٹیوں میں علومِ اسلامیہ کے لئے ایک باوقار اور شایانِ شان مقام پیدا کرنے کی تجاویز۔

۸۔ دیگر متعلقہ مسائل۔

ضمیمہ نمبر ۱ :-

سوال نامہ

یہ سوال نامہ متعدد جرائد میں شائع کیا گیا اور تین صد سے زائد مدارس عربیہ اسلامیہ اور علمائے کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔ جواب کے لئے ٹکٹ ڈاک ہمراہ ارسال کئے گئے (۲۸۳) معلوم مدارس میں سے صرف ۹۰ کے جواب وصول ہوئے ہیں باقی کے جوابات کا انتظار ہے۔

۱۔ نام ادارہ

۲۔ مکمل پتہ

۳۔ نصاب درجہ وار کیا ہے (کتابوں کے نام)

۴۔ کس درجہ تک تعلیم کا انتظام ہے؟

۵۔ تعداد طلبہ درجہ وار مثلاً :

قرآن ناظرہ	حافظہ	تجوید و قراءت	فارسی	عربی	مختلف درجے

۶۔ حدیث میں کونسی کتب زیرِ تدریس ہیں؟

۷۔ درجہ حدیث میں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔

۸ ۔ تفسیر قرآن مجید میں کون سی تفاسیر زیر تدریس ہیں ؟

۹ ۔ درجۂ تفسیر میں طلبہ کی تعداد کیا ہے ؟

۱۰ ۔ مدرسہ کی آمدنی کے ذرائع :-

چندہ دوامی ۔ عطیات ۔ صدقہ زکوٰۃ ۔ چرم قربانی ۔ وقف ۔ کوئی امدادی ذریعہ ۔

۱۱ ۔ کل سالانہ آمدنی (اندازاً)

۱۲ ۔ تخمینۂ خرچہ سالانہ

۱۳ ۔ اساتذہ کی تعداد (اگر ممکن ہو تو ان کے اسمائے گرامی)

۱۴ ۔ اساتذہ کا مشاہرہ (کم سے کم ۔ زیادہ سے زیادہ)

۱۵ ۔ مہتمم مدرسہ کا اسم گرامی

۱۶ ۔ انتظامیہ کمیٹی ہے یا کوئی صاحب خیر انفرادی طور پر مدرسہ چلا رہے ہیں ۔

۱۷ ۔ مدرسہ کی مختصر تاریخ (اگر ممکن ہو تو دو ایک صفحہ کی حد تک لکھ دیں) الف سن تاسیس (ب) مقاصد (ج) آئندہ کی سکیم (د) ارتقاء اور تنقید (ہ) معروف اساتذہ (و) ممتاز قدیم طلبہ (ز) قابل ذکر سرپرست (ح) اور کوئی قابل ذکر بات

۱۸ ۔ کیا مدرسہ کے نام کوئی وقف ہے ۔ کس قدر آمدنی کا ہے ؟

۱۹ ۔ اگر کوئی روداد مطبوعہ ہو تو ارسال فرماویں ۔

۲۰ ۔ اگر مطبوعات ہوں تو وہ یا کم از کم اُن کی فہرست

۲۱ ۔ اگر مدرسہ کا نقشہ ، فوٹو یا بلاک ہو ۔

۲۲ ۔ آپ کے علم میں قرب و جوار میں جو دینی مدرسے ہوں اُن کے نام اور پتے ۔

ضمیمہ نمبر ۲ :-

نصاب درس نظامی (دارالعلوم دیوبند) (پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں رائج ہے)

ضمیمہ نمبر ۳ :-

نصاب دارالعلوم تقویت الاسلام لاہور اور اکثر مدارس اہل حدیث ۔

ضمیمہ نمبر ۴ :-

نصاب اسلامی سینئر مدارس ۔ ملحقہ مشرقی بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ (مشرقی پاکستان)

ضمیمہ نمبر ۵ :-

نصاب مدارس عربیہ ۔ زیر نگرانی محکمۂ تعلیم (شعبہ مدارس عربی) حکومت ریاست بہاولپور

(باقی بر صفحہ ۱۳)

اُردن

اُردن ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کی آبادی چار لاکھ سے زیادہ نہ تھی، اس کی زمین بنجر اور پتھریلی تھی جس کا بہت کم حصہ قابلِ کاشت تھا۔ اپنے تمام ذرائع سے اس کو جو آمدنی ہوتی تھی اس سے اس کی کفالت بھی نہ ہوتی تھی اس لئے اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اسے برطانیہ سے ہر سال گراں قدر وظیفہ قبول کرنا پڑتا تھا جس کے عوض میں اس نے فوج کی تربیت اور اپنے فوجی اڈے برطانیہ کی تحویل میں دے رکھے تھے۔ تقسیم فلسطین سے قبل کسی کو شاذ ہی ضرورت محسوس ہوئی ہو کہ وہ نقشہ اٹھا کر اُردن پر نگاہ ڈالے لیکن ۱۹۴۶ء میں تقسیم فلسطین کے ساتھ ہی یہ چھوٹی سی ریاست اُبھر کر نمایاں ہوگئی، اور دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک اس کی تاریخ، حیثیت اور نوعیت کے متعلق معلومات کے تقاضے ہونے لگے۔

اُردن درحقیقت ارضِ فلسطین کا ایک حصہ تھا جو دریائے اردن کے شرق میں واقع تھا۔ اس کی تخلیق چرچل کے ذہن رسا کی رہین ہے اور بقول اس کے یہ ریاست ایک اتوار کی سہ پہر کو معرضِ وجود میں آگئی۔ یہ ریاست محض اپنے وفادار حلیف امیر حسین سابق شریف مکّہ کو ممنون کرنے کے لئے بنائی گئی، جس نے جنگِ عظیم اوّل میں ترکوں سے غداری کر کے انگریزوں کو تقویت پہنچائی تھی۔ اس خدمت کے معاوضہ میں حسین انگریزوں سے ایک متحدہ عرب سلطنت کی سربراہی چاہتا تھا۔ انگریزوں نے حامی بھر لی لیکن فرانس نے سکوت رکھا اور حسین کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ تاہم انگریزوں نے اس کی خدمات کے صلہ میں اس کے لڑکے کو شام کا بادشاہ بنا دیا۔ شام اس وقت فرانسیسیوں کے زیرِ انتداب تھا۔ فرانسیسیوں نے کچھ دیر تک تو اس زبردستی کو برداشت کیا پھر موقع پاتے ہی امیر فیصل کو ۲۴ گھنٹے کا نوٹس دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔ انگریزوں نے اسے عراق کا علاقہ دے دیا، اور اس کے دوسرے بھائی امیر عبداللہ کے لئے فلسطین کے ایک حصہ کو کاٹ کر ایک نئی سلطنت تخلیق کر دی۔ فلسطین کے ان دو حصوں کے درمیان دریائے اردن قدرتی حدِ فاصل کا کام دیتا تھا۔ اس کے شرق میں امیر عبداللہ کی حکومت تھی اور غرب میں انگریزوں کی۔

سنہ ۱۹۴۶ء تک شرقِ اردن کا کاروبار نہایت سکون سے چلتا رہا۔ سوائے اس کے کہ یہاں کی فوج کو انگریزوں کا مشہور فوجی مُدبّر گلب پاشا تربیت دے رہا تھا۔ اس کے کل رقبہ میں صرف دو قابلِ ذکر اور جدید شہر تھے۔ اور آبادی کا بیشتر حصہ صحرانشین بدوؤں پر مشتمل تھا جس کو اس سے کچھ غرض نہ تھی کہ حکومت کس پالیسی پر گامزن ہے اور اس کی سیاسی روش کیسی ہے۔ وہ سال بھر میں جب کبھی بادشاہ کے حضور میں پیش ہوتے اس کے سامنے دست بستہ جھک کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ لیکن اردن کے غرب میں جہاں انگریزوں کی حکومت قائم تھی ایک طوفان نہایت خاموشی سے پل رہا تھا۔ اسرائیلی تمام دنیا کے گوشوں سے کھنچ کر رفتہ رفتہ یہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ ان ... کی

آبادکاری اس قدر منظم تھی کہ عرب چونکے ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے بعد سب دنیا کو معلوم ہوگیا کہ یہودیوں اور انگریزوں کے درمیان مدتِ دراز سے اک مفاہمت خفیہ طور پر طے پا چکی تھی، جس کی رُو سے انگریز ارضِ موعود یعنی فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ عربوں نے یہودیوں کے عیارانہ داخلے کو روکنے کی کوشش کی، بلوے ہوئے، فسادات پھیلے۔ لیکن یہودی اور انگریز اپنے منصوبہ پر اس حد تک عمل کر چکے تھے کہ اب پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بالآخر جب انگریزوں کے انتداب کی میعاد ختم ہونے کو آئی تو معاملے کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان معلق چھوڑ کر چپکے سے رخصت ہوگئے۔ یہودیوں نے اسی رات اپنی حکومت کا اعلان کر دیا، اور عربوں نے اسی لمحہ غیر قانونی اسرائیلی ریاست کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ میدانِ جنگ چونکہ فلسطین کا علاقہ تھا اس لئے سب سے اہم پارٹ اُردن ہی کو ادا کرنا پڑا۔ اسرائیل کی فوجوں کو جہاں سے راستہ ملا وہ عرب علاقے میں گھستی چلی گئیں اور عربوں کو جہاں سے راہ ملی وہ اسرائیل کو دھکیلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بیت المقدس کی گلیاں تک بٹ گئیں۔ شہر کا ایک حصہ اسرائیل کے قبضہ میں تھا تو دوسرا عربوں کے قبضہ میں۔ اس پر اقوام متحدہ حرکت میں آئی اور لڑائی بند کروائی گئی۔ اسرائیل سے عرب علاقہ خالی کرایا گیا، لیکن عرب جہاں تک پہنچ چکے تھے ان کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔

اُردن کے عرب کا جتنا بھی علاقہ عربوں کے قبضہ میں آچکا تھا اس پر فی الفور ایک عارضی نظامِ حکومت قائم کر دیا گیا جس کے صدر مفتی امین الحسینی منتخب ہوئے۔ مصر چاہتا تھا کہ یہی عارضی انتظام مستقل صورت اختیار کرلے لیکن اُردن، جس کی فوجوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا اس کے خلاف تھا۔ اس نے فلسطین کے تمام عرب قبائل کی ایک کانفرنس منعقد کی اور اس میں طے کرالیا کہ یہ علاقہ بجائے الگ مملکت بننے کے ریاست اُردن کا ایک حصہ ہو اور اس کا سربراہ شاہِ اُردن ہی ہو۔ عربوں نے بحیثیت مجموعی اس فیصلے کو ناپسند کیا۔ انہوں نے اس فیصلہ کو رد کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انگریزوں کی تائید کے مقابلے میں ان کی کوئی پیش نہ گئی۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان خطِ متارکہ قائم ہو جانے کے بعد عربوں کی ہجرت وسیع پیمانے پر شروع ہوگئی۔ عرب مہاجرین کے جہاں سینگ سمائے وہیں جا بسے۔ لیکن پناہ کی اصل اور قریبی جگہ اُردن ہی تھی۔ اس لئے سب نے یہیں کا رُخ کیا۔ لیکن اپنی آبادی سے زیادہ تعداد میں آنے والے مہاجرین کا انتظام اردن کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کی اصل آبادی چار لاکھ تھی اور مہاجرین چار لاکھ سے بھی زائد آگئے۔ اقوام متحدہ کی مدد سے صورتِ حال قدرے سنبھلی لیکن جن مبصرین نے عرب مہاجرین کے وہ کیمپ دیکھے ہیں وہ تعجب کئے بغیر نہ رہ سکے کہ انسانوں کے یہ ریوڑ کس طرح عفونت، گندگی اور عسرت کے درمیان اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ایسے گندے ماحول میں صحت مند جذبات کا پیدا ہونا ناممکن تھا۔ یہ مہاجر سراپا ناراضگی، شکایت اور انتقام تھے۔ وہ نہ تو اقوام متحدہ کے ممنون تھے، نہ شاہِ اردن کے۔ وہ دونوں سے نفرت کرنے لگے۔ اقوام متحدہ سے اس لئے کہ اسی کے سربراہوں نے عربوں کے پہلو میں اسرائیلی خنجر بھونکا تھا اور اب زخمی کرنے کے بعد مسیحا بن کر آگئے تھے۔ اور شاہِ اردن کے خلاف اس لئے تھے کہ وہ اس پر ہوسِ ملک گیری کی بنا پر اسرائیل سے صلح کرنے کا الزام عائد کرتے تھے۔ اگر اُردن اسرائیل سے صلح نہ کرتا تو اسرائیل کے پاؤں اکھڑ چکے ہوتے۔

عرب مہاجرین نے پہلے تو اس ہجرت کو چند دنوں کا عارضی ردّوبدل ہی سمجھا اور اس انتظار میں رہے کہ جلد ہی عرب ممالک

متحد ہو کر اسرائیل کے اس سرطان کو نکال باہر پھینکیں گے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور حقیقت زیادہ شدت کے ساتھ کھٹکنے لگی
ان کی مایوسی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ حزب اردن کے سابق الگ عارضی انتظام کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ یہ ان کی جدوجہد کا نشان تھا
ان کا خیال تھا کہ جب اسرائیل نکال باہر کر دیئے جائیں گے تو فلسطین ایک مستقل مملکت بن جائے گا۔ لیکن جب شاہ اردن نے اُسے
اپنی سلطنت کا جزو بنا لیا اور اسرائیل کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا تو ان کے غصے اور ناراضگی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے قومی
لحاظ سے اردن کا جزو بننے سے انکار کر دیا۔ اور اردن کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو فلسطینی کہنے لگے [1]۔ وہ اپنے آپ کو ان
بدوؤں سے برتر سمجھتے تھے کہ جو نہ تو جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے نہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ اور وہ اس موقع کی انتظار میں رہنے لگے
جب وہ اپنے عزائم بروئے کار لانے کے قابل ہو سکیں گے۔

وقت جوں جوں گزرتا گیا عربوں پر واضح ہوتا گیا کہ اسرائیل کا سرطان مسلط کرنے کے حقیقی مسبب انگریز اور امریکی ہیں ٹرومین
نے تو واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اسرائیلی اب قائم ہو گئے ہیں تو قائم رہیں گے اور ان کو اکھاڑنے کی ہر قوت کی مزاحمت کی جائے گی
اور عملاً اس کو مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے اسے ہر طرح سے مسلح بھی کرنا شروع کر دیا بظاہر مغربی قوتوں نے ایک غیر جانبدار
کی سی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کی، اور جب عربوں نے اسلحہ خریدنا چاہا تو ان کی بھی نہایت فراخ دلی سے مدد کا وعدہ کیا لیکن
انہیں ہمیشہ ضرورت سے کم اسلحہ دیا۔ اس دقت کو مصر نے خاص طور پر محسوس کیا۔ اس لئے کہ اسرائیل کی زد پر سب سے زیادہ اسی
کا علاقہ تھا اور جب کبھی جنگ چھڑی اسرائیل کی فوجیں سب سے پہلے اسی کے علاقہ میں گھس آئیں —— اسرائیل کے پاس عمدہ ہتھیار
اور جدید ترین اسلحہ تھے، جس کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر اس سے بہتر نہیں تو کم از کم ویسے ہی ہتھیار درکار تھے۔ جب مصر نے مغربی
طاقتوں سے اپنی ضرورت کے مطابق ہتھیار خریدنے چاہے تو اسے معلوم ہوا کہ اس غرض کے لئے نہ تو اسے زرِ مبادلہ دیا جاتا ہے، نہ
اس کی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ یہی دقت آگے چل کر عربوں کی عام پالیسی موڑنے کا باعث بنی۔

عربوں کے عام سیاسی افکار میں مغرب دشمنی خاص طور پر ابھرنے لگی اور وہ اپنی مصیبتوں کا واحد سبب مغربی طاقتوں کو سمجھنے
لگے۔ اور مصر اس احساس میں قضیہ نہر سویز کے سبب سب سے پیش پیش تھا۔ مصر کی موجودہ انقلابی قیادت کی مغرب دشمنی کوئی جدید
پالیسی نہیں ہے۔ یہ پالیسی شاہ فاروق کی حکومت کی پالیسی بھی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب اس کو پیش کرنے والی شاہی حکومت تھی،
اب برسرِ حکومت عوام کے نمائندے ہیں۔ اب سوال تھا کہ مغربی طاقتوں سے کس طرح گلو خلاصی کرائی جائے اور اس کے بعد کس سے
رشتہ تعلق استوار کیا جائے۔ مغربی دائرۂ اثر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ قریب قریب تمام عرب ممالک اپنے خارجی کاروبار میں
اسٹرلنگ زرِ مبادلہ میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی معاہدے انہیں پابندِ مغرب کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے
ممالک تھے کہ جو مغربی وظائف پر پل رہے تھے، اور اگر وہ یکدم مغربی بلاک سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں تو وظائف کے بند ہو جانے

[1] سابق شاہ اردن امیر عبداللہ اسی سبب سے گولی کا نشانہ بنا تھا اور اس کا قاتل ایک فلسطینی تھا۔

سے جو خلا پیدا ہو جائے گا اس کو کون پورا کرے گا؟ ان وجوہ کی بنا پر اکثر عرب ممالک متذبذب تھے اور وہ کوئی قدم جلدبازی میں نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ اسرائیل کو مٹانے پر متفق تھے لیکن اس کے استیصال کے لئے عملی اقدام کرنے میں اپنی اپنی مشکلات کے سبب ایک پروگرام کے تحت چلنے سے معذور تھے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ مغربی بلاک کے بعد کس سے رشتۂ تعلق جوڑا جائے۔ اس کا قدرتی جواب روس تھا، لیکن ہر عرب حکومت جانتی تھی کہ اسے روس کا اسلحہ بہت مہنگا پڑے گا۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ اسے روس کے ساتھ کاروبار صرف سکے سے نہیں بلکہ دین و تہذیب سے کرنا پڑے گا۔ وہ روس سے محض تجارتی معاہدہ کر سکتے تھے، محض تجارتی، اگر ایسا ممکن ہو۔ مصر کی انقلابی قیادت نے چیکوسلوایا کے ذریعہ گفت و شنید شروع کی۔ روس پہلے ہی سے منتظر تھا، اور معاملہ طے ہو گیا، جس کے نتیجہ میں تمام مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹ بیک جنبش بیدار ہو گئے۔

روسی مصری تعلق کے بعد کمیونزم کو مشرق وسطیٰ میں ایک بہت بڑا حلیف مل گیا۔ مصر کی موجودہ قائدانہ پوزیشن کچھ جمال ناصر ہی سے پیدا نہیں ہوئی، یہ ہر لحاظ سے اس سے پہلے بھی عرب ممالک کا قائد تھا۔ یہ مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا ملک ہے اور جدید تعلیم و سیاست کے لحاظ سے آج نہیں پہلے بھی سب سے پیش پیش تھا۔ دیگر ممالک کو جب کبھی پروفیسروں، انجینئروں اور فوجی مربیوں کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ مصر ہی سے پوری کرتے تھے۔ یہ کارنامہ فقط جمال ناصر ہی نے انجام نہیں دیا۔ انقلابی قیادت نے ثابت کرنے کے لئے کہ عرب قومیت کا وہی مرکز و مرجع ہے البتہ اس کی اشتہار بازی خوب کی ہے۔ مصری روسی تعلق میں دونوں کا فائدہ مضمر تھا۔ روس کو مصری اثر و رسوخ کی آڑ میں مشرق وسطیٰ میں گھسنے کا موقع مل گیا اور مصر کو مغربی بلاک کی نگاہوں میں قابل اعتناء حریف بننے کے ساتھ ساتھ خود عرب ممالک میں نئی وقعت و سربراہی حاصل ہو گئی۔ اس طرح روسی مصری تعلق محض اسرائیل کو مٹانے کے لئے نہ آیا بلکہ اپنے ساتھ کمیونزم اور مصری استیلاء کی الجھنیں بھی لے آیا۔

اس سے پہلے تمام عرب ممالک کے سامنے ایک صاف اور سیدھا راستہ تھا۔ مغربی طاقتوں سے گلوخلاصی اور عرب ممالک کا اتحاد۔ اسی گلوخلاصی اور اتحاد میں ان کے تمام مفادات مضمر تھے۔ لیکن اب یہی صاف اور سیدھا راستہ بلائے جان بنتا جا رہا تھا۔ اگر وہ مغربی طاقتوں کو چھوڑتے ہیں تو کمیونزم کا شکار ہوتے ہیں۔ آپس میں متحد ہوتے ہیں تو مصری آمریت مسلط ہونے کا خطرہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک کی پالیسی اب انہی دو معاملات پر مرتکز ہو رہی ہے۔ ہر ملک ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے کہ جس میں مغربی طاقتوں سے گلوخلاصی اور عربی اتحاد کے مفادات تو حاصل ہو جائیں لیکن ان کی تہہ میں چھپے ہوئے مضرات سے بچ جائیں۔

اردن کے حالیہ بحران کو پیدا کرنے کے ذمہ دار بھی یہی دو مسائل تھے۔ اردن کے مہاجرین یہ باور کر چکے تھے کہ مغرب سے گلوخلاصی اور عرب ممالک کا اتحاد ہی انہیں اپنے گھروں کو لوٹا سکے گا۔ چنانچہ یہ یقین اردن کی سیاسی سطح پر روز بروز نمایاں ہونے لگا۔ حتیٰ کہ انتخابات کا وقت قریب آ گیا۔ شاہ اردن کے قریبی حلقے خوب سمجھ رہے تھے کہ یہ انتخابات اردن کی قسمت کے لئے فیصلہ کن ہوں گے۔ ان انتخابات کے بعد یا تو یہاں پر بادشاہت ہو گی یا مصر نواز جمہوریت۔ شاہ اردن کو مشورہ دیا گیا کہ وہ انتخابات کو فی الحال ٹال دے۔ لیکن اس نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا اور انتخابات کے انعقاد کا حکم دے دیا۔

انتخابات نے اس چیز کو ظاہر کر دیا جو زیرِ سطح کھبلا رہی تھی۔ اکثر نشستیں فلسطینیوں نے جیت لیں اور وزارت پر انہی کا قبضہ ہو گیا۔ وہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق سیاست کا رُخ موڑنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلا کام جو نئی وزارت نے کیا وہ گلب پاشا کی برطرفی تھی۔ یہ گویا انگریزوں سے قطع تعلق کا پہلا قدم تھا۔ لیکن انگریزوں سے قطع تعلق کا صاف مطلب تھا اُردن کی فوجی قوت کی کمی اور سالانہ برطانوی وظیفے کی بندش۔ بادشاہ اس اقدام کے عواقب سے آگاہ تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ گلب پاشا کی برطرفی کے بعد قدرتی طور پر دوسرا مطالبہ انگریزوں سے فوجی اڈوں کا انخلاء تھا۔ انگریز اُردن کو جو سالانہ مدد دیتے تھے وہ انہی اڈوں کا معاوضہ تھی۔ اور اس مدد کا انقطاع گویا کل سلطنت کے کاروبار کو معطل کر دینے کے مترادف تھا۔ توسیع علاقہ سے اُردن کو جو آمدنی ہوئی تھی، مہاجرین کے خرچ نے اس کو برابر کر دیا تھا۔ اور اس سالانہ مدد کی احتیاج بدستور باقی تھی۔ بادشاہ کو بہرحال اس عوامی مطالبے کے سامنے بھی جھکنا پڑا۔ اگرچہ شام، مصر اور سعودی عرب نے وعدہ کیا کہ وہ اس تلافی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس وعدہ کو صرف سعودی عرب ہی نے پورا کیا ہے۔ اب اردن کو آئزن ہاور پروگرام کے تحت امریکہ سے مدد ملے گی۔

یہاں تک تو پروگرام کا منفی پہلو تھا، یعنی انگریزوں سے انقطاعِ تعلق کی تکمیل۔ پروگرام کا مثبت پہلو ابھی باقی تھا۔ اس سلسلہ میں اُردن کی پارلیمنٹ نے حکومتِ شام سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں، اور یہاں تک طے کر لیا کہ اردن اور شام کا تعلیمی نصاب ایک ہو، اور کسٹم اور کرنسی میں یگانگت ہو۔ کسٹم اور کرنسی کا معاملہ ابھی زیرِ غور تھا کہ بحران پیدا ہو گیا۔ اگر یہ معاملہ بھی طے ہو جاتا تو اردن کا سارا معاشی نظام عمان (دارالسلطنت اُردن) سے دمشق (دارالسلطنت شام) منتقل ہو جاتا، اور جس پھرتی سے شاہ حسین نے آج حالات پر قابو پا لیا ہے شاید ممکن نہ رہتا۔ دونوں ممالک یعنی شام اور اردن کو ایک سکیم کے تحت قریب لانے والے تمام تر وہ لوگ تھے جو مغربی بلاک کے کٹر دشمن، روس کے زبردست حامی اور مصر کے اشاروں پر حرکت کرنے والے تھے۔ ان میں عام سیاسی کارکن بھی شریک تھے اور شامی اور مصری افسر بھی۔ عرب ممالک کے اکثر سربراہ اس صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ ان باغیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ وہ لوگ پبلک سے گلیوں اور قہوہ خانوں میں ربط پیدا کر سکتے تھے، لیکن یہ سربراہ اس حد تک نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ اس لئے اس انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے بجائے نیچے کے اُوپر ہی دیکھا، اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے بجائے خارجی امداد کے سہارے کی خواہش کی۔

یہ مادہ جو اندر ہی اندر سرد جنگ کی صورت میں پک رہا تھا قضیۂ نہر سویز کے بعد لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ جونہی اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تمام عرب ممالک کی فوجیں مشترکہ کمان کے تحت اردن اسرائیل سرحدوں پر جمع کر دی گئیں اس لئے کہ مصر کے بعد سب سے زیادہ خطرہ جس کو درپیش تھا وہ اُردن ہی تھا۔ لیکن خطرہ ٹل گیا اور جنگ صحرائے سینا ہی میں رک گئی۔ اُردن نے کچھ دیر توقف کیا۔ جب مطلع صاف پایا تو دیگر عرب ممالک کو اطلاع کر دی کہ اب وہ اپنی فوجیں واپس بلا سکتے ہیں۔ عراق اور سعودی عرب نے اپنی اپنی فوجیں واپس بلا لیں لیکن شام اور مصر کی فوجیں وہیں جمی رہیں۔ یہ فوجیں درحقیقت اُردن کی بادشاہت کا تختہ اُلٹ کر اُسے شام میں ضم کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اُردن کی وزارت نے شام اور مصر سے اس

بارہ میں پوری سازباز کرلی تھی، اور وہ صرف اس موقع کی تلاش میں تھی کہ اُردنی فوج بھی اس کی ہمنوا بن جائے۔ عین اس
موقع پر بادشاہ کو ساری سازش کی اطلاع مل گئی اور اس نے نہایت پھرتی سے فوج میں اپنے جاسوس بھیج کر فوج کو اس خطرے سے
خبردار کردیا۔ پھر ایک روز اچانک جیپ پر سوار ہوکر فوجیوں کے عین درمیان جا کھڑا ہوا اور ایسی پراثر تقریر کی کہ فوج کی ساری
فضا بدل گئی۔ فوج کی فضا بدلتی دیکھ کر بادشاہ نے فی الفور تمام سازشیوں کو گرفتار کرلیا۔ مصری سفیر کو فی الفور اُردن سے نکل
جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن جب تک مصری اور شامی فوج اردن کی سرحدوں پر موجود تھی اس کو ہر آن خطرہ تھا کہ اپنا ہی ملک میدانِ کارزار
بن جائے اس لئے اس نے امریکہ سے فوجی مدد طلب کی۔ امریکہ نے اسی وقت اردن کی آزادی و خود مختاری کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے
ایک جنگی بیڑا روانہ کردیا۔ اس بحران نے چند روز تمام دنیا کے مدبرین کو دم بخود بنائے رکھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ چھوٹی سی بنجر
ریاست اپنے جواں سال بادشاہ سمیت اس بحران سے زندہ و سلامت نکل سکے گی یا نہیں۔ تاہم چند روز کے بعد گھٹاؤں کی سیاہی
دور کی جھلکیاں نظر آنے لگیں اور مغربی بلاک نے شکر کا سانس لیا۔ ان کے نزدیک یہ مغربی بلاک اور کمیونزم کی جنگ تھی جبکہ
ان کے نزدیک یہ مصری آمریت اور ملکی خود مختاری کی کشمکش تھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فتح عارضی ہے یا مستقل کیونکہ جن
عوامل نے اس بحران کو جنم دیا ہے وہ بدستور موجود ہیں اور جب تک ان کے توڑ کا مستقل چارہ نہ کیا جائے گا خطرہ ملتوی تو ہو
جائے گا لیکن ختم نہیں ہوگا۔

بقیہ: پاکستان کے مدارسِ دینیہ - از صفحہ ۲۵

<u>ضمیمہ نمبر ۶:</u>

اعداد و شمار دینی مدارس ریاست بہاولپور - زیر نگرانی محکمہ مدارسِ عربیہ، بہاولپور ڈویژن۔

<u>ضمیمہ نمبر ۷:</u>

مشرقی اور مغربی پاکستان کے دینی مدارس کے اعداد و شمار (ابتدائی جائزہ)۔

<u>ضمیمہ نمبر ۸-الف:</u>

مغربی پاکستان کے دینی مدارس، ضلع وار فہرست حروفِ ابجد کے اعتبار سے۔

<u>ضمیمہ نمبر ۸-ب:</u>

مشرقی پاکستان کے دینی مدارس - ضلع وار فہرست حروفِ ابجد کے اعتبار سے

(پہلی پاکستان اورینٹل کانفرنس منعقدہ ۲۸-۳۰ دسمبر ۱۹۵۶ء میں پیش کیا گیا)

[ضمیمہ ۲ تا ۸ کی تفصیل یہاں نقل نہیں کی گئی جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو، وہ اس پمفلٹ سے استفادہ کرسکتے ہیں]

نعیم صدیقی

غزل

شاداں گزر گئے، کبھی گریاں گزر گئے
جو دن بھی آئے، لے غمِ ہجراں گزر گئے

لائے بجا جو خدمتِ گلزار بس میں تھی
مثلِ نسیم جھاڑ کے داماں گزر گئے

تیری فضاؤں میں بھی نہ ہم کو ملی پناہ
لے، اور آ گئے، منزلِ جاناں! گزر گئے

بالکل عبث تم آئے ہو ساحل پہ بعدِ وقت
جن کی رہی ہے دھوم وہ طوفاں گزر گئے

اس دشتِ آرزو میں نہ رہ تھی، نہ رہنما
تھامے ترے خیال کا داماں گزر گئے!

ذوقِ سفر اب ایک ہی وادی ہے موت کی
کتنے ہی ہولناک بیاباں گزر گئے

یہ چار بول سن لو کہ فرصت ہے دم دو دم
کل روؤ گے کہ کیسے غزل خواں گزر گئے

اکبر صدیقی

غزل

جینے کی ٹھان لی تھی دلِ بے قرار نے
آئی تھی ورنہ موت مجھے بھی پکار نے

کچھ بے خودی سرورِ دل و جاں بنی رہی
کچھ تابِ رنجِ زیست بھی دی انتظار نے

کچھ ہم بھی شکوہ سنجِ دل و جاں نہیں ہوئے
کچھ روک بھی دیا نگہِ شرمسار نے

کچھ اہلِ دل بھی خوگرِ دار و رسن سے ہیں
کچھ حوصلے بڑھا بھی دئیے ہیں بہار نے

کچھ دل بھی حشرگاہِ تمنا ازل سے ہے
کچھ شورشیں بھی دی ہیں غمِ روزگار نے

کرنوں کو آفتاب کی شانہ کئے ہوئے
آئے ہیں ہم بھی گیسوئے دوراں سنوارنے

ادیب یا ماہرِ سیاست کے قول سے بھی ملتی ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول سے بھی ملتی ہے۔ البتہ بحث اس سے ہو سکتی ہے کہ آیا آغا حشر اپنی سوسائٹی کا ایک مثالی فرد تھا یا نہیں تھا۔ ملّا کہتا ہے کہ وہ شرابی تھا، لیکن ملّا بھول جاتا ہے کہ یہ اشعار اسی بندے کے ہیں ؎

رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا!
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

یہ شعر اسی مناجات سے ماخوذ ہے جس کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کیلئے

اللہ اللہ کیا جذبات ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ بخش دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرات! میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ میری تقریر کے عنوان میں ایک ظاہری مغالطہ پایا جاتا ہے اور وہ مغالطہ خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے باعثِ خلجان ہے جو ہر وقت ریاضی کے چکر میں رہتے ہیں۔ مرصوع ہے:

"Something of everything and ultimately nothing."

اس کو اگر ریاضی کی قدروں یعنی values کی شکل میں تبدیل کیا جائے تو یوں ہوگا

اگر Something = S

اور Every thing = E

اور Nothing = O

$$\therefore \frac{E}{S} = O$$

یعنی E کو S پر تقسیم کیا جائے تو حاصلِ تقسیم صفر آئے۔ اور یہ ممکن نہیں اِلّا یہ کہ خود S = O ہو،

یعنی

Some thing = Nothing

یہ ہے ریاضی کے حساب سے وہ مغالطہ جو مجھ عاجز کو میرے مخلص رفقاء نے بدنیتی سے نہیں بلکہ محض اخلاص کی بنا پر دیا ہے یعنی مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم سب کچھ کہو یعنی کچھ نہ کہو۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ آدمی سب کچھ کہے اور پھر بھی کچھ نہ کہے۔ لیکن وہ جو فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ حُسنِ ظن سے کام لو تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنے رفقائے محترم کو محض اخلاص سراپا قرار دے کر رہ جاؤں بلکہ مجھے یہ بھی فرض کرنا چاہیئے کہ وہ دانش ور یعنی Intelligentia بھی ہیں ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

عرض یہ کہ جو موضوع مجھے ملا ہے اس میں کسی قسم کا مغالطہ ہرگز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ریاضی کے قاعدہ سے بھی کوئی شخص کسی قسم کا

منطقی مغالطہ ثابت نہیں کر سکتا۔ واہ یہ بھی عجیب منطق ہے کہ استدلال ہو ریاضی کے قاعدے سے، اور ثابت کیا جائے ایک منطقی مغالطہ یا رد کیا جائے ایک منطقی نتیجہ۔ گویا منطق نہ ہوئی دو اور دو چار کا حساب ہو گیا۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ریاضی کے قاعدے سے بھی میرے رفقاء کے متعین کردہ موضوع میں کوئی جھول نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کو میں ایک منٹ میں یوں بتا سکتا ہوں۔ ریاضی کے قاعدے سے بھی صفر یا zero بالکل نفی کی قدر نہیں ہے۔ وہ کچھ تو ہے جسے صفر یا zero کہتے ہیں۔ اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو اس کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ:

Something = Nothing

یا

Nothing = Something

تو بات ایک ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا پیچیدگی ہے۔ میں خود خواہ مخواہ موضوع کو پہلے پہل سُن کر "گرم مشکل و گرنہ گوئم مشکل" کے اُدھیڑبن میں پھنس گیا تھا۔

لاحول ولا قوۃ۔ بیچ تقریر میں چرمُی گھوم پھر کر اپنے موضوع کی طرف آ گیا حالانکہ وہ تقریر ہی کیا کہ پرکار کی طرح گھوم پھر کر موضوع پہ پہنچ جائے۔

خیر میں آغا حشر کاشمیری کو ایک اچھا ڈرامہ نگار ثابت کر رہا تھا بلکہ کر چکا تھا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ اس کی ضرورت کیا تھی اور کہاں سے یہ مضمون پیدا ہوا۔ اگر میں پھر پیچھے کی طرف جاؤں تو وہی خطرہ سامنے ہے کہ موضوع پہ پہنچ جاؤں گا، جس سے میں بچنا چاہتا ہوں اور آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ کہ آگے بڑھنا اور بڑھتے رہنا ہی زندگی ہے۔ خواہ سامنے غار یا خندق یا کوئی کھڈ ہو۔ بس آگے بڑھتے رہنا چاہیئے.... غاروں اور خندقوں اور کھڈوں کی کیا حیثیت ہے۔ شرط یہ ہے کہ آنکھیں بند ہوں۔ کیونکہ یہ ظاہر بیں آنکھیں ہیں۔ باطن کی آنکھوں کو روشن رکھنا چاہیئے اور آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ ہزاروں غاروں، خندقوں اور کھڈوں کو پار کرتے ہوئے یا پھر ان میں گرتے پڑتے ہوئے ہم بالآخر معراجِ کمال پر پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

واہ واہ واہ۔ اقبال نے سائنس کے اس عہد کی پوری تاریخ کو اس شعر میں سمو دیا ہے۔ اس عہد کو ہم Aviation Age کہتے ہیں۔ کچھ لوگ Atomic Age بھی کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پرواز کئے بغیر آخر Atom bomb ایک ملک سے چل کر دوسرے ملک میں کیسے گرے گا۔ لہٰذا یہ دَور بہر حال عہدِ پرواز ہے، اور طیارہ اس کا بہترین Symbol ہے، جو اقبالؒ کے شاہین یا عقاب کے Symbol سے بھی ملتا جلتا ہے، جس کے بارے میں اس مردِ قلندر نے کہا ہے ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا،
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

خواہ شاہین صفت طیارہ طیارچی کے قابو سے باہر ہو جائے اور کسی اڈہ پر اترنے کی بجائے، مٹر کے کھیت میں سر کے بل، مٹرگشتی شروع کر دے اور اپنی گرمیٔ خون سے مشتعل ہو کر ایسا جل اُٹھے کہ نہ وہ رہے نہ اس کا کارفرما۔ یہ کارفرما کی اصطلاح غالبؔ کی

وضع کردہ ہے۔ غالباً عبدالرحمٰن بجنوری نے یا شاید میرے استاذِ محترم رشید احمد صدیقی صاحب نے غالبؔ کے مصرع ؎

اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تیل ہی نہ رہا اب چراغاں کیا ہوگا۔ لیکن اگر یہ حضرات اس بات کو ملحوظ رکھتے کہ غالبؔ وہ سخنور تھا جو ایک ختم ہوتے ہوئے عہد اور دوسرے شروع ہوتے ہوئے عہد کی سرحد پر کھڑا تھا اور اس کے فن پاروں میں عہدِ جدید یعنی عہدِ پرواز کی جھلک ہے تو "کارفرما" کا مطلب طیارچی یا پائلٹ زیادہ صحیح ہوگا۔

معاف کیجئے گا پھر موضوع یاد آگیا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں سمع خراشی کر رہا ہوں اور تقریر کا طول شیطان کی آنت کے طول سے مشابہ ہوگیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ مجھے اس مقدس تقریب میں دوسری تشبیہہ دینی چاہیئے تھی۔ طولِ شبِ فراق کہہ لیجئے۔ لیکن خوش قسمتی سے طولِ شبِ فراق کا رونا مجھے نہیں ہے۔ طولِ روزِ سیاہ کہہ سکتا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ادبی تشبیہہ نہیں ہے، اور اُستادوں کی سند کے بغیر ادب میں کوئی اختراع قطعی حرام ہے جیسے مذہب میں اجتہاد حرام ہے۔ واہ واہ، مذہب کا لفظ آتے ہی کیا عمدہ تشبیہہ سوجھ گئی جو ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھی لیکن سُوجھ نہیں رہی تھی۔ یعنی طُولِ دستارِ شیخ فضیلت مآب۔ لیکن یہ اگر ادب ہے تو دوسری طرف سُوءِ ادب بھی ہے! لہٰذا اس تشبیہہ سے بھی باز آتا ہوں اور کفِ افسوس ملتا ہوں کہ ذہن کام نہیں کرتا۔ البتہ یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ مذہب کا نام آتے ہی نعوذ باللہ شیخ فضیلت مآب کا تصور معاً ذہن میں آگیا تو اس کی حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے۔ ایک ماہرِ نفسیات یعنی Psychologist ——— H. G. Wells یا غالباً William James امریکہ یا انگلستان میں تھا۔ اس نے اپنی کتاب "Varieties of Experimental Religions" (مجھے یاد نہیں کتاب کا نام یہی ہے یا کچھ اور ہے؟) بہرحال اس کتاب میں لکھا ہے کہ آدمی کا ذہن ایک تیز و تند دھارا سے مشابہ ہے کہ بس رواں دواں ہے ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حتیٰ کہ آدمی اگر کسی لمحہ میں ایک بات کا یا نکتہ کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو تو معاً دوسرے لمحہ میں خود بخود وہ بات یا نکتہ اچھل کر اُس کے پردۂ تخیل پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اس کو وہ لاشعور کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو خیر سے اب لندن سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے ہیں، ایک دن اپنا ایک مضمون "فیشن اور اس کی نفسیاتی تعبیر" سے متعلق سُنا رہے تھے۔ موصوف نے اسے ترقی پسندی سے تعبیر کیا تھا، اور اس کے ڈانڈے لاشعور سے ملا کر انسان کی فطرت میں ترقی پسندی ثابت کرنی چاہی تھی۔ مَیں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسندی اگر لاشعوری کیفیت کا نام ہے تو بے شعوری اور کس چیز کا نام ہے۔ اس پر ایک تلخ سا قہقہہ پڑا۔ معلوم نہیں یہ قہقہہ شعور کا کرشمہ تھا یا لاشعور کی گہرائیوں سے نکلا تھا۔ کہتے ہیں تمام علوم و فنون لاشعور کا کرشمہ ہیں لیکن تحریکِ اسلامی کے مُلّا اگر اسی بات کو یوں کہیں کہ یہ علوم و فنون جن پر انسان کو اتنا ناز ہے کہ وہ وحیِ الٰہی سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا، سراسر جاہلیت کی پیداوار ہیں، تو اس پر ہمارے یہی ماہرینِ نفسیات ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ ان علوم و فنون کو جاہلیت کی پیداوار کیوں قرار دے دیا گیا ؎ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ....

باقی بر صفحہ ۴۳

محمد خالد اختر

چالیس

ق ——— کے شہر میں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے جس میں ہمارا تانگے والا ہمیں لے گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ق میں سب سے اچھا اور سستا ہوٹل ہے۔ ہوٹل سٹینڈرڈ ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ ایک وسیع چوگوشہ ہوٹل تھا، کمروں کے آگے لکڑی کے ستونوں کا برآمدہ تھا۔ اور احاطے میں باداموں، سیبوں اور پھولوں کا ایک مسرت بخش باغیچہ۔ ایک بڑی اونچی پہاڑی ایک زریں بادل کی طرح مشرقی سمت سے اٹھ رہی تھی۔

ہمیں ہوٹل سٹینڈرڈ میں ٹھہرے دو دن ہی ہوئے تھے کہ میرے ساتھی نے کہا۔

"آج ہم کیا کریں؟"

ہم نے دو دن میں ق ——— کا چھوٹا پہاڑی شہر ایک سرے سے دوسرے تک دیکھ لیا تھا۔ اور میں اس روز کے پروگرام کے متعلق کچھ نہ سوچ سکا۔ میں نے جواب دیا۔

"میں آج برآمدے میں بیٹھ کر دھوپ سینکوں گا اور خوابیں دیکھوں گا۔"

اس نے کہا "میں سوچ رہا ہوں آج غلام حسین خاں سے ملیں۔"

"غلام حسین کون ہے؟"

"وہ ایک پرانا انقلابی ہے۔ میں اسے پہلے سترہ اٹھارہ سال ہوئے اسلامیہ کالج میں ملا تھا۔ میں ایف اے کا طالبعلم تھا۔ اور غلام حسین بی اے کا امتحان دینے بلوچستان سے آیا تھا۔ ایک شام ہوسٹل میں مجھے اس سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے خیالات ایک آتش مزاج انقلابی نوجوان کے تھے اور میں اس کے جذبۂ حب الوطنی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ بی اے کے امتحان میں پاس ہوا اور ق ——— کی بلوچستانی ریاست سے وہ پہلا گریجویٹ تھا۔ ق ——— میں اس کے خاندان کا کافی رسوخ تھا۔ اور چونکہ وہ ساری ریاست میں واحد گریجوایٹ تھا وہ جاتے ہی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے ممتاز عہدے پر مامور ہو گیا دو تین سال بعد خان نے اسے اپنا وزیرِ تعلیم رکھ لیا۔ وہ تھوڑی ہی مدت اس عہدے پر رہا، اور پھر کوئی ایسی بات ہوئی ——— غالباً اس نے ق ——— کے ہائی سکول کے انعامی جلسے میں برطانیہ راج کے خلاف ایک سخت جوشیلی تقریر کی۔ ——— کہ اسے وزارتِ تعلیم سے دستبردار ہونا پڑا۔ وہ سردار عبدالصمد اچکزئی کے اثر تلے آگیا اور اپنے رشتہ داروں کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سردار کے لفٹیننٹوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی میں بڑا کام کیا۔

بلوچستانی قبائل میں تیز و تند باغیانہ تقریریں کی۔ اور چار پانچ سال تک اپنے وطن کی پہاڑیوں میں وہ ایک بھاگا ہوا آؤٹ لا (Out Law) تھا۔ آخر وہ پکڑا گیا اور اچک زئی کے ساتھ اس نے کچھ عرصہ قید کاٹی ——— میں نے کل پتہ لگایا ہے کہ ق ——— کے شہر میں ہے۔ اس سے ملاقات دلچسپ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوسکے گا کہ اچک زئی وغیرہ حقیقت میں چاہتے ہیں۔"

"ق ——— میں وہ کیا کرتا ہے؟"

"وہ وکالت کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد اس نے گزران کے لئے سندھ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی مگر میں نے سنا ہے وہ کوئی کامیاب وکیل نہیں ہے۔ وہ چھوٹے مقدمے لینے سے انکار کر دیتا ہے۔"

"کیا وہ تمہیں پہچان لے گا؟"

"شاید نہیں۔ ہم کو ملے اٹھارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے جب ہماری گفتگو ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوئی ہوگی"

"چلو۔ اس سے ملنا چاہیئے دیکھیں تو سہی کہ ایک اصلی انقلابی کیسا ہوتا ہے"۔

"ممکن ہے وہ بدل چکا ہو۔ میں اٹھارہ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں جب وہ ایک گرم اور جوشیلا نوجوان تھا۔"

سو ہم غلام حسین سے ملاقات کرنے روانہ ہوئے۔ کئی جگہوں سے پوچھتے پچھاتے ہم آخر اس کے مکان کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ شہر کے شمالی کونے میں ایک چھوٹی گلی میں گلابی رنگ کا ایک معمولی سا مکان تھا اور اس کے نام کے بورڈ پر اتنی گرد جمی تھی کہ الفاظ ذرا مشکل سے پڑھے جاتے تھے۔ ظاہراً وہ ق ——— کے تیسرے درجہ کے وکلاء میں تھا۔ ہم نے سیڑھیوں پر چڑھ کر بیٹھک کے دروازہ پر دستک دی جو بند تھا۔ ایک صاف ستھرے ملازم نے دوسرے دروازے سے نکل کر ہمیں بتایا کہ اس کا آقا گھر پر ہی ہے۔ اس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔

بیٹھک وکیل کے لئے ایک دفتر کا کام دیتی تھی۔ ایک میز کے پیچھے جس پر قانونی کاغذات اور دو تین اخبار پڑے تھے۔ ایک دوہرے جسم کا گل گوتھنا سا شخص بیٹھا اپنے ایک باریش مؤکل سے اس کے کسی مقدمے کے بارے میں محو تکلم تھا۔ اس نے بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا اور قدرے حیران نظر آتا تھا۔ پرانا انقلابی ایک معصوم سے ضرر اور بشاش چہرے کا شخص تھا۔ آنکھیں بلی اور چشموں کے پیچھے مسکراتی ہوئیں۔ بدن پر سادہ ملیشیا کی شلوار قمیص، کشادہ اور خنداں پیشانی۔ اس کی عمر چالیس اکتالیس برس کی ہوگی، گو سر کے بال قریب قریب سب سفید ہو چلے تھے۔

اس نے ہمیں بٹھایا اور اپنے مؤکل سے کہا "آپ تھوڑی دیر انتظار کریں"۔ اس کی ٹمٹماتی بلی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔ اور وہ تعجب کر رہا تھا کہ ہم کون لوگ ہیں، اور اس سے کیوں ملنے آئے ہیں۔ بہت کم لوگ اس سے ملنے آتے ہوں گے۔

"ہم نے آپ کا ہرج تو نہیں کیا" میرے ساتھی نے معذرت کرتے ہوئے باریش شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ صاحب یہ کام تو وکیلوں کے ہاں ہوتا رہتا ہے۔ سنائیے آپ خیریت سے ہیں؟

"اللہ کا شکر ہے۔"

"اور آپ خیریت سے ہیں؟" اس نے میزبانہ خوش اخلاقی سے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں"۔

کچھ منٹ خاموشی رہی۔ میرے ساتھی نے اپنی آمد کی صراحت کی: "آپ سے اٹھارہ سال پیشتر غالباً ۱۹۴۳ء کے دسمبر میں ریواز ہوسٹل میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ ان دنوں بی اے کا امتحان دینے گئے ہوئے تھے۔ آپ کو تو یاد نہیں ہوگا۔"

غلام حسین ذرا غور سے میرے ساتھی کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ "نہیں معاف کیجئے۔ میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔ عرصہ بھی تو کافی گزر چکا ہے۔ اٹھارہ سال!"

"آپ سے ملاقات بھی سرسری ہوئی تھی"۔

"مجھے مطلقاً یاد نہیں آرہا۔ آپ بھی تو اٹھارہ سال کی بات کر رہے ہیں۔ اٹھارہ سال میں آدمی کا حلیہ تک بدل جاتا ہے" وہ اپنے حافظہ پر زور دیتا معلوم ہوتا تھا۔

"ایک بار بعد میں بھی ——— غالباً ۱۹۴۶ء کا مارچ تھا آپ سے حیدر آباد کے سٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ آپ سردار .... عبدالصمد اچکزئی کے ہمراہ لاہور کسی جلسے کی غرض سے تشریف لے جا رہے تھے۔"

ہم نے دیکھا کہ سردار عبدالصمد اچکزئی کے نام پر اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک چالاک گھبرائی ہوئی سی نظر اس کی آنکھوں میں در آئی۔ یہ صاف تھا کہ وہ حکومت کے ایک معتوب انقلاب پسند لیڈر سے جسے ملک کی سلامتی کے لئے خطرناک سمجھ کر نامعلوم عرصہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا تھا کوئی واسطہ رکھنا نہ چاہتا تھا۔ اچکزئی کے نام پر ہم نے دیکھا کہ وہ بے حد غیر آسودہ محسوس کر رہا ہے۔

غلام حسین کو شاید خیال گزرا ہو کہ ہم سی آئی ڈی کے آدمی ہیں اور اس سے اس کی پچھلی سیاسی زندگی کا کوئی راز کریدنا چاہتے ہیں جو اُسے ملک کے ساتھ غداری کے جرم میں لپیٹ لے۔ اس نے میرے ساتھی کو احتیاط اور شک سے جانچا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" وہ اچکزئی کے ذکر سے دُور محفوظ باتوں کی طرف پلٹ گیا۔ اور جب ہم نے اُسے اپنے پیشے بتائے اور اسے کہا کہ ہم ق   میں چھٹی پر سیر کے لئے آئے ہیں تو وہ ہنسا۔ "آپ نے سیر کے لئے بڑا اچھا موسم چُنا۔ دسمبر کے ان دنوں میں یہاں برف پڑتی ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ اس دفعہ خلاف معمول ابھی سخت سردی نہیں پڑی۔ ورنہ ان دنوں میں قندھار کے پہاڑوں سے ایک ہوا چلتی ہے، 'سیستانی ہوا' جو ہڈیوں کے گودے کو جما دیتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک ہوا ہے۔"

اس کے نوکر نے نمکین کشمیری چائے کے چار پیالے میز پر لا رکھے اور ہم چائے پینے لگے۔ میرے ساتھی نے غلام حسین کو سگرٹ پیش کیا۔

اس نے بڑا سفید سر نفی میں ہلایا: "شکریہ۔ نہیں میں سگرٹ نہیں پیا کرتا۔ جب سے میرا معدہ خراب ہوا ہے میں نے سگرٹ ترک کر دیئے ہیں۔"

اس نے ہمیں کچھ خودرحمی سے سمجھایا کہ اس کے معدے میں کیا خرابی ہے۔ اُسے کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی، اور کھانے کے فوراً بعد اس کا پیٹ پھول جاتا تھا اور دماغ میں اتنی پریشانی اور پراگندگی سی اثر کر جاتی تھی کہ وہ نہ کچھ کام کر سکتا تھا، نہ کچھ سوچ سکتا تھا۔

"معدے کی خرابی کی وجہ سے میری پریکٹس کو بھی بڑا نقصان پہنچا ہے۔" اس نے ہمیں بتایا۔

میرے ساتھی نے پوچھا۔ "آپ ق—— میں وزیرِ تعلیم بھی تو تھے۔"

"ہاں بھائی۔ ق—— میں میں نے دو سال خدمت کے جذبہ کے تحت محکمہ تعلیم میں کام کیا۔ اُس سے مجھے بڑا نقصان پہنچا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ اس وقت ہی یوں بھٹکنے اور عمر ضائع کرنے کی بجائے 'لاء' (Law) کر لیتا تو اب ق—— کے پرانے اور مشہور وکلاء میں سے ہوتا۔ اب بھی خدا کا فضل ہے۔ پانچ چھ سو روپیہ ماہوار اب بھی کما لیتا ہوں، اور یہ اس صورت میں کہ معدے کی وجہ سے میں زیادہ کام بھی نہیں کر سکتا۔ مہینے میں دو تین کیس سے زیادہ نہیں لیتا۔ آپ بھی میری بات مانیں اور 'لاء' کر لیں۔"

"روپیہ تو آخر سب کچھ نہیں ہے۔"

ہمیں امید تھی کہ یہ سوال اس پرانے انقلابی کے دماغ میں بلوچستانی چٹانوں اور غاروں میں بسر کئے ہوئے 'رابن ہڈ' (Robin Hood) ایام کی یادوں کی گونج جگا دے گا—— جب اس کی جیب خالی تھی، اور دل آزاد اور باہمت۔ جب وہ آرام اور آسائش سے بے پرواہ غاروں کے پتھریلے بچھونوں پر سوتا تھا اور پانی کے گھونٹ سے سوکھی مکی کی روٹی کھاتا تھا۔

اس کے جواب نے ہمیں مایوس کر دیا۔ یہ ایک عام دنیادار آدمی کا جواب تھا۔

"خیر صاحب"، وہ چہرے پر تبسم لاتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ مشائخ، اولیاءِ کرام اور صالحین وغیرہ میں سے ہیں تو پھر تو آپ کا خیال درست ہے، اور آپ کی رائے صائب۔ مگر عام انسان کے لئے روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ ساری تعلیم اور تگ و دَو روپے کے لئے ہی تو ہے۔"

میرے ساتھی نے پوچھا "سردار عبدالصمد صاحب کو حکومت نے کیوں نظربند کر رکھا ہے؟"

پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ اس موضوع سے دور رہنا چاہتا تھا۔

"صاحب، حکومت نے بھی تو اپنا کام چلانا ہے۔ سردار صاحب بھی تو ملک کی سالمیت کے مخالف ہیں.... اس وقت ہمیں تعمیری جذبے سے کام کرنا چاہیئے۔"

ہم نے اس سے پوچھا کہ امریکن ایڈ کے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟

"بھائی جان! یہ ہائر پالیٹکس (Higher Politics) کی باتیں ہیں—— میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ ہمارے ملک کے لیڈر ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم لوگوں کا کیا ہے۔ ہمیں اپنی دال روٹی سے مطلب رکھنا چاہیئے......"

کیا یہی وہ آدمی ہے جو ہم نے سوچا، جسے ق ـــــــ کی ریاست سے جلا وطن کیا گیا تھا، اور جو بلوچستان کی تحریکِ آزادی میں اچکزئی کا دایاں بازو رہا تھا اور قید کی مشقتیں جھیل چکا تھا۔ اب وہ عام دنیا دار آدمی کی سی باتیں کرتا ہے، روپے اور پیشے کی باتیں۔ اور یہ رائے رکھتا ہے کہ اس نے اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ اس کے جسم اور دل میں آگ نہیں رہی ـــــــ اور وہ شائد کبھی تھی ہی نہیں۔

"ہاں تو صاحب، آپ 'لا' میں تشریف داخل ہوں" اس نے میرے ساتھی کو مشورہ دیا "بھائی اگر آپ یہ دس سال پہلے کر لیتے تو اس وقت تک 'اسٹیبلش' (Established) ہو چکے ہوتے۔ اب بھی اگر آپ کے وسائل اخراجات کے متکفی ہیں تو آپ 'لا' میں داخلہ لیجئے ـــــــ دو تین سال میں آپ کے لئے سات آٹھ سو روپیہ ماہوار کما لینا بڑی بات نہیں۔ باقی رہی خدمت تو اسے فقہا اور اولیائے کرام کے لئے چھوڑیئے ـــــــ"

غلام حسین ہمیں اپنے مکان سے باہر گلی تک چھوڑنے آیا۔

سیاہ سوٹ میں طربوس ایک شخص سائیکل پر جاتا گزرا۔

"اس کا نام علی محمد ہے۔ اس کو پریکٹس شروع کئے تین سال ہی ہوئے ہیں، اور اب بیشتر فوجداری کے کیس اس کے پاس آتے ہیں۔ ق ـــــــ کے نامی وکیلوں میں گِن گیا ہے۔ اس کی پریکٹس کم سے کم بارہ سو روپے ماہوار ہے"۔

ہم اس سے رخصت لے کر روانہ ہوئے تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا:

"تو یہ تمہارا عظیم انقلابی ہے!"

"تم بھول رہے ہو" اس نے جواب دیا "اس کے گھر میں بیوی بچوں سمیت سات افراد کھانے والے ہیں، اور وہ اب چالیس سال کا ہے ـــــــ چالیس!"

بقیہ: بے پر کی .... از صفحہ ۳۸

جاہلیت اور لاشعور میں آخر فرق کیا ہے!

قصہ مختصر۔ اس تقریر پر خواہ چوں چوں کا مربہ کی پھبتی کسی جائے خواہ اسے معجون مرکب یا اصطلاح سیاست میں ملکوٹا تا کہ کی اردیا جائے۔ جو کچھ عرض کیا بلا تمہید نہیں کہ کیا کچھ عرض کیا۔ اس لئے کہ بات میں سے بات نکلتی چلی گئی۔ اور اتنی باتوں کو کوئی اُن تک یاد رکھے۔ لہٰذا اب صرف یہ دعا ہے کہ ؎

بک گیا مجھ جنوں میں کیا کیا کچھ

جن کے پاس دو دو پاسپورٹ ہیں اور بیک وقت بھارتی اور پاکستانی شہری بنے پھر رہے ہیں۔ نہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے بیٹھا ہوں کہ "مہاجرین" جاہلیت سے ہجرت کرکے اسلام کی طرف نہیں آئے ہیں بلکہ بقول علامہ راغب محض مسلم شرنارتھی کی حیثیت سے آئے ہیں اور مخصوص معاشی و سیاسی حقوق و مفاد کا تحفظ ہی ان کا سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ نہ میں یہ بتانے کے لئے بیٹھا ہوں کہ ہندو اور اشتراکی متحدہ محاذ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور دوسرے "کیرالہ" کی تیاری پوری شد و مد سے ہو رہی ہے نہ یہ کہ پیر کا گماری اندرونی کارروائی میں مصروف ہیں اور عنقریب چین کی طرح یہاں بھی یکایک ایک دہقانی تحریک (کریشک سمیتی) اُٹھ کھڑی ہونے والی ہے۔ نہ میں اس کا رونا روؤں گا کہ مخلوط قومیت کا جوا گردن میں پہننے کے بعد ہمارے ارباب اقتدار اتنے با مروت ہوگئے ہیں کہ اپنے ہندو ساتھیوں اور ان کے ہم قوم "محبانِ وطن" کے حد سے بڑھے ہوئے "حبِّ وطن" پر کچھ بول بھی نہیں سکتے۔ میں اس کا بھی ماتم نہیں کروں گا کہ کچھ ایسے دینی پیشوا بھی یہاں سرگرم ہو چلے ہیں جنہوں نے دینی تحریک کی راہ روکنا ہی سب سے بڑا دینی کارنامہ سمجھ لیا ہے یا یہ کہ دیوبندی حنفی چپقلش اور باہمی جوتی پیزار سے اقامتِ دین کا شاندار ریکارڈ قائم کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ میں یہ ڈھول بھی نہیں پیٹوں گا کہ جماعت اسلامی نے میدان مار لیا ہے اور بس اب اسلامی انقلاب برپا ہوا ہی چاہتا ہے .... یہ سب کچھ میں آئندہ کی کسی صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال ایک نہایت تلخ بات کہنی ہے جس کو چراغِ راہ کے ناظرین محض دردمندی اور خلوص پر محمول کریں تو تلخی کی تہ میں ایک شیرینی محسوس کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ روئے سخن چونکہ اپنی ہی طرف ہے لہٰذا اپنوں سے اُمید ہے کہ بُرا نہ مانیں گے اور کونین کی کڑوی گولیوں کو فرو ئے حلق کرلیں گے۔

بات جو کہنی ہے صرف ایک ہے۔ یعنی یہ کہ مشرقی پاکستان کو تحریک اسلامی ہی بچا سکتی ہے لیکن تحریک اسلامی کے کارکن اس معاملے میں نہ پوری طرح باشعور ہیں نہ پوری طرح مضطرب ہیں۔ اور شعور اور اضطراب کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں نہ آج تک کہیں چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اسی ایک بات کا تجزیہ کرکے اس کے ایک ایک جزو کی وضاحت کردوں تاکہ میری بات محض چیستاں بن کر نہ رہ جائے۔ اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

ایک طرف صدیوں کی دُہری غلامی اور دوسری طرف اپنی ہی تاریخ سے لاعلمی اور تحریک اسلامی کے پورے فکری خوراک سے محرومی کے سبب احساسِ کہتری، تھڑدلاپن، جذباتیت، یاس و قنوط، جذبۂ ایثار کی کمی اور قوتِ اقدام سے محرومی یہاں تقریباً عام ہے۔ "پیری و صد عیب" کی طرح "غلامی و صد امراض" ازحقیقت سے کم نہیں۔ اور ہر مرض ایسا کہ کئی امراض کا باعث۔ دوسروں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا۔ ذاتی مفاد کو ہر وقت خطرے میں محسوس کرنا۔ جاہلی عصبیتوں کو قاضی الحاجات کا مرتبہ دینا، چالاکی، داؤں پیچ اور "ہل من مزید" کی ہر وقت فکر۔ اور کم محنت اور زیادہ حصول کی بے سود تمنا میں دن رات سرگرداں رہنا۔ یہ وہ امراض ہیں جنہیں بنیادی انسانی صفات کے ضعف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جہاں بنیادی انسانی صفات ہی نہ ہوں وہاں اسلامی صفات کس طرح جڑ پکڑ سکتی ہیں۔ اسلامی صفات قلعی تو نہیں ہے کہ اوپر سے پھیر دی جائے اور رنگ چوکھا آجائے۔

یہی بنگال ہے! کیسا ماجرا ہے!

جب یہاں کی دلفریب ہریالیوں، دریاؤں کے پیچ و خم، بادل کے لہراتے ہوئے مرغولوں، بل کھاتے ہوئے کیلے اور سپاری کے نازک اندام درختوں اور قریب سے سنائی دینے والی بانسری کی آواز یا ملاحوں کے گیت میں کوئی کھو جائے تو لاوارث دوشیزہ کی روح کی اصل بے چینی کیسے محسوس ہو سکتی ہے اور گرفتارِ بلا شہزادے کے اصل اضطراب کو کون سمجھ سکتا ہے۔

مغربی بازو کے سیاحوں کو چاہیئے کہ فطرت، موسیقی اور ادب کے طلسمی جالوں میں الجھے بغیر وہ بنگال کے قلب کی گہرائیوں میں اُتر کر اس کی صدیوں کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ وہ آئیں اور بستیوں کو دیکھیں۔ گاؤں اور گاؤں والوں کا مشاہدہ کریں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ بھولے بھالے انسانوں کی بھولی بھالی فطرت حوادث اور مظالم سے کس طرح مسخ ہوتی ہے۔ دودھ اور شہد میں زہر اور حنظل کی تلخیاں کیسے حل ہوتی ہیں۔ اور کرب و اندوہ سے زندگی کے زمزمے کیونکر لرزاں لرزاں سے ہو جاتے ہیں۔

جناح ایونیو کے کسی ریستوران۔ دریائے پدما کے سینے پر تیرتے ہوئے کسی "عیش گھر"۔ پلٹن میدان یا نواب پور روڈ کے کسی سیاسی تماشے۔ رمنا کے گھڑ دوڑ میدان۔ اسٹیڈیم میں چو این لائی کے استقبال اور گلستان سینما کے دروازے پر بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر جو لوگ بنگال کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ سخت افلاطونی "دانشمندی" کا ثبوت دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے وہ زمانہ جب ۱۹۴۳ء کے قحطِ بنگالہ میں بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر لاکھوں انسان مر رہے تھے۔ سڑکیں اور گذرگاہیں لاشوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ اس وقت متحدہ بنگال کے انگریز گورنر Mr. Casey نے فخر یہ کہا تھا "لوگ کہتے ہیں کہ قحط ہے، عوام مر رہے ہیں۔ حالانکہ کلکتہ کے سینما گھروں میں اتنی ہی بھیڑ ہوتی ہے جتنی پہلے ہوتی تھی" ——— کیا Mr. Casey کا مشاہدہ بالکل درست تھا؟۔ افسوس کہ ہم بھی کبھی کبھی پرانے انگریز آقاؤں جیسی شاہانہ غلطی کر بیٹھتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ

GOD IS IN HIS HEAVEN

ALL IS RIGHT WITH THE WORLD

یعنی خدایانِ سیاست اپنے شیش محل میں ہیں اور ساری دنیا چین سے ہے ....

میں یہ "مکتوب بنگالہ" اس غرض سے نہیں لکھ رہا ہوں کہ یہاں کے سترہ اضلاع کے بازاروں کا بھاؤ بتاؤں۔ اور یہ کہوں کہ چاول کہیں چالیس روپے من اور کہیں پچاس روپے من ملتا ہے۔ لوگ بھوک کے مر رہے ہیں۔ امراء اور حکام دادِ عیش دے رہے ہیں یا "غذائی" کانفرنسیں بلا رہے ہیں۔ نہ یہ کہ "بھوک مارچ" کرانے والوں کے راج میں پہلے سے زیادہ بھوک کا راج ہے۔ نہ یہ کہ مارواڑی درشنا سے سلہٹ تک اور دیناج پور سے چاٹگام تک جونکوں کی طرح مسلم بنگال کے سینے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اور اس کا خون چوس چوس کر کچھ اپنے سیاسی سرپرستوں کو دیتے ہیں اور کچھ سرحد پار بھیج رہے ہیں۔ نہ یہ کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے خواب میں جو دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوئی دیکھی تھیں وہ عالمِ واقعہ میں الٹی سمت بہہ رہی ہیں۔ اور بھارتی بنگال سیراب ہو رہا ہے۔ نہ یہ کہ لاکھوں بھارتی شہری بغیر ویزا یہاں آ کر جاسوسی اور سبوتاژ کا کام کرتے ہیں اور لاکھوں ایسے ہیں

فروغ احمد

مکتوبِ بنگالہ

میدانوں اور دریاؤں، دھوپ اور چھاؤں، گرمی اور حبس، سائیکلون اور سیلاب۔ ہریالیوں اور گھٹاؤں، گیتوں اور "زاری گان"[1] خرمنوں اور بجلیوں۔ فاقوں اور وباؤں اور روز و شب کی نت نئی نیرنگیوں کا یہ دیس بھی عجب دیس ہے!۔ کسے معلوم تھا کہ "بندوبستِ استمراری" (PERMANENT SETTLEMENT) کی چٹان تلے دبا ہوا بنگال اٹھے گا اور خطِ تقسیم کھینچ دے گا! اور جب وہ لکیر مٹا دی جائے گی تو پھر اُٹھے گا اور پھر اسی عمل کا اعادہ کرے گا! جب میں کسی دھان کے کھیت میں، گھٹنوں پانی میں چلتے ہوئے جفاکش بنگالی دہقان کو دیکھتا ہوں تو اس کے پیچھے تاریخ کے چند بڑے بڑے اوراق الٹتے پلٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ——— اسی کے آبا و اجداد تھے جو نمازیں پڑھتے تبلیغ کرتے اور فولادی بجلیاں ہاتھوں میں لئے بالاکوٹ کے افق تک پہنچے تھے ——— اور جب گاؤں کی شکستہ مسجد کے صحن سے تکبیر کی لرزتی ہوئی آواز میرے کانوں میں آتی ہے تو میرا دل پکار اٹھتا ہے کہ مسلم بنگال زندہ ہے.....

لیکن یہ مسلم بنگال جو صدیوں کے پیہم اضطراب اور مسلسل زک پر زک اٹھانے کے بعد پھر اُبھرا ہے، پاکستان کا یہ مشرقی بازو اب بھی اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے بندھن سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی سے بھی زیادہ اپنوں کے ہاتھوں ڈھائے ہوئے مظالم سے اب بھی اس کا جسم زار و نزار ہے۔ پرانی خون آشام جونکیں اب بھی اس کی رگوں سے چمٹی ہوئی ہیں۔ زہریلے حشرات الارض اب بھی (بلکہ اب تو پہلے سے بھی زیادہ) اسکے تلووں اور پنڈلیوں پر ڈنک مار رہے ہیں۔ اب بھی اس کے لبوں پر درود و صلوٰۃ کی گلوگیر آواز کے ساتھ آہ و شیون کی لَے جاری ہے۔

اس ہرے بھرے دیس کے منظر کا دوسرا رُخ کتنا ہولناک ہے! چاول کی دو دو فصلیں پیدا کرنے والے دانے دانے کو محتاج ——— ڈھیر کے ڈھیر ڈھو ڈھو کر سرحد پار پہنچانے والے سماج دشمن چوہوں کی بھرمار ——— گوداموں کے موٹے موٹے فوج در فوج بیوپاری ——— اور بے چینی اور جنون پھیلانے والے کیڑوں کوڑوں کا طوفانِ بے پناہ! عیاری اور لفنگا پن کا اقتدار ——— گمراہ اور حیا سوز "ترقی" کا زور۔ مکارانہ پیری اور پھر رہزنی کو مات کرنے والی رہنمائی کی ریل پیل! یہ ہے بنگال کا موجودہ نقشہ جس کے متعلق ۴۳ء کے قحط کے زمانے میں کہنا پڑا تھا اور آج بھی کہنا پڑتا ہے کہ

؎ وہ دودھ اور شہد کی نہریں کہاں ہیں
یہ "شونار دیش" کو کیا ہو گیا ہے!
کہاں ہیں دھان کی ہریالیاں وہ!

---

[1] زاری گان "لوک گیتوں کی ایک قسم ہے جس میں زندگی کے تلخ حقائق بیان کئے جاتے ہیں۔

زندگی کی کشمکش میں قلعی کھل جاتی ہے تو اندر سے کالے اور پیلے دھبّے اپنا منہ دکھانے لگتے ہیں۔ بنیادی انسانی صفات کا مادہ ہی وہ "حدید" ہے جس سے اسلام کی تلوار بن سکتی ہے اور بنتی ہے۔ یہ پختگی اور صلابت اگر نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے پیدا کی جائے؟ س کی واحد شکل یہ ہے کہ ایک اصولی اور انقلابی تحریک اپنا قدم جمائے۔ اشتراکیت یہاں اپنے سرگرم کارکن اسی طرح پیدا کر رہی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد نے اسی طرح کبھی اپنے سرفروش یہاں پیدا کئے تھے۔ اور اُسی تحریک اسلامی کے باقیات الصالحات ں جو آج بھی یہاں زندگی کی واحد رمق بنے ہوئے ہیں۔ جدید تحریک اسلامی فولاد کے انہی ننھے ذرات کو یکجا کرکے اور تپا تپا کر ایک سانچے میں ڈھال رہی ہے۔ صدیوں کا میل کچیل آن کی آن میں کیسے چھٹ جائے گا۔ کچھ دیر لگے گی۔

لیکن حالات اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ ہم "فولاد سازی" کے عمل کو تیز سے تیز تر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ایک ایسے فوری منصوبے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ "زمانے کی تند و سبک سیر رَو" پر "عشق کے سیل" کو غالب کیا جا سکے۔

یہاں کی زمین چونکہ بہت نرم ہے اور آب و ہوا بھی ایسی ہے کہ جو کچھ مٹی میں پہنچتا ہے لہلہا کر اُگ آتا ہے لہٰذا بونے والوں کو بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ خالص نظری اور عقلی باتوں کو ذرا کم کرکے ذمہ دار حضرات ٹھوس حقائق اور عملی حل کے نقشے لو اپنے اور اپنے مخاطبین کے ذہنوں میں استوار کرنے کی کوشش کریں گے تو کم سے کم عرصے میں ایسے ذی صلاحیت اور فعال دانشور ہاں پیدا ہو جائیں گے جن کے اندر یقین اور خود اعتمادی کی صلاحیت بھی ہوگی اور آگے بڑھنے اور تحریک کے پورے کارواں کو آگے ھانے کا جذبۂ بے پایاں بھی ہوگا۔

ضرورت ہے کہ بڑے پیمانے پر توسیع دعوت کا کام شروع کر دیا جائے۔ جو کارکن ابھی میسر ہیں انہیں دو ہمہ وقت رمتوازی (Simultaneous and parallel) کاموں میں لگایا جائے۔

(۱) قلیل المعیاد تربیتی پروگرام

(۲) طویل المعیاد دعوتی پروگرام

قلیل المعیاد تربیتی پروگرام میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ کم سے کم مدت میں ہر کارکن کو تحریکی لٹریچر کے ایک جامع نصاب (condensed course) کا ایک سریع الہضم خوراک مل جائے اور جن بڑی کتابوں کا ترجمہ بنگلہ میں ابھی نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان کا بھی کم از کم ایک خاکہ ان کے ذہنوں میں اتار دیا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اظہار اور زورِ بیان کی بھی انہیں مشق کرائی جائے۔

طویل المعیاد دعوتی پروگرام ہمہ جہتی ہونا چاہیے۔ منفق سازی، تعلیم بالغاں۔ تنظیم مساجد، اصلاح معاشرہ۔ تعلیم نسواں اور اسلام پسند طلبہ کی بالواسطہ لیکن مضبوط تنظیم۔ طلبہ یہاں ہمیشہ سیاست کی روحِ رواں رہے ہیں۔ وہ جدھر ہوتے ہیں حالات کا رُخ اسی طرف ہوتا ہے۔ انقلاب ہم یہاں اسی دن لائیں گے جس دن یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے دارالاقامہ پر اسلام کا پرچم لہرانے کی رسم ادا کی جائے گی۔

طویل المعیاد توسیع دعوت کا بایاں محاذ (LEFT FRONT) ادبی تحریک ہوا کرتی ہے۔ بنگلہ زبان کا حلقۂ ادب اسلامی پہلا

ایک پرانا خواب ہے جو آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اس کے کئی اسباب ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بلا استثنا یہاں کا ہر صاحبِ قلم ایک نہایت ہی افسوسناک کمزوری میں مبتلا ہے۔ انفرادیت پسندی، دوسروں کی حوصلہ افزائی سے گریز اور تنگ نظری۔ کم از کم تحریکی اصحابِ قلم کو ان کمزوریوں سے پاک ہونا چاہیئے۔ جب تک ادبی محاذ پر ہم کوئی طوفانی کام نہیں کریں گے دانشوروں اور طلبہ کا رُخ موڑنا ممکن نہیں ہوگا۔ تحریک قدم جما نہیں سکتی ہے جب تک ادب کے ذریعہ ہم دانشوروں، خواتین اور نوجوان نسل کے دلوں میں داخل نہ ہوں۔ تحریک اوپر ہی اوپر تیرتی رہے گی اگر لوگوں کے دلوں پر ہم قبضہ نہیں کریں گے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے پاس جو گنے چنے چند اصحابِ قلم ہیں وہ اپنے اندر اتنی وسعتِ قلب پیدا کریں کہ وہ ایک دوسرے کو APPRECIATE کر سکیں۔ انفرادیت کو اعلیٰ تر مفاد کی خاطر اجتماعیت پر قربان کریں اور مل جلکر کچھ کارہائے نمایاں انجام دیں۔ مشرقی پاکستان تو فنونِ لطیفہ کا دیس ہے۔ رونا صرف اس کا ہے کہ مسلم فن کاروں میں اجتماعی شعور کا فقدان ہے اور اعلیٰ تر اجتماعی مفاد کے لئے وہ ایک دوسرے کو آگے نہیں بڑھا سکتے نہ آگے بڑھتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

مسلم بنگال کی تاریخ کا مطالعہ اور اس سے INSPIRATION لینے کی بھی ضرورت ہے۔ افسوس کہ چوہدری علی احمد خان مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی حلقہ مشرقی پاکستان کی کتاب "مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ (اور اس کا تاریخی پس منظر)" کو بنگلہ میں منتقل کرنے کی توفیق آج تک نہ ہو سکی۔ فی الحال اس کی سخت ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جدید روسی ترکستان اور جدید چین کی عبرت ناک تاریخ "اشتراکیت اور مذہب و اخلاق" جیسی کتابوں کے ترجمے سے بنگلہ میں مرتب کرکے جلد سے جلد شائع کرنا چاہیئے۔ تنہا جماعت اسلامی اپنے قلیل وسائل کے ساتھ کہاں تک ہر ضروری کام کو انجام دے سکتی ہے۔ رفقائے کے اندر اگر جذبۂ کارکردگی ہو اور وہ مل جل کر کچھ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں لکھے گا اگر اس غرض سے کسی رسالے میں چھپوانے کی نیت نہ ہو کہ معاوضہ ملے گا اور پھر شائع شدہ مضامین کو کتابی شکل میں چھپوا کر مزید منافع حاصل کیا جا سکے گا ——— ورنہ میری یہ آٹھ سالہ تگ و دَو ضرور کامیاب ہوتی کہ تحریک ادبِ اسلامی کے اُردو شہپاروں کا ایک انتخاب بنگلہ میں ترجمہ کرکے آب و تاب سے شائع کیا جاتے اور مقامی ادیبوں کو اس نمونۂ فن کی طرف مائل کرکے چونکایا جاتے ———
لیکن ؎ کون سنتا ہے فغانِ درویش ٭ قہر درویش بر جانِ درویش۔

تحریک اسلامی کے اساسی لٹریچر کے ترجمہ اور اشاعت کا کام بھی عرصہ سے ملتوی یا سست ہو کر رہ گیا ہے۔ اس دوران میں انفرادی تصنیف و تالیف کا کام آب و تاب سے ہوتا رہا ہے۔ اور PRIVATE ENTERPRISE کی جو خصوصیات ہونی چاہیئں ان میں کوئی کمی نہیں پائی گئی ہے۔ الحمدللہ کہ اس کے بجائے نہ کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن یہ فوائد یقیناً ان فوائد سے کم ہیں جو اساسی لٹریچر کی اشاعت اور پبلسٹی سے ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز کا یہ فرض ہے کہ یہاں انفرادی تصنیف و تالیف کے کام کو اساسی لٹریچر کے ترجمہ پر ترجیح دینے کی ہر کوشش سے کم از کم باخبر رہے۔ بالخصوص جو مترجم جماعت کا ہمہ وقتی کارکن ہو اسے تو سختی سے اس قاعدے کا پابند بنایا جانا چاہیئے کہ پہلے وہ اصل سپرد کردہ کام انجام دے لے اس کے بعد جو چاہے

کرے۔ اور اگر معاملہ اس کی بڑھتی ہوئی معاشی ضروریات کا ہو تو اس کے لئے پوری جماعت کو فکر مند ہونا چاہیئے۔ لیکن تحریک کے اعلیٰ تر مفاد کو کسی حال میں قربان نہیں کیا جا سکتا۔

سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے اگر جماعت اسلامی کی تنظیم کی مشینری پوری طرح کسی ہوئی ہو اور اس کا ہر پرزہ متحرک اور چوکس ہو۔ مشرقی پاکستان میں تنظیمی مشینری کو کسا ہوا رکھنے کے لئے کم از کم چار اسکرو ایسے ہیں جن کو ہر وقت کستے رہنے کی ضرورت ہے۔

- مقامی جماعتیں ——— بیس سے زائد مقامی جماعتیں بن چکی ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کو علاقائی مراکز سے جوڑا تو گیا ہے لیکن اس جوڑ کا اسکرو ابھی تک پوری طرح فٹ نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ مقامی جماعتیں پوری طرح فعال ہیں نہ مجموعی مشینری کے ساتھ مکمل تعاون کا ثبوت تندہی کے ساتھ دے سکتی ہیں۔ اس پیچ کو بھی کسنے کی ضرورت ہے۔
- علاقائی مراکز ——— پورے حلقۂ مشرقی پاکستان کے مرکزی نظم سے اس کا تعلق محض آئینی ہے اور وہ بھی اس قسم کا جس کی ایک مثال پاکستان کے دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی سرکاری تعبیر میں ملتی ہے ("ایک سال کے اندر اندر کا مطلب "ایک سال کے خاتمہ پر") علاقائی مراکز حلقہ کے مرکز کی ہدایات پر اسی نہج سے عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا اس پیچ کو بھی مزید کسنے کی ضرورت ہے۔
- مرکز حلقہ مشرقی پاکستان ——— کل پاکستان مرکز سے جغرافیائی اور نفسیاتی دوری کے سبب ایک قسم کی Autonomy سے مستفید ہو رہا ہے۔ اور تصور آخرت اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کے عقیدہ کے علاوہ اور کوئی ڈوری ایسی نہیں ہے جو طبیعاتی نظام اور اسباب و علل کی دنیا میں ہمیں ضوابط کے کم سے کم تقاضوں کا پابند بنا سکے۔ ان دونوں مراکز کے درمیان جو تنظیمی ڈوری ہے وہ بہت لمبی ہے۔
- کل پاکستان مرکز ——— مذکورہ بالا تینوں تعلقات کو استوار کرنے کے لئے تینوں اسکروؤں کو اچھی طرح کسنے کی ضرورت ہے۔ میں عرصہ سے اس پر غور کر رہا ہوں کہ اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اور بہت غور کرنے اور یہاں کے احوال و کوائف کا تقریباً نو سال تک انتھک مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ کل پاکستان مرکز تنہا اپنے شعبہ تنظیم کے ذریعہ مشرقی پاکستان کی قریبی نگرانی نہیں کر سکتا۔ مرکز میں جہاں اور بہت سے شعبے ہیں، مشرقی پاکستان کے بہترین مفاد کی خاطر ایک خصوصی شعبہ کی ضرورت ہے، اسے "شعبہ امور مشرقی پاکستان" کہا جا سکتا ہے۔ اور ماہانہ مرکزی گرانٹ کا ایک چوتھائی حصہ یا مشرقی پاکستان فنڈ کا ایک منظور شدہ حصہ اس پر صرف کرکے اس شعبہ سے بڑے اہم کام لئے جا سکتے ہیں۔

شعبہ امور مشرقی پاکستان جو کام کیا ہوگا، اس کی تفصیلات پر تحریک اسلامی کے ماہرین تنظیم بیٹھ کر سوچ بچار کریں تو کوئی مفید صورت وضع کی جا سکتی ہے۔ اس حل اور کسی متبادل اور بہتر حل پر غور جب تک نہیں کیا جائے گا کام کسی نہ کسی طرح چلتا رہیگا لیکن مشرقی پاکستان میں سیکولر تحریکوں کے مقابلے میں کوئی (بڑا) تعمیری انقلاب تقریباً محال ہے۔

فہرست مفت طلب فرمائیں۔

Printer & Publisher S. Kazim Ali
Printed at Nazar Printing Press Title Printed at Shan Electric Press KARACHI.

اگست 1957 قیمت 0-8-0

روشنی .... گرمی .... حرکت

جلد نمبر ۱۱	شمارہ نمبر ۸

قیمت فی پرچہ: آٹھ آنے
سالانہ چندہ: پانچ روپے

ایڈیٹر:-
جیلانی۔ بی۔ اے

اگست سنہ ۱۹۵۷ء

ترتیب

دفتر چراغ راہ۔ فیض محمد فتح علی روڈ۔ کراچی

سیّد کاظم علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر چراغ راہ فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۵ سے شائع کیا۔

جیلانی بی اے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوچ بچار

ترمیم دستور کے سلسلہ میں وَن یونٹ کی مخالفت اور مشرقی پاکستان کی علاقائی خود مختاری کے مطالبہ میں ایک چیز یکساں جھلکتی
ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے ہر صوبے کو لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے۔ اگر اس تجویز کو عمل میں لایا گیا تو
یہ پاکستان کو ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن میں تبدیل کر دے گی جس میں صوبوں کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیارات اور مرکز کے
پاس کم سے کم اختیارات رہ جائیں گے۔ پھر صوبوں کا اتحاد کسی مرکز کے تحت نہیں ہوگا بلکہ اغراض کے تحت ہوگا۔ جب تک وہ
اغراض پوری ہوتی رہیں گی صوبے ایک دوسرے سے جڑے رہیں گے، لیکن جونہی وہ اغراض ایک دوسرے سے ٹوٹنے سے
پوری ہوں گی وہ بلا تامل علیحدگی اختیار کر لیں گے۔ یہ فرضی امکانات نہیں ہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں کنفیڈریشن بنی وہاں ایسا ہی
ہوا ہے۔ جرمنی کی ریاستیں ایک دفعہ کنفیڈریشن نظام کے تحت جمع ہوئی تھیں لیکن صرف سات سال تک متحد رہ سکیں۔ بالآخر
اس تانے کو خود اپنے ہاتھوں توڑنے پر مجبور ہوئیں کہ جس میں یہ پہلے اپنی فلاح دیکھ رہی تھیں۔ امریکی ریاستیں بھی پہلے کنفیڈریشن
طرز پر متحد ہوئی تھیں، لیکن بہت جلد ہی ان کی انفرادی اغراض اتحاد کی مصلحت پر غالب آنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ عظیم
خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ اگر اس وقت ابراہیم لنکن امریکہ کا صدر نہ ہوتا تو آج امریکی قوم دنیا کی سیاست میں وہ اہم مقام نہ رکھتی جیسا کہ
اب رکھتی ہے۔ اس نے اس وقت تک جنگ بند کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ تمام امریکی ریاستیں اپنے مرکز کے سامنے
سرنگوں نہیں ہو گئیں۔ اس نے مرکز ریاست کے اقتدار کو بچا کر گویا پوری امریکی قوم کی زندگی بچا لی۔ اس کے بعد جب جنگ بند ہوئی
تو انہوں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ امریکی ریاستوں کو فیڈریشن طرز پر ڈھالنے کا تھا، جس میں اگرچہ صوبوں کو اندرونی
خود مختاری حاصل ہوتی ہے لیکن وہ اپنے مرکز کے دائرہ اثر سے باہر نہیں نکل سکیں۔

انفرادیت جس طرح فرد کو خود غرض بنا دیتی ہے اس طرح صوبوں کی ہمدردیاں بھی سکیڑ دے گی۔ پھر ان کے لئے سب سے
ضروری اپنا مفاد ہوگا نہ کہ کسی دوسرے صوبے کا۔ پاکستان کی ہیئت ترکیبی کے پیش نظر یہ اشد ضروری ہے کہ ہمارا مرکز کمزور نہ ہو۔
ہمارا ایک حصہ قدرتی طور پر ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں علیحدگی اور انفرادیت کا احساس ذرا سے ہیجان پر بھی بھڑک سکتا
ہے۔ اگر مرکز کو کمزور تر کرنے کی کوشش کی گئی تو گویا ہم اپنے جسم کی بوٹیاں خود اپنے ہاتھوں گدھوں کو پیش کریں گے ......
مولانا بھاشانی نے جو ایک دفعہ معاملہ کشمیر سے مشرقی پاکستان کی لاتعلقی کا اظہار کیا تھا تو یہ گویا کنفیڈریشن طرزِ حکومت کی نفسیات
کی مثالی جھلک تھی۔

پھر لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر جس خود مختاری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ درحقیقت پاکستان کے کسی مسئلہ کا حل ہے ہی
نہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ وہ کون سی الجھن ہے جس کو کھولنے کے لئے علاقائی خود مختاری کے مطالبات پیش کئے جا رہے

یہی ہمارا ملک بلقان یا یورپ نہیں ہے کہ جہاں مختلف نسلیں مختلف تہذیبوں کو بچانے کی فکر کر رہی ہوں۔ یہاں ایک ہی تہذیب ہے جو مختلف علاقوں میں مقامی، نسلی اور لسانی فرق کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے۔ یورپ اور بلقان کی ریاستوں کو علاقائی خود مختاری کی ضرورت اس لئے تھی کہ ان کے نزدیک ان کا مذہب اتنا اہم نہ تھا جتنا کہ ان کا علاقائی اور نسلی و تہذیبی فرق۔ لیکن ہمارے اس قدرِ مشترک کو جس نے دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہنے والے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے سرے سے ایسی بات ہی نہیں ہے۔ ہمارے لئے مختلف علاقوں اور نسلوں کا باہمی تہذیبی فرق اتنا اہم نہیں ہے جتنی کہ وہ علاقائی خود مختاری کا مطالبہ پیش کرنے والے اگرچہ نیت سے ایسا نہ چاہ رہے ہوں لیکن عمل سے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کی جڑوں پر ہلکی ضرب لگانے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ فی الواقع پاکستان میں ایک کیفیت پیدا کر رہے ہیں کہ اگر کل کو کشمیر پر جنگ کی ضرورت محسوس ہو تو مشرقی پاکستان اس "غیر متعلق" جنگ میں اپنا وقت اور روپیہ ضائع کرنے سے انکار کر دے اور صوبہ سرحد مالِ غنیمت سمیٹنے کے لئے چل کھڑا ہو۔

ترمیمِ دستور کی دوسری تجویز عمل کی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔ اس کا پہلا قدم مخلوط انتخاب اور آخری منزل سیکولر نظامِ حکومت ہے، اور اس کے حامی صرف غیر مسلم ہی نہیں وہ لوگ بھی ہیں جو داعیِ اسلام کے اہلِ بیت ہونے کے دعویدار ہیں۔ دستور کے دینی رنگ کی مخالفت میں جو بھی طبقے پہلے یا اب پیش پیش ہیں ان کی پہلی دلیل تو یہ تھی کہ پاکستان کو مذہبی ریاست بنا کر مہذب دنیا کی نگاہوں میں خواہ مخواہ نکو بنانا ہے۔ اور آخری اور تازہ ترین دلیل یہ ہے کہ قومی اقلیتوں کے دل میں نفیاً خوف دور کرنے اور اثباتاً پاکستان کی محبت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے اندر وطنی قومیت کو فروغ دیا جائے۔ یہ دلیل ظاہراً اسلام اور دین سے تعرض نہیں کرتی لیکن آہٹ پیدا کئے بغیر اس نے اسلام کو دستور بدر کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ قدرتی طور پر اس کے بعد اس کا ہاتھ مذہبِ صدر پر اٹھے گا۔ پھر نامِ ریاست پر اور پھر غالباً پرچم کے ستارہ و ہلال پر۔ اور اس کے بعد اسلامی دفعات کو خارج از دستور کروانا تو معمولی بات ہو گی۔

میدانِ سیاست کارزار آرا ہے۔ ہم وطنی قومیت کے حامیوں کے سامنے دلیلوں کا انبار لگا سکتے ہیں لیکن جن کی قوتِ محرکہ سچائی نہ ہو فقط اپنی اغراض ہی ہوں ان کے سامنے کلامِ نرم و نازک بے اثر ہے۔ اس لئے ہم ان گھناؤنی ترامیم کے عزائم رکھنے والوں سے ایک بات کہہ دینی چاہتے ہیں کہ وہ محض اپنی ناپاک خود غرضی کے لئے پاکستان کو داخلی و خارجی الجھنوں کے لامتناہی جہنم میں پھینک رہے ہیں۔ آنے والی تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ وہ نہ صرف پاکستان میں نئے سرے سے تقسیمِ ہند سے قبل کی دو قومی کشمکش کا آغاز کر رہے ہیں بلکہ اگر کسی شر انگیز کی جانب سے اس کو آگ دکھا دی گئی تو اس کی پوزیشن دنیا بھر کی نگاہوں میں گر جائے گی۔

حامیانِ متحدہ قومیت اپنے ملک میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں کر رہا ہے۔ جس طرح وہ ایک ہاتھ سے عربوں کو دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینے کی پالیسی کا پابند ہے، اسی طرح یہ لوگ ایک طرف مسلمانوں کو اطمینان دلا کر کہ یہ حقیقت میں ہندوؤں کو سیاسی موت کے گھاٹ اتارنے کی چال ہے، دوسری طرف ہندوؤں کو قبل پاکستان جیسی جارحیت کا موقع دے

رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں آج ملک کی مالک اکثریت خوفزدہ ہے۔ لیکن وہ تو یہی ہیں کہ جنہوں نے آج تک پاکستان کو دل سے اپنا گھر نہیں جانا
مخلوط انتخاب کی منظوری کے فوراً ہی بعد آتش زدگی کے واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے۔ گولہ بارود کے ٹرک درآمد ہوتے پکڑے
گئے اور سمگلنگ کی رفتار دوگنی ہو گئی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ فلسطین میں یہودی آبادکاری کی طرح مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کو دھڑا دھڑ
بسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ حقیر اقلیت اکثریت بن جائے۔

پاکستان میں عمل کی آزادی ہے۔ اگر یہاں مخلوط انتخاب بن سکتا ہے تو یہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ مسلمانوں کا جو ملی جذبہ تیس کروڑ ہندوؤں
اور برطانیہ کی عظیم سامراجی طاقت کے علی الرغم رونما ہوا تھا اس کا سوتا پاکستان میں خشک نہیں ہو گیا۔

تیسرا دعویٰ ترمیم زرعی اصلاحات کی مخفی صورت میں آ رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے وزیر مال محمود علی صاحب نے حال ہی میں
ایک تقریر میں کہا کہ ہم اس وقت تک مؤثر زرعی اصلاحات نہیں کر سکتے جب تک کہ دستور میں تبدیلی نہ ہو۔ اس سے ان کا مفہوم یہ ہے
کہ زمین کی یکساں تقسیم دستور کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اور اگر ہم کو اس کی یکساں تقسیم چاہیئے تو دستور میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔
اشتراکی طرز کی یہ پہلی آواز ہے جو پاکستان میں کسی ذمہ دار شخص کی جانب سے اٹھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے جب پنجاب
میں زرعی اصلاحات کا غلغلہ بلند ہوا تو صرف اتنا گمان ہوا تھا کہ یہ طبقاتی شعور کو بیدار کرنے کی حکیمانہ کوشش ہے، لیکن اب معلوم
ہو رہا ہے کہ پاکستان کو لاوارث پا کر سوشلسٹ اسٹیٹ بنانے والے بھی آن موجود ہوئے ہیں۔

قطع نظر اس بات کے کہ ان تجاویز کو کون لا رہے ہیں، ہم ایک بات جاننا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ کیا پاکستان فی الواقع ایک
فیوڈل اسٹیٹ ہے؟

بلاشبہ پاکستان میں بڑی بڑی جاگیریں ہیں اور ان کا مسئلہ موجود ہے، لیکن پہلے اس بات کو تو منقح ہو جانا چاہیئے کہ یہاں پر کتنے
جاگیردار، کتنے اوسط زمیندار اور کتنے ایسے مالکان زمین ہیں کہ جن کو اپنی کھیتی سے پیٹ بھر کر روٹی بھی میسر نہیں آتی؟ پھر جاگیروں
کے مسئلے کا یہ حل تو نہیں ہے کہ یہاں پر غیر مالکان زمین کا طبقاتی شعور بیدار کر دیا جائے۔ اس سے کش مکش تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن الجھن
نہیں کھلتی۔ پنجاب میں دولتانہ زرعی اصلاحات نے اس کی ایک جھلک دکھا بھی دی ہے۔ اس نے نہ صرف زرعی رقبہ میں بسنے والی
پُرامن آبادی کے سکون میں خلل ڈال دیا بلکہ الٹا شرح پیداوار میں بھی کمی کر دی تھی۔

اگر اصلاحات کا مقصد مظلوم کو نامنصفانہ رویہ سے پناہ دینا اور حقدار کو اس کا حق دلانا ہے تو اس کی اور بھی راہیں ہیں
جو تمام تر دائرۂ دستور کے اندر ہیں۔ لیکن اگر اس سے مقصود اپنے سیاسی حریفوں کو زک پہنچانا، اپنے سینے پر عوام کی خدمت
کا ایک تمغہ آویزاں کرنا، یا ایک مفروضہ فرض بجا لانا ہے تو یہ اور بات ہے۔

ایک تجویز ملک کے ذمہ دار ترین صاحب منصب کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔ یہ کہ ملک میں کابینہ نظام کی بجائے صدارتی نظام
ہونا چاہیئے۔ اس تجویز کے ساتھ دلائل منسلک نہ تھے۔ تاہم اس خواہش سے یہ بات از خود واضح ہو رہی تھی کہ سربراہ حکومت
مقننہ کی اطاعت سے مایوس ہو چکا تھا اور اس کے نزدیک ایسی مقننہ بجائے ممد ارتقاء بننے کے اُلٹا کام کی راہ میں رکاوٹ بن کر

رہ جاتی ہے۔ اس لئے انتظامیہ کے ہاتھ میں اتنے اختیارات ہونے چاہئیں کہ وہ بروقت مؤثر اور سریع اقدامات کرنے میں پوری طرح سے آزاد ہو۔ ہم نے ایک سابقہ اشاعت میں اس تجویز کا بالتفصیل جائزہ لیا تھا۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ہی کر دینا کافی ہوگا کہ صدارتی نظام میں کابینہ نظام کی نسبت بھٹکنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدارتی نظام میں صدرِ ریاست کو جم کر کام کرنے کا موقع ہوتا ہے اس لئے کہ اس کا منصب ارکان مقننہ کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا۔ لیکن کابینہ نظام میں وزارت کی اساس ارکان مقننہ کے ووٹوں پر ہوتی ہے۔ وہ اس لئے دلجمعی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے کہ ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کب ان کی اکثریت اقلیت میں بدل جائے گی۔ بایں ہمہ مطلق العنانی کے جتنے خطرات صدارتی نظام میں مضمر ہیں اتنے کابینہ نظام میں نہیں پائے جاتے۔ کابینہ نظام میں مطلق العنانی حاصل کرنے کے لئے کافی وقت اور کافی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ صدارتی نظام میں یہ نیت کی تبدیلی سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ صدرِ حکومت بحری، بری اور فضائی تینوں افواج کا کمانڈر انچیف ہوتا ہے۔ صدر کے اندر ذرا سا خلل نیت بھی ملک کو جمہوریت کی آزادی سے نکال مطلق العنانی کی غلامی میں پھینک سکتا ہے۔ امریکہ، جہاں پر یہ نظام چل رہا ہے، اس نازک سے نازک تر کی کے دونوں نظارے پیش کر رہا ہے۔ اس کے مرکزی نظام میں جس شگفتے کی سی نازک جمہوریت کی نظیر ملتی ہے، وہی لاطینی حصہ میں نہایت گھناؤنی ڈکٹیٹرشپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یہ خود امریکہ کے اندر، اس کے مختلف حصوں میں اس حسن و خوبی کے ساتھ موجود نہیں ہے تو مشرق میں اس حسن و خوبی کے ساتھ اس کا موجود ہونا بڑی ہی بعید بات ہے۔

اگرچہ دنیا میں ہر جگہ انتظامیہ زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کا رجحان رکھتی ہے، تاہم پاکستان میں اس مطالبے کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ وہ یہ کہ آزادی کا جو انقلاب ہمارے ہاں آیا تھا وہ صرف گلی کوچوں اور بازاروں ہی میں آیا تھا۔ ملک کے سرکاری دفاتر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ حاکمیت (Sovereignty) کی تبدیلی کے باوجود ہمارے ملک کا انتظام انہی ہاتھوں میں رہا کہ جن کی ذہنی تربیت خالص انگریزی استبداد کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ بارہ سال تک وہ جس نظام (۱۹۳۵ء ایکٹ) کے تحت کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے دس سال تک انہیں مزید انہی بنیادوں اور اسی طرز پر پھر کام کرنا پڑا۔ اس نظام میں انتظامیہ غالب اور مقننہ مغلوب تھی۔ وہ اس ترتیب کے کچھ ایسے خوگر ہو چکے تھے کہ اس کے علاوہ کسی ترتیب سے وہ طبعاً اور مزاجاً مانوس نہ ہو سکتے تھے۔

پھر اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت انتظامیہ کو اس لئے بھی محسوس نہ ہوئی کہ قیام پاکستان کے بعد ملک کی داخلی سیاست میں سخت اختلال واقع ہو چکا تھا۔ وزارتیں آئے دن ٹوٹتی رہتی تھیں اور انتظامیہ کے لئے پالیسی بنانے اور کام کی نگرانی کرنے کے لئے کوئی عوامی نمائندہ موجود نہ ہوتا تھا۔ بالآخر انتظامیہ کو سارا کام خود ہی سنبھالنا پڑا۔ مقننہ اپنی داخلی سازشوں کے سبب جوں جوں وقار کھوتی گئی انتظامیہ کے اندر توں توں یہ احساس ابھرتا گیا کہ ملک کی ناؤ کے حقیقی کھیون ہار ہم ہی ہیں۔ ان کا یہ احساس برتری دراصل اس طرح غالب آگیا کہ مقننہ اپنی رہنمائی کے لئے سیکرٹری سروسز سے قائد درآمد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اور اس طرح جس انتظامیہ کو عوامی نمائندوں کے زیر ہدایت و نگرانی کام کرنا تھا وہ اب ان ہی پر حکمرانی کرنے لگی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انتظامیہ کا یہ رجحان کہاں جا کر رکے گا؟ تاہم اتنی بات ضرور واضح ہے کہ اگر ہمارے ملک میں عوام

کے نمائندوں کے زیرِ ہدایت و نگرانی کام نہیں ہوگا تو وہ نظامِ حکومت جمہوری نہیں، کچھ اور ہوگا۔

حال ہی میں خود حکومت کی جانب سے ایک بل گزٹ ہوا ہے جس میں ملازمین حکومت سے عدالتی داد رسی کا حق چھین لینے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ حکومت اس تجویز کو اس خدشہ کے پیشِ نظر لا رہی ہے کہ اگر ملازموں کا حقِ استغاثہ تسلیم کر لیا گیا تو ملازم دلیر ہو جائیں گے اور ذرا ذرا سی بات پر حکومت کے خلاف عدالت میں دعوے دائر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس طرح کام میں سخت خلل واقع ہوگا۔

یہ دلیل دفاترِ حکومت کے لحاظ سے تو درست ہو لیکن عدل کی رو سے سخت غیر معقول ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسی پردے میں خود حکومت اپنے ملازمین پر زیادتیاں کرتی رہی تو اس کا کون ذمہ دار ہوگا؟ جن بے اعتدالیوں کی روک تھام کے لئے حکومت ایک مستقل شعبہ (وزارتِ محنت) رکھتی ہے انہی بے اعتدالیوں کو اب یہ خود بلاخوف پرسش اختیار کرنا چاہتی ہے؟

یہ دستور بھی واضح ہے کہ تمام باشندگانِ ملک قانون کی نگاہ میں مساوی اور اس کی پناہ کے یکساں حقدار ہیں۔ اس بل کی رو سے ایک طبقہ باشندگان ایسا موجود رہے گا کہ جو قانون کی پناہ کا یکساں حقدار نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملازمین کو ناانصافی کے خلاف فریاد کرنے کی اجازت دینے سے کام میں خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ اس کی اجازت نہ دینے سے ہوگا۔ یہ جبر ان کے اندر نفرت اور بیزاری کے بیج بو دے گی اور وہ اس ذوق و شوق سے کام نہیں کریں گے کہ جس کی خود حکومت کو اشد ضرورت اور طلب ہے۔

اس سرسری جائزے کے بعد ہم اپنے سوال کی طرف آتے ہیں۔

لاریب دستور میں ترمیم کا حق دستوری حق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اپنی سیاسی رزم آرائی کے لئے اک دستور ہی کیوں ہدف بنایا جا رہا ہے؟ کیا اس سے یہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دستور میں جس منزل کا نشان ملتا ہے وہ عوام کی منزل نہیں ہے۔ عوام کی اصل منزل کا پتہ ہم دے رہے ہیں؟ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان اس لیے بنایا گیا تھا کہ بنگالی، سرحدی اور سندھی تہذیبوں کے جو جوہر انگریزی ملاء ما استبداد میں دب گئے تھے وہ نمایاں ہوں؟ یا سارا کشت و خون اس لئے ہوا تھا کہ جس ہندو مسلم اتحاد کے لئے گاندھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رہ گیا تھا وہ پورا ہو؟ یا یہ کہ یہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ خوابیدہ سرجاہل اشتراکیوں کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں؟ یا پھر یہ کہ یہاں کے عوام اس لیے انگریزوں کے خلاف لڑے تھے کہ وہ کبھی لاٹ بہادر کی حکومت کے زیرِ سایہ رہنے کے متمنی تھے؟

اسعد گیلانی

اسلامی نظامِ حیات کا ایک نقیب

جس تدریج سے ملتِ مسلمہ اجتماعی طور پر اسلام کے بتائے ہوئے مکمل نظامِ حیات سے ہٹتی گئی اور زندگی کے معاملات میں خود بخود
کے ساتھ ساتھ قیصر کا بھی حصہ تسلیم کرتی چلی گئی اسی نسبت سے وہ دنیا کی امامت اور اقتدارِ زمانہ کی نشستین سے تدریجاً پستی کی طرف
گرتی چلی گئی۔ اسلام سے فرار اور زوال سے ہم آغوشی میں یکساں نسبت ہے۔ اس عملِ انحطاط کے شروع ہونے کے بعد ایسا نہیں ہوا
کہ انحطاط کی تحریک یک آگئی ہو یا اسے آتے ہوئے کسی نے محسوس نہ کیا، یا پستی سے پھر بلندی کی طرف پیش قدمی کے لئے کسی نے پکارا
نہ ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ملتِ مسلمہ کی پوری تاریخ میں سنبھلنے کے لئے آوازیں اور مکمل اسلامی نظامِ حیات کی طرف مراجعت کی پکاریں
مُسلسل سُنائی دیتی رہی ہیں۔ جس جس نے جس جس بیماری کو ملت میں جہاں جہاں زیادہ کارفرما دیکھا اس سے بچنے کی تلقین کی، اس کا
قلع قمع کرنے کی جدوجہد اور اس سے ہٹا کر مسلمانوں کو اسلام کی طرف پلٹائے جانے کی مسلسل کوششیں جاری رکھیں ——— اس معاملہ
میں مسلمان قوم سے زیادہ زرخیز گود اور کسی کی نہیں ہوئی۔

قوموں کے عروج و زوال کا عمل کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے سمندر کا مدوجزر۔ جب عروج ہوتا ہے تو لہریں چڑھتی ہیں اور جب چڑھنے
پر آتی ہیں تو پھر ہر لہر پہلی سے پیش قدمی کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ ہر لہر کا قدم آگے اور ہر موج کا سینہ ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب
زوال ہوتا ہے تو پھر ہر لہر پہلی سے پسپا رہتی ہے اور ہر موج کا قدم دُوسری سے پیچھے ہوتا ہے۔ اسی طرح دورِ عروج میں ہر نسل پہلی
سے بہتر اور قوم کے اکابرین میں اصلاح کا جذبہ ایک سے ایک بڑھ کر موجود اور کارفرما ہوتا ہے، اور قوم کا بہترین عنصر چھٹ کر اس کی
قیادت کرتا ہے۔ لیکن جب دورِ زوال شروع ہوتا ہے تو ہر نسل پہلی سے کمزور اور بدتر اٹھتی ہے اور اپنے حقیقی مقصدِ حیات سے دُور تر
ہوتی چلی جاتی ہے۔ قوم کا بدترین عنصر بلکہ تلچھٹ قیادت کے مقام پر فائز ہوتا اور ایک سے ایک بڑھ کر ملت کو زوال و پستی کی طرف
دھکیلتا ہے۔

اقبالؒ ان خوش نصیب افراد میں سے ہے جسے ملتِ مسلمہ کے مُصلحین میں شمار کیا جا سکتا ہے اور جس کی حیثیت اس موج کی
سی تھی جو زوال و پستی اور جمود کے دور میں عروج و بلندی اور مد کی طرف رہنمائی اور پیش قدمی کرتی ہے۔ اس نے کارِ اصلاح میں ایک
ت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اگرچہ اصلاح کے لئے انہوں نے شاعری کو ذریعہ بنایا لیکن ان کی شاعری ذہنی عیاشی، داد طلبی اور یاوہ گوئی
تمل نہیں تھی جس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کا اطلاق ہوتا ہو کہ :

"آدمی کے لئے پیٹ کو پیپ سے بھر لینا جو پیٹ کو خراب کر دے اس سے بہتر ہے کہ وہ اس میں شعر کو بھر لے"

بلکہ اس کا شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ :

"تم کافروں کو شعر سے اس طرح مارتے ہو جس طرح نیزوں سے"

اور یہ کہ :

"مومن اپنی تلوار سے جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی"

اقبالؒ نے خود اپنی شاعری کے متعلق کہا ہے کہ ؏

مصرعِ من قطرہ خونِ من است

چنانچہ اقبال نے شعر و شاعری کو غیر اسلامی نظامِ فکر کے خلاف اپنی مساعی کی حد تک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور اسلامی نظامِ فکر کی راہ ہموار کرنے کے لئے اپنی شعری صلاحیتوں کو عمر بھر وقف رکھا۔ ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے آم کا موسم آنے سے پہلے کوئل کوکتی ہے اور موسمِ انبہ کی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ اسی طرح اقبال نے فکری طور پر اسلامی نظام لانے کا جذبہ، اس کے آنے کی تمنّا اور اس کی آمد کی خبر سنائی ہے۔ ؎

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور!
کھا گئی رُوحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

اس نے قوم کے منجمد وجود میں تجدیدِ فکر اور اصلاحِ حال کی بہت سی لہریں دوڑائی ہیں اور ایک وزنی کارنامہ ہے جو انجام دیا ہے۔ اقبال کے اس اصلاحی اور تعمیری کارنامے کے تین پہلو ہیں :-

۱۔ پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مغربی تہذیب کے خلاف عالمِ افکار میں ایک شدید کشمکش کی اور مسلمان نوجوان کی مرعوبیت کو ختم کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ اس نے اسلام کو ملت کے عالمِ افکار میں، ایک محبوب جس سے عشق کیا جائے، ایک جذبہ جس کی قدر کی جائے، ایک نصب العین جس کی تمنّا کی جائے اور ایک کھوئی ہوئی شے جس کی جستجو کی جائے، کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی اصطلاحات کو دوبارہ زندگی دی اور ان کی معنوی تجدید (Re-valuation) کی۔ چنانچہ ان کا سارا ذخیرہ شعری اس پر گواہ ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عالمِ سیاسیات میں ہندوستان کی ملتِ مسلمہ کو ایک سیاسی نصب العین دیا جو ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کی ایک علیحدہ ریاست کے قیام کے تصور پر مشتمل تھا۔ اس تصور کو بروئے کار لانے کے لئے اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو حقوق طلبی کے لئے ساری جدوجہد کرتی تھی ایک ایسا لیڈر فراہم کر کے دیا جو دھن کا پکا ثابت ہوا، اور جس طرح کا کام وہ کر سکتا تھا اس نے اقبال کے دیئے ہوئے خطوط پر وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کو پاکستان کا تصور دینے کے بعد مسٹر محمد علی جناح مرحوم کو یورپ سے بلا کر مسلمانوں کی رہنمائی کرنے پر انہوں نے ہی آمادہ کیا

۳۔ اس نے تیسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ عالمِ اسلام میں ایک نئی اسلامی تحریک کے اُٹھ کھڑے ہونے کے امکانات کا جائزہ لے کے اس کے لئے حتی المقدور اسباب فراہم کئے۔ اس کی شناخت کر کے ان اسباب کو پنجاب منتقل کیا جو ایسی تحریک کے لئے موزوں ترین سرزمین ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو حیدر آباد دکن سے بلا کر پٹھان کوٹ دارالاسلام میں ٹھیرایا اور اس کے لئے حتی الامکان امداد فراہم کی۔ موصوف اس وقت قوم میں دعوت و تنقید کا کام کر رہے تھے اور بالآخر انہوں نے ۱۹۴۱ء میں

ایک تحریکِ اسلامی کی بنیاد رکھ دی جو آج مسلمانوں کو اس کے اصل نصب العین اقامتِ دین کی طرف بلا رہی ہے۔

یہ تین کارنامے ہیں جو اس کی زندگی کے سارے کام کا تجزیہ کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ یہ کارنامے اپنی اپنی جگہ ایک مکمل صورت رکھتے ہیں اور تکمیلی مدارج طے کر سکے ہیں۔ البتہ یہ بات شرحِ صدر سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کارناموں کی انجام دہی کی طرف اس نے ایک شعوری پیش قدمی کی۔ اس کی خود اپنی زندگی تلاشِ حقیقت کی ایک مسلسل داستان ہے جس میں کئی مقامات ایسے بھی آتے ہیں جن کا مستقل تجزیہ کیا جائے تو اس کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ لیکن انسان کی زندگی ایسی چیز نہیں ہے جس کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے مطالعہ کیا جائے۔ وہ تو بہرحال ساری کی ساری سامنے آئے گی اور اس ساری زندگی کی اٹھان، رجحان، پیش قدمی، آرزوئیں، تمنائیں، اعمال و افکار اور نتائج سبھی کچھ بیک وقت سامنے رکھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے گا۔ یہ بات پہلے قدم پر ہی اس کے بارے میں سمجھ لینے اور طے کر لینے کی ہے کہ اس کی اصلاحی، تعمیری اور تجدیدی تگ و دو کا سارا میدان ملت کا عالمِ افکار اور اجتماعی ذہن ہے۔ عالمِ اعمال و اسباب میں کام کرنے کا نہ اسے دعویٰ ہے اور نہ اس کے کام کا تجزیہ اس نقطۂ نظر سے کر کے اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

نا پید ہے بندۂ عمل مست   باقی ہے فقط نفس درازی

حضورؐ کے ارشاد کے مطابق مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔ تو اس کوئی شک نہیں ہے کہ اس نے زبان سے جہاد کا حق ادا کیا ہے، اور اس کا یہ جہاد اس دشمن کے خلاف ہے جو اس دور میں اسلام کا بد ترین دشمن ہے یعنی مغرب کی الحادی تہذیب۔ تلاش و جستجو کے ابتدائی مرحلے میں وہ متحدہ قومیت اور لادینی سیاست کا قائل اور وطن کا پرستار تھا ؎

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس نے فکری لحاظ سے جس پگڈنڈی پر سفر شروع کیا تھا اس کے بعد کئی راستوں پر ٹھوکریں کھائیں۔ کچھ دنوں وہ مسلم قوم پرستی کو ملت کے مسائل کا واحد حل سمجھتا رہا لیکن بالآخر وہ اسلام کی اس آخری تعبیر اور اپنے ذہنی سفر کی اس آخری منزل تک پہنچ گیا جو کسی علاقہ میں محدود نہیں بلکہ صاف، سیدھی اور عالم گیر ہے ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اس نے دین کا وہ ہمہ گیر تصور اختیار کر لیا جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا،

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں کی خدمت میں صرف کر دے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں۔ جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو ـــــــــ آج تمہارے دین کی بلند نظری فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں، جو

صدیوں کی مدت میں ہم نے خود اپنے گرد تعمیر کر لیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ (ذکرِ اقبال ——— ۲۱۴ صفحہ)

مسلمان قوم کے اندر قومیت اور وحدت کے مشترک لوازمات کو بیان کرتے ہوئے جوابِ شکوہ میں فرمایا ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

انہوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

"اسلام وحدتِ انسان کو روح اور مادہ کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔" ؏

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ!

انہی تصورات کے پیشِ نظر ایک مدت سے ان کے سینے میں احیاءِ اسلام کی تمنا پرورش پا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام اب صرف کتابوں میں رہ گیا ہے اور وہ بھی دھندلا۔ اس پر زمانے کے گرد و غبار کی تہ در تہ چڑھ گئی ہے اور اس کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ وہ اسلام جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف پیش کیا تھا، دوسری طرف خود اس پر عمل کر کے دکھایا تھا اور تیسری طرف نافذ کر دیا تھا اب وہ کہیں نظر نہیں آتا تو ان کا سینہ غم و درد سے بھر جاتا۔ چنانچہ ایک لمبے عرصہ تک وہ اس فکر میں رہے کہ اس پر جمے ہوئے گرد و غبار کو جھاڑ کر زندگی کی عملی تگ و دو میں اسے پیش کیا جائے۔ اس شعر میں ان کی یہ تمنا پوری طرح جھلکتی ہے ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے خود فرمایا کہ اس سے میرا اشارہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی طرف ہے اور اس وضاحت سے خود بخود یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان کا تصورِ اسلام کتنا واضح، نکھرا اور کتاب و سنت سے ماخوذ تھا۔
(ملفوظاتِ اقبال ص۲۴)

ایک دوسرے موقعہ پر احباب کی مجلس میں انہوں نے اپنے اس جذبہ کو اس طرح ظاہر کیا:

"There is a crust at the heart of Central Asia. I want to break through it"

(ملفوظاتِ اقبال ص۱۲)

"وسطِ ایشیا کے قلب پر بے خبری کی ایک موٹی گہری تہ جمی ہوئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے پاش پاش کر دوں"
ان الفاظ میں ان کی وہ تمنائے تجدیدِ اسلام پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی ہے۔

لیکن جہالت اور بے خبری کی یہ موٹی تہ توڑ کر وہ کون سا چشمہ ہے جو وہ بہا کر وسطِ ایشیا کے انسانوں کے سامنے لانا چاہتے ہیں اور ان کے سامنے وہ کون سا تصورِ قومیت ہے جسے وہ واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔ اسے وہ خطبہ آل انڈیا مسلم کانفرنس' اجلاس منعقدہ لاہور ۲۱-۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

"اسلام کی حیثیت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام کے اندر مذہب کا مفہوم خصوصیت سے چھپا ہوا ہے اور ہماری مذہبی زندگی کا مقصد اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بہ الفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا ابدی گھر اور وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگریزوں کو انگلستان سے اور جرمنوں کو جرمنی سے ہے وہ ہم مسلمانوں کو اسلام سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا دوسرے لفظوں میں خدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔" (خطبات ص۹۴)

اسی خطبہ میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعتِ مُسلمین کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہیئے۔ صبغۃ اللہ کے اس خُم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مُسلمان دو رنگی چھوڑ کر ایک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی پس منظر ایک ہو۔ وہ مظاہرِ آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔" (خطبات ص۹۶)

چنانچہ اسی احیائے اسلام اور دو رنگی کو چھوڑ کر یک رنگ کرنے کے کام کے لئے وہ ناگزیر سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم اپنا ہو اور جو غیروں نے ان پر ٹھونسا ہے اسے بدلا جائے اس لئے کہ نظامِ تعلیم ہی انسان کا دل و دماغ بدل کر اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور انسان ظاہر میں چاہے جس رنگ اور صورت کا رہے لیکن داخلی طور پر یکسر بدل کر اسے کسی دوسرے ہی انداز کا انسان بنا دیتا ہے ؎

شیخ مرحُوم کا یہ قول بھی یاد آتا ہے
دل بدل جائینگے تعلیم بدل جانے سے

چنانچہ آپ نے دیکھا کہ کس طرح دل بدل گئے اور مسلمانوں کے گھروں میں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خدا اور رسول کے بھی منکر ہو گئے۔ انہوں نے ایک جگہ اپنے خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۱ء میں فرمایا:

"میں گزشتہ دس گیارہ برس سے درس دے رہا ہوں اور طالب علموں سے میرے سابقہ ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے تصورِ حیات سے محض نابلد ہے اور اگر دس بیس سال یہی حالت قائم رہی تو اسلامی رُوح ہماری جماعت

کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی"۔ (خطبات صد ۱۰۳)

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لاالٰہ الا اللہ!

پھر آگے فرمایا "ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو اپنا مرکز نہ ہونے کے سبب اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ختم ہو جائے گا جس میں اسکی نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی"۔ (خطبات صد ۱۰۲) (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مارچ ۱۹۱۱ء)

چنانچہ یہ بات ہو کر رہی کہ ہماری قوم کا ایک طبقہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن میں ایسا غرق ہوا کہ بحیثیت مسلمان کے اس کی شناخت مشکل ہو گئی۔

اقبال کے نزدیک احیائے اسلام کی جد و جہد میں سب سے پہلا کام جو کرنے کا ہے وہ تہذیبِ مغرب پر شدید ضرب لگانا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ بے خدا تہذیب ہے جس نے دنیا میں خدا پرستی کی جڑ کاٹی ہے۔ جس نے ایک ایک کر کے مسلمان اور کمزور ملکوں کو دبایا ہے اور طاقت اور ہوس کو حق قرار دیا ہے۔ اسی کے نظامِ تعلیم سے فارغ ہو کر مسلمانوں کے گھروں میں ملحد پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی مرعوبیت کو ختم کرنا ضروری ہے

سُن لے اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بدتر ہے بے یقینی!

چنانچہ ایک بار جب احیائے اسلام کا ذکر ہو رہا تھا تو فرمانے لگے "اسلام تہذیبِ حاضرہ کی تمام ضروری اور اصلی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوششیں کرنی چاہئیں، نہ یہ کہ ان کو جزوِ اسلام بنا لیا جائے"۔ (ملفوظات صد ۱۱۹)

پھر فرمایا:

"اب دنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے اس لئے اگر آج مغربی تہذیب تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ لہٰذا ... مسلمانوں کو اس آنے والے دور کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ جس وقت تہذیبِ جدید کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیئے"۔ (ملفوظات صد ۱۱۳)

تہذیبِ مغرب کی تباہی کے ساتھ ساتھ اسلام کا علم بلند کرنے کے لئے جو لازمی تیاری ان کے نزدیک ناگزیر تھی وہ یہ کہ اسلام کے نظامِ حکومت اور قانون کو زمانہ حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدوّن اور مرتب کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ مدت سے غور و فکر کر رہے تھے۔ ذکرِ اقبال میں ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ "وہ جوانی ہی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانہ میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے جیورِس پروڈنس (Juris Prudence) یعنی اصولِ قانون کی روشنی میں شرعِ اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں، اور دلیل و برہان سے اصولِ فقہِ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کر دی جائے"۔ (ذکرِ اقبال صد ۲۱۲)

دوسری جگہ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کا خیال تھا کہ :

"ایک جماعتِ علماء بنائی جائے جس میں وہ مسلمان قانون دان بھی لازماً شامل کئے جائیں جنہوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ شرع اسلامی کی حفاظت کی جائے۔ اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری ہو تو حالات جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر و تاویل کی جائے جس میں اس کے اصولِ اساسی کی اسپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے۔ اس مجلس کی حیثیت آئینی اعتبار سے مسلّم ہونی چاہیئے تاکہ ہر مسوّدہ قانونی جو مسلمانوں کے پرسنل لا سے تعلق رکھتا ہو اس مجلس میں پیش ہو کر بحث و تمحیص کے تمام مراحل طے کرے۔" (ذکرِ اقبال ص۱۶۳)

وہ ایک ایسے ادارے کے قیام کے خواہش مند بھی تھے جس کے ذریعے علوم اسلامی کا احیاء ہو۔ چنانچہ پٹھانکوٹ میں جب ایک صاحبِ خیر نے اپنی اراضی اور مکانات پیش کر کے ایسے ایک ادارے کے قیام کی پیشکش کر دی تو علامہ اقبال مرحوم نے جامعہ ازہر کے شیخ کو لکھا :

"ہم ایک ادارہ قائم کر رہے ہیں یہاں چند باصلاحیت اور فارغ التحصیل ماہرین علوم اسلامی کو جمع کیا جائے گا۔ ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی قدیم و جدید کتب موجود ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل اور صالح ہو اور قرآن کریم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو۔ اور نیز انقلابِ دورِ حاضر سے بھی واقف ہو تاکہ وہ ان کو کتاب و سنت کی روح سے واقف کرائے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید کرے اور پھر اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کرے"۔

یہی وہ دارالاسلام تھا جہاں بعد میں علامہ اقبالؒ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں کو لائے اور جہاں سے تحریکِ اسلامی کی انقلابی کتب اور رسالہ ترجمان القرآن کی اشاعت کی جاتی رہی۔

علامہ اقبال مرحوم خود بھی مطالعۂ قرآن کے بارے میں اسلامی تصورات پر مبنی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا نام "تعارفِ مطالعہ قرآن"، (Introduction to the study of Quran) تھا۔ فرمایا کرتے :

"ذرا صحت اچھی ہو تو چاہتا ہوں کہ کوئی پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب عالم دین میسّر آئے جو مجھے حوالہ جات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے۔ انگریزی سے واقف ہو تو نہایت اچھی بات ہے۔ ایک دفعہ میں نے کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام نظریات (Theories) کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتب بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر خرید لوں۔ یہ اب میرے کس کام کی ہیں"۔ (ملفوظات ص۳۱)

ایک طرف ان کے سامنے تہذیبِ مغرب کے مقابلے میں اسلام کی علمی اور فکری تحریک برپا کرنے کا یہ عظیم ارادہ تھا، دوسری طرف سیاسی طور پر بھی وہ مسلمانوں کی جدوجہد سے بے تعلق نہ تھے۔ وہ ان کے سامنے ایک لائحہ عمل رکھتے تھے۔ مسلمانوں کو وہ اسلام کے نام پر اسلامی مقاصد کے لئے یک جا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خطبہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں فرمایا :

"دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعتِ اسلامی کی ترکیب اسلام ہی کی رہینِ منت ہے اس لئے کہ اسلامی تمدن بمانند ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے ——— اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قید سے

آزاد کر سکتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسلام کی قضا یہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستورِ حیات اور نظامِ عمل کے اسلام کی پوری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے حامل بن سکیں۔" (خطبات ص ۳۰)

پھر ایک اسلامی ریاست میں پاکستان کا تصور دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ کسی طرح غیر مناسب نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہم ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے اور مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو تو لازماً ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔" (خطبات ص ۳۶-۳۷)

چنانچہ حکیم الامت کی وہ پیش گوئی جو ۱۹۳۰ء میں کی گئی تھی ۱۹۴۷ء میں سترہ سال بعد آ کر پوری ہوئی۔ لیکن ان کے سامنے ایسی ریاست کا جو مقصد تھا وہ انہوں نے مسلم لیگ کے آل انڈیا اجلاس الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں اس طرح پیش کیا تھا:

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام اس ملک میں بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔" (خطبات ص ۳۷)

چنانچہ ان کے نزدیک اگر مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست قائم کرنے یعنی پاکستان حاصل کرنے کا کوئی مقصد تھا تو وہ یہی تھا کہ اس ملک میں اسلام کی تمدنی قوت کو برباد نہیں بلکہ محفوظ اور زندہ کیا جائے اور اس علاقہ میں اسلام کو نظامِ زندگی کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس لئے کہ اسلام کے نظامِ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ایک اسلامی حکومت کے قیام کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انہوں نے ایک مجلس میں فرمایا:

"قرآن میں مسلمانوں کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعتِ حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمان امر و نہی کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے۔"

پھر ایسی ایک ریاست کے قیام کی جدوجہد کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے قائد اعظم سے خط و کتابت کی اور ان کو مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کیا تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں ایک خطۂ زمین ایسا ہاتھ آ جائے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت کی تلوار ہو جس کی مدد سے وہ امر و نہی کا کام کر سکیں۔

یہ دونوں تمنائیں ان کے دل میں رہیں اور ان کی زندگی میں بار آور نہ ہوئیں۔ ان کو خود بھی اس کی امید نہ تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی شکل میں منتج ہوئی اور بدقسمتی سے ایسے حضرات اُوپر آئے جنہوں نے اسلام کے تمدن کی حفاظت کی بجائے اس کی بجائے اس کی بربادی کا ایک مستقل منصوبہ بنا لیا۔ پٹھان کوٹ میں قائم کردہ اس علمی اور فکری ادارے نے بالآخر ایک اسلامی تحریک کی شکل اختیار کر لی جو آج ملک میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعتِ اسلامی کے نام سے احیائے اسلام کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔

علامہ اقبال مرحوم کی زندگی جس طرح ایک تدریج سے چل کر مسلسل ارتقاء کرتی ہوئی اسلام کے صحیح شعور تک پہنچی اس کا سبب اُن کا

ابتدائی تربیتی اور گھریلو ماحول بھی تھا۔ ان کے والدِ محترم کی ایک نصیحت سونے کے حروف میں لکھے جانے اور ہر مسلمان کے سینے پر کندہ کرنے کے قابل ہے جو انہوں نے ایک بار اقبال کو قرآن پڑھتے دیکھ کر کی۔ انہوں نے فرمایا:

"بیٹا قرآن کو اس طرح نہ پڑھو جیسے یہ کوئی کتاب ہے جو تیرہ سو سال پہلے عرب میں ایک انسان پر نازل ہوئی تھی بلکہ اسے یوں پڑھو کہ جیسے یہ تمہارے مالک کی کتاب ہے اور تم پر ہی نازل ہو رہی ہے اور تم ہی اس کے براہِ راست مخاطب ہو"

یہ وہ ابتدائی نقطۂ آغاز ہے جس کے ذریعے علامہ اقبال نے قرآن پر غور کرنے کا صحیح رُخ پایا اور ان کے ہاتھ میں ساری گتھیوں کی شاہ کلید آگئی چنانچہ مرحوم جب قرآن پاک پڑھتے تو مطالب پر نظر رہتی۔ ایک ایک لفظ پر غور کرتے۔ نماز کے دوران میں بھی باآوازِ بلند پڑھتے اور متأثر ہو کر رو پڑتے۔ دوسری چیز جو اُن کے ہاں بڑی نمایاں ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کا عشق ہے۔ حضورؐ کا نام آتے ہی وُہ بے قابو ہو جاتے۔ ان کا دل حضورؐ کی محبت کا سمندر لئے ہوئے تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب وہ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس کی دعوت پر مدعو تھے۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے آرام دہ اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسولِ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے حاصل ہیں اس نے تو بوریے پر سو سو کر زندگی گزار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر بیٹھنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنی چارپائی اس غسل خانے میں رکھوالی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے میں ہی سوتے رہے۔ (ذکر اقبال ص ۲۲۴)

وہ سادہ اور فقیرانہ زندگی کے قائل تھے چنانچہ خود اپنے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ہوں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے جو کسی بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں" (ذکر اقبال ص ۲۴۱)

وہ اکثر اپنی مجالس میں سادہ زندگی کی تلقین فرمایا کرتے، بلکہ حضورِ رسالت مآب کی سادہ زندگی کو اپنا اسلوب بنانا چاہتے۔ کسی قسم کے تکلفات میں الجھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کوٹھی میں رہائش کے باوجود انہوں نے اپنی معاشرت وہی سادہ رکھی۔ فرش پر بیٹھتے۔ غیر ملکی لباس سے نفرت تھی۔ اکثر شلوار اور چھوٹا کوٹ پہنتے۔ عیدین کی نماز کے موقع پر کبھی کبھی بند گلے کا کوٹ بھی پہن لیتے۔ دیسی جوتی اور تُرکی ٹوپی پہننا پسند کرتے۔ کبھی کبھی صافہ بھی باندھ لیتے۔ دیسی کھانے رغبت سے کھاتے۔ ڈیوڑھی میں ایک کھری چارپائی بچھی ہوتی جس پر چھوٹا سا تکیہ دھرا ہوتا۔ پائنتیوں کی طرف کوئی کپڑا نہ ہوتا، اس پر اکثر بیٹھا کرتے، سادہ کُرتے اور شلوار میں ملبوس ———" (ملفوظات ص ۲۹۸)

——— بس یہ ان کی معاشرت تھی۔

حلال و حرام کی بڑی احتیاط کرتے۔ جن دنوں وکالت کرتے تھے ایک عالمِ دین کو خط لکھ کر پوچھا کہ لوگ جو اپنے ساتھ فیس کے علاوہ تحائف لے آتے ہیں یہ جائز ہیں یا ناجائز ——— فرمایا کرتے: "فقیر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے۔ نور ایمان بھی کسبِ حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے" (ذکر اقبال ص ۲۴۶)

جہاد کا بڑا شوق تھا۔ جب کبھی صحابۂ کرام اور مجاہدین کا ذکر آتا تو دل بھر آتا۔ حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے لمبے برس کی عمر میں شوقِ جہاد اور شہادت کا ذکر کیا تو چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔ بولنے کی طاقت نہ رہی اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

حج کا شوق اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ آخری عمر میں حج کی تیاریاں جاری تھیں۔ ان کی کتاب ارمغانِ حجاز اس زمانے کی یادگار ہے جب جسم ہندوستان میں اور ان کی روح طوافِ حرمِ پاک میں رہا کرتی تھی ؎

به این پیری رهِ یثرب گرفتم — نوا خوان از سرودِ عاشقانه
چو آں مرغے که در صحرا سرِ شام — کشاید پر به فکرِ آشیانه!

یہ اُن کی قلبی اور ذہنی کیفیت تھی کہ وہ اپنے آپ کو رہِ حجاز کا مسافر سمجھتے تھے ؎

سحر با ناقه گفتم نرم تر رَو — که راکب خسته و بیمار و پیر است
قدم مستانه زد چندان که گوئی — به پایش ریگِ این صحرا حریر است

لیکن حجاز کا راستہ قطع کر کے جلد پہنچنے کے مقابلے میں وہ ایک اذیت کوش عاشق کی طرح انتظار کی لذت کو بڑھانا اور سوزِ جدائی میں اضافہ پسند کرتے تھے ؎

غمِ راهی نشاط آمیز تر کن! — فغانش را جنوں انگیز تر کن!
بگیر اے ساربان رہ دراز ے — مرا سوزِ جدائی تیز تر کن!

چنانچہ ان کے اس سوزِ جدائی کی یہ قدر کی گئی کہ ایک طرف سفرِ حجاز کی تیاریاں ہوتی رہیں اور دوسری طرف سفرِ آخرت قطع کرتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے ؎

سرودِ رفته باز آید که ناید — نسیمے از حجاز آید که ناید
سر آمد روزگارے این فقیرے — دگر دانائے راز آید که ناید

مشتاق احمد

ماڈرن غزل

وہ دنیا ہو کہ جنت، دل کو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
یہاں پریاں وہاں حوریں، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بجٹ ہو سرپلس[1] یا ڈیفی سِٹ[2] ٹیکس بڑھتا ہے
مری پاکٹ پہ سرکاری کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ہے مولانا سے یاد اللہ! مسٹر سے بھی شناسائی!
خدا کے فضل سے اپنا بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

پھرے گر ساتھ تو شکی، رہے گھر میں تو تنہائی!
پریشاں لیڈرانی کا خصم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

تجرّد دردِ دل ہر دم، گرہستی دردِ سر پیہم!
مقدر میں ہمارے درد و غم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بچے گر مرگِ ہجراں سے تو شادی مرگ ہونی ہے
اجل شاعر کی قسمت میں رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

[1] Surplus [2] Deficit.

اداریہ

میکارتھی کی موت

سن اکیاون میں اچانک امریکی اخبارات و رسائل میں میکارتھی ازم کی اصطلاح ایسی چل نکلی کہ پھیل کر تمام دنیا میں معروف و مروج ہو گئی۔
اس اصطلاح کا مفہوم تھا تنقید و محاسبہ میں حد سے زیادہ غلو۔ اور یہ بالعموم ایسے مقامات پر استعمال کی جاتی تھی جہاں کوئی شخص کسی دوسرے
کی سُنی بغیر تابڑ توڑ الزامات عائد کرتا چلا جاتا تھا۔ اس اصطلاح کی شہرت نے یہ سوال عام کر دیا کہ میکارتھی کون ہے؟
میکارتھی امریکی سینیٹ (ایوانِ بالا) کا رکن تھا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں منتخب ہو کر آیا تھا۔ لیکن جلد ہی اُس نے امریکہ چھوڑ ساری دنیا میں
ایسی شہرت حاصل کر لی کہ پرانے پرانے سیاست دان دنگ رہ گئے۔ وہ ایک حوصلہ مند اور طالع آزما شخص تھا۔ سیاست میں داخل ہونے
سے پہلے وہ باکسنگ کا کھلاڑی تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کھیل میں ہر جانا پسند کرتا تھا لیکن حملے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس کی سیرت
کا یہی خاصہ میدانِ سیاست میں بھی آ کر ظاہر ہوا۔ لیکن یہاں اسے اس صفت سے چند روزہ شہرت تو ضرور مل گئی لیکن نہ مقبولیت حاصل
ہوئی نہ کامیابی۔ میکارتھی کی موت کے بعد اس کی جارحانہ لذتِ تنقید کے سبب سبب اس کے حالاتِ زندگی کا گہرا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا
کہ اسے شہرت اور بڑائی حاصل کرنے کی بے پناہ لپک تھی۔ اس نے خود ایک دوست کے سامنے نہایت رازدارانہ انداز میں کہا:۔
"میں پسند کرتا ہوں کہ ہنگامِ موت میری نگاہوں کے سامنے صرف میری کامیابی ہی کی تصویر کھڑی ہو"۔
کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر ہوسِ اقتدار پیدا کرنے کا بڑا سبب اس کی والدہ تھی جو اپنے بچوں کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھی کہ "آدمی دنیا میں
کچھ کرنے کے لئے آیا ہے"۔ اور میکارتھی کے نزدیک کچھ کرنے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ میکارتھی زندہ باد کا نعرہ لگانے والوں کے
درمیان بڑھتا ہوا مسندِ اقتدار و عظمت تک پہنچ جائے۔
سینیٹ میں پہنچنے کے بعد چار برس تک میکارتھی قعرِ گمنامی میں رہا۔ اس کے ساتھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے خاموش چہرے
کے پیچھے ایک حوصلہ مند دل چھپا ہوا ہے جو اپنے لئے راہ عمل کے مواقع ڈھونڈھ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اچانک اسے وہ موقع حاصل ہو گیا۔
امریکی عدالتِ عالیہ میں ہلس نامی ایک شخص کے مقدمہ میں یہ انکشاف ہوا کہ کمیونزم کی جڑیں امریکی نظامِ حکومت میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اور
امریکہ کی کچھ معتمد و نامور شخصیتیں روس سے ساز باز رکھتی ہیں۔ اس انکشاف سے امریکی قوم کو غیر متوقع شاق گزرا۔ قوم کا یہ نفسیاتی اضطراب
میکارتھی کے لئے خداداد موقع تھا۔ اس نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور نہایت ڈرامائی انداز سے
کہا: "میرے پاس وزارتِ داخلہ کے اُن دو صد سرکاری افسروں کی مستند فہرست ہے کہ جو روس سے ساز باز رکھتے ہیں"۔ اس انکشاف یا
الزام نے حکومت اور عوام کو چوکنا کر دیا۔ وزارتِ داخلہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور تحقیقات شروع ہو گئی۔ اخبارات میں اس الزام کی مخالفت
اور موافقت میں مضامین و مقالات کی بھرمار لگ گئی، اور گمنام میکارتھی اچانک معروف ہو گیا۔ اب اس کا ہر جملہ اخبارات کے پہلے صفحہ پر
جلی عنوانات کے ساتھ جگہ پانے لگا۔

امریکی کانگریس نے اس الزام کی تحقیق کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی تحقیق کے مطابق یہ الزام سراسر جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ لیکن میکارتھی نے اپنے دعویٰ پر اصرار کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ امریکی انتظامیہ کا روس سے حالیہ تعلق نہیں پیدا ہوا ہے، اس تعلق کو قائم ہوئے بیس برس ہو گئے ہیں۔ اخبارات ہمیشہ سے سنسنی پھیلانے والی خبروں کے متلاشی رہتے ہیں اور میکارتھی کا ہر جملہ سنسنی پھیلانے والا تھا اس لئے کمیٹی کے فیصلۂ برات کے باوجود میکارتھی کے الزامات شہرت پاتے رہے۔

میکارتھی اس اچانک شہرت سے آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے تصور کر لیا کہ جو شخص بھی اس کی مخالفت کرے گا وہ یا کمیونسٹ ہو گا یا احمق۔ شہرت نے اس کے اندر جارحانہ اقدام کے جذبے کو اور بھی ابھار دیا اور اس نے اس سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے تو اس نے کانگریس کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے صدر کو معزول کروانے کے لئے جوڑ توڑ شروع کیا اور صدر کے خلاف اس طرح فضا ہموار کر دی کہ صدر کو اپنے منصب سے ہٹتے ہی بنی۔ اس فتح نے اس کے سیاسی جوڑ توڑ کی دھاک بٹھا دی اور امریکی کانگریس کے ارکان اور سرکاری ملازمین اس سے خوف کھانے لگے۔

۱۹۵۳ء میں میکارتھی اپنے عروج پر تھا۔ وہ بے محابا تنقید اور الزام تراشی میں اس حد تک بے باک ہو چکا تھا کہ امریکہ کے بڑے سے بڑے شخص کی عزت، شہرت اور مقبولیت اس کی ہرزہ درائی میں مانع نہیں ہو سکتی تھی۔ اب اس نے بڑے بڑوں پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ اس فہرست میں جارج مارشل (مارشل پلان کا مفکر) اور امریکی سفیر متعینہ روس چارلس بوہلن بھی شامل تھے۔ جارج مارشل امریکہ کا نہایت معزز و محترم جرنیل اور نہایت قابل مدبر ہے اور چارلس بوہلن امریکہ کی ان چند قابل ہستیوں میں سے ہے جو روس کے معاملات میں درجۂ سند رکھتے ہیں۔ جارج مارشل کے متعلق میکارتھی نے کہا: "وہ شخص جھوٹ میں سراپا غرق اور دروغ بافی کا ماہر ہے۔" ۱۹۵۲ء میں جب آئزن ہاور اپنی صدارتی انتخابی مہم پر روانہ ہوا تو میکارتھی نے اس پر اس حد تک دباؤ ڈالا کہ آئزن ہاور اپنی ایک تقریر میں سے جرنیل مارشل کی حمایت میں لکھے ہوئے چند جملے تک حذف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بوہلن کے متعلق میکارتھی نے کہا کہ روس میں اس کا تقرر ایک سازش ہے۔ اس نے وزیرِ داخلہ کو چیلنج کیا کہ وہ عدالت میں آ کر اس کے متعلق صفائی پیش کرے۔ اس کا یہ چیلنج صراحتاً لغو تھا۔ نتیجۃً یہ تاثر نمایاں ہو گیا کہ وہ ایک اڑیل اور بڑبولا آدمی ہے۔ اس چیلنج سے اس کی سیاسی حیثیت بھی متاثر ہوئی اس لئے کہ وہ جس وزیرِ داخلہ کو چیلنج کر رہا تھا وہ اس کی اپنی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ہی جماعت کے کسی رکن کو کھلم کھلا چیلنج کرنا جماعتی اور سیاسی حماقت تھی۔ آئزن ہاور نے میکارتھی کے چیلنج کو اس شانِ استغناء سے نظر انداز کر دیا کہ میکارتھی اور بھی چڑ گیا، اور اس نے براہ راست آئزن ہاور (اپنے ہی پارٹی لیڈر) پر تنقید شروع کر دی۔ لیکن یہ حربہ تا دیر نہ چل سکا۔ اس تکنیک کی ندرت اور تاثیر ختم ہو چکی تھی پھر بھی میکارتھی نے ہمت نہ ہاری اور جس جنگ کا اعلان وہ کر چکا تھا اس سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔ امریکی انتظامیہ پر میکارتھی کے تابڑ توڑ الزامات کے بعد سینیٹ نے ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی جس کا یہ صدر تھا۔ جب آئزن ہاور نے بے رخی اور قدرے بیزاری کا اظہار کیا تو اس نے اپنے موقف کی صداقت اور کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لئے فوج کے جائزے کو قومی واقعہ بنا دیا۔ یہ جائزہ ۳۶ دن تک جاری رہا اور اس کی سماعت باقاعدہ ٹیلی ویژن پر دکھائی جاتی رہی۔ میکارتھی کے طرزِ تکلم، تکیہ ہائے کلام اور اسلوبِ تنقید کے گھر گھر چرچے پھیل گئے۔ یہاں تک کہ ناٹکوں میں اس کی نقلیں اتاری جانے لگیں۔ میکارتھی کی غیر معقول ہٹ اور ہر شریف آدمی کی پگڑی اتارنے میں بے باکی سے سبھی بیزار ہو گئے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی واقعے کو بھی سنسنی خیز بنا کر پیش کرتا اور اس کی کڑی براہ راست غداری اور روسی جاسوسی سے ملا دیتا۔

عام رائے بھی طرزِ تفتیش کے خلاف ہو گئی۔ اس لئے کہ ہر معاملے کو نگاہِ شک سے دیکھنا گویا خود اپنوں کو بیگانہ بنا دینا تھا۔ معروف قاعدۂ عدالت یہ تھا کہ ہر شخص معصوم ہے تاآنکہ اس کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا۔ لیکن میکارتھی قاعدے کے مطابق ہر شخص مجرم تھا تاآنکہ اس کی برئیت ثابت نہیں ہو جاتی۔

اپنا کیس پیش کرنے کے لئے فوج نے ایک وکیل مقرر کر رکھا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اسی وکیل نے میکارتھی کو پسپائی پر مجبور کیا۔ ایک روز سماعت کے دوران میں میکارتھی نے اس وکیل کے ایک نائب پر الزام لگایا کہ وہ ایک ایسی انجمن کا رکن رہ چکا تھا جو کمیونسٹوں کے زیرِ اثر تھی۔ وکیل صاحب آہستہ سے کٹہرے کے قریب آئے اور میکارتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے "جناب والا، بالآخر شرافت کی کوئی رمق آپ میں باقی نہیں رہی ہے؟" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ یہ الفاظ فوج کے وکیل کے نہ تھے، اس کے طریقِ کار کو ناپسند کرنے والی اکثریت کے تھے۔ میکارتھی اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس کے بعد موج کا رُخ مڑ چکا تھا۔ اب میکارتھی رُو بہ زوال تھا۔ سینیٹ نے محسوس کیا کہ میکارتھی امریکی سینیٹ کے لئے باعثِ ننگ بن رہا ہے اس لئے اس کی روک تھام ضروری ہے۔ اس نے اس کی تمام سابقہ کارروائیوں کی تحقیق کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی کو تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ کانگریس کی پہلی سب کمیٹی کے صدر کے منزل میں محض میکارتھی کا جذبۂ انتقام کام کر رہا تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی کے الفاظ میں میکارتھی نے اس کے خلاف "نہایت گھٹیا قسم کی بازاری مہم" چلائی تھی۔ یہ کمیٹی اس نتیجہ پر بھی پہنچی کہ میکارتھی نے اپنے اختیارات کا نہایت غلط استعمال کیا ہے جس سے سینیٹ کی عزت اور وقار کو صدمہ پہنچا ہے۔

میکارتھی نے اس کمیٹی کا مقابلہ کیا لیکن اب کے اس کو تائید پہنچانے والے عناصر یعنی اخبارات کے پہلے صفحے کی سرخیاں، ٹیلی ویژن اور کیمرہ مینوں کے جُھرمٹ مفقود تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ زوال کے سائے دراز ہو چکے تھے۔ تحقیقاتی کمیٹی کے دوران میں دیکھا گیا کہ اس کی خود اعتمادی میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی سینیٹ میں آتا تو اس کے بال بکھرے ہوتے، لباس شکن آلودہ اور وہ خود دکھی یا کھویا کھویا سا ہوتا تھا۔ وہ جب بولتا تو اس کی آواز میں پہلی سی خود اعتمادی نہ ہوتی تھی۔ ذہنی پریشانی نمایاں طور پر ظاہر تھی۔

تحقیقاتی کمیٹی کے فیصلے کے اعلان کے بعد اس کے ساتھی اس سے دور رہنے لگے۔ میکارتھی اب سینیٹ کے اجلاسوں میں بہت کم شرکت کرتا۔ اس کا زیادہ وقت یا تو اپنی نئی بیوی کی معیت میں گزرتا یا پھر ہسپتال میں جہاں وہ اپنے مختلف عارضوں کے علاج کے لئے اکثر حاضری دیتا رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ اس کا جگر ناکارہ ہو چکا ہے اس لئے اسے شراب سے پرہیز کرنی چاہیئے۔ اس تنبیہہ کے باوجود وہ کثرت سے شراب نوشی کرنے لگا۔ شائد اپنے غم غلط کرنے کے لئے اور حسرتوں کی ندد بھری یاد دبانے کیلئے۔ اس کا وزن کم ہو گیا اور وہ اس قدر نحیف ہو گیا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرنے کے بعد اُسے مسلسل کئی روز تک آرام کرنا پڑا۔

موت سے چند روز قبل اس نے سب مصروفیتوں سے ہاتھ کھینچ لیا اور الگ تھلگ زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ آئندہ انتخابات میں کامیابی سے بھی قطعی مایوس ہو چکا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا "میں اور میری بیوی ایک چھوٹا سا فارم کھول لیں گے اور سکون سے زندگی بسر کریں گے"۔

انتخابات میں مایوسی کے باوجود اس نے اپنے حلقۂ نیابت کے دورے کا عزم کر لیا اور یہ اس کا آخری دورہ تھا۔

اس کی موت پر ہر طرف سے پیغاماتِ تعزیت آنے لگے۔ لیکن وہ تکلف سے اس قدر پُر تھے کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ کا

سیاسی حلقہ اس کی موت کو ایسا نقصان تصور نہ کرتا تھا کہ جس کی تلافی نہ ہو سکتی ہو۔ ٹرومین نے کہا مجھے اس کی موت پر سخت افسوس ہے۔ آئزن ہاور نے پسماندگان سے ہمدردی ہی پر اکتفا کیا۔ جب کہ لنڈن اور پیرس میں اس کے کردن کارناموں پر تعریفیں کی گئیں۔ اور روس کو ایک بار پھر امریکی سامراجی عزائم پر برسنے کا موقع میسر آگیا۔

مغربیوں کے نزدیک ممکن ہے میکارتھی کی زندگی ایک ناکام سیاست دان کی زندگی ہو، وہ اس کے انجام پر نگاہِ تاسف ڈال کر اس کی ناکامی کا سرسری تجزیہ کر لینا ہی کافی سمجھتے ہوں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی زندگی ہوسِ اقتدار و شہرت کی الم ناک داستان ہے۔ سیاست ہو یا تجارت، حکومت ہو یا معیشت، یہ ہوس جہاں کہیں ظاہر ہوتی ہے آدمی کو گھن کی طرح کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے۔ دنیا کی چشمِ ظاہر بیں کو تخچیرِ ہوس بامِ عروج پر چڑھتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ نہایت تیزی سے پستی کی طرف گر رہا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہوس اپنے اندر ایک داخلی تضاد کا قانون لئے ہوئے ہے۔ آدمی جتنا مقتدر ہوتا ہے اس کی ہوس بجائے سیر ہونے کے اتنی ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ جس طرح شراب کا ہر پیالہ آدمی کی جسمانی اہلیت جذب کو جوں جوں کم کرتا چلا جاتا ہے اس کی خواہش توں توں بڑھتی چلی جاتی ہے، اسی طرح آدمی... کامیابی کے جتنے زینے طے کر لیتا ہے اس کی ہوس اسی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ اپنی کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لئے وہ اپنے سلاحِ اقتدار سے مزاحم قوتوں کو ابھار دیتا ہے اور جب وہ چوٹی پر پہنچ کر نیچے نگاہ ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اتنی کامیابی کے باوجود اس کی جڑیں حد درجہ بودی اور کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ وہ جس لذت و انبساط کے خواب دیکھتا تھا وہ قطعاً مفقود ہے اور اس کی جگہ اُن خوف اور رنج نے لے لی ہے۔

وہ تب تجربے سے جان لیتا ہے کہ قصرِ ہوس جتنا رفیع ہوگا اس کی قبر اتنی ہی گہری ہو گی۔

غزل

ابو البیان حمّاد

دشوار منزل، پُرخار جادہ — پھر بھی چلا ہوں میں پاپیادہ
کیا پوچھتے ہو میرا ارادہ — کچھ ترا فادہ کچھ استفادہ
اُن کی نگاہیں سمجھا رہی ہیں — ساغر کا مطلب، مفہومِ بادہ
کس طرح سمجھے کس طرح جانے — انوار کی قدر ظلمات زادہ
اللہ رے میری بے خیالی — اُن کو بلایا ہے بے ارادہ!
اہلِ نظر کی پہچان ہے یہ — ظرفِ وسیع و قلبِ کشادہ
باتوں میں اُن کی رنگینیاں ہیں — لیکن طبیعت بے رنگ و سادہ
حالِ مریضِ اُلفت نہ پوچھو — آفت رسیدہ، الزام دادہ
اپنے گلے میں ڈالا ہے میں نے — اُن کی اطاعت ہی کا قلادہ
میں جانتا ہوں پہچانتا ہوں — اُن کی نظر سے ان کا ارادہ

حمّاد اپنی رودادِ الفت
میں کیا کہوں اب اس سے زیادہ

اداریہ

کیا ہم ہمیشہ غلام رہیں گے

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ایک امریکی جرنلسٹ ایشیا کی سیاحت سے لوٹتے ہوئے رُوم پہنچا۔ یہاں چند روز سستا کر وہ واپس نیویارک جانا ہی چاہتا تھا کہ انقلاب ہنگری کی خبر پہنچ گئی۔ امریکی جرنلسٹ نے بجائے نیویارک کے آسٹریا کے دارالسلطنت وی آنا کا رُخ کیا۔ یہاں سے وہ سرحدی مقام قریب ہی تھا جہاں سے ہنگری بھاگ بھاگ کر آسٹریا میں پناہ لیتے تھے۔ اس مقام کا نام اینڈو تھا۔ یہ مقام اس نہر پر واقع تھا جو آسٹریا اور ہنگری کے درمیان قدرتی حدِ فاصل کا کام دیتی تھی۔ اس پر ایک پیر پلیا تھی جس کو گھاس کاٹنے والوں نے اپنی سہولت کے لئے تعمیر کر رکھا تھا۔ یہ پیر پلیا بس اتنی چوڑی اور مضبوط تھی کہ صرف ایک موٹر سائیکل سوار اس پر سے گزر سکتا تھا۔ آشوب ہنگری میں یہی پلیا اہلِ ہنگری کے لئے شہراہِ حیات و حریت کا کام دے رہی تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر آتے تھے اور اس چھوٹی سی پلیا کو عبور کر کے امن و سلامتی کی گود میں پہنچ جاتے تھے۔ جب روسی فوج کو اس خفیہ راہِ فرار کا علم ہو گیا تو اس نے یہ پل ڈائنامیٹ سے اڑا دیا اور امید کی وہ کرن بجھ گئی جس نے استبداد کی تاریکیوں میں مظلومین کے ناتوان دلوں کو ایک مدت تک سہارا دیئے رکھا۔

اس پلیا کے آسٹروی کنارے پر دنیا کے اکثر حصوں سے اخبار نویس اور فوٹو گرافر جمع تھے جو روس کے آہنی استبداد کی ناقابلِ تردید شہادتیں ریکارڈ کرنے میں مصروف تھے۔ یہ امریکی جرنلسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو سب سے پہلے اس پلیا پر پہنچ کر پناہ گزینوں کے لئے پیغامِ سکینت لے کر پہنچے تھے۔ یہ لوگ سردی کے مارے خوفزدہ پناہ گزینوں کو گرم چائے اور کھانے کے ساتھ نویدِ امید بھی دیتے تھے۔ اور انہی کی طفیل تمام دنیا کو علم ہوا کہ ایک چھوٹی سی کمزور ریاست دیو روس کے چنگل سے رہائی کے لئے کس طرح تڑپ رہی ہے۔

ہنگری اور آسٹریا اصل میں ایک ریاست کے دو حصے تھے۔ ان کا ایک ہی بادشاہ اور ایک ہی نظامِ حکومت تھا۔ جنگِ عظیم اول کے بعد ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا، اور ہنگری ایک مستقل مملکت کی صورت میں معرضِ وجود میں آ گیا۔ خود مختاری کے بعد کچھ عرصہ تو یہ ریاست کمیونسٹ اثر کے تحت رہی۔ اس کے بعد ایک فوجی ڈکٹیٹر اس پر مسلط ہو گیا، تا آنکہ جنگِ عظیم دوم چھڑ گئی اور یہ پھر ہٹلر کا لقمۂ ہوس بن گئی۔ جنگِ عظیم دوم ختم ہو گئی۔ جرمنی کھنڈروں کا ملک بن گیا۔ اس کے باوجود ہنگری کے نصیب میں آزادی کا سانس نہ تھا، اور وہ دوسرے دام یعنی روس کے زیرِ انتداب آ گیا۔ روس نے انتداب سنبھالتے ہی اس کی خود مختاری کو ظاہری ٹیپ ٹاپ کو خوش نما بنا کر کمیونسٹ کارکنوں کو چھوڑ دیا کہ وہ اس کو کمیونزم کے لئے ہموار کریں۔ کمیونسٹ غیر وقیع اقلیت میں تھے جب روس اس کا نگران مقرر ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی سالوں میں غیر کمیونسٹ اکثریتیں نمک کی طرح گھلنے لگیں۔ یہاں تک کہ صرف کمیونسٹ ہی نمایاں نظر آتے تھے۔ اقتدار حاصل کرتے ہی کمیونسٹ حکومت نے نئے دستور کا اعلان کر دیا جس میں تمام زمین، زراعت اور صنعت اجتماعی ملک قرار دے دیئے گئے۔ اس طرح ہنگری ایک کمیونسٹ ریاست بن گیا۔

نئے دستور کے بعد راکوسی وزیر اعظم بنا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر اور بڑا جابر اور تشدد پسند تھا۔ اس نے روس کی طرز پر ہنگری میں خفیہ پولیس قائم کی اور مخالفین کو ختم کرنے میں بڑے انہماک سے کام لیا۔ لیکن وہ اپنے تشدد اور جبر کے باوصف زراعت اور صنعت میں حسب منشائے روس انقلاب نہ دکھا سکا تب اس کو بدل کر امرے ناگی کو لایا گیا۔ یہ بھی کمیونسٹ تھا لیکن آزاد خیالی کی بنا پر اس کو غیر کمیونسٹ لوگوں میں بھی خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ امرے ناگی ۱۹۵۳ء میں برسرِ اقتدار آیا، لیکن وہ اس مقام پر دو سال سے زائد نہ ٹھہر سکا کیونکہ اس کی آزاد خیالی روسی آقاؤں کو کھٹکنے لگی تھی ۱۹۵۵ء میں ایک اور تبدیلی آئی... اور راکوسی کا ایک جی حضوری وزیر اعظم بن گیا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اصل وزیر اعظم راکوسی ہی تھا لیکن اپنی غیر مقبولیت کی بنا پر وہ کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

۱۹۵۵ء کی اس تبدیلی کے بعد ہنگری میں نیا دورِ استبداد شروع ہوا، اور یہ دور راکوسی کے دورِ تشدد سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان تمام عناصر کو کچلنے کا اہتمام کیا گیا جو امرے ناگی کے وسیع المشرب دور میں ابھر آئے تھے۔ تشدد جوں جوں بڑھتا گیا ناگی کے دورِ وزارت کی آزادی کی یاد ابھرتی گئی، اور موجودہ حکومت کے خلاف نفرت منظم صورت میں ڈھلنے لگی۔ پہلے صرف اخبار نویس ہی حکومت کے متشددانہ رویہ پر تنقید کرنے کا فرض انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد ذہین طبقہ بھی اس کا ہمنوا ہو گیا، اور پی ٹوفی کلب مضطربین کا مرکز، مرجع اور نشان بن گئی۔ یہاں پر ادیبوں، پروفیسروں اور اقتصادیات میں دلچسپی رکھنے والوں کے اجتماع منعقد ہوتے اور نظامِ ملکی، آزادی اور جمہوریت پر مقالے اور نظمیں پڑھی جاتیں۔ بہت جلد ہی حکومت اس خطرے سے متنبہ ہو گئی اور اس نے پی ٹوفی کلب کے اجتماعات خلاف قانون قرار دے دیئے۔ اس کے بعد اضطراب پھیلانے والے عنصر کا صفایا کرنے کے لئے ایک دن میں چار صد گرفتاریاں کیں۔ حکومت کے اس اچانک حملے نے سارے بوڈاپسٹ کو چونکا دیا اور بلوے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

یہ مئی ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ روسی آقا تشویشناک صورت حال کا مطالعہ کرنے کے لئے فی الفور ہنگری پہنچے۔ یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ہنگری میں بگاڑ کا سبب راکوسی کی نااہلی تھی جو ابھی تک ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا۔ راکوسی کے ہاتھ سے زمامِ قیادت چھین کر گیرو کے سپرد کی گئی۔ لیکن اضطراب پھر بھی دور نہ ہوا اور راکھ میں دبی ہوئی چنگاری بدستور سلگتی رہی

اکتوبر میں پولینڈ میں ہنگامے ہوئے (پولینڈ پر جنگِ عظیم دوم کے بعد سے روس کا قبضہ ہے) جن کو روس نے بڑی سختی سے دبا دیا۔ لیکن ان ہنگاموں سے نہ صرف یہ راز فاش ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ روس کے ماتحت ممالک کو کمیونزم سے کتنا قلبی لگاؤ ہے بلکہ روس کے خلاف دبی ہوئی نفرت بھی بھڑک اٹھی۔ پولینڈ اور ہنگری کے درمیان ویسے بھی ایک قدیم تاریخی تعلق موجود تھا...... ۱۸۴۸ء کے یورپ گیر اضطرابات میں پولینڈ نے ہنگری کی مدد کی تھی اور اس کی یاد میں پولینڈ کے مشہور جرنیل کا مجسمہ بوڈاپسٹ کے وسطی چوک میں نصب پرانے احسان کی ہر وقت یاد دلا رہا تھا۔ جب پولینڈ کو سختی سے دبائے جانے کی یہاں اطلاع ملی تو یونیورسٹی کے طلبہ نے پولینڈ کی حمایت میں مظاہرے شروع کر دیئے۔ اور انہی مظاہروں نے درحقیقت دبے ہوئے انقلاب کے شعلے کو آگ دکھائی۔

——————

ہنگری کے ایک نوجوان نے ایک انٹرویو میں بتایا —— "ہنگری کی معاشیات پر کمیونزم جس طریقہ سے اثر انداز ہوا درحقیقت اسی نے میرے اندر اس نظام کے متعلق مختلف سوالات کو ابھارا۔ ہمارے ملک کو نہایت بھدّے اور بھونڈے طریقے سے رُوس کے مفاد کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ مجھ کو ایک بھی ایسا فیصلہ یاد نہیں پڑتا جو صرف ہنگری کے مفاد کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا ہو، اور کسی کمیونسٹ نے کوئی کام بے غرض کیا ہو، اس کا بھی مجھ کو علم نہیں۔ زرخیز ذرائع اور محنت سے ہنگری کو ہر لحاظ سے فارغ البال ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن ہم روز بروز پستی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ جب ہم کو کمیونزم کا علم نہیں تھا اور ہم کام بھی کم کرتے تھے تب ہم زیادہ خوش حال تھے۔ لیکن اب جب ہم کام بھی زیادہ کرتے ہیں اور علم بھی زیادہ رکھتے ہیں تو ہم تنگ دست ہو گئے ہیں۔ اور ہر چیز جس میں ہمارا خون پسینہ شامل ہوتا ہے روس کو منتقل کر دی جاتی ہے۔"

ایک طرف ان حقائق کا انکشاف جو انسانی ذہنوں کو روس اور کمیونزم سے باغی کر رہا تھا، اور دوسری طرف ہنگری کے ہر گوشے میں خفیہ پولیس کی (جس کو ہنگری میں AVO کے نام سے پکارا جاتا ہے) خوفناک کارروائیاں، جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ خفیہ پولیس ساری آبادی میں اس طرح رچی ہوئی تھی کہ کوئی شخص کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ ایک شخص کا ایک دوست ایک دن پہلے اس کی نگاہوں میں انتہائی معتمد تھا لیکن اچانک دوسرے روز اس انکشاف سے وہ مبہوت رہ جاتا ہے کہ وہ تو حقیقت میں خفیہ پولیس کا مخبر تھا۔

ایک معمر عورت نے ایک دفعہ کسی مجلس میں بیٹھے بیٹھے مذاق سے کہہ دیا کہ "جس طرف جاؤ روسی جھنڈا ہی لہراتا نظر آتا ہے۔ پُرانے ہنگری جھنڈے کو دیکھنے کے لئے تو آنکھیں ترس گئی ہیں"۔ اس کے دو دن بعد خفیہ پولیس نے اس عورت کو تھانے میں بلوایا، اور اس کے بعد کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گئی۔ چھ ماہ بعد وہ ایک دن پھر مسکراتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے جوان سال مزدور لڑکے نے استعجاب سے پوچھا "اماں تم کہاں رہیں؟"

عورت نے نہایت سکون سے جواب دیا: "کچھ نہیں، اطمینان رکھو"۔

لیکن وہ عورت اپنے سکون و اطمینان کی سطح کو تادیر قائم نہ رکھ سکی اور بیمار پڑ گئی۔ جب وہ زندگی سے ناامید ہو گئی تو ایک دن اس نے بتایا کہ جیل میں اس پر کیا کچھ بیتی اور کیسے اُسے ہر روز گھنٹوں ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسرا شخص جو اپنے ٹیکس ادا نہ کر سکتا تھا گرفتارِ بلا ہو گیا۔ ایک دن اس نے اپنے دوستوں سے ذکر کرتے ہوئے ایسے ہی کہہ دیا "میرا ایک بھائی امریکہ میں ہے، میں اس سے روپے منگوا لوں گا"۔ خفیہ پولیس نے اس کو بُلوا کر چھ ہفتوں کی مزید مہلت دی کہ وہ امریکہ میں رہنے والے بھائی سے روپے منگوا کر ٹیکس ادا کر دے۔ جب چھ ہفتے کی میعاد گزر گئی اور روپے نہ آئے تو اسے پھر تھانے بلوایا گیا۔ اور اس کے بعد اس شخص کو تھانے سے باہر نکلتے کسی نے نہ دیکھا۔

فضا میں بارُود کی تہ بچھ رہی تھی لیکن انقلاب کی بنا ڈالنے والے وہ لوگ نہ تھے جو تختۂ ظلم بنے تھے بلکہ وہ نوجوان تھے فلسفۂ کمیونزم سے سب سے زیادہ متأثر تھے۔ ایک واقفِ حال لکھتا ہے "انقلاب ہنگری کا یہ پہلو روسیوں کو اور بھی زیادہ کھَلا کہ وہ نوجوان جن پر کمیونزم سب سے زیادہ نگاہِ التفات رکھے ہوئے تھا، اس کے سب سے زیادہ خلاف ہو گئے۔ کمیونزم کے خلاف طوفانِ انقلاب کو بپا کرنے میں سب سے زیادہ انہی کمیونسٹ ذہنوں کا ہاتھ تھا۔"

تشدد نے آزادی کی دبی ہوئی چنگاری کو سلگا دیا اور اضطراب مطالبات کی شکل میں ڈھلنے لگا۔ ان مطالبات کی سب سے پہلے قانون پڑھنے والے طلباء نے ضرورت محسوس کی۔ ایک اجتماع میں ان طلباء نے ملک کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا کہ اصلاح پانچ صورتوں سے ممکن ہے :

۱۔ روسی ہنگری سے نکل جائیں۔

۲۔ گرتے ہوئے معیارِ زندگی کو سنبھالا جائے۔

۳۔ اشیائے ضرورت کی کمی رفع کی جائے۔

۴۔ روسی زبان کا مطالعہ لازمی نہیں ہونا چاہیئے۔ اور

۵۔ موجودہ ہتھوڑے اور درانتی کے نشان کی بجائے ہنگری کا پرانا نشان قومی جھنڈے پر ہونا چاہیئے۔

یہ جائزہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو لیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر کو طلباء کا ایک عام اجلاس اس جائزے پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا۔ ہر مقرر نے اس جائزے کی تائید کی۔ اور جب جلسہ اختتام پر پہنچا تو سب نے محسوس کیا کہ تمام مطالبات کی جان ایک مطالبہ تھا۔ وہ یہ کہ روسی ہنگری سے نکل جائیں۔ تمام طلباء نے بیک زبان اس مطالبے کی تائید کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ پارلیمنٹ اسکوائر میں ایک اجتماعِ عام میں اس مطالبے کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز یعنی ۲۳ اکتوبر کو پارلیمنٹ کی پُرشکوہ عمارت کے سامنے اسکوائر میں جلسے کی اسٹیج لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان حاضرین سے بھر گیا۔ ہر طرف انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی جذبے نے بجلی کے جھٹکے کی مانند ساری قوم کو چونکا دیا تھا۔ مقررین کی تقریریں شعلہ بار تھیں، اور تمام لوگ بیک زبان نعرے لگا رہے تھے ..... "موجودہ قیادت مردہ باد! آزادی زندہ باد! ہم اَمرے ناگی کو چاہتے ہیں۔ اَمرے ناگی زندہ باد!"

ٹامس اکزل، ہنگری کا مشہور اخبار نویس، جو امرے ناگی کا ذاتی دوست ہے، بتاتا ہے: "اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں کسی محاصرے کا مشاہدہ کر رہا ہوں، ایک خاموش اور خوفزدہ حکومت کا جسے نہتے عوام نے گھیر رکھا ہے۔ نعرے پھر بلند ہوئے۔ "امرے ناگی، ہمیں اپنی صورت دکھاؤ۔" اسی اثناء میں چند اخبار نویس میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک شخص جو جانتا تھا کہ میں امرے ناگی کا دوست ہوں، بولا: "امرے ناگی کہاں ہے؟ تم اسے کیوں نہیں لاتے؟" میں بمشکل تمام ہجوم سے نکل کر اپنی کار کے پاس پہنچا اور بسُرعت امرے ناگی کے ہاں پہنچا۔ مجھ سے پہلے چند آدمی اس کے پاس پہنچے ہوئے تھے اور وہ اسے چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا "تم وہیں سے آ رہے ہو؟" میں نے جواب دیا "ہاں: اور تمہیں ایک ثانیئے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیئے"۔ امرے ناگی اچانک تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔ وہ چُپ چاپ میری کار میں آ کر بیٹھ گیا اور خاموش نگاہوں سے کہیں دُور دیکھنے لگ گیا۔ جب ہم پارلیمنٹ اسکوائر میں پہنچے تو امرے سکوٹ مشہور اداکار پی گرفی ہنگری کے قومی شاعر کے ولولہ انگیز شعر پڑھ رہا تھا:

"اے اہلِ ہنگری، کمربستہ ہو جاؤ،
تمہارا ملک تمہیں پکار رہا ہے
وقت آ گیا ہے

اب یا کبھی نہیں۔
کیا ہم ہمیشہ غلام رہیں گے ؟
یا کبھی آزاد بھی ہوں گے ؟
یہی سوال ہے۔
انتخاب کر لو۔"

ہجوم بیک آواز گانے لگا :

"ہم قسم کھاتے ہیں، ہم حلف اٹھاتے ہیں۔
خدائے ہنگری کی،
ہم کبھی بھی غلامی کا طوق گلے میں نہیں ڈالیں گے۔"

امرے ناگی سیدھا نائب وزیر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ناگی کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ پھر اس نے کہا: "آپ کی ابھی ضرورت نہ تھی" لیکن پیشتر اس کے کہ ناگی جواب دیتا۔ سیکس (ہنگری کا ایک اور مشہور سیاست دان) نے اس کو شانے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا:
"تم اپنے حواس تو نہیں کھو بیٹھے ؟ دیکھتے نہیں سارا بوڈاپسٹ تمہارے دروازوں پر اُمڈ آیا ہے۔ تم جانتے نہیں۔ انقلاب آ رہا ہے !"

نائب وزیر کا کمرہ طالب علموں اور اخبار نویسوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ عین اس وقت ریڈیو پر ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر گیرو بولا: "پارلیمنٹ اسکوئر کا ہجوم انقلاب دشمن ہے"۔ ناگی نے نفرت آمیز نگاہوں سے نائب وزیر کی طرف دیکھا اور پارلیمنٹ کی بالکونی میں آن کھڑا ہوا۔

ہجوم نے مسرت کا نعرہ بلند کیا۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو امرے ناگی نے خطاب کیا۔ "پیارے کامریڈو" تمام مجمع بیک آواز چلّا اٹھا۔ "ہمیں کامریڈ مت پکارو۔ ہم کو یہ لفظ سننا گوارا نہیں ہے" ناگی نے بغیر توقف کے اس تصحیح کو قبول کر لیا اور بولا "پیارے دوستو! اقتدار کی اس شکست پر لوگ خوشی سے اُچھلنے لگے۔ اور اس خوشی میں ان کی زبان پر ہنگری کا قومی نغمہ پھر جاری ہو گیا۔۔
'اب یا کبھی نہیں! اب یا کبھی نہیں!' امرے ناگی نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کی اپیل کی، جب قدرے خاموشی ہوئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ امرے ناگی نے ہنگری کا ممنوع قومی گیت لرزتی ہوئی آواز میں گانا شروع کر دیا۔ "خدا ہنگری کا محافظ ہو"۔

اس گیت کے بولنے گویا ہنگری کی رُوح کو بیدار کر دیا۔ اسکوئر کا ذرّہ ذرّہ اس نغمے سے جھوم رہا تھا۔ اچانک کوئی چلّایا۔ "ریڈیو اسٹیشن پر گولی چل رہی ہے"۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ اس کے بعد ایک اور خبر پہنچی "طلباء اور مزدور خفیہ پولیس کا مقابلہ کر رہے ہیں"۔ اس خبر نے گویا فتیلہ کا کام کیا۔ قومی کا رُکن ہجوم کرتے ہوئے ریڈیو اسٹیشن کی طرف ہو لئے۔
ریڈیو اسٹیشن کے راستہ میں اسٹالن پارک پڑتا تھا جہاں سٹالن کا عظیم مجسمہ نصب تھا۔ ہجوم میں سے دو آدمی مجسمہ کے چبوترہ پر چڑھ کر ہتھوڑوں سے وار کرنے لگے۔ ہجوم ان کی امداد کے لئے رُک گیا۔ کچھ لوگ لوہے کے مضبوط تار لے آئے اور

بُت کے گلے میں اس کا پھندا ڈال کر کھینچنے لگے لیکن بُت ٹس سے مَس نہ ہوا۔ اس پر چند مزدور مشعلیں لے آئے اور مجسمہ کے کھوکھلے گھٹنوں میں آگ دہکا دی۔ اس کے ساتھ سینکڑوں ہاتھ تار کھینچنے لگے۔ اچانک بُت جُھکا اور دھڑام سے منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ ہجوم مسرت سے چلا اٹھا۔ پھر لوگ چلائے "اس کو سیدھا کرو تاکہ ہم اس کے چہرے پر تھوک سکیں"۔

اتنے میں ایک لاری آگئی اور کچھ لوگوں کو یہ سُوجھی تو انہوں نے بُت کے گلے میں پھندا ڈال کر لاری سے باندھ دیا۔ جب لاری چلی تو بُت اس کے پیچھے اُوندھے مُنہ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ جب لوگ یہاں سے فارغ ہوئے تو اُن کی نظر کمیونسٹ اخبار "آزاد لوگ" کے بورڈ پر پڑی جو ایک عمارت کی پیشانی پر آویزاں تھا۔ اس عمارت میں اس کا دفتر اور پریس تھا۔ ہجوم کا ایک حصہ طیش کھا کر اس عمارت میں گھس گیا تو دوسرا کمیونسٹ کتب خانے میں داخل ہو گیا جو اس کے عین متصل تھا۔ چند طلباء نے کتب خانے کے شیشے توڑ دیئے اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر جلتی ہوئی کتابوں کا بہت بڑا ڈھیر سڑک کے گرد و نواح کی عمارتوں اور ہجوم کے وحشیانہ بشاشت سے لبریز چہروں کو روشن کر رہا تھا۔

جب یہ ہجوم ریڈیو اسٹیشن پر پہنچا تو جنگ عین شباب پر پہنچ چکی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن کے احاطے کے پھاٹک بند تھے۔ اس کے باہر ہجوم محاصرہ کئے کھڑا تھا اور اندر اسٹیشن کی چھت پر خفیہ پولیس مشین گنیں چھپائے بیٹھی تھی۔

معاملہ یوں ہوا کہ جب پارلیمنٹ اسکوئر میں لوگ جمع ہو رہے تھے تو نوجوانوں کی ایک ٹولی نعرے لگاتی ہوئی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی "اگر تم ہنگری ہو تو ہمارے ساتھ چلے آؤ" جو جو لوگ قومی جوش سے لبریز ہوتے گئے وہ ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہ گروہ پہلے ایک تھانے میں داخل ہوا اور اس کے اسلحہ خانے پر قابض ہو گیا۔ جس جس کو جو جو کچھ ملا وہ لے کر پھر سڑک پر آگیا اور اب یہ مسلح گروہ پھر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ ایک روسی ٹینک سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے خطرہ دیکھ کر گولیوں کی ایک باڑ مار دی۔ چند لڑکے وہیں ڈھیر ہو گئے، باقی طیش کھا کر دیوانوں کی طرح ٹینک پر اینٹیں برسانے لگے۔ ٹینک کھڑا ہو گیا۔ دو لڑکے موقع پاتے ہی عقب سے ٹینک پر چڑھ گئے اور ٹینک کی پناہ گاہ کے سُوراخوں میں پستول کی نالیں داخل کر کے ٹینک چلانے والوں کو ختم کر دیا۔ اس غیر متوقع فتح کے بعد ٹولی ایک ہجوم کی صُورت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اس فتح کے نشہ سے سرشار ہو کر کسی عظیم تر محاذ کی تلاش میں چل دیئے۔

اب اُن کا رُخ ریڈیو اسٹیشن کی طرف تھا۔ یہ ریڈیو اسٹیشن گویا ہنگری میں آباد کمیونزم کا مرکزِ اعصاب تھا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی حفاظت کے لئے اسّی سپاہی متعین تھے، اور اس کی چھت پر مشین گنیں نصب تھیں۔ ریڈیو اسٹیشن میں داخلہ ایک طویل عمل تھا۔ جس میں اجازت ناموں کا ایک دشوار مرحلہ طے کرنے کے بعد ہی آدمی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس کے بیرونی پھاٹک دوہرے اور ہر لحاظ سے مضبوط تھے۔ جب ہجوم کا مقدمہ ریڈیو اسٹیشن کے سامنے پہنچ گیا تو ریڈیو اسٹیشن کا حفاظتی دستہ چوکنا ہو گیا۔ ریڈیو اسٹیشن کے احاطہ کے پھاٹک کھلے اور لوگوں نے دیکھا کہ مزید کمک مع اسلحہ بارُود کے اندر داخل ہو گئی ہے۔

رات کے نو بجے تک ہجوم ریڈیو اسٹیشن کے اردگرد منڈلاتا رہا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے طلبہ کے ایک وفد نے ریڈیو اسٹیشن پر قوم کے نام ایک پیغام نشر کرنے کی اجازت چاہی۔ پہرے دار ان کی بات سُن کر ہنس دیئے اور انہوں نے احاطہ کا پھاٹک بند کر دیا۔ ہجوم اس توہین آمیز رویّے کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے پھاٹک پر دھاوا بول دیا۔ اندر سے آنسو رُلانے والی

گیس پھینکی گئی، اور ہجوم چند قدم پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اس رات ہنگری پر آزادی کا کچھ ایسا خمار چھایا ہوا تھا کہ وہ آنسو لانے والی گیس کے باوجود آگے بڑھتے اور پھاٹک پر بلہ کرتے رہے۔ جب ہجوم کسی طرح نہ ہٹا تو ریڈیو اسٹیشن کی چھت سے ہجوم پر تیز روشنی ڈالی گئی۔ غالباً یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کون ہجوم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ہجوم نے اس کے جواب میں پتھر پھینکے..... جواب الجواب میں مشین گن تڑ تڑ کر کے چلنے لگی۔ کچھ لوگ گرنے لگے۔ کچھ ایک طرف ہٹنے لگے۔ لیکن ہجوم کے اندر سے نعروں کی آواز ابھری "وہ ہمیں ہلاک کر رہے ہیں، ان سے جنگ کرو"۔

اچانک اس گڑبڑ میں ایک ہنگری فوجی افسر جوش کھا کر لاری کی چھت پر چڑھ گیا اور اس نے فوجی تحکم سے چلا کر کہا "سورو، تم دیکھتے نہیں تم کن پر گولیاں چلا رہے ہو۔ تمہارے اپنے ہی بھائی بند؟" اس کی للکار پر مشین گن بند ہو گئی۔ اس نے پھر غصے سے کہا "سورو، کمینے، بند کرو اس مشین گن کو"۔ اچانک اندھیرے میں لپٹے ہوئے ریڈیو اسٹیشن سے گولیوں کی ایک باڑ پھر چلی اور ہنگری کا پہلا فوجی اس کی آزادی کی بھینٹ چڑھ گیا

ہجوم پر مایوسی طاری ہونے لگی وہ نہتے کیا کر سکتے تھے؟ ایکا ایکی لاریوں کی گونج سنائی دی اور ہجوم کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کمیونسٹ نظام کے سب سے بڑے کارخانے کیسپل کے مزدور اسلحہ لے کر ہجوم کی مدد کے لئے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی لاری کی چھتوں پر مشین گنیں نصب کر دیں اور جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اسٹیشن کا مشرقی حصہ اس کے جواب میں خاموش ہو گیا۔

اسی اثنا میں ہجوم نے دیکھا کہ سڑک پر ریڈ کراس کی ایک ایمبولینس آہستہ آہستہ چلی آ رہی ہے۔ ہجوم خوش ہوا کہ وہ اس کے زخمی لینے کے لئے پہنچ گئی تھی۔ لیکن وہ بجائے رکنے کے ریڈیو اسٹیشن کی جانب چلتی گئی۔ طلباء بھاگ کر اس کی طرف گئے اور پکارے "تم کہاں جا رہے ہو؟ ہمارے زخمی تو یہاں ہیں"۔ لیکن ڈرائیور نے جواب دیا "مجھے اسٹیشن کے اندر کے زخمی اٹھانے کا حکم ہے"۔

لوگوں نے ایمبولینس روکنے کی کوشش کی لیکن ڈرائیور نے رکنے سے انکار کر دیا۔ اچانک ایک شخص کا پاؤں کار کے نیچے آ گیا اور وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس پر لوگ جھلا کر کار پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے کار کے عقبی دروازے توڑ دیئے، اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں بجائے ادویات کے بم اور بندوقیں تھیں۔ سینکڑوں ہاتھ فی الفور ڈرائیور کی طرف اٹھ گئے۔ ایک عینی شاہد کہتا ہے "میں نے ڈرائیور کی چیخیں سنیں۔ وہ برابر کہہ رہا تھا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اس کی کون سنتا تھا۔ کسی نے ایمبولینس ہی کی بندوق اٹھائی اور اس کا خاتمہ کر دیا"۔

حملہ نئے سرے سے شروع ہو گیا۔ دونوں طرف سے گولیاں تڑ تڑ کرتی چل رہی تھیں۔ ہجوم اب بم بھی پھینک رہا تھا۔ اچانک ایک دھماکہ بڑے زور سے ہوا اور کسی نے چلا کر کہا۔ "پھاٹک کھل رہا ہے"۔

لیکن یہ پھاٹک ریڈیو اسٹیشن کے احاطے کا نہیں کھل رہا تھا بلکہ ایک تاریک اور غیر منتہی دورِ کشمکش کا کھل رہا تھا۔ جس میں ایک قوم کمیونزم کے دلفریب نعروں کے نام پر دوسری کو دبا دینا چاہتی تھی جبکہ دوسری اپنی رہائی کے لئے زخمی فاختہ کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

جب ریڈیو اسٹیشن پر معرکہ گرم تھا تو عین اس وقت بوڈاپسٹ کی ایک فوجی بارک کے باہر ایک فوجی نے ایک شہری کو بارک میں نظر بچا کر گھستے دیکھا۔ وہ اس طریقہ سے بارک میں داخل ہوا تھا کہ فوجی متنبہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بھی دبے پاؤں اُس کے تعاقب میں اندر داخل ہو گیا۔ شہری فوجی بارک کے ایک فوجی افسر کے کمرے میں داخل ہوا اور سوئے ہوئے افسر پر گولی چلا کر اُلٹے پاؤں واپس نکل آیا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو فوجی نے روشنی میں دیکھا کہ وہ خفیہ پولیس کا ایک مشہور میجر تھا۔ فوجی جلدی سے اسلحہ خانے میں گیا اور ایک دستی بم اُٹھا کر خفیہ پولیس کے میجر پر دے مارا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے بارک کے تمام فوجیوں کو پکار کر ہوشیار کیا کہ خفیہ پولیس بارک پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ تمام فوجی ہوشیار ہو گئے تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے دیکھا کہ خفیہ پولیس کے ڈیڑھ صد آدمی اسلحہ خانے پر قبضہ کرنے کے لئے جھپٹ رہے تھے... فوجیوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں روک لیا اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ فوجی چونکہ تعداد میں زیادہ تھے اس لئے خفیہ پولیس جلد ہی بھاگ گئی۔ وہ ابھی اس لڑائی سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ شہریوں کا ایک گروہ بارک میں داخل ہوا، جن کے چہروں اور لباسوں پر خون کے جا بجا چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے چلّا کر کہا۔ "خفیہ پولیس ہمیں ختم کر دینا چاہتی ہے، ہمیں ہتھیار دو۔"

فوجی ابھی عالمِ تذبذب ہی میں تھے کہ ایک فوجی باہر سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے آتے ہی کہا "انہیں اسلحہ کی ضرورت ہے، انہیں اسلحہ دے دو۔ ایک بہت بڑی جنگ شروع ہو چکی ہے۔"

فوجی جانتے تھے کہ خفیہ پولیس جس بُری طرح پٹ کر گئی تھی وہ اس کا انتقام لینے کے لئے ضرور آئے گی اس لئے جونہی شہری اسلحہ لے کر چلے گئے وہ دستی بم تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پو پھٹنے تک وہ اپنی حفاظت کے لئے اچھی طرح سے تیار ہو گئے تھے۔ علی الصبح ایک فوجی کار آتی دکھائی دی جسے چار بموں سے اُڑا دیا گیا اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر نو بجے کے قریب خبر پہنچی کہ رُوسی ٹینک بارک کی طرف آ رہے ہیں۔

ان ٹینکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بارک کے علاوہ ایک اور بھی مورچہ تیار تھا۔ یہ مورچہ کاروِن سینما تھا۔ یہاں کچھ نوجوان دستی بم اور ایک اینٹی ٹینک بندوق لئے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بھاری گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور ناگاہ سات بھیب ٹینک بارک کی جانب آتے دکھائی دیئے۔ جونہی ٹینک سینما کے قریب پہنچے اینٹی ٹینک بندوق حرکت میں آ گئی اور سب سے اگلا چند لمحات کے لئے رُکا، پھر ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ پچھلے ٹینک کچھ توقف کے بعد بڑھے لیکن ایک ٹینک پھر سینما کے برابر پہنچ کر نشانہ بن گیا۔ سینما کی اگلی جانب چند لڑکوں نے سڑک کے عین درمیان زمین سے چند فٹ اونچی ایک الگنی لٹکا رکھی تھی جس کے ساتھ پانچ بم آویزاں تھے۔ ٹینک جونہی اس الگنی سے ٹکرائے بم پھٹ گئے، اور ٹینک رک گئے۔ اس پر لوگوں نے کھڑکیوں سے پٹرول کی دھاریں بہا دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تیسرے ٹینک سے بھی شعلے اُٹھنے لگے۔

بقیہ چار ٹینک بارکوں کے سامنے مورچہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور گولہ باری کرنے لگے۔ انہوں نے بارک کے دو پاکھے گرا دیئے لیکن محصورین کو پھر بھی نکلنے پر مجبور نہ کر سکے۔ کچھ وقت کے بعد وہ خاموشی سے لوٹ گئے۔ غالباً ان کا اسلحہ ختم ہو چکا تھا۔

اس کے دو دن بعد یعنی ۲۵ اکتوبر کو پارلیمنٹ کا وہی میدان جہاں امرے ناگی اور ہنگری قوم نے مل کر قومی نغمہ گایا تھا، میدانِ کارزار بنتا ہے۔ ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے " میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور وہ حکومت سے کسی قسم کا پختہ وعدہ لئے بغیر ٹلنا نہ چاہتے تھے۔ لیکن پارلیمنٹ کی بالکنی میں کوئی ذمہ دارِ حکومت ظاہر نہ ہوا۔ خفیہ پولیس پارلیمنٹ کی چھت پر مشین گنیں نصب کئے بیٹھی تھی۔ سپریم کورٹ کے اوپر مزید بندوقیں لگ گئیں۔ اور وزارت زراعت کی چھت پر بندوقوں کی نالیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ میدان کی ایک جانب روسی ٹینک پرے باندھے کھڑے تھے۔ بندوقوں اور ٹینکوں کی ہیبت ناک دھمکی کے باوجود لوگ امرے ناگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ہجوم بالکل پُرامن تھا۔ اور اس لئے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی کہ بندوقوں کو اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ لیکن اچانک سپریم کورٹ کی چھت سے ایک فائر ہوا اور ایک عورت کی گود سے خون آلود بچہ زمین پر گر پڑا۔ عورت نے ایک الم ناک چیخ ماری اور خاک و خون میں لتھڑے ہوئے بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے روسی ٹینکوں کی طرف بڑھی۔ وہ زور سے چلائی " تم نے میرے بچے کو مارا ہے۔ تم نے میرے بچے کو مارا ہے۔" کورٹ کی چھت سے گولیاں پھر تڑتڑ کرتی ہوئی چلیں اور اس کی درد بھری چیخ کو سمیٹتی ہوئی لے گئیں۔

ٹینک دستہ کا روسی کپتان بچے کی لاش کے سامنے اپنی ٹوپی اتار کر تعظیماً جھکا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے دوسری طرف رُخ پھیر لیا۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ کیا اس نے گویا ہنگری کے فسادات کو ایک باقاعدہ جنگ کی صورت دے دی۔ اس نے اپنے ٹینک کی توپ کی نال سپریم کورٹ کی چھت کی طرف موڑ دی اور ایک ہی باڑھ میں خفیہ پولیس کے سارے مورچے کو اڑا دیا۔[1]

روسی کپتان کی اس حرکت نے سب کو حیرت میں غرق کر دیا۔ کوئی دیکھنے والا اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر رہا تھا۔ جونہی لوگ اس حیرت سے سنبھلے گولیاں پھر برس رہی تھیں اور سارا میدان زخمیوں اور لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی، کچھ بھاگ رہے تھے کچھ اسلحہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایک روسی فوجی بندوق لئے خاموش اس منظر کی طرف پُشت کئے کھڑا تھا۔ ایک ہنگری قوم پرست اس کے اس رویہ سے اس کی نفسیاتی کیفیت بھانپ کر اس کے قریب ہوا اور کہا " اگر تم ہمیں ہلاک کرنے میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو اپنی بندوق مجھے دے دو۔" روسی نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بندوق اس کے حوالے کر دی۔[2]

مسلح اور نہتے، دیوانہ پن کی یہ جنگ چار روز تک بوڈاپسٹ کے گلی کوچوں میں جاری رہی۔ پھر اچانک روسی ٹینک ہٹنے لگے اور لوگوں کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا ان کے مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے۔ ۲۹ اکتوبر کو امرے ناگی کی حکومت کا اعلان ہو گیا، اور بوڈاپسٹ خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ شکستہ عمارتیں، لاشوں اور خون آلودہ سڑکوں کے باوجود ہنگری سمجھ رہے تھے کہ سودا مہنگا نہیں رہا۔

۲۹ اکتوبر سے ۴ نومبر تک سکون طاری رہا۔ پھر اچانک جو کچھ ہوا وہ ہنگری کے جرنیل بیلا کرالی کی اس رپورٹ سے معلوم ہوا جو اس نے اقوام متحدہ کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کی۔

---

[1] یہ حیرت انگیز واقعہ سچا ہے۔ اس کی تصدیق متعدد شہادتوں سے کر لی گئی ہے۔ [2] یہ واقعہ بھی مصدقہ ہے۔

۲ر نومبر کو جرنیل بیلا کرالی کو وزیرِ اعظم امرے ناگی نے فون کیا: "روسی سفیر نے اطلاع دی ہے کہ ہنگریوں کی کچھ ٹولیاں رُوسی سفارت خانے کے گرد منڈلا رہی ہیں۔ تم فوراً پہنچ کر انہیں ہٹا دو ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ روسی فوج منگا لے گا۔ میرا خیال ہے تم معاملے کی نزاکت سے بخوبی آگاہ ہو۔ اگر ہم اس کا انتظام نہ کر سکے تو گویا ہم روسی تشدد کو جواز کا موقع بہم پہنچا دیں گے۔"

جرنیل اسی وقت ایک ٹینک کمپنی لے کر روسی سفارت خانے پہنچا مگر روسی سفارت خانے کے گرد و نواح میں بالکل امن اور خاموشی تھی۔ جرنیل نے رُوسی سفیر سے کہا "فسادی کہاں ہیں؟" روسی سفیر نے جواب دیا: "ابھی یہاں تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب چلے گئے ہیں۔" پھر اس نے کہا: "ہم رُوسی آپ کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم آپ کی دقتوں سے آگاہ ہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا: "آپ جانتے ہیں کہ ہم نے آپ کی حکومت کو عوامی مطالبات کے متعلق گفت و شنید کی پیش کش کر دی ہے؟ ہماری حکومت اپنی فوج ہنگری سے فی الفور نکال لینا چاہتی ہے۔ اب صرف انخلاء کی تفصیلات طے کرنا باقی ہیں۔ آپ اپنے وزیرِ اعظم سے پوچھئے کہ انہیں اس امر کی تحریری اطلاع مل گئی ہے یا نہیں؟"

جرنیل نے اسی وقت ناگی سے فون پر دریافت کیا۔ ناگی نے جواباً اطلاع دی کہ اسے رُوسی تحریر مل گئی ہے۔

اسی رات بوڈاپسٹ کے ہوائی اڈے سے دو صد روسی ہوائی جہاز واپس پرواز کر گئے اور ٹینک شہر کی چھاؤنی سے نکل کر مضافات کی طرف منتقل ہو گئے۔

اس کارروائی سے روسی نیت کی تصدیق ہوتی تھی۔

۳ر نومبر کو ہنگری کا جرنیل ملیٹر روسی جرنیلوں سے انخلاء کی تفصیلات طے کرنے کے لئے ان کے ہیڈکوارٹر پر گیا جو دریائے ڈینیوب کے ایک جزیرے پر واقع تھا۔ جرنیل کرالی کہتا ہے: "میں جنگ رہنے کی وجہ سے تھوڑی سی پرسکون نیند سونا چاہتا تھا اس لئے میں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ وہ جزیرے کی طرف ریڈیو کار روانہ کر دے جو ہمیں انخلاء کی دم بدم خبروں سے مطلع رکھے۔ کار آدھی رات کے بعد گئی۔ جونہی وہ کشتی پر سوار ہوئی ریڈیو پر اطلاع آنا شروع ہو گئی: "ہم کشتی پر سوار ہو گئے ہیں ——— ہم ڈینیوب عبور کر رہے ہیں ——— اب ہم روسی ہیڈکوارٹر کی طرف بڑھ رہے ہیں ———"

اور اس کے بعد اچانک خاموشی ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ جنرل ملیٹر روسی حراست میں تھا۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ روسی ٹینک شہر میں داخل ہو رہے ہیں اور کاروں سینما اور فوجی بارکوں پر گولہ باری ہو رہی ہے۔ مجھ پر روسی فریب کی حقیقت واضح ہو گئی۔ میں نے وزیرِ اعظم سے جوابی حملہ کی اجازت چاہی مگر اس نے یہ کہتے ہوئے اجازت دینے سے انکار کر دیا: "ابھی حملہ مت کرو۔ کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو گی۔ میں روسی سفیر سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔"

میں کرسی پر گر پڑا۔ دس منٹ بعد روسی ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ میری کھڑکی کے نیچے بھی سنائی دینے لگی۔ میں بے بس تھا۔ میں نے وزیرِ اعظم کو پھر فون کیا۔ لیکن اس نے پھر صبر کی تلقین کی۔ اور اس کے آدھ گھنٹہ بعد وزیرِ اعظم ریڈیو پر قوم کو بتا رہا تھا:

"رُوسی فوج نے ہمارے دارالخلافہ پر ہلّہ بول دیا ہے اور ہماری فوجیں لڑ رہی ہیں۔"

مجھ کو جوابی حملے کا حکم مل گیا تھا۔ میں نے اسی وقت فوج کے ہیڈکوارٹر پر فون کیا مگر یہ سن کر حیرت میں ڈوب گیا کہ فوجی ہیڈکوارٹر پر روسی ٹولیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

اس کے بعد ہم جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر گزرے لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا!"

بوڈاپسٹ میں دوبارہ داخل ہو کر روسی فوج نے جس اصول پر جنگ کی وہ یہ تھا: "اگر کسی مکان سے ایک گولی چلے پورے مکان کو اڑا دو۔ اگر کسی کوچے سے چند گولیاں چلیں تو پورا کوچہ ہموار کر دو"۔ روسی فوجوں نے اس اصول کی سختی سے پابندی کی۔ تیس ہزار گولیوں کا نشانہ بننے والوں کے علاوہ صرف مکانوں کے ملبے میں دب کر ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار تھی اور زخمیوں کی تعداد اسّی ہزار تک پہنچ گئی۔

اس مہیب مسلح فوج کے مقابلے میں یونیورسٹی کے طلباء، لڑکے بالے اور جوان سال لڑکیاں تھیں۔ جس دلیری سے یہ نہتی قوم لڑی اس کی وضاحت صرف ایک مثال سے ہو جائے گی۔ ایک پادری کہتا ہے: "جس بہادری سے بوڈاپسٹ کی لڑکیوں نے مقابلہ کیا، اس کی نظیر ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ لیکن ایک بارہ سالہ لڑکے نے جو کچھ کیا وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے۔ اس نے اپنی کمر سے آتش گیر دستی بم باندھ لئے اور روسی ٹینکوں کی قطار میں جا گھسا۔ اس کے چھوٹے سے جسم کے پرزے ایک دھماکے کے ساتھ ہوا میں اڑ گئے لیکن اس نے دیو ہیکل ٹینکوں کی پیش قدمی روک دی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کسی نہ کسی کو آگے بڑھ کر اس بچے کو خودکشی سے روک لینا چاہیئے تھا۔ لیکن کسی نے اس کو اس لئے نہ روکا کہ سب جانتے تھے کہ وہ کس کے خلاف اور کس کے لئے لڑ رہا ہے"۔

مگر یہ جنگ بہت جلد ختم ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ ہنگری کی روح تھک گئی تھی بلکہ اس لئے کہ مادّی سر و سامان کے بغیر مادّی جنگ زیادہ دیر تک لڑی نہیں جا سکتی۔ بے بسی کی حالت میں ہنگری نے دنیا کو پکارا:

"دنیا کے مہذب لوگو! ہنگری کے حفاظتی برج پر ہزار سالہ شعلے فرو ہونے کو ہیں۔ روسی فوج ہمارے دکھی دلوں کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کے ٹینک اور توپیں سرزمین ہنگری پر آگ برسا رہی ہیں۔ ہماری مائیں اور بیوی بچیاں خوف و ہراس میں گھری ہوئی ہیں۔ ان کے ذہنوں میں ۱۹۴۵ء کی سرخ فوج کی یاد ابھی تک زندہ ہے۔

ایس۔ او۔ ایس ——— ہمیں بچالو۔

دنیا کے باشندو ہماری پکار سنو۔ ہماری مدد کرو۔ نصائح سے نہیں، الفاظ سے نہیں! عمل سے، فوجوں سے اور اسلحہ سے! یہ یاد رکھو، بالشویزم کا یہ سیلاب رکنے والا نہیں ہے۔ شاید اس کا اگلا لقمہ تم ہی بننے والے ہو۔ ہمیں بچالو۔

دنیا کے تہذیب یافتہ مکینو! حریّت و استحکام کے نام پر ہم تم سے مدد چاہتے ہیں۔ ہماری کشتی ڈوب رہی ہے۔ بتیاں گل ہو چکی ہیں، اور ہر لمحہ تاریکی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری فریاد سنو، اٹھو! تم حرکت کیوں نہیں کرتے؟ ——— اپنا محبت بھرا ہاتھ بڑھا دو۔ اے دنیا کے عوام! ہمیں بچالو۔ مدد! مدد! ——— خدا ہم سب کا حافظ ہو!"

یہ ہنگری کے آخری الفاظ تھے، اور ——— اس کے بعد وہ ایک خوفناک سناٹے میں ڈوب گیا!

فاطمہ صدیقی

فیصلہ

گو چاند کی روشنی ہلکے ہلکے اُجالے کے پھیلنے سے پھیکی پڑ چکی تھی تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ صبح ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود نل کے گرد آدمی ابھی سے اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔

نل میں پانی سات سوا سات بجے آئے گا۔ اس وقت تک اچھی خاصی بھیڑ لگ چکی ہو گی۔ روز پانی اسی وقت آتا ہے۔ روز بچے بوڑھے مرد اور عورتیں ہاتھوں میں بالٹیاں یا گھڑے لٹکائے اسی طرح آتے ہیں۔ روز اسی طرح بھیڑ لگتی ہے۔ البتہ پہلے یہاں پانی کے لئے مار پیٹ ہوا کرتی تھی۔ دھکا پیل میں کمزور پیچھے پڑ جایا کرتے تھے۔ خاص طور پر عورتوں کی گالیوں اور کوسنوں کی آوازیں دُور دُور تک سُنائی دیا کرتی تھیں اور اب لائن لگتی ہے۔ سب قطار میں کھڑے ہوتے ہیں اور باری باری پانی بھرتے ہیں۔

شہر کی یہ بستی جہاں پہلے بجلی گھر کے سبب صرف مزدوروں کی چند جھونپڑیاں تھیں آہستہ آہستہ کافی گنجان ہو گئی تھی۔ سڑک کے اس پار نہال کالونی بن گئی ہے۔ کہتے ہیں کسی دردمند نے مہاجرین کے لئے بنوائی تھی مگر اب دراصل بنانے والا خود ہی نہال ہو رہا تھا۔ ایک ایک کمرہ پر مشتمل ایک گھر تھا۔ کمرہ اونچا اس قدر کہ بس آدمی کھڑا ہو سکے۔ چوڑا اس قدر کہ پاؤں پھیلا کر لیٹا جا سکے اور لمبائی اتنی کہ چار آدمی بیک وقت سو سکیں۔ اور اس کا کرایہ ازراہِ غریب نوازی صرف دس روپیہ ماہوار تھا۔ پہلے اس کالونی میں پندرہ گھر تھے، پھر پچاس ہوئے اور آج کل پھر کچھ مزدوروں کو اینٹیں توڑتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ نہال کالونی کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ ویسے اصلی بازار راستہ کے دونوں طرف صبح و شام لگتا تھا۔

نہال کالونی کے علاوہ پرانی بستی کے بھی چند مکانات پختہ ہو چکے تھے اس کے علاوہ وہی ٹیڑھے ٹیڑھے راستوں اور تنگ گلیوں میں بنے ہوئے بانس اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ یہ بستی بجلی گھر میں کام کرنے والے مستریوں، قلیوں اور بابوؤں کی بستی تھی۔ اس بستی اور بجلی گھر کے درمیان ریلوے لائن ہے جس کے اوپر ایک اونچا سا پرانا پل ہے جس کو شائد صرف اس کی اونچائی کے سبب ہاتھی پل کہا جاتا ہے ورنہ کسی کام نہیں آتا۔ سچ ہے ہاتھی مرنے پر بھی سوا لاکھ کا......... اور میونسپلٹی کا یہ نل ٹھیک اسی پل کے نیچے سڑک پر بائیں طرف گڑا ہوا ہے۔

پو پھٹ چکی تھی اور اُجالا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ بارش کے چند چھینٹے پڑ جانے کے سبب صبح بڑی خوشگوار تھی۔ محلّے کے واحد تالاب کے پانی کے ختم ہو جانے کے سبب پانی کے امیدواروں کی قطار کافی طویل ہو چکی تھی۔ چھ بجے گزرنے والی چاٹگام ایکسپریس کے فرانسیسی انجن کی گھڑگھڑاہٹ صاف سُنائی دے رہی تھی۔ چند لوگ لنگیاں باندھے کاندھوں پر گمچھے لٹکائے مسواک کرتے ہوئے پانی کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔

مسواک کرتے کرتے بڈھا رمضانی بھی بستی سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا نل کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک

سلاخ تھی جس کے سرے کو اس نے پیٹ کر نوکدار بنالیا تھا۔ صنعتی علاقہ کی طرف جانے والی پائپ لائن میں اس نے ایک جگہ وہ سلاخ لگا کر ایک پیچ ڈھیلا کر دیا۔ نتھو جو ایک ایک کرکے گرنے والے قطروں سے کسی طرح بدن کو تر کرنے کی فکر میں تھا رمضانی کے ہاتھ ہٹاتے ہی نکلنے والی پانی کی دھار کے نیچے آبیٹھا۔ اس سوراخ میں سے پانی فوارہ کی طرح اُبلتا تھا جس کی وجہ سے بالٹی یا گھڑے میں تو بھرنا ممکن نہ تھا البتہ صبح سویرے نہا کر کارخانوں کی طرف دوڑنے والے مزدوروں کے غسل کرنے کا بہترین انتظام تھا۔

نتھو نے جلدی جلدی صابن مل کر بدن دھویا اور ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ویسے وہ اگر دو چار منٹ اور نہاتا رہتا تو کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ تھا۔ مگر وہ اتنا خود غرض بھی نہ تھا کہ پانی ملنے پر وہ دوسروں کا حق مار کر دیر تک صرف اپنی تسکین کے لئے نہاتا رہتا۔

اس کے ہٹتے ہی جب سالک نہانے کے لئے آگے بڑھا تو خیرو چلا اٹھا "او لاٹ صاحب پہلے میں نہاؤں گا!"

"کیا؟" نتھو نے اسے گھورتے ہوئے کہا "یہاں جمعداری نہیں چلے گی، سالک پہلے آیا ہے وہی پہلے نہائے گا!"

"پہلے میں آیا ہوں" خیرو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تجھ سے پہلے سالک آیا ہے!"

"تیرے کہنے سے، پوچھ لے نورو سے!"

نورو وہیں زمین پر ہوٹل والے کے برتن پھیلائے کڑھائی مانجھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ روک کر کہا "میں نے تو خیرو کو پہلے دیکھا تھا!"

"ارے جھگڑتے کیوں ہو ایک ایک کرکے نہالو" رمضانی جھگڑا چکانے کے لئے بولا۔

مگر خیرو اس آسانی سے ماننے والا نہیں۔ پانی بدستور ابل ابل کر گر رہا تھا۔ گرتا رہے اس کی بلا سے۔ سالک اتنی دیر میں نہا بھی چکتا۔ یہ دوسری بات ہوئی۔ ایک سالک کیا دس سالک اس سے پہلے نہالیں اسے ذرا بھی پرواہ نہیں مگر انصاف کی بات میں وہ بڑے ٹھیکیدار کی بھی نہیں سنتا۔

"سالک پہلے آیا تھا" رمضانی اسے سمجھاتے ہوئے بولا "میں نے اسے راستہ سے چابی لانے بھیج دیا تھا"

"تب کوئی بات نہیں" ——— اس نے بدن پر تیل ملنا شروع کر دیا۔ سالک پانی کے نیچے جا بیٹھا۔ نل میں پانی اس وقت تک نہ آیا تھا، قطار اور لمبی ہو چکی تھی۔

"تم آج ابھی سے نہانے کیوں آ گئے؟" نتھو نے رمضانی سے پوچھا۔

"کیوں۔ کام پر جانا نہیں کیا؟"

"آج بھی کام پر جاؤ گے؟"

رمضانی آج سے نہیں، پچیس برس سے اسی طرح اسی وقت نہا کر کام پر جاتا رہا ہے۔ اس کے لئے جمعہ یا اتوار، چھٹی یا ہڑتال کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ نتھو کی بات سن کر وہ چونکا۔

"کیوں آج کیا بات ہے؟" ——— اس نے آہستہ سے پوچھا

"کام پر جاؤ گے تو کچہری کون جائے گا۔ آج تاریخ نہیں ہے کیا؟"

"اوہ کچہری ——— ! کچہری جا کر بھی کیا کروں گا ——— ؟ تاریخیں تو کتنی آئیں اور گزر گئیں!" اس نے بڑی بے نیازی سے

کہا اور ہاتھ منہ دھونے لگا۔ ایک اینٹوں سے بھری ہوئی ٹرک تیزی سے دھول اڑاتی ہوئی گزر گئی۔

اسحٰق نحورسے ضبط نہ ہو سکا، وہ لنگی نچوڑتے ہوئے بولا ـــــــ "پھر بھی کچھ فیصلہ تو ہوگا۔؟"

"بس ہو چکا فیصلہ ـــــــ ہو چکا انصاف۔ میں کیوں خواہ مخواہ اپنی ایک دن کی مزدوری بھی برباد کروں اور سارے سارے دن کچہری میں بھی بھوکا پیاسا مارا پھروں ـــــــ تم کو ایسا ہی شوق ہے تو دیکھ آؤ 'انصاف' میں منع نہیں کرتا!"

اس کو اپنے بیٹے کی رہائی کا ایک مدت تک انتظار رہا۔ اس نیک بیٹے کا جس کو پولیس ایک رات چپکے سے غنڈہ کہہ کر پکڑ لے گئی تھی۔ پھر انتظار مایوسی میں بدلتا گیا۔ اب اس کو انتظار بھی نہیں۔ فکر بھی نہیں ـــــــ مگر وہ مایوس بھی نہیں ـــــــ اسے امید ہے کہ ایک دن اس کا بیٹا ضرور رہا ہو کر آئے گا۔ مگر کب؟ ـــــــ جب زبردستی بغیر مقدمہ چلائے جیل میں ٹھونسنے کا قانون ختم ہو جائے گا ـــــــ جب جھوٹے لوگوں کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اُسے امید ہے وہ دن ضرور آئے گا ـــــــ آج نہیں تو کل ـــــــ!

نل میں پانی اس وقت تک نہیں آیا تھا، مگر آنے ہی والا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ قطرہ ٹپک جاتا تھا۔ قطار میں سے کسی نے چلاّ کر پوچھا ـــــــ "چچا آج عدالت نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں" ـــــــ اس نے بھی چلاّ کر جواب دیا۔

اس کا غیر متوقع جواب سُن کر کئی مرد و عورتیں قطار سے نکل کر نزدیک آگئیں۔ ان کی آپس میں کانا پھوسی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُن کو رمضانی کے جواب پر حیرت ہے۔ نزدیک آتے ہی کسی نے پوچھا:

"کیوں نہیں جاؤ گے۔ تاریخ رہائی کی بارہ تی کا حکم ہو گیا؟"

رمضانی کے بوڑھے چہرے پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی "ہاں رہائی کا حکم ہو گیا تھا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔ اب اسے شادی کرنے کے لئے ہوائی جہاز سے امریکہ بھیجا گیا ہے"۔ یکایک وہ سنجیدہ ہو گیا ـــــــ "تم سمجھتے ہو وہ اسے عدالت میں لے آئیں گے اور عدالت انصاف کر دے گی وہاں قانون کے الفاظ کے ساتھ کھیلا جائے گا، قانونی داؤ پیچ ہوں گے۔ میرا وکیل حقِ نمک ادا کرے گا اور سرکاری وکیل حقِ تنخواہ ـــــــ میں جاہل آدمی ٹھہرا، نہ قانون سمجھتا ہوں نہ اس کی موشگافیاں۔ پھر میرے جانے سے فائدہ؟"

"پھر بھی تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ سلیم کو عدالت میں نہیں لائیں گے؟"

"کیسے لائیں گے۔ اتنی ہمت ہوتی ان کی تو اگر عدالت میں لانا ہوتا، اگر انصاف ہی کرنا مقصود ہوتا تو پھر بغیر انصاف کئے جیل میں ٹھونسنے کا قانون کیا شوقیہ بنایا تھا؟"

سب دم بخود سُن رہے تھے۔ سُن کر سب دم بخود تھے۔ پائپ سے پانی ابل ابل کر بہے جا رہا تھا۔ مگر اب خیرو کو نہانے کا ہوش تک نہ تھا۔

اسحٰق ساٹھ برس کے ضعیف نمبردار نے اس چھیانک خاموشی کو توڑا۔ اس نے دھاگہ بٹی بیڑی کا ایک لمبا سا کش لے کر اسے پھینکتے ہوئے کہا: "آخر عدالت اور قانون ......!

"ارے چچا" رمضانی بات کاٹتے ہوئے بولا "تم سمجھ رہے تھے انگریز چلا گیا تو اب امن و انصاف کا دور آیا ہے۔ قانون تو

کتابوں میں رہتا ہے ۔ پھر جس کا قانون ہے اسی کی عدالت اور اسی کا راج ۔ کوئی قانون اگر ان کے خلاف پڑتا ہے تو پھر ایک قانون بنا کر اس قانون کو باطل کرتے ان کو کتنی دیر لگتی ہے ..."

برتن مانجھتے ہوئے نورو کے ہاتھ بھی یہ بات سن کر رک گئے ۔ اس کو سلیم کا انتظار تھا ۔ ایک وقت جب وہ سارے دن کے فاقے سے تھا تو سلیم نے اس کو اس ہوٹل میں نوکری دلائی تھی ۔ پھر نورو کو اپنے مدرسہ میں بھی داخل کر لیا تھا جہاں وہ رات مزدوروں کو بنگلہ اور قرآن پڑھایا کرتا تھا ۔ اسے امید تھی وہ پڑھ لکھ کر کہیں اچھی جگہ نوکر ہو جائے گا ۔ پھر وہ اپنی بوڑھی ماں کو ہر ماہ کچھ روپیہ بھیجا کرے گا ۔ اب رمضانی کی باتیں سن کر اسے انتہائی مایوسی ہو گئی ۔ اس کا دل ٹوٹ گیا ۔ کیا اب وہ کبھی ماں کی خدمت نہ کر سکے گا ؟ ہمیشہ اسی طرح برتن مانجھتا رہے گا ——— ؟

آمنہ کی ماں قطار کی طرف جاتی ہوئی بولی " شریفوں کی زبان ایک ہوتی ہے بابو ۔ یہ کیسی ایک زبان ہے کہ ایک طرف قانون بھی ہے دوسری طرف کالا قانون بھی ہے ۔ رکھنی ہے تو ایک چیز رکھو ۔ یا تو انصاف ہی رکھو یا بے انصافی ہی رکھو ۔ بھیا انصاف کے رہتے ہوئے بے انصافی کرنا کہاں کا انصاف ہے ؟"

" یہ امریکہ کا انصاف ہے نانی ! اور امریکہ بہت بڑا ملک ہے ! " رمضانی ہنستے ہوئے بولا ۔ " خیر وہ تجھے تو جلدی جانا نہیں ، لا پہلے میں ہی نہا لوں " ———

" ہاں ، آجاؤ " ———

رمضانی نے نہانا شروع کر دیا ۔ پانی کی قطار سے جو لوگ نکل کر آگئے تھے وہ واپس چل دیئے ۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد رمضانی کو احساس ہوا کہ نل کے پاس کچھ جھگڑا ہو رہا ہے ۔ اندھی آمنہ کی ماں کی اونچی بات دار آواز سب سے نمایاں تھی ۔ جلدی جلدی لنگی نچوڑ کر جب وہ قطار کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ لائن چھوڑ کر اس سے بات کرنے گئے تھے ان میں اور بقیہ آدمیوں میں جھگڑا ہو رہا ہے ۔ لائن میں جس سے صرف دو منٹ کے لئے وہ ہٹ گئے تھے اب اسی جگہ کھڑے ہونا چاہتے تھے ۔ دوسرے لوگ کہہ رہے تھے کہ ان کو سب سے پیچھے کھڑا ہونا پڑے گا ، کیوں کہ یہی طریقہ ہے اور پانی کے امیدواروں کی کھڑی ہوئی پارلیمنٹ کے قانون کی پہلی دفعہ ۔!

دراصل یہ قانون بھی سلیم ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا ۔ صرف یہی ایک آئین نہ تھا ، دوسری دفعات بھی تھیں مثلاً ایک شخص ایک وقت میں کتنا پانی لے سکتا ہے ۔ کس وقت زیادہ پانی لیا جا سکتا ہے اور کس وقت غسل بھی کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ اس قانون کے پاس ہونے سے پیشتر اکثر مار پیٹ کی نوبت آجایا کرتی تھی ۔ اور خصوصاً رمضان میں تو روزانہ ہی دو چار جھگڑے ہوا کرتے تھے ۔

شروع شروع میں جب یہ قانون بنایا گیا تو نہال کالونی کے بابو رشید بہت بگڑے تھے ۔ چونکہ صبح کے وقت ایک آدمی صرف ایک بالٹی پانی لے جا سکتا تھا اس لئے انتقاماً وہ دوسرے دن شاید پڑوسیوں سے مانگ تانگ کر چار پانچ بڑی بڑی بالٹیاں اور اپنے سب بچوں کو لئے چلے آئے تھے اور جب کوئی ان کو اس بات پر قائل نہ کر سکا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تب سے اس دفعہ میں یہ اضافہ کیا گیا کہ ایک شخص ایک وقت میں اتنا ہی پانی لے سکتا ہے جتنا وہ خود لے جا سکتا ہو ۔ اس پر بھی رشید صاحب نے اعتراض کیا بہت واویلا مچایا ، مگر اکثریت کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی ۔

آج بھی رشید بابو ہی زیادہ چلا رہے تھے : " جو طریقہ ہے اسے ماننا ہی پڑے گا ۔ واہ جی واہ ، تم کون ہو قانون توڑنے والے ۔ پیچھے

کھڑا ہونا پڑے گا۔ سب کے پیچھے ..."

آمنہ کی ماں بھی زور زور سے چیخ چیخ کر جواب دے رہی تھی ——— "تجھے اللہ سمجھے۔ میں تو ذرا کی ذرا سلیم بیٹا کی خبر لینے چلی گئی۔ اتنے دنوں سے بیچارے کو جیل میں بند کر رکھا ہے اور کوئی اس کے باپ سے اس کی خبر بھی نہ پوچھے"۔

آمنہ کی ماں سلیم کو بہت یاد کرتی تھی۔ وہ اکثر پانی بھر کر اس کے گھر پہنچا دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا بھی تھا کہ نانی ——— ذرا اسلامی قانون بننے دے پھر تجھے اس بڑھاپے میں اندھی آمنہ کو کھلانے کے لئے گھر گھر مزدوری کرنی نہیں پڑے گی۔ گھر بیٹھے وظیفہ ملا کرے گا۔ اب وہ سلیم کی منتظر تھی، وہ آئے تو پوچھے بیٹا اسلامی قانون کب تک بنے گا؟ اسے سلیم کا انتظار تھا کیوں کہ اسے اسلامی قانون چلتے دیکھنے کی آرزو تھی۔

رمضانی کو قریب آتے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی۔ اس نے کہا: "رمضانی بھیا تو ہی انصاف کر دے۔"

رشید بابو بولے "رمضانی اور کیا انصاف کرے گا۔ انصاف تو کیا ہی ہوا ہے۔ تجھے سب سے پیچھے جاکر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

مگر رمضانی کو اس آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ اور لوگ جو ابھی تک خاموش تماشائی تھے بول پڑے "سنو تو رمضانی کیا کہتا ہے!"

رمضانی تولیہ سے موہنہ پونچھتے ہوئے رشید بابو سے مخاطب ہو کر بولا ——— "بابو ہم غریب آدمی ضرور ہیں مگر مسلمان ہیں، بات بدلا نہیں کرتے!"

اس نے چند لمحہ سکوت کیا۔ چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ رشید بابو پہلو بدل رہے تھے۔ مجمع اس کی بات سننے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اس نے کہا: "ہم دس آدمیوں نے مل کر خود ایک فیصلہ کیا ہے، ایک قانون بنایا ہے۔ ہم جو قانون بناتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں الم کہ آمنہ کی ماں سب کے پیچھے ہی جاکر کھڑا ہونا پڑے گا!"

سب آدمیوں نے سر ہلایا۔ آمنہ کی ماں نے دبی زبان سے احتجاج کیا " ذرا امریکہ کا قانون سننے چلی گئی ......!"

"تم مجھے بعد میں پوچھ سکتی تھیں۔ جب میں ادھر سے گزرتا تب پوچھ لیتیں، اور اگر بات اتنی ہی ضروری تھی تو اس کی قیمت ادا کرنی ہی پڑے گی!"

بوڑھا نمبردار بولا "ٹھیک کہتے ہو"۔

اس نے اپنی بالٹی اٹھائی اور سب سے پیچھے جانے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ نوجوان خلیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا ——— "تم بوڑھے آدمی ہو، تم کو تکلیف ہو گی۔ میں پیچھے چلا جاتا ہوں ———!" اس کی باری آنے میں صرف چار آدمیوں کی کسر تھی مگر وہ خوشی خوشی اپنا گھڑا اٹھائے ۲۵ آدمیوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

لائن کے درمیان میں سے جمن نے پکارا "آمنہ کی ماں، تم کو آمنہ کی دوا بھی لانی ہے، تم میری جگہ آجاؤ!"

جو لوگ رمضانی کی بات سننے کے لئے لائن چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کے نزدیک آکر دبی زبان سے رشید بابو بولے:

"میری بھی آج چھٹی ہے اگر تم میں سے کسی کو کوئی جلدی ہو تو ....!"

(ماخوذ از بنگلہ ادب)

(حلقۂ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

اسرار احمد سہاوری ایم اے

"فال"

یو۔پی۔ میں ہم جیسے جیسے پورب کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، ہمیں لوگ زیادہ جاہل اور توہم پرست ملتے ہیں۔ اور مسلمان تو خصوصاً زیادہ جاہل اور اوہام پرست ہیں۔ اس طرف سابقہ راج کے راجہ صاحبان اور سابقہ علاقے کے نواب صاحبان کی بہت کثرت ہے۔ ان راجہ صاحبان اور نواب صاحبان کا یہ عالم ہے کہ نانِ شبینہ کو محتاج ہیں گولہ گوکرن ناتھ میں بالکل میرے مکان کے سامنے ایک اُجڑے ہوئے روائتی .... نواب صاحب کا جھونپڑا تھا۔ محنت مزدوری کرتے اور روپیہ سوا روپیہ روزانہ کما کر بھوکے نہ سوتے۔ چار چھ گز کی جھونپڑی میں آٹھ دس آدمیوں کا کنبہ رہتا ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ان کے دادا کے قبضہ میں تقریباً آدھا قصبہ تھا۔ بہت بڑے تعلقہ داروں میں شمار ہوتا تھا، لیکن اب پورا قصبہ مقامی سیٹھ ساہوکاروں کے قبضے میں ہے۔ جس مکان میں میں مقیم تھا وہ بھی انہی اجڑے نواب کی ملکیت تھا۔ لیکن اب اس کے مالک سورج بلی منیم تھے اور لطف یہ ہے کہ یہ چار گز کا جھونپڑا بھی اسی سورج بلی منیم نے خرید لیا تھا۔ نواب صاحب نے چھ مہینے ٹھہرنے کی اجازت لے لی تھی۔ اس کے بعد وہ اس سے بھی بے دخل ہو جانے والے تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے، دیکھئے حضرت! ہم نے اس ذرا سی جگہ کے نو سو روپے وصول کئے ہیں۔ اب ہم جوڑ والے محلے میں مکان تعمیر کرانے والے ہیں۔ یہاں تو تمام اہلِ ہنود کی آبادی ہو گئی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر مکان تعمیر کرانے کے لائق ہوتے تو یہ جھونپڑا فروخت کرنے کی نوبت کیوں آتی۔ اسی قسم کی خود فریبی نے آپ کو تباہ کیا ہوگا۔

یہاں لوگوں کا یہ عالم ہے کہ جس معمولی حرف شناس مسلمان نے داڑھی رکھ لی سمجھ لیجئے کہ عوام کی نظر میں وہ ایک سند یافتہ مولوی اور مولانا ہو گیا۔ اچھا اب جس شخص کے سر پر یہ دستارِ فضیلت زبردستی باندھ دی گئی اس سے یہ توقع بھی رکھی جائے گی کہ وہ جادو ٹونے اور ٹوٹکے بھی جانتے ہوں گے۔ اب ایسا اتفاق ہوا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ہی ہم نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ چنانچہ ابھی تک وضعداری کے طور پر چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی مستقل طور پر مولانا کا خطاب ملا ہوا ہے اور گولہ میں اکثر لوگ ہم سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ ہم دعا، درود، فاتحہ خوانی اور میلاد خوانی وغیرہ سے پوری طرح واقف ہوں۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ آزمائش میں پڑ چکے ہیں۔

اس نواح میں لوگ چھالی، تمباکو، کتھا اور چونا ملا کر بہت کھاتے ہیں اور اسے اپنی اصطلاح میں گٹکا کہتے ہیں۔ کتھا اور چونا رکھنے کے لئے ایک گول ڈبیہ سی رکھتے ہیں جسے چنوٹی کہتے ہیں۔ یہ چنوٹی غریب سے غریب آدمی بھی بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہماری مرحومہ ملازمہ بتاشن بھی گٹکا کھانے کی بہت شوقین تھی اور ایک صاف ستھری سی چنوٹی اپنے ساتھ ہر وقت رکھتی تھی۔ ایک دن مہترانی کی نو عمر صاحبزادی کمانے کیلئے آئیں تو بتاشن کی چنوٹی جو آنگن کے ایک طاق میں رکھی تھی، بڑی صفائی سے اڑا کر لے گئیں۔ بتاشن کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ جلدی جلدی صفائی کر کے بتاشن کے آنے سے پہلے وہ ہوا ہو گئیں۔ بتاشن کو تھوڑی دیر بعد طلب

لگی تو جھونٹی کا خیال آیا۔ طاق میں نہ پاکر سخت پریشان ہوئی اور سر پیٹ کر رہ گئی۔ غریب دوسری جھونٹی کہاں سے خریدتی۔ بقول شخصے مُرغی کو تکلے کا گھاؤ ہی بہت ہوتا ہے، تڑپ کر رہ گئی۔ سارے گھر میں تلاش کرتے پھری۔ کہیں ہوتی تو ملتی۔ مہترانی کی شوخ صاحبزادی کا خیال آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور مجھ سے بولی "ضرور یہ مالجادی مہترانی کی چھوکری لے گئی ہے۔ آپ پڑھ کر نام نکال دیں، میں چاول لاتی ہوں۔ آپ ان پر پڑھ کر دم کر دیں۔ میں اس چھوکری کو کھلاؤں گی۔" میں نے بہت کہا کہ بھئی میں نام وغیرہ نکالنا بالکل نہیں جانتا ہوں، مسجد کے مولوی صاحب کے پاس جاؤ وہ نام نکال دیں گے۔ لیکن توبہ کیجئے بتاشن ہماری معذرتیں کہاں سننے والی تھی۔ فوراً جا کر چاول لے آئی۔ ہم نے مجبوراً کچھ پڑھ کر چاولوں پر دم کر دیا۔ بتاشن چاول لے کر سیدھی مہترانی کے گھر گئی اور اس کی لڑکی کو چاول کھلانے پر اصرار کیا۔ لڑکی کام سے کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن ہمارے گھر ہی چاول کھلائے جائیں گے۔ مہترانی اور اس کی لڑکی پر بتاشن نے ہماری ولائت کا بہت رعب جمایا تھا۔ وہ دونوں گھبرا گئیں اور دوسرے دن علی الصبح آکر پاخانے کی ایک طاق میں سے جھونٹی نکال لائیں اور بتاشن سے خوب لڑیں کہ جھوٹا نام لگاتی ہے۔ خود پاخانے میں بھول آئی ہے۔ بتاشن نے بہتیرا کہا کہ میں پاخانے میں کبھی جاتی ہی نہیں لیکن مہترانی ایک نہ مانی۔ خیر۔ بتاشن جھونٹی پاکر خوش ہو گئی اور اس نے اپنے سارے محلے میں ہماری ولائت کا خوب پروپیگنڈہ کیا۔

چنانچہ تیسرے ہی دن میں سائیکل لے کر شوگر فیکٹری دیکھنے جا رہا تھا، کچھ طبیعت خراب تھی اسلئے خیال تھا کہ دیکھ بھال کر کے جلدی ہی واپس آجاؤں گا لیکن ابھی صحن سے نکلا بھی نہ تھا کہ ایک بڑھیا نے آکر سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا اور بولی "مولانا میری لڑکی کئی برس سے بیمار ہے۔ ہوا کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اسے چل کر دیکھ لیں اور یہ فال نکال دیں کہ وہ اچھی ہو سکے گی یا نہیں۔ اگر کچھ امید ہو تو علاج کراؤں ورنہ کیوں پیسہ خراب کروں۔ صبر کر کے بیٹھ جاؤں۔ سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ میں خرچ کر چکی ہوں۔" میں حیران تھا کہ اس بڑھیا کو کیا جواب دوں، کہ بتاشن پر نظر پڑی۔ ایک کونے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس بتاشن کی بچی کی یہ حرکت ہے۔ اس نے بڑھیا سے کہا ہوگا کہ انسپکٹر صاحب بڑے سیانے ہیں۔ میری جھونٹی مہترانی سے نکلوا دی۔ میں نے ٹرے پیلے بہانے کئے۔ بڑی بی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اڑ کر کھڑی ہو گئی۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔ گھر کے تمام لوگ مجھے دیکھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ لوبان وغیرہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی سلگا دیا گیا تھا۔ مریضہ ایک چوکی پر تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ نہائت نحیف و نزار۔ چہرے کے نقوش اور رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی نہائت قبول صورت اور حسین لڑکی ہوگی لیکن اب تو پیوند خاک ہونے کی تیاریاں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ زندگی سے بالکل مایوس معلوم ہوتی تھی۔ اس قدر لاغر تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کی مالا کو تکئے کے سہارے رکھ دیا ہو۔ اس غریب کی یہ حالت دیکھ کر میرے بھی آنسو بھر آئے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کئے۔ دل میں تہیہ کر لیا کہ اس مایوس لڑکی کی ضرور حوصلہ افزائی کروں گا خواہ جھوٹ ہی بولنا پڑے۔ مجھے مریضہ کی چوکی کے برابر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ماں روتی ہوئی آئی اور اس لڑکی کے سر پر بیٹھ کہنے لگی:

"مولانا صاحب کیا بتاؤں میں نے اس کے سینکڑوں علاج کرائے ہیں لیکن کوئی کارگر نہیں ہوتا۔ میری بچی کو یا تو نظر لگ گئی ہے یا کوئی ہوا ستاتی ہے۔ ایک دفعہ تو اس کا سانس رک گیا تھا تین گھنٹے کے بعد لوٹا۔ آپ فال نکال دیں کہ یہ اچھی ہوگی یا نہیں۔ اگر اچھی ہو جائے تو اس کا علاج کراؤں ورنہ خدا کو سونپ دوں۔"

لڑکی نے بڑی حسرت بھری اور یاس انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ہزاروں منتیں ان نگاہوں میں پوشیدہ تھیں، کہ بان حال

سے کہہ رہی تھی کہ مولانا خدا کے لئے میری مدد کیجئے اور مجھے بچائیے۔ میں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ میرا حسن و شباب دیکھتے دیکھتے خاک میں مل گیا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔

میں نے آنکھیں بند کر کے کچھ زیرِ لب پڑھا۔ پھر ایک کٹورے میں پانی دم کر کے اس کو دیا اور کہا کہ اسے پی لو۔ پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے آنکھوں کو اُوپر اٹھایا جیسے کچھ آسمان پر دیکھ رہا ہوں اور وثوق کے انداز سے حکم لگا دیا کہ یہ لڑکی یقیناً اچھی ہو جائے گی انشاءاللہ۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کا علاج کراؤ۔ تعویذ گنڈے وغیرہ چھوڑ دو۔ مریضہ کے چہرے پر فوراً کچھ ایسا نفسیاتی اثر پڑا کہ چہرہ مسرت کے جذبات سے تمتما اٹھا جیسے سوکھی کھیتی کو پانی میسر آ گیا ہو۔ اس کی تشکر آمیز نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ میرے قدموں میں سر رکھ دے گی۔ میں یہ کہہ کر اٹھ آیا کہ تیسرے دن مجھے پھر بلانا میں کچھ دعائیں پڑھوں گا۔ تیسرے دن پہنچا تو لڑکی کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا، اور چہرے پر بڑی شگفتگی تھی۔ میں نے مسکرا کر دریافت کیا کہ اب تو اپنی صحت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ فرطِ جذبات سے اس کی آواز نہ نکلی صرف سر ہلا کر اثبات میں اس کا جواب دے دیا۔ میں نے اس دفعہ پھر یقین دلایا کہ مرض ختم ہو گیا صرف کمزوری باقی ہے وہ بھی چند دنوں میں ختم ہو جائے گی۔ صرف میری یقین دہانی اور ہمت افزائی سے نیم جان لڑکی دو ہفتے کے اندر پوری طرح صحتیاب ہو گئی، حالانکہ اس دوران میں اسے نام کو بھی کوئی دوا نہیں دی گئی تھی۔ ہم اپنی زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں کرتے ورنہ ان باتوں کا انسانی ذہن پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر آپ اچھے خاصے تندرست آدمی سے اکثر یہ کہتے رہیں کہ بھئی تمہاری صحت بڑی خراب ہو رہی ہے، کیا بات ہے خدانخواستہ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ تو یقین مانئے کہ وہ آپ کے اس نفسیاتی حملے کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور چند دنوں میں یا تو واقعی بیمار ہو جائے گا اور یا اسے اپنی بیماری کا غلط یقین ہو جائیگا اور اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ کسی مریض کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں کہ تم بیمار نہیں تندرست ہو تو یقیناً اس کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ ہمیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی میں بھی بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

غرض کہ ایک دن فیروزہ مع اپنی ماں اور بتاشن کے نئے ریشمی لباس میں ایک تھال میں بہترین قسم کی مٹھائی اور ایک تھال میں مختلف قسم کے پھول رکھے میرے گھر میں آ دھمکیں۔ مجھے تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا کہ یہ وہی فیروزہ ہے جو چند دن پہلے بسترِ مرگ پر مایوسی کا مجسمہ بنی پڑی تھی۔ آج ایک نوشگفتہ پھول کی طرح مہک رہی ہے اور اس کے رونگٹے رونگٹے میں زندگی موجیں مار رہی ہے۔ وہ انتہائی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ تھال میں رکھے ہوئے بیلے اور چنبیلی کے پھول بھی اس کے حسن کے آگے شرما رہے تھے۔ مجھے آگے آکر بڑے ادب سے سلام کیا اور پائینتی بیٹھ گئی۔ دونوں تھال میرے سامنے رکھ دیئے۔ میرے خوشی سے آنسو نکل آئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے اپنی حقیقی بہن کو موت کے چنگل سے چھڑا لیا ہے۔ ایک رکابی میں تھوڑی سی مٹھائی اور پھول لے کر اسے کہا کہ باقی واپس لے جاؤ اور بچوں میں تقسیم کر دینا۔ اس نے بے چون و چرا حکم کی تعمیل کی اور سب لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو گوکنہ سے تبادلہ کرالو ورنہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی اور پھر ہر وقت لوگ تعویذ گنڈے اور دعا و درود کے لئے گھیرے رہیں گے اور اگر انکار کرو گے تو جان کی امان نہ پاؤ گے!

——— ———

انور صدیقی

غزل

اندھیری راہ میں عزمِ سفر کی بات کرو، چمن میں آج طلوعِ سحر کی بات کرو

اُداس اُداس ہے شام و سحر کی رعنائی نگاہداریٔ شمس و قمر کی بات کرو

گذر گئی ہے یہ کہتی ہوئی نسیمِ چمن، قفس نصیب ہو، کچھ بال و پر کی بات کرو

نہیں ہیں وجہِ سکوں پچھلے غم کے افسانے دلِ حزیں سے غمِ تازہ تر کی بات کرو

ہے جس کا ذرّہ ناچیز مہر و مہ کا امیں دیارِ دوست کی اُس رہگذر کی بات کرو

شکستہ پا ہیں وہ انورؔ، جو مجھ سے کہتے ہیں
جنوں کے دشت میں دیوار و در کی بات کرو

نعیم صدیقی

غزل

جب اُن سے لگی تو کیسی دُوئی؟ غیروں سے کنارا چاہئے تھا
جاں پُوری کی پوری چاہئے تھی، دل سارے کا سارا چاہئے تھا

ہم چرخ کا سینہ بھ ماتے، ہم دورِ زماں سے ٹکراتے،
پر تیری طرف سے جانِ نظر! ہلکا سا اشارا چاہیئے تھا!

کاہے کے لئے یہ برقِ تپاں؟ کیوں اتنے جہنم شعلہ فشاں؟
اس دل کو بھسم کرنے کے لئے اک آدھ شرارا چاہیئے تھا!

کاٹی تو رہِ تسلیم و رضا اے حسن! وفا کے ماروں نے
تھوڑی سی تسلّی چاہیئے تھی، تھوڑا سا سہارا چاہیئے تھا!

جس نگہِ کرم نے مار دیا وہ نگہِ کرم پھر کی ہوتی،
اک بار وہ جس کا ذوق دیا وہ لُطف دوبارا چاہیئے تھا۔

عزیز دانش

غزل

عشق ہے بے سر و ساماں تو کوئی بات نہیں
دُور ہے منزلِ جاناں تو کوئی بات نہیں!

جادۂ عشق ہے دشوار تو دُشوار سہی،
لغزشوں کا بھی ہے امکاں تو کوئی بات نہیں

شرطِ منزل ہے فقط جوشش و نشاطِ پیہم،
سُست ہے گردشِ دوراں تو کوئی بات نہیں

عشق تو دار و رسن سے بھی گزر جاتا ہے
سامنے ہے دَرِ زنداں تو کوئی بات نہیں

دامنِ مہر و وفا چاک نہ ہونے پائے،
چاک ہیں جیب و گریباں تو کوئی بات نہیں

اسی خاشاک سے پھوٹے گی بہارِ گلشن،
بزمِ گلشن ہے پریشاں تو کوئی بات نہیں،

بات جب ہے کہ خزاں میں کوئی گُل ہو خنداں
خندۂ صبحِ بہاراں تو کوئی بات نہیں

خود ہمیں ذوقِ دُرِ ناب نہیں ہے دانشؔ
ورنہ ہر موج ہو طوفاں تو کوئی بات نہیں

نقوشِ خاطر

آباد شاہپوری

(دو مکتوب)

[ذیل میں دو خط شائع کئے جا رہے ہیں۔ یہ ۱۹۵۳ء کے دورِ پرآشوب میں لکھے گئے تھے۔ ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ آج بھی اور آئندہ بھی حق کے پرستاروں کو باطل کے خلاف صف آرا ہونے پر اُبھارتے رہیں گے۔ ع "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"]

(۱)

مکتوب مع افسانہ ملا۔ شکریہ۔ مکتوب پڑھ کر کیا کہوں، کیا کیفیت ہوئی۔ بس ع:

اشکے کہ ز دل خیزد در دیدہ شکستم من

میری صحت بدستور ہے سنیے خیریت سے ہیں، رفقاء حالات کے علی الرغم سعی و جہد میں گم ہیں اور لاہور؟ ؎

عیاں ہے جنبشِ دیوار و در سے | کوئی دیوانہ گزرا ہے اِدھر سے

وہ ہے رفقائے قفس اور میر کارواں! تو بھائی وہ پیغام دے رہے ہیں ؎

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ | دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
اے منت اربابِ وفا! صبر و تحمل | چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

اور عرش نشینوں سے کہہ رہے ہیں ؎

یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا!! | کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو لے آ کے بجھا دیکھ

واللہ متم نورہ و لو کرہ الکفرون

آپ نے درست سُنا۔ حدیث میں ہے مومن کو ابتلا و آزمائش کی از خود آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن جب قیدِ قفس سے چھوٹنے والے ایک ساتھی سے اس تربیت گاہ کی داستان سنی تو بے اختیار دل میں تمنا جاگ اٹھی اور ذہن کی تختی پر طالب آملی کے اشعار اجاگر ہو گئے ؎

بیا کہ مجمعِ خوبانِ دلربا ایں جاست | کہ شمع ہا ہمہ ایں جا زنار ہا ایں جاست
کجا بہشت کجا بزم بادہ لے زاہد | تو دل بجائے دگر بستہ و جا ایں جاست
مرو بدیدنِ بلبل سوئے چمن طالب | بیا کہ بلبل مستِ غزل سرا ایں جاست

بھائی تصور تو کیجئے، زنداں کی چار دیواری ہو، شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ ہو اور مولانا اصلاحی اس کا درس دیں۔ کیا عالم جذب و سوز نہ ہوگا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے بھی تو اسے ایک ایسی چار دیواری میں بیٹھ کر لکھا تھا جہاں اسلام کو زندگی کے ہر گوشے سے خارج کر کے محبوس کر دیا گیا تھا اور اس کی بیعت

جو گویا تھی کہ زبانِ حال سے پکار رہا تھا ۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم
کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش !
چہ معصومانہ غربت را فریبم

آپ مجھ سے سفارش چاہتے ہیں۔ بھائی آپ یہاں ہوتے تو سفارش کی مطلق حاجت نہ تھی وہ لکھنے ——— لب بہ بند از اسرار ما مگو
اور آپ صرف اتنا کہہ دیتے ——— خبر آ نعرۂ تکبیرم آرزو دست
تو یقین جانئے آج آپ سفارش کے طالب نہ ہوتے ۔

(والسلام)

(۲)

جفا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

عزیزی ! وادیٔ نیل کے حوادث پر کون آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہوگی اور کون دل ہے جو خون نہ روئے گا ۔ آپ کا حزن واندوہ بجا ۔ لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ ہماری سیزدہ صد سالہ تاریخ کو ایسے ہی خونچکاں حوادث نے آب ورنگ بخشا ہے ۔ اس باب کو اگر حذف کر دیا جائے تو اس تاریخ کے دامن میں سلاطین و ملوک کی جاہ پرستیوں ، بندگانِ ہوس کی سرمستیوں اور "فراعنۂ امت" کی حق فراموشیوں کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے ۔

یہ سرخیٔ گل و لالہ مرے لہو سے ہے

اخوان پر جو کچھ گذری ہے حق پرستوں پر ہمیشہ گزرتی آئی ہے ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا جو میرے ساتھ آتا ہے وہ اپنی صلیب آپ اٹھا کر چلے مطلب یہ ہے کہ حق کا راستہ اختیار کرنا کوئی کھیل نہیں ہے ۔ اس پر چلنے والے کو آفات و مصائب کے ہجوم اور سلب و نہب اور دار و رسن کے مراحل کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے ۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا !!

اپنی صلیب آپ اٹھا کر "پہلے بغیر منزلِ عشق" پر جا پہنچنے کی تمنا تمنائے خام کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ یہ سودا جن کے سر میں سمایا ہے انہیں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا پڑی ہے اور راستے کی مہیب رکاوٹوں سے متصادم ہونا پڑا ہے ۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولمّا یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین امنوا معہ متیٰ نصر اللہ ۔

ابتلاء اور آزمائشیں ایمان کا منطقی تقاضا ہیں ——— ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ۔ ان کے بغیر نہ مومن و منافق اور مخلص و غیر مخلص کے درمیان امتیاز کیا جا سکتا ہے اور نہ ایک مقصدِ عظیم کی خاطر جد و جہد کرنے والوں کو میل کچیل سے پاک کر کے کندن بنایا جا سکتا ہے ۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولمّا یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصبرین ۔

حیاتِ اجتماعی کے خزاں زدہ ماحول کے لئے دعوتِ حق موسمِ بہار کی پیامبر ہوتی ہے اور جب بہار آتی ہے تو اس سے لطف اندوز ہونے والوں کے لیے جنوں سامانیاں اپنے جلو میں لے کر آتی ہے۔ مومن نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی!
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

آپ اندوہگیں ہیں کہ اسلام کی ایک عظیم قوت کو کچل ڈالا گیا ہے جس سے نہ صرف مشرقِ وسطیٰ کا مستقبل وابستہ تھا بلکہ جو کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں کلمۃ اللہ بلند کرنے والی تحریکوں کی تقویت کا باعث بھی تھی۔ آپ کو اس حادثے نے مستقبل سے کچھ مایوس کر دیا ہے حالانکہ یہ حادثہ ایک نئے دور کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ع

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

دعوتِ حق کا قافلہ مکّہ کی پرصعوبت گھاٹیوں اور بدر و حنین کے خونیں میدانوں میں سے گزرنے کے بعد ہی منزل ہمکنار ہوا کرتا ہے۔ ذرا مکّی دور پر ایک نظر ڈالئے اس دور میں اسلامی تحریک جن حالات سے دوچار تھی ان کی موجودگی میں کون تصور کر سکتا تھا کہ مٹھی بھر افراد پر مشتمل یہ تحریک ایک روز طوفان بن کر پورے عرب پر چھا جائے گی اور جس تحریک میں شامل ہونا مصائب و آلام کو اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دینا ہے ایک دن لوگ اس کی طرف اس طرح لپکیں گے کہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کا سماں بندھ جائے گا۔

اسلام اور مسلمانوں پر کوئی ابتلاء آتا ہے تو دشمنانِ حق کے گھروں میں گھی کے چراغ جلا ہی کرتے ہیں مگر آپ کے اُن صاحبِ ورع و تقویٰ بزرگ کے متعلق کیا کہوں؟ —— اگر ہو سکے تو ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دیجئے۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

والسلام

نقد و نظر

حج کیا ہے!

تصنیف : سید حامد علی
ناشر : مکتبہ جماعتِ اسلامی رامپور (بھارت)
قیمت ۱۰/۸ آنے صفحات : ۹۶ سائز $\frac{20\times30}{16}$

حج اسلام کا بنیادی رکن ہے اور مذہب سے بے تعلقی کے اس دور میں بھی مسلمان اس اہم فریضے کی طرف اس قدر متوجہ ہیں کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں بھی تمام عازمین کو پاسپورٹ اور ویزا کی سہولتیں فراہم نہیں کی جاسکتیں۔ ایک بڑی تعداد ہر سال محروم رہ جاتی ہے۔ یہ تو اس فریضے کی اہمیت اور مسلمانوں کے ذوق و شوق کا حال ہے۔ لیکن جہاں تک ان فوائد اور برکات کا تعلق ہے جو مسلمان قوم کو لازمی طور پر حاصل ہونی چاہیئے تھیں تقریباً مفقود نظر آتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ رفتہ رفتہ حجاج کا احترام تک ختم ہو رہا ہے۔ عام ماننے یہ بن رہی ہے کہ جو صاحب حج کر آتے ہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ بدمعاملہ اور سخت دل بن جاتے ہیں۔

اس خرابی کے اور بھی بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو لوگ یہ اہم دینی فریضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں وہ اس کی روح سے آشنا نہیں ہوتے۔ لے دے کے انہیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم چند ہزار روپے کی قربانی دے ڈالیں گے تو ہمارے تمام گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ حج کے اس فائدے سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ خاص ایام میں ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر کا نام حج رکھ دیا جائے۔ حج صرف مکہ اور مدینہ کے سفر کا نام نہیں بلکہ عالمگیر اصلاح (اسلام) کی ایک جاندار تحریک کے اہم حصے کا نام ہے جس کے پس منظر میں عشقِ الٰہی کا ولولہ اور انسانی مساوات و اخوت اور خدمت کے ساتھ خود اپنی اصلاح کی امنگیں کارفرما ہیں۔ یہ حقیقی مقاصد نظروں سے اوجھل ہونے تو مسلمان قوم ان فوائد سے بھی محروم ہو گئی جو فریضۂ حج کی ادائگی کے بعد لستہ لازمی طور پر حاصل ہوتے۔

سید حامد علی صاحب نے اس کتابچے میں فریضۂ حج کی اسی رُوح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حج بیت اللہ کے سلسلے میں ایسی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں حجاج کی سہولت کے خیال سے عرب کے جغرافیائی حالات، مناسک اور دعاؤں وغیرہ کا حال ہے، لیکن اسی موضوع پر (غالباً) یہ پہلی کوشش ہے اور فاضل مصنف اس کوشش کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھ کر یقیناً ایک اہم دینی خدمت انجام دی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے یہ کتابچہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن حکیم کی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں حج کی اہمیت اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اس فریضے کی رُوح کی طرف اشارات ہیں اور تیسرے حصے میں مناسک

کا احوال بیان کیا گیا ہے اور اس طرح اپنی تنگ دامانی کے باوجود یہ تحریر موضوع کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ مصنف کا انداز بیان بے حد آسان، دلکش اور پرخلوص ہے۔ انھوں نے ہر جگہ انصاف اور اعتدال کو اپنایا ہے اور یوں یہ کتاب مسلمانوں کے تمام فرقوں کے انصاف پسند حضرات کے لئے قابل قبول بن گئی ہے۔

اگر بعض دردِ دل رکھنے والے مسلمان، مصنف کی اجازت سے اس کتاب کا سستا ایڈیشن چھاپ کر حجاج کے کیمپوں اور حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں مفت تقسیم کریں تو اس سے بے حد مفید نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ عربی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کرنا اور بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

(نظر زیدی)

چہچہے

مصنف : مضطر گجراتی

ناشر : مکتبۂ علمیہ، لیک روڈ لاہور

قیمت : ۱۲/ر صفحات، $\frac{۲۲×۳۰}{۱۶}$ سائز کے ۴۸

چہچہے مضطر گجراتی کی چھوٹی چھوٹی ۴۰ نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں انہوں نے ننھے بچوں کے لئے لکھی ہیں اور ان میں ایسے پرندوں کا احوال بیان کیا گیا ہے جنھیں ننھے بچے جانتے پہچانتے ہیں۔

اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کوشش نہایت اچھی ہے لیکن اندازہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کام بے حد عجلت میں انجام دیا ہے۔ ایسی نظم تو شاید ایک بھی نہ ملے جس میں ایک آدھ اچھا شعر نہ ہو گیا ہو، لیکن کتاب کی عام فضا آمد کے حُسن اور ذائقے سے محروم ہے۔ بس ایک حسابی قسم کی شاعری ہے جسے مضطر صاحب اپنی کہنہ مشقی کی بنا پر نباہ گئے ہیں۔ اگر کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں وہ اپنی ان نظموں میں اور رس اور خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کریں تو یہ کتاب اور بھی مفید ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ان نظموں میں بعض ایسے الفاظ بھی آگئے ہیں جو سماعت سے ثقیل معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ ذہن پر گراں گزرتے ہیں: مثلاً گندا پاپی، پلید وغیرہ۔ عام اخلاقی ضابطوں کی رُو سے شاید ان الفاظ کی گنجائش نکالی جا سکے لیکن بچوں کے ادب کی معصوم، سادہ فضا میں ایسے الفاظ کا کھپانا مشکل ہوگا۔

بہر حال یہ کتاب اس قابل ہے کہ بچوں کی لائبریری میں رکھی جائے۔ کم سے کم اس کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ بچے پرندوں کے انواع عادات اور ناموں سے مانوس ہو جاتے ہیں اور ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب مصور ہے اور رنگدار چھاپی گئی ہے

(نظر زیدی)

۱۔ طریقۃ جدیدۃ فی تعلیم اللغۃ العربیۃ حصہ اول باتصویر قیمت آٹھ آنے ۴۰ صفحات، چھوٹا سائز

۲۔ قواعد اللغۃ العربیۃ حصہ اول قیمت دو روپے، ۲۲۴ صفحات۔ چھوٹا سائز

۳۔ مبادی تعلیم القراۃ العربیہ باتصویر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، ۱۰ صفحات سائز بڑا۔

ناشر: مکتبہ علمیہ، ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور۔

ان میں سے پہلی کتاب شام کے الاستاذ محمد امین المصری کی تالیف ہے۔ محمد امین المصری کو چند سال پیشتر شامی سفارت خانہ نے پاکستان میں عربی تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں بلایا تھا اور انہوں نے کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں اپنے ایک نئے انداز پر عربی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تھا، چنانچہ ان کی یہ تالیف اسی زمانہ کی ہے۔ جہاں تک کتاب کی زبان کے صحیح ہونے کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا استعمال صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے جب کہ اسے براہ راست طریقہ (DIRECT METHOD) پر پڑھایا جائے۔ عربی بول چال سیکھنے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ جہاں کوئی ایسے صاحب ہوں جو عربی کا اچھا ذوق رکھتے ہوں اور عربی بولنے پر قدرت رکھتے ہوں، وہاں وہ تختۂ سیاہ اور اس کتاب کی مدد سے آٹھ دس نوجوانوں کو عربی بولنے کی اچھی مشق کرا سکتے ہیں۔ مکتبۂ علمیہ نے ابھی اس کتاب کا پہلا حصہ شائع کیا ہے۔ اس حصہ کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری کتاب کم از کم تین اور حصوں پر مشتمل ہوگی جنہیں مکتبہ بعد میں شائع کرے گا۔

دوسری کتاب میں عربی زبان کے قواعد درج کئے گئے ہیں اور پھر اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے، الفاظ کو جملوں میں استعمال کرنے خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کرنے اور اسی طرح کے دوسرے سوالات کے ذریعے ان قواعد کی مشق کرائی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں۔ کتاب کی ترتیب ایک نئے انداز سے کی گئی ہے جس کے مطابق یہ پہلا حصہ ان قواعد پر مشتمل ہے جو اسم کے متعلق ہیں، فعل اور حروف کے قواعد غالباً اگلے حصوں میں بیان کئے جائیں گے۔ کتاب کی زبان اس لحاظ سے اطمینان بخش ہے کہ مرتب نے کوشش کی ہے کہ خود ساختہ جملے بہت کم استعمال کئے جائیں اور زیادہ تر جملے عربی گرامر کی جدید کتابوں سے اخذ کئے جائیں۔ جو لوگ پہلے سے عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں اور اپنی تعلیم کو ترقی دینا چاہتے ہوں ان کے لئے کسی استاد کی مدد سے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ بالکل مبتدی شاید اس کتاب سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکیں، کیوں کہ مختلف کتابوں سے جملے اخذ کرنے کی وجہ سے کتاب میں بہرحال وہ تدریج نہیں ہے جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔

تیسری کتاب تصویروں کے ذریعے چھوٹے بچوں کو عربی الفاظ یاد کرانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ جو لوگ خود اچھی عربی جانتے ہوں، وہ اس کتاب کے ذریعے چھوٹے بچوں کو پہلے عربی الفاظ یاد کرانے اور بعد میں آہستہ آہستہ عربی بولنے کی بھی مشق کرا سکتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں۔

(م - ع)

وہ ایک انسانی کردار تھا ———
جو ہمیشہ بھڑک اُٹھنے والی آگ لے کے اُٹھا۔
اور ——— اس کا وجود مکمل راکھ بن کر رہ گیا!
تب اس پر یہ حقیقت کھلی کہ

زندگی کو 'ٹھنڈی آگ' کی ضرورت ہے
بجھی ہوئی آگ نہیں
!

ٹھنڈی آگ!

- جو بھڑک سے اڑ جانے والے مادوں کے لئے کسی کام کی نہیں!
- جو زندگی کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے کے لئے ہے!
- جس کا نہ شعلہ ہے نہ دھواں!

یہ نعیم صدیقی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ افسانوں اور کرداری و نفسیاتی خاکوں کا تازہ مجموعہ ہے!

ایک جاندار افتتاحیہ ——— "میرا قلم، میرا ادب" کے عنوان سے

- یہ ایک پیغام ہے ——— "نئی نسل کے نام"

طباعت معیاری اعلیٰ   خوشنما گرد پوش   ضخامت ۴۰۴ صفحات

قیمت [illegible] روپے

مکتبہ چراغ راہ
کراچی

ماہنامہ سوداگر کراچی

اشاعتِ خاص

سنہ ۱۹۵۷ء

- "سوداگر" نے ہمیشہ پاکیزہ فکر و نظر، اور تعمیری مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہے۔
- "سوداگر" نے دینی و اخلاقی رجحانات کے احیاء کی سعیِ پیہم کی ہے۔
- "سوداگر" نے روزِ اول سے سماجی و معاشرتی خرابیوں اور بُرائیوں کو مٹانے کے لئے قلمی جہاد کیا ہے۔
- "سوداگر" نے اِنفرادی و اِجتماعی سیرت و کردار کی تعمیر کی مسلسل دعوت دی ہے۔
- "سوداگر" ۵۴ء میں اصلاحِ رسوم نمبر، ۵۵ء میں خاتون نمبر، اور ۵۶ء میں اشاعتِ خاص پیش کر کے ادبی دُنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔
- "سوداگر" اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں سنہ ۱۹۵۷ء کا خاص نمبر "اشاعتِ خاص" کے نام سے پیش کر رہا ہے جس کی ضخامت ۲۰×۳۰/۸ کے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہوگی اور جس کے ذریعہ معیاری مقالات و مضامین، افسانے، خاکے، ڈرامے، اور منظومات پیش کی جائیں گی۔ مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ نمبر سالانہ چندہ میں پیش کیا جائے گا۔

سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ چار آنے خاص نمبر بذریعہ رجسٹری کُل تین روپے چار آنے بذریعہ منی آرڈر یا دستی بھیجکر اپنی کاپی محفوظ کرا لیجئے۔ "سوداگر" ایک سال میں اپنے مستقل خریداروں کی خدمت میں ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل مواد بشمول خاص نمبر پیش کرتا ہے۔

ماہنامہ "سوداگر" سرائے روڈ۔ کراچی ۲

آج کے نئے دور میں

جبکہ دنیا کا کاروبار مغرب کے اس بینکنگ سسٹم پر چل رہا ہے جس کا دارومدار "اصول ابواء" پر منحصر ہے

یہ امر باعث نزاع تھا کہ

کیا کوئی باہمی بچت کی اجتماعی اسکیم "اصول معاربت" کے تحت بھی کامیابی سے چلائی جا سکتی ہے؟

باوقار تنظیم

کی چند ماہ میں شاندار کامیابی اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس قسم کی اجتماعی اسکیموں کو سودی لین دین جوئے لاٹری یا قرعہ اندازی جیسے پر فریب حرکات کے بغیر بھی نہایت کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے۔

باوقار تنظیم کیا ہے

یہ چھوٹی بچت کی ایک ایسی پرائز شیئرنگ اسکیم ہے۔ جس میں آپ صرف پانچ روپے ماہوار بچاتے ہوئے حصہ لے سکتے ہیں۔
مقررہ مدت میں آپ ایک دفعہ قرعہ اندازی سے پانچ صد روپے کی کثیر امدادی رقم حاصل کرتے ہیں۔
اس کے علاوہ آپ کو وہ بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے منافع سے اس اسکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبروں کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔
اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی صورت میں ضبط نہیں ہوتا خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

ان کے علاوہ

اور بہت سی خوبیاں اور سہولتیں ہیں جو آپ کو آج کل کی تمام امدادی کمیٹیوں میں حاصل ہو سکتی ہیں۔

پانچ گروپ چند ماہ میں مکمل ہو چکے ہیں اور آج تک بیس ممبروں کو دس ہزار روپیہ تقسیم ہو چکا ہے۔ جو کمپنی ہذا کی دیانت اور اعتماد کی بہترین دلیل ہے۔ چھٹا گروپ قریب الاختتام ہے اپنا کھاتہ جلد محفوظ کرا لیجئے۔ تاکہ آپ کو ساتویں گروپ کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

تفصیلات مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیجئے

باوقار کمپنی لمیٹڈ

بندر روڈ کراچی نمبر (۱)

فون نمبر 70928

SUNDER PALAYAKAT CO.
আবদুল্লা
FAST COLOUR
GUARANTEED
Abdulla
BRAND
LUNGI
عبداللہ مارکہ
MADRAS - CALCUTTA

अफगान
افغان
Afghan
BRAND
100%
COTTON
LUNGI
SUNDER PALAYAKAT CO.
MADRAS - CALCUTTA

अब्बा
আব্বা
عبا برانڈ
ABBA
BRAND
LUNGI
MANUFACTURED BY
SUNDER PALAYAKAT CO.
MADRAS - CALCUTTA

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اردو رسالہ

ISSN : 0971 - 6009

۱۵: | جنوری فروری ۲۰۰۰ء ملینیم۔ عید نمبر | شمارہ ۱-۲

مدیر : ف۔س۔اعجاز

اس شمارے کی قیمت : ۲۰ روپے

زر سالانہ : ۱۲۰ روپے

مغربی ممالک سے : £ 15
or
US $ 25

INSTRUCTIONS FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

امریکہ سے انٹرنیشنل منی آرڈر روانہ کئے جائیں جو کلکتہ میں امریکن ایکسپریس بنک سے نقد واجب الادا ہوں۔

فہرست

منظومات : ف۔س۔اعجاز ۷ جگن ناتھ آزاد / قاضی رئیس ۱۳ نیاز جیراجپوری ۱۴ حاجی انیس دہلوی / عنبر بہرائچی ۱۸ اشرف کمالی / شبنم سنبھلی / سہیل فصیحی ۲۱ ف۔س۔اعجاز / نوشاد مومن ۲۵ عاصی کاشمیری / رئیس الدین رئیس / مدہوش بلگرامی / فاروق جائسی ۲۶ / نریندر سیٹھ / عاصی کاشمیری / ظفر محبی ۲۷ نقشبندی / پرکاش تیواری ۳۴ طہور منصوری نگاہ ۳۵ اچل بھارتی ۶۱ فراق جلال پوری / ڈاکٹر شباب للت ۶۸

نیا سال، نئی صدی، نیا ہزارہ اور عید مبارک

گرافکس : ثاقب فیروز

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :
۲۵۔بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون: ۲۳۵-۴۶۱۶

Fax : 232-0104 Attn. "MAHNAMA INSHA" • E-mail : safe@cal2.vsnl.net.in